ماہنامہ

نئے اُفق

قیمت =/50 روپے

ابتدائیہ

متفرق کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

سلسلے وار ناول

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

پولیس ناکے اور دہشت گرد......؟

کراچی شہر آج کل پھر دہشت گردی کی زد پر ہے ہر روز کہیں نہ کہیں نامعلوم دہشت گرد دو چار افراد کو لقمہ اجل بنا رہے ہیں، کہیں کوئی انہیں روکنے والا نہیں ہے صرف زبانی بیان بازی کے جوہر دکھائے جا رہے ہیں۔ سندھ کے وزیر داخلہ کا فرمانا ہے کہ ''ٹارگٹ کلنگ کرنے والوں کو اللہ ہی ہدایت دے۔'' انہوں نے ٹھیک ہی تو کہا ہے شاید انہیں ٹارگٹ ہلاکتوں کی ہدایت بھی اللہ ہی نے دی ہوگی اور انہیں یوں ہی دندناتے پھرنے اور قتل در قتل کرنے کا سدباب کرنے انہیں گرفت میں لینے کے بجائے ان کی ہدایت کی دعا کرنے کی بھی ہدایت یا توفیق وزیر داخلہ کو اللہ ہی نے دی ہوگی۔

کراچی میں جگہ جگہ ہر چھوٹی بڑی اہم اور غیر اہم سڑک پر کئی کئی جگہ پولیس نے ناکے لگا کر عوام الناس کو ٹریفک جام کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو وہ اس طرح ٹریفک کے اژدہام میں دہشت گردوں کو محفوظ راہ داری فراہم کر رہے ہیں کیونکہ جگہ جگہ پولیس نے سڑکوں پر آڑی ترچھی موبائلیں کھڑی کر کے آدھی سے زیادہ سڑک کو گھیر رکھا ہے دونوں اطراف میں کھڑے پولیس والے بظاہر تو ڈیوٹی دے رہے ہوتے ہیں لیکن کسی کی توجہ ٹریفک سے زیادہ یا تو باہمی گفتگو پر موبائل فون سے بات کرنے پر یا کھڑی گاڑی میں سیٹ پر پاؤں پسارے نیم غنودگی کے عالم میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں حقیقی دہشت گردوں کو موقع مل رہا ہوگا کہ ٹریفک کے رش میں درمیان میں رہ کر اپنی راہ نکلیں۔ اگر کہیں پولیس کسی کو روک رہی ہے تو وہ بلا جواز بلا ضرورت افراد کو روک رہی ہے کسی کی نمبر پلیٹ مڑی ہوئی ہے، کسی کی شکل پسند نہیں یا اس کے چہرے پر داڑھی ہے تو اسے روک رہے ہیں، کہیں پولیس والے صرف موٹر سائیکل سواروں کو روک رہے ہیں ان کی جامع تلاشی کر رہے ہیں، ان کی جیبوں کا صفایا کیا جا رہا ہے جو ذرا چیں چپڑ کرتا ہے بقول پولیس مین کے نخرہ کرتا ہے، اسے لائن میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور چالان کر دیا جاتا ہے اور دہشت گردی میں بند کر دینے کی دھمکی الگ دی جاتی ہے۔

کراچی شہر کا نظام پہلے ہی گاڑیوں کی تعداد میں اضافے کے باعث اور سڑکوں کی زبوں حالی کی وجہ سے انتہائی خراب ہے۔ اب اس پر یہ دہشت گردوں کی تلاش میں جگہ جگہ ناکے بازی نے معصوم بے قصور لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ سب سے بڑی خرابی اس وقت دیکھنے میں آتی ہے کہ جب کوئی ایمبولینس اپنے ہوٹر بجاتی رہتی ہے اور اسے ٹریفک ہجوم سے نکلنے کی جگہ کسی طرح نہیں ملتی کیونکہ آگے ناکہ جو لگا ہوتا ہے اور تمام گاڑیاں ناکے کی چھلنی سے چھن کر ہی گزر سکتی ہیں تب تک ایمبولینس میں لیٹے مریض کا جو بھی حشر ہو اس کی کسے پرواہ ہے۔ یہاں تو صرف اور صرف وزیر داخلہ کے احکام کے مطابق ہر پولیس اسٹیشن کے انچارج کو زیادہ سے زیادہ نمبر بنانے اور اپنی کارکردگی دکھانا جو ہے۔ اس میں قصور اور بے قصور کی کوئی تخصیص نہیں بس کام ہونا چاہئے، مجرم اندر ہونا چاہئے، چاہے اس نے کوئی جرم کیا ہو یا نہ کیا ہو یا صرف پولیس کے روکنے پر اس نے اپنی ناراضی کا اظہار ہی کیا ہو۔ آخر یہ بھی تو بڑا شدید جرم ہے کہ بھلا

پولیس روکے اور اس سے باز پرس کرے تو بندہ خوامخواہ اپنی ناراضی یا خفگی کا اظہار کردے' آخر یہ بھی تو جرم ہی ہے اور پولیس کے کام میں مداخلت کا کیس از خود بن جاتا ہے۔

کیا کراچی میں پولیس اس طرح کی ناکہ بندی سے کراچی میں ہونے والی دہشت گردی کو روک سکے گی جب کہ کسی بھی پولیس اسٹیشن کی تمام نفری سڑکوں پہ ناکہ بندی میں لگی ہوتی ہے اور نا صرف پولیس اسٹیشن بلکہ شہر بھر کے تمام محفوظ اور غیر محفوظ علاقے دہشت گردوں کے لیے خالی چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہیں بھی خوب کھل کر کھیلنے کا موقع مل رہا ہے اور وہ پوری جرأت' دلیری' بے خوفی سے اپنی کارروائیاں کررہے ہیں اور محفوظ ہیں۔ کیا کراچی میں اب تک قتل ہونے والوں میں سے کسی ایک کا بھی قاتل گرفتار ہوسکا ہے۔ عام شہریوں کی بات تو اپنی جگہ وہ تو چھٹ بھیئے ہوتے ہیں' کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں مرنے کے لیے ہیں لیکن کراچی کے جید علمائے کرام زعمائے دین کے قاتلوں پر بھی ابھی تک ہاتھ ڈالنا تو دور کی بات انگلی بھی نہیں رکھی جاسکی۔

کراچی میں غنڈہ راج یا پولیس راج دونوں ہی اپنے عروج پر ہیں۔ ہر سیاسی لسانی گروہ اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ معصوم بے گناہ لوگوں کو قتل کرکے یا اپنے مخالفین کا صفایا کرکے کررہا ہے۔ کسی کی ناک نیچی نہیں سب ایک سے بڑھ کر ایک اپنی قوت کا اسلحہ کی برتری کا کھلے عام مظاہرہ کررہے ہیں اور پولیس جگہ جگہ ناکہ بندی کرکے انہیں محفوظ راہ داری فراہم کررہی ہیں۔ دہشت گرد جہاں چاہتے ہیں جدھر چاہتے ہیں اپنی من مانی کررہے ہیں انہیں کوئی خوف کوئی خطرہ اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ خوب اچھی طرح دیکھتے سمجھتے ہیں کہ ان کی راہ روکنے والا سارا کا سارا عملہ سڑکوں پر عام لوگوں کی راہ روکنے میں لگا ہوا ہے اور ان کا راستا صاف کررکھا ہے۔ جدھر سے چاہے وہ آئیں اپنا کام کریں اور نکل جائیں۔ انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں کیونکہ روک ٹوک اسلحہ برداروں کی کرکے مرنا ہے' روک ٹوک تو عام شہریوں کی کرنا ہے' جن سے کچھ کیا کافی کچھ فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے اور اٹھایا جارہا ہے۔ چور ڈاکو بھی موقعہ محل دیکھ کر اپنی کارروائی کرتے ہیں لیکن پولیس تو کھلے عام پوری سڑکوں پر لوگوں کو خصوصاً موٹر سائیکل سواروں کو روک کر ان کا صفایا کررہی ہے۔ زبان درازی احتجاج کرنے پر دہشت گردی میں بند بھی کرسکتی ہے پھر تو مجبور و بے بس کو ضمانت کرانے اور پولیس اسٹیشن کے چکر لگانے میں نانی یاد آجاتی ہے اور جرمانہ الگ منہ مانگا ادا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی پولیس کا نعرہ تھا کہ ''پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی''۔ لیکن غالباً اب یہ تبدیل ہوکر ''پولیس کا ہے فرض مرمت آپ کی'' جس پولیس کا سربراہ وزیر داخلہ ہی انہیں اللہ سے ہدایت پانے کی دعا دے رہا ہو تو اس بے چارے کی بے بسی' بے چارگی اور مجبوری کا عالم دیدنی ہی ہوسکتا ہے' جانے وہ کیسے اب تک اپنی اس بے بسی کے ساتھ پولیس کی سربراہی کررہے ہیں۔ شاید وہ اسے چھوڑنا چاہتے ہوں لیکن پولیس کا کمبل انہیں نہیں چھوڑ رہا ہو یا پھر یہ ہو کہ چھٹتی نہیں ہے ظالم منہ کو لگی ہوئی۔ اقتدار اور وہ بھی ایسا اقتدار کہ سب کے سب اقتدار و اختیارات ایک طرف اور وزارت داخلہ کے اختیار و اقتدار ایک طرف موجاں ہی موجاں ہیں۔ اگر وہ پولیس کے کسی طرح رسا ڈال بھی دیں تو ان کی اپنی خیر کہاں ہوگی۔ اللہ اہل کراچی کی خصوصاً اہلِ پاکستان کی عموماً حفاظت فرمائے آمین۔

گفتگو

عمران احمد

> ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات (بلاتحقیق) بیان کردے۔'' (مسلم)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

پراسرار کہانی نمبر 2 کو پسند کرنے کا شکریہ، دراصل آپ کی پسند ہی ہمیں حوصلہ دیتی ہے کہ ہم نت نئے تجربوں سے گزر سکیں۔ یہ آپ کی ہی حوصلہ افزائی ہے کہ نئے افق اپنی اشاعت کے مسلسل انتالیس سال مکمل کرسکا ہے اور اب اس کے بعد آنے والے شمارے سے یہ بھی اپنی اشاعت کے چالیسویں سال میں داخل ہوجائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ، موسم آتے رہتے ہیں جاتے رہتے ہیں ان چالیس سالوں میں ہمیں تقریباً تین نسلوں کا ساتھ ملا ہے۔ امید ہے آپ کا یہ نئے افق یوں ہی اور کئی نسلوں تک آپ کی دلچسپی اور تفریح کا سامان مہیا کرتا رہے گا۔ ادارے کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اپنے قارئین کی دلچسپی و تفریح کے ساتھ ساتھ ان کی کچھ نہ کچھ ذہنی تربیت بھی کرتے رہنا چاہیے۔ الحمدللہ آپ کے تعاون سے ہم بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ عریانی فحاشی کا کھل کھلا کر اظہار جو ایک وبائی شکل اختیار کر چکا تھا اب تقریباً تھم چکا ہے آئیں اب چلتے ہیں آپ کی کھٹی میٹھی محفل کی طرف۔

شہناز بانو...... کراچی۔ محترم عمران بھائی، السلام علیکم ورحمتہ اللہ! اللہ کرے تمام قارئین اور نئے افق کا سارا اسٹاف بخیریت ہو، بہت بھی غیر حاضری کے بعد محفل میں ایک بار پھر حاضر ہوں۔ میری کوئی خاص مصروفیات تو نہیں تھیں۔ بس اپنے القرآن کے مدرسے کی مصروفیات تھیں لیکن محفل میں شرکت نہ کرنا ایک بڑا سبب میرے ہاتھ میں ہونے والی تکلیف تھی۔ گردن سے درد دائیں ہاتھ کے انگوٹھے تک آرہا تھا کیفیت یہ تھی کہ اس ہاتھ سے پانی کا گلاس بھی منہ تک نہیں لے جا پارہی تھی۔ پھر لکھتی کیسے......؟ اس لیے کوئی اسٹوری بھی تحریر نہیں کی۔ اب کچھ بہتری آگئی ہے تو دوبارہ آپ سب کے سامنے حاضر ہوں۔ میرے جن ساتھیوں نے میری کمی محسوس کی مجھے یاد کیا، سلام لکھے ان سب کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ سب میری دعاؤں میں ہمیشہ رہتے ہیں اللہ سب کو سکھی رکھے۔ میرے بڑے بیٹے ارشد اور ان کی زوجہ حج بیت اللہ کے لیے گئے ہیں دعا کیجیے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانیاں پیدا کرے اور ان کی عبادات، حج اور دعائیں قبول فرمائے۔ عمران بھائی نے پراسرار نمبر نکال کر میری دیرینہ فرمائش کو پورا کیا ہے لیکن افسوس کہ میں اس کے پہلے حصے کے لیے کوئی کہانی نہیں لکھ سکی۔ عبداللہ شاہد بھی بہت دنوں سے غائب ہیں بلکہ بہت سے پرانے ساتھی غائب ہوتے جارہے ہیں۔ اس وجہ سے محفل کی تو جیسے رونق ہی ختم ہوگئی ہے۔ بھئی پہلے کی طرح سب لوٹ آئیں تاکہ محفل کا مزہ دوبالا ہوجائے ریاض صاحب، جاوید مقبول، عالیہ انعام آپ سب کو بہت سلام، بھائی لنگاہ آپ کی صحت کیسی ہے؟ یہ بہن آپ کی صحت اور خوشیوں کے لیے ہمیشہ دعاگو رہتی ہے۔ بیٹے کی شادی بہت مبارک ہو۔ طاہرہ جبیں کیسی ہو، فیس بک پر تو تمہاری نظمیں اور غزلیں میں پڑھتی رہتی ہوں محفل میں بھی ضرور آؤ، ریحانہ کی غزلیں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ پرچے میں ارشد علی ارشد ایک بہترین اضافہ ہیں ان کی ناول کی تمام اقساط ایک ساتھ پڑھیں کیا تعریف کروں، میرے پاس الفاظ نہیں ہیں بہت بہترین، بہت شاندار لکھ رہے ہیں۔ سچ اور حقائق پر مبنی ناول ہے اللہ آپ کا زور قلم اور زیادہ کرے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو ہم ''سچی کہانیاں'' کے پرانے لکھنے والے ساتھی ہیں۔ آپ دبئی چلے گئے تھے واپس آگئے ہیں یا وہیں سے لکھ کر بھیج رہے ہیں اللہ آپ کو صحت و ہمت عطا فرمائے۔ پراسرار کہانی نمبر کی

تقریباً کہانیاں اچھی تھیں سوائے ایک دو کے اب ان کے نام نہیں لکھوں گی۔ ورنہ انہیں اچھا نہیں لگے گا۔ ویسے میرا خیال تھا کہ یہ نمبر جنوری میں نکالا جاتا بچپن میں جب میں کوئی ڈراؤنی کہانی پڑھتی تھی تو خوب ڈر لگتا تھا پھر لحاف میں منہ چھپا لیتی تھی۔ ویسے بھی سردیوں کی راتیں ہوتی ہی پراسرار ہیں۔ لوگ جلد ہی گھروں کو لوٹ جاتے ہیں اور باہر سناٹا پھیل جاتا ہے۔ خیر چلیں جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ اب اجازت دیں، بہت لکھ لیا ہاتھ ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ سب دعاؤں میں یاد رکھیں۔ جن، بہن بھائیوں کا حال نہیں پوچھ سکی ہوں وہ ناراض نہ ہوں، باقی آئندہ۔ والسلام

طاہرہ حسین تارا...... لاہور۔ محترمی عمران صاحب آداب۔ امید ہے خیریت سے ہوں گے کافی عرصے بعد گفتگو کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں کچھ تو میں بیمار رہی کچھ کالج کی مصروفیات کی وجہ سے محفل میں شریک نہ ہو سکی نور الدین شہروز کے والد محترم کی وفات کا بہت دکھ ہوا اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین اور پسماندگان کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا کرے۔ ٹائٹل اس دفعہ بھی بہت اچھا ہے شہرِ خموشاں کا دروازہ اور دروازے کے باہر استخوان سر جو کبھی کسی کے سر کا غرور تھا خطوط کی محفل میں بہت سے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی اور کچھ ساتھی مستقل غائب ہیں۔ اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے ویسے آپس کی بات ہے کہیں قادری اور عمران کے دھرنے میں اسلام آباد کی سیر تو نہیں کر رہے کیونکہ آج کل بے چارے عوام کو لفاظی کے جال میں جکڑ کر اور ان کو پیسوں کا لالچ دے کر ہمارے نام نہاد رہنما اپنی کرسی وزارت کے لیے سرگرداں ہیں کسی نے مذہب کو آڑ بنایا ہے اور کوئی ووٹ کو چیلنج کر رہا ہے دشنام طرازی اور الزام تراشی کا ایک باب کھلا ہوا ہے جانے یہ رہنما کس کے آلہ کار بن کر ملک کی معیشت کو تباہ کر رہے ہیں۔ کاروبارِ زندگی معطل ہو کر رہ گیا ہے اور ہم مسلمان پوری دنیا میں تماشا بن کر رہ گئے ہیں نئے پاکستان کے چکر میں فحاشی اور بے راہ روی کو ہوا دے رہے ہیں اللہ ہمیں عقلِ سلیم سے نوازے۔ انکل مشتاق احمد بھی انہی رہنماؤں کا پول کھول رہے ہیں جو نماز کی تلقین کرنے کے بجائے مسلمان بہن بیٹیوں کے ناچ گانے سے حظ اٹھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کرشماتی نام اللہ نے دل و ذہن کے بند تالوں کو کھول دیا اگلی صفات کا انتظار ہے۔ پانچ سلسلوں نے خوش کر دیا کوشش کروں گی کہ پانچوں سلسلے کے لیے کچھ لکھ سکوں مستقبل ساز ایک اچھی کاوش ہے کمپیوٹر کے حوالے سے مستقبل میں جھانکنا۔ "ردوبدل" "آپ اپنی قید میں صیاد آ گیا" "آخری چوری" "انجام کار موت۔" گنج ادا بس ٹھیک ہی تھی "محبت گزیدہ" "مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے" سیاہ گلاب کالے بلے کے شیطانی کام مزے کی تھی شہناز آپی سچ میری امی بھی یہی کہتی تھیں کہ مغرب کے وقت درختوں کے پاس نہ جاؤ ننگے سر صحن میں نہ نکلو شیطانی چیزیں ہوتی ہیں آپ نے امی کی یاد دلا دی "انجانا خوف" پولیس کا سیاہ کارنامہ ہماری پولیس یونہی کرتی ہے بے گناہ مارے جاتے ہیں اور گناہ گار دندناتے پھرتے ہیں انوکھا تجربہ سب سے بہترین کہانی تھی جس نے دل کے تاروں کو چھو لیا۔ نوشاد صاحب ویل ڈن بھوک انسان کی ہوس کو ابھارتی ہے اور انسان، انسان نہیں رہتا وحشی اور درندہ بن جاتا ہے حلال اور حرام میں کوئی فرق نہیں رہتا آپ نے لفظوں سے منظر نگاری کر کے سعادت کے افسانوں کی یاد دلا دی "شب حیرت" آج کل پریوں کا دور کہاں رہا ویسے جنوں کا ذکر تو ہے مگر یہ پری؟ پھر انسان سے شادی؟ "دہشت زدہ" گورکن صاحب نے اچھا سبق سکھایا ناصر کو دیدبان اور قلندر ذات بہت اچھی جا رہی ہیں اگلی قسط کا انتظار ہے جگت سنگھ کو تو اب ختم ہو جانا چاہیے زیادہ طوالت بھی بوریت پیدا کر دیتی ہے ایک کہانی لکھنی شروع تو کی ہے جیسے ہی مکمل ہوئی آپ تک ارسال کر دوں گی۔ آپ، نئے افق کو سجانے والے اور قارئین کو عید کی ڈھیر ساری خوشیاں مبارک اللہ تعالیٰ ہمیں قربانی کا صحیح فہم عطا کرے اور ایک دوسرے کے لیے ایثار کا جذبہ پیدا کرنے کی توفیق عطا کرے آمین۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب سلام شوق، امید ہے آپ اور ادارے کے باقی سب لوگ بخیریت خوش و خرم ہوں گے۔ آپ لوگ جس طرح ہماری تفریح طبع کا سامان کرتے ہیں اللہ کریم اس پر آپ کو بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ منفرد ٹائٹل والا اکتوبر کا نئے افق پراسرار کہانی نمبر 2 باصرہ نواز ہوا۔

سب سے پہلے اپنے ساتھی نورالدین شہروز صاحب کے والد محترم کی وفات حسرت آیات کی خبر پڑھی جس سے دلی صدمہ ہوا خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ نصیب فرمائے لواحقین اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اس پر اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے خون کے آنسو رلا دیا وہ کون سی نیکی ہے جس کے لیے نماز جیسے اہم رکن دین کو چھوڑ دیا جائے آقائے نامدار نے فرمایا جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی اس نے کفر کیا اور تاریخ گواہ ہے غزوات میں جب گھمسان کی جنگ جاری ہوتی تھی تو نماز کے وقت آدھے مجاہد جنگ کرتے اور آدھے پیچھے جا کر باجماعت نماز ادا کرتے پھر وہ جنگ لڑتے اور باقی ماندہ مجاہد جا کر نماز ادا فرماتے۔ اب ان نام نہاد علمائے دین نے دین کی صورت ہی بگاڑ دی ہے خدا انہیں فہم دین عطا فرمائے اور اہم دین کو ذاتی مفادات پر قربان کرنا چھوڑ دیں، آمین۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے بہت پیاری حدیث بیان کی ہے جو سبق آموز بھی ہے عمران بھائی اپنی بات میں آپ نے بڑے عزم کے ساتھ سال میں مختلف موضوعات پر پانچ نمبر لانے کا وعدہ کیا ہے خداوند کریم آپ کو اس پر استقامت بخشے آمین۔ گفتگو میں اس بار کرسی صدارت محترمہ ریحان سعیدہ لاہور کے حصے میں آئی انہوں نے اپنے خط میں ہر محب وطن پاکستانی کے دل کی بات کی ہے ہم نے خاص دنوں کا تقدس پامال کر دیا ہے کاش ہم اصل اور نقل کو پہچان سکیں۔ جناب ریاض بٹ صاحب کا تبصرہ خوب تھا بھائی آپ نے میرا تبصرہ اور غزل پسند فرمائی ڈھیروں شکریہ قبول فرمائیں۔ آپ کی کہانیوں کا رنگ واقعی جداگانہ ہوتا ہے اور اصلاحی پہلو اس میں بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے اللہ کریم آپ کی اس سعی کو قبول و منظور فرمائے آمین۔ جناب محمد اسلم جاوید صاحب لیے مختصر تبصرہ کے ساتھ تشریف لائے بھائی اسلم جاوید صاحب آپ کا کلام نئے افق کے علاوہ بھی کئی جرائد میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ ماشاء اللہ آپ خوب لکھتے ہیں ایک شاعر ہونے کے ناطے آپ کو خوشبوئے سخن پر بھرپور تبصرہ کرنا چاہیے۔ میرے پڑوس سے ہمارے بزرگ جناب میاں کرامت صاحب کھری کھری باتیں لے کر تشریف لائے سوئٹ ویلکم میاں صاحب محترم عمران احمد صاحب کو چاہیے کہ آپ کی تحریر کو وزن دیں اور اس مقبول جریدہ میں کچھ تبدیلیاں کریں۔ میاں صاحب آپ کو اپنے درمیان پا کر بہت خوشی ہوئی خدائے لم یزل آپ کو اس پیرانہ سالی میں صحت اور تندرستی عطا فرمائے اس جریدے سے اتنی پرانی وابستگی آپ کی مستقل مزاجی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جناب عبدالرحمان بالی کا مختصر خط خوب تھا۔ جناب حسن اختر پریم صاحب خیر مبارک تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ بھائی ایک کراچی کیا پورے ملک کے حالات دل جلا دینے والے ہیں۔ دراصل ہم سب کے دل خوف خدا سے عاری ہو گئے ہیں اور باقی تو پھر کچھ نہیں بچتا۔ رب کریم ہم سب پاکستانیوں کے دلوں میں اپنا خوف پیدا فرمائے۔ جناب مبارک علی صاحب چیچہ وطنی سے تشریف لائے ہیں انہوں نے بھی میری طرح بعض دوستوں کی مسلسل غیر حاضری کو محسوس کیا اور انہیں حاضر ہونے کی دعوت دی۔ خدا کرے کہ غیر حاضر دوستوں کے کانوں پر جوں رینگ جائے۔ جناب سید عبداللہ شاہد، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، عمر فاروق ارشد، عصمت اقبال عین اور بہت سے دوسرے، بہن بھائی تو جیسے گفتگو کی محفل کو بھول ہی گئے، بھئی لوٹ آؤ۔ زین الدین صدیقی صاحب اچھے تبصرے کے ساتھ شریک گفتگو ہوئے۔ بھائی تبصرہ پسند فرمانے کا بہت شکریہ، جناب نجم حسن صاحب بھی دوستوں کی غیر حاضری سے شاکی نظر آئے۔ کاش غیر حاضر ساتھی ہم سب کے احساسات کو محسوس کریں بھائی زین الدین خیر مبارک آپ کا شکر گزار ہوں۔ اقرا میں اس بار محترم مشتاق احمد قریشی صاحب خالق و مالک حقیقی اللہ کے بارے میں ایک تحریر لائے جس کی بہت اہم ضرورت تھی پہلی قسط میں ہی آنکھیں کھل گئیں، خوشبوئے سخن میں سب انتخاب ہی اچھا تھا ایک سے بڑھ کر ایک کلام تھا۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ محترم عمران احمد صاحب السلام علیکم! پر اسرار کہانی نمبر 2 ملا۔ تمام مواد نہایت عرق ریزی سے جمع کیا گیا تھا اور کاش حدیث مبارکہ کے مطابق ہی ہم اپنی زندگیاں ڈھال لیں آمین۔ ہم بھی نورالدین شہروز کے غم میں برابر کے شریک ہیں یہ پورے سال کا شیڈول دے کر آپ لوگوں

نے قارئین کے دل جیت لیے ہیں واہ خوب مزہ رہے گا۔ اسی دوران عیدالاضحی بھی گزرے گی۔ تمام قارئین کو مبارک باد اور جو لوگ حج جیسی نعمت سے مستفید ہو رہے ہیں انہیں نصیب ہو اور ہمارے ملک کے حالات بھی صحیح ہوں۔ یہ سونامی تا ٹپ دھرنے، سیلاب اور دوسری آفات یہ ہم سب من حیث القوم کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ حقوق العباد کو پامال کرنے والی قومیں ہمیشہ ہی مصیبتوں میں مبتلا کردی جاتی ہیں۔ بے حسی، بے وقعتی اور ظالمانہ رویہ ہم سب کی فطرت میں رچ بس گئے ہیں۔ سب واویلا دیکھنے کے بجائے اصلاح کا پہلو اپنے آپ سے، اپنے گھر سے شروع کرنا ہوگا تب ہی ہم کچھ پا سکیں گے۔ گفتگو میں ریاض بٹ صاحب کا شکریہ کہ یاد رکھا اسی طرح ریاض قمر آپ کا بے حد شکریہ آپ کی شاعری خوب صورت اور استعاروں اور محاوروں کا مرقع ہوا کرتی ہے۔ عبداللہ شاہد پتا نہیں کہاں ہیں اور اس دفعہ سرور شاذ کی آزاد نظم دیکھ کر تعجب ہوا کہ موصوف کون سے کونے سے نکل کر وارد ہوئے۔ خیر مرضی کے مالک ہیں۔ اسی طرح محترم فقیر بخش لنگاہ صاحب و صاحبزدگان کے تبصروں کے بھی منتظر ہیں۔ ہاں ہماری محترمہ تہنی ارشاد کہاں ہیں؟ تبصروں میں سب ہی نے ملکی حالات کو اجاگر کیا۔ چند ایک ہمارے بے باک تبصرہ نگار بھی غائب ہیں۔ کہانیوں میں سب ہی اچھی تھیں۔ عمران جی نے لکھا ہے کہ ابھی تک کہانیاں موصول ہو رہی ہیں تو جناب دیر کس بات کی پراسرار کہانی نمبر 3 بھی ہو جائے۔ ردوبدل اچھی کہانی رہی۔ انجانا خوف پراسراریت سے مبرا تھی اور انوکھا تجربہ تو صحیح معنوں میں سائنسی کہانی تھی۔ اس کا تعلق پراسراریت سے نہ تھا یہ دونوں کہانیاں آپ عام شمارے کے لیے رکھ لیتے۔ آخر میں اس شمارے کی سلسلہ وار کہانیوں کے علاوہ خورشید پیرزادہ کی مستقبل ساز تو انتہائی خوبصورت، گہرائی میں جا کر لکھی گئی سسپنس اور تجسس سے بھرپور کہانی ہے آگے انتظار رہے گا۔ اقرا امین قریشی صاحب کی کتاب اللہ سے لی گئی تحریر تو دل میں اتر گئی۔ جزاک اللہ خوشبوئے سخن میں میرا انتخاب بارہواں کھلاڑی شامل کرنے کا شکریہ۔ باقی محمد اسلم جاوید، ریاض حسین قمر زبردست رہے، ریاض حسین قمر بھی خوب تھے۔ اسی طرح ذوق آگہی میں میرے بھیجے دو سوال بھی تھے شکریہ۔ دعاؤں کا طالب۔

مجید احمد جائی...... ملتان شریف۔ محترم عمران احمد صاحب! ڈھیروں دعاؤں، نیک خواہشات کے ساتھ، لبوں پر مسکراہٹ کے پھول سجائے بنا اجازت منہ اٹھائے نئے افق کی نگری میں حاضری دے رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ہمیشہ آپ کو، نئے افق کے تمام اسٹاف، قارئین، لکھاریوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، دشمنوں کے شر سے محفوظ اور دوستوں کی محفلیں سجی رہیں۔ ایمان کی سلامتی، صحت کی بادشاہی ہو۔ جہاں رہے خوشیاں رقص کریں۔ اداسیاں، محرومیوں کا دور دور تک نام ونشان تک نہ ہو۔ لمحہ لمحہ رب سوہنے کی رحمتوں کا نزول ہو۔ آمین ثم آمین۔ اُمید واثق ہے بندہ ناچیز کو ویلکم کریں گے۔ ویلکم تو آپ کر چکے ہیں ہمیشہ محبتوں کا ثبوت فراہم کریں گے۔ نئے اُفق میں پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ سب آپ کی کرم فرمائی ہے کہ بندہ منہ اٹھائے، پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس اتنی اچھی محفل میں آ ٹپکا ہے۔ دھتکارنا نہیں ہم جوتیوں پر بیٹھ جائیں گے۔ بس تھوڑی سی جگہ عنایت فرمانی پڑے گی۔ لمبی تمہید نہیں موضوع کی طرف آتے ہیں۔ سولہ اگست کو لاہور سے ملتان چھٹی پر آیا تو اپنے پوسٹل ایڈریس سے ڈاک کا پتہ کیا۔ بہت سے لیٹر کے ساتھ نئے اُفق کا پرچا بھی موصول ہوا۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ دل بھنگڑے ڈالنے لگا۔ ارے بابا تجھے کیا ہوا۔ نہیں معلوم میرے پاگل شہنشاہ آپ کی کہانی ''خونی بیوی'' نئے افق میں شامل اشاعت ہے اسی لیے تو پرچا آپ کو بھیجا گیا۔ یہ نئے اُفق کی بہترین پالیسی ہے کہ جس کی کہانی اشاعت ہوتی ہے اسے اعزازی پرچہ ارسال کیا جاتا۔ واہ بھائی واہ۔ ہم خوش ہو گئے۔ لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پاگلوں کی طرح ٹائٹل میں اپنی کہانی کا صفحہ معلوم کیا اور وہیں کھڑے کھڑے خونی بیوی کا دیدار کر لیا۔ بہت شکریہ بہت مہربانی۔ کمرشل اور جھلکیاں دیکھتے ''دستک'' مشتاق احمد قریشی کے پاس جا ٹھہرے۔ مشتاق صاحب نے حکومت وقت کی توجہ جس طرف کروائی قابل تعریف ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ میری بیوی نے دستک پڑھنے کو کہا۔ دستک کا جو اثر میری بیوی پر ہوا اسے بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میرے ماموں، جو میرے سسر بھی لگتے تھے، سعودی عرب میں

وصال فرما گئے تھے۔ان کی تدفین کے لئے جو مشکلات پیش آئی بیان کرنے سے قاصر ہوں۔میری بیوی ابھی تک وہ پل، وہ لمحے نہیں بھول پائی۔اس غم سے نہیں نکل سکی۔بس دعا کو کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔گفتگو میں عمران احمد کی باتیں دل پر اثر کر گئی۔ان کے علاوہ تمام خطوط زبردست تھے۔لیکن بہت کم شامل حال تھے۔ریاض حسین قمر، ادیب سمیع چمن، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، ریاض بٹ، ایس ذیشان ریاض، حسن اختر پریم شامل تھے۔کہانیوں پر تبصرے دو تاریخ مشکل ہدف دیا گیا ہے۔کہانیوں میں سب سے پہلے راہ انتقام خورشید پیرزادہ کی پڑھی۔کافی محنت سے لکھی گئی تھی۔ ہما کا مختصر کردار پسند آیا۔روزی جو بدروح کا کردار تھی، کیسے انجان تھی کہ اس کا قاتل اس کا محبوب نہیں بلکہ اسٹیورٹ تھا۔روحوں کو علم ہوتا ہے پھر یہ کیسے انجان تھی؟ خیر بہترین کہانی لکھی گئی تھی۔اس کے بعد نقوش عبرت ریاض حسین شاہد معاشرے کی عکاسی کر رہی تھی۔آج کے جدید دور میں بھی نام نہاد عامل ہیں جو لوگوں کو گمراہی ہی نہیں بلکہ ان کی عزت اور دولت سے کھلواڑ کر رہے ہیں۔یہ سچ ہے کہ ناحق قتل کبھی نہ کبھی دست گریبان ضرور ہوتا ہے اسی لیے تو جبار گرفت میں آیا اور جس کو قتل کیا اس کی قبر سے لپٹ کر معافی مانگتا وہی ڈھیر ہو گیا۔زبردست تحریر تھی۔خونی بیوی مجید احمد جائی، اپنی کہانی بار بار پڑھتا رہا اور نئے اُفق کو داد دیتا رہا۔بھیانک راستہ احمد سجاد بابر، بدعقیدہ نوشاد عادل، پراسرار خزانہ، خلیل جبار، بددعا زریں قمر کی بہترین کہانیاں تھیں۔باقی ابھی زیر مطالعہ ہیں۔اس کے علاوہ خوشبوئے سخن، ذوق آگہی خوبصورت سلسلے ہیں۔اب اجازت دیں، باقی اگلے شمارے میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔اس وقت تک ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ! والسلام

ادیب سمیع چمن...... حیدر آباد۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے تمام اسٹاف اور تمام عزیزان کی جان و مال عزت آبرو کی حفاظت فرمائے اور نئے افق کے ذریعہ آپ جس طرح تبلیغ اسلام اور درمند دل و خیالات کے ذریعہ اہل وطن کی رہنمائی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ آپ کو دنیا اور آخرت میں اجر عظیم سے مستفیض فرمائے گا۔وطن عزیز کے حالات پر آپ جس طرح اپنی قوم کی اصلاح فرما رہے ہیں اس نے ہمیں ایک عظیم حوصلہ دیا ہوا ہے کہ آپ جیسے چاند ستارے لوگ وطن کی تاریکیوں میں نور کی کرنیں بکھیرنے والے موجود ہیں۔دعا ہے کہ آپ کا سایہ تادیر سلامت رہے آمین۔نئے افق میں آپ کی آپ کے اسٹاف کی انتھک محنت جگمگاتی نظر آتی ہے۔اتنا صاف و شفاف طباعت کا معیاری پرچہ اتنی کم قیمت میں میرا دعویٰ ہے پاکستان میں شائع ہی نہیں ہوسکتا ہے۔پاکستان کی قسمت میں زخموں پر زخم لگنا ہی لکھے ہیں جو اس کا کھاتے ہیں وہ اس پر ہی خنجر چلا رہے ہیں اپنے حرص و حواس اور خود غرضی میں اتنے اندھے اور بے حس ہو گئے ہیں کہ ذرا سی بات پر پاکستان ٹوٹ جانے کی گندگی سے لبریز دھمکیاں دیتے نظر آرہے ہیں۔گویا پاکستان نہ ہوا کوئی مٹی کا برتن ہو گیا کوئی نیا پاکستان بنانے کے لغو نعرے لگا رہا ہے کوئی کہتا ہے صوبے بناؤ ورنہ پاکستان ٹوٹ جائے میرا ان سے یہ کہنا ہے کہ ہمیں معاف کرو ہمارا پرانا پاکستان ہی رہنے دو خدا کے لیے تم یہاں سے چلے جاؤ کیا کوئی اپنا نیا باپ بنا سکتا ہے؟ پاکستان کی دھرتی ہماری ماں ہے تو پاکستان ہمارا باپ ہے کچھ سیاسی گماشتے اپنی بقراطی جھاڑ رہے ہیں کہ فلاں ملک میں اتنے صوبے ہیں فلاں ملک میں اتنے صوبے ہیں ان ناعاقبت اندیش لوگوں کو اتنی بھی سیاسی بصیرت نہیں ہے کہ جناب پاکستان اک نظریاتی ملک ہے یہ ایک نقطہ پر بنا ہے اس کا وجود یکجہتی اور ایک قوم سے تعمیر کیا گیا ہے اور برصغیر کے مسلمانوں نے ایک قوم ایک نظریہ کے تحت جدوجہد کی تھی۔پنجابی، پٹھان، سندھی، بلوچ اور بقول آپ کے مہاجر بن کر نہیں کی تھی تاریخ جھوٹ نہیں بولتی ہے آپ جھوٹ بول سکتے ہیں۔میرا مشورہ ہے یہاں کوئی صوبہ نہیں بننا چاہیے دنیا میں دو ہی ایسے ممالک ہیں جو اک نظریہ سے وجود میں آئے ہیں نمبر 1 پاکستان نمبر 2 اسرائیل۔یہ بقراط بتانا پسند کریں گے کہ اسرائیل میں کتنے صوبے ہیں؟ ہم صرف اور صرف مسلمان اور ایک قوم ہیں اور ہماری بقا کا دارومدار ایک قوم ہونے میں ہے اور جب بنگالیوں نے سوچا وہ علیحدہ ہیں تو ہمارا پیارا وطن کتنی جلد ٹکڑے ہو گیا۔ناعاقبت اندیش لوگ، کیا پھر ہمارے پیارے وطن کو ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں کچھ بقراط

کچھ ایسا ہی پنجابیوں کے لیے پنجاب، بلوچوں کے لیے بلوچستان، پختونوں کے لیے پختون اور سندھیوں کے لیے
[illegible] تو صدیوں سے قائم ہیں پاکستان بننے سے بھی صدیوں پہلے
ان کی مثال ایسی ہی ہے [illegible] ہندوستان میں صدیوں سے آباد تھے اور آج بھی ہندوستان میں پاکستان سے زائد
مسلمان آباد ہیں [illegible] بنایا گیا ہے اصل مسئلہ عوام کو سمجھنا ہے ایک طرف کہا جاتا ہے کہ ہم
سندھی ہیں [illegible] جب آپ خود کو سندھی سمجھتے ہیں تو پھر کیوں سندھ کی چھاتی
اور گردن پر خنجر چلا رہے ہو [illegible] اپنی ماں کو خود ہی ٹکڑے کرنے کے شیخ چلی خواب کیوں دیکھ رہے ہو؟ خدا کے
لیے [illegible] ایوب خان کے خلاف جب 1968ء میں قوم کو ورغلا کر جو تحریک چلائی گئی تھی اس وقت ون یونٹ
قائم تھی [illegible] کے ذریعے ایوب خان کو پیشکش کی گئی کہ اگر صدر ایوب ون یونٹ توڑ کر چار صوبے قائم کر دیں
تو [illegible] ایوب خان نے اپنی آخری تقریر میں فرمایا تھا کہ مجھے یہ پیشکش
قبول نہیں پاکستان کی وحدت کو ٹکڑے کر کے وطن کا غدار کہلوانا نہیں پسند کروں گا۔ جس روز ون یونٹ ٹوٹا اس دن
پاکستان ٹوٹ جائے گا اور پھر دنیا نے دیکھا ایوب خان کا تجربہ حق ثابت ہو گیا تھا۔ یحییٰ خان جو سیاسی بقراطیوں کی ڈھیل
پیداوار تھا اس کے پاس اسمبلی بھی نہیں تھی وہ بقول ان کے غیر قانونی صدر تھا اسی غیر قانونی بغیر اسمبلی کے صدر کے ون
یونٹ توڑ دیا گیا اور چھ ماہ کے مختصر عرصے میں وطن عزیز دو ٹکڑے ہو گیا جبکہ اسی ون یونٹ کے زمانے میں پاکستان نے
بے مثال ترقی کے جوہر دکھائے تھے اور ہماری قوم اسلامی دنیا کی بہترین قوم اور ہمارا پاکستان کامیابی و ترقی میں نمبر ون تھا
اور پاکستان دنیا بھر کے لیے مثال بن گیا تھا بھارت سے ہم کئی گنا آگے چل رہے تھے اسی ون یونٹ اور ڈکٹیٹروں کے
زمانے میں تربیلا ڈیم، منگلا ڈیم بنائے گئے پھر کسی نام نہاد جمہوری حکومت کو اور کوئی تربیلا ڈیم تو کیا آج تک کالا باغ ڈیم
بھی بنانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ پاکستان کا شاندار موجودہ دارالحکومت اسلام آباد 1960ء میں 1961ء میں قائم کر دیا گیا
انہیں ڈکٹیٹروں نے نئی آبادیاں اور کراچی جیسے شہر میں کورنگی جیسی بستی، اورنگی، نیو کراچی، سرجانی ٹاؤن قائم کر کے دکھا دیے۔
انہیں ڈکٹیٹروں نے مزار قائد سے لے کر ایٹمی ری ایکٹر پلانٹ چٹاگانگ سپر ہائی وے اور اسٹیل ملز، مینار پاکستان اور ہوائی
اڈے قائم کر دیے انہیں ڈکٹیٹروں نے 1965ء کی جنگ میں بھارت کو بدترین شکست سے نوازا اور اسی ایک ڈکٹیٹر نے
شاہ فیصل مسجد، شاہراہ ریشم جیسے یادگار شاہکار قائم کر کے دکھائے اور ضیاء الحق جیسے عظیم فوجی لیڈر نے پاکستان کو ایٹمی ملک بنا
کر پاکستان کا نام بلند کر دیا ہے۔ تو سوچیں ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب سے بھٹو نے تو صرف منصوبہ بنایا تھا اگر ضیاء الحق نا
چاہتے اور صدر اسحاق نہ چاہتے تو کیا کسی پارٹی میں دم تھا جو ایٹمی طاقت حاصل کر کے دکھا سکتی۔ اتنی بھی احسان فراموشی
اچھی نہیں تاریخ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ خدا کے لیے پاکستان کو سیاسی اکھاڑا مت بنائیں اسے قائداعظم کا پاکستان ہی
رہنے دیں۔ آپ نیا پاکستان تو کیا ایک نیا ڈیم بھی نہیں بنا سکتے۔ شہید ملت لیاقت علی خان کے آخری الفاظ تھے خدا
پاکستان کی حفاظت کرے اور انشاءاللہ پاکستان کی خدا حفاظت کرتا رہے گا دشمنان وطن ناکام ہوتے رہیں گے پھر پاکستان
کے غیور عوام اور اس کی مسلح افواج کے ہوتے ہوئے انشاءاللہ دشمنان وطن ہرگز کامیاب نہ ہوں گے میں نے یہ باتیں آج
کے پڑھنے والوں کے لیے بیان کی ہیں کہ یہ جمہوریت کا راگ الاپنے والے کوئی کارنامہ انجام دے چکے ہیں تو سامنے
بیان کریں سوائے مہنگائی، کرپشن، خودغرضی، فرقہ واریت کے انہوں نے پاکستان کو کیا دیا ہے؟ صرف کراچی حیدرآباد کی
ایک روزہ ہڑتال اور اربوں کا نقصان کا بتا دیا جاتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ وہ محب وطن ہیں علم دانش اور اسلام کے پیروکاروں
کے چراغ آئے دن گل ہو رہے ہیں کیا اسی کو جمہوریت کہتے ہیں؟ صدر ضیاء الحق کی حکومت کے بعد سیاسی شعبدے
بازوں نے جتنا نقصان پہنچایا ہے پاکستان کی تاریخ کو داغ دار بنا دیا ہے جو کسی کسر دھرنے دینے والوں نے پوری کر دی
ہے۔ ضیاء الحق کو قوم کا ایسا مجاہد ہیرو بنا دیا جائے جس سے نئی نسل کے خون گرما دیے جائیں فرسودہ عشق بھری لن
ترانیوں [illegible] پر نشر ہونے والی گل و نجاست اور بے ہودہ روی کی داستانوں سے نئی نسل کو پاک کر دیں یا اور اس ذہنی غلاظت

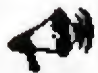
کہتے ہیں کہ پنجابیوں کے لیے پنجاب، بلوچوں کے لیے بلوچستان پختونوں کے لیے پختون اور سندھیوں کے لیے سندھ ہے تو ہمارے لیے اردو صوبہ کیوں نہیں؟ یہ تمام صوبے تو صدیوں سے قائم ہیں پاکستان بننے سے بھی صدیوں پہلے ان کی مثال کیوں دیتے ہیں آپ لوگ ہندوستان میں صدیوں سے آباد تھے اور آج بھی ہندوستان میں پاکستان سے ڈبل مسلمان آباد ہیں وہاں کیوں آج تک اردو صوبہ نہیں بنایا گیا ہے دراصل اصل معاملہ کچھ اور ہے ایک طرف کہا جاتا ہے کہ ہم سندھی ہیں ہم بھی اس دھرتی کے فرزند ہیں تو جناب بقراطیوں جب آپ خود کو سندھی سمجھتے ہیں تو پھر کیوں سندھ کی چھاتی اور گردن پر خنجر چلانے پر تلے جا رہے ہیں اپنی ماں کو خود ہی ٹکڑے کرنے کے شیخ چلی خواب کیوں دیکھ رہے ہو؟ خدا کے لیے ہمیں معاف کردو ایوب خان کے خلاف جب 1968ء میں قوم کو ورغلا کر جو تحریک چلائی گئی تھی اس وقت ون یونٹ قائم تھی۔ گول میز کانفرنس کے ذریعہ ایوب خان کو یہ پیش کش کی گئی کہ اگر صدر ایوب ون یونٹ توڑ کر چار صوبے قائم کردیں تو آئندہ انتخابات میں انہیں بلا مقابلہ صدر بنائیں گے ایوب خان نے اپنی آخری تقریر میں فرمایا تھا کہ مجھے یہ پیش کش قبول نہیں پاکستان کی وحدت کو ٹکڑے کرکے وطن کا غدار کہلوانا نہیں پسند کروں گا۔ جس روز ون یونٹ ٹوٹا اس دن پاکستان ٹوٹ جائے گا اور پھر دنیا نے دیکھ لیا ایوب خان کا تجربہ سچ ثابت ہوگیا تھا۔ یحییٰ خان جو سیاسی بقراطیوں کی ڈیل میں ڈکٹیٹر تھا اس کے پاس اسمبلی بھی نہیں تھی وہ بقول ان کے غیر قانونی صدر تھا اسی غیر قانونی بغیر اسمبلی کے صدر کے ون یونٹ تڑوا دیا گیا اور چھ ماہ کے معمولی عرصہ میں وطن عزیز دو ٹکڑے ہوگیا جبکہ اسی ون یونٹ کے زمانے میں پاکستان نے بے مثال ترقی کے جوہر دکھائے تھے اور ہماری قوم اسلامی دنیا کی بہترین قوم اور ہمارا پاکستان کامیابی و ترقی میں نمبر ون تھا اور پاکستان دنیا بھر کے لیے مثال بن گیا تھا بھارت سے ہم کئی گنا آگے چل رہے تھے اسی ون یونٹ اور ڈکٹیٹروں کے زمانے میں تربیلا ڈیم، منگلا ڈیم بنائے گئے پھر کسی نام ونہاد جمہوری حکومت کو اور کوئی تربیلا ڈیم تو کیا آج تک کالا باغ ڈیم بھی بنانے کی جرات نہ ہوسکی۔ پاکستان کا شاندار موجودہ دارالحکومت اسلام آباد 1960ء میں 1961ء میں قائم کردیا گیا انہیں ڈکٹیٹروں نے نئی آبادیاں اور کراچی جیسے شہر میں کورنگی جیسی بستی، اورنگی، نیو کراچی، سرجانی ٹاؤن قائم کرکے دکھا دیے۔ انہیں ڈکٹیٹروں نے مزار قائد سے لے کر ایٹمی ریکٹر پلانٹ چٹاگانگ سپر ہائی وے اور اسٹیل ملز، مینار پاکستان اور ہوائی اڈے قائم کردیے انہیں ڈکٹیٹروں نے 1965ء کی جنگ میں بھارت کو بدترین شکست سے نوازا اور اسی ایک ڈکٹیٹر نے شاہ فیصل مسجد شاہراہ ریشم جیسے یادگار شاہکار قائم کرکے دکھائے اور ضیاء الحق جیسے عظیم فوجی لیڈر نے پاکستان کو ایٹمی ملک بنا کر پاکستان کا نام بلند کردیا ہے۔ تو سوچیں ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب سے بھٹو نے تو صرف منصوبہ بنایا تھا اگر ضیاء الحق نا چاہتے اور صدر اسحاق نہ چاہتے تو کیا کسی پارٹی میں دم خم تھا جو ایٹمی طاقت حاصل کرکے دکھا سکتی۔ اتنی بھی احسان فراموشی اچھی نہیں تاریخ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ خدا کے لیے پاکستان کو سیاسی اکھاڑا مت بنائیں اسے قائداعظم کا پاکستان ہی رہنے دیں۔ آپ نیا پاکستان تو کیا ایک نیا ڈیم بھی نہیں بنا سکتے۔ شہید ملت لیاقت علی خان کے آخری الفاظ تھے خدا پاکستان کی حفاظت کرے اور انشاءاللہ پاکستان کی خدا حفاظت کرتا رہے گا دشمنان وطن ناکام ہوتے رہیں گے پھر پاکستان کے غیور عوام اور اس کی مسلح افواج کے ہوتے ہوئے انشاءاللہ دشمنان وطن ہرگز کامیاب نہ ہوں گے میں نے یہ باتیں آج کے پڑھنے والوں کے لیے بیان کی ہیں کہ یہ جمہوریت کا راگ الاپنے والے کوئی کارنامہ انجام دے چکے ہیں تو سامنے بیان کریں سوائے مہنگائی، کرپشن خود غرضی، فرقہ واریت کے انہوں نے پاکستان کو کیا دیا ہے؟ صرف کراچی حیدرآباد کی ایک روزہ ہڑتال اور اربوں کا نقصان پہنچا دیا جاتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ وہ محب وطن ہیں علم دانش اور اسلام کے پیروکاروں کے چراغ آئے دن گل ہورہے ہیں کیا اسی کو جمہوریت کہتے ہیں؟ صدر ضیاء الحق کی حکومت کے بعد سیاسی شعبدے بازوں نے جتنا نقصان پہنچایا ہے پاکستان کی تاریخ کو داغ دار بنادیا ہے رہی سہی کسر دھرنے دینے والوں نے پوری کردی ہے۔ نئے افق کو قوم کا ایسا مجاہد ڈائجسٹ بنا دیا جائے جس سے نئی نسل کے خون گرما دیے جائیں فرسودہ عشق بھری لن ترانیوں جو ٹی وی پر نشر ہونے والی قتل وغارت اور بے راہ روی کی داستانوں سے نئے افق کو پاک کردیں یہ اور اس ذہنی غلاظت

سے ہمیں بچائیں اور اردو ڈائجسٹ کے طرز پر اسے گامزن کیا جائے گا آپ پاکستان کے مایہ ناز لکھاری اور دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں تقریباً پچاس ساٹھ سال سے علم وادب کا پرچم آپ لہرا رہے ہیں آپ جیسے لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ آپ اقبال کے چمن کے دیدہ ور ہیں اٹھیے اور نئے افق کے ذریعہ وطن پرستی، انسان دوستی، تہذیب وتمدن اور اصلاح قوم سے اس وطن کے در و دیوار آراستہ فرما دیجیے۔ نئے افق کو پاکستانی قوم کا نیا افق بنا دیجیے۔ میں تمام لکھاریوں کی درازی عمر ان کی ترقی خوشحالی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ والسلام۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد! محترم عمران احمد اور پیارے ساتھیوں اتنے ماہ نئے افق کی جدائی نے بے چین کیے رکھا مگر جانے کیوں لکھنے سے دل اچاٹ ہوگیا وجہ شاید وقت نے موقع فراہم نہیں کیا اور کچھ اپنی کوتاہی بھی شامل رہی مگر افق سے رابطہ رہا کچھ دوستوں نے اپنے قیمتی محبت ناموں میں یاد رکھا جن کی نوازش۔ سب دوستوں کو سلام محبت اور ان کی سلامتی کے لیے دعا گو اور سبھی سے گزارش کے ہمارے پیارے پاکستان کے لیے دعا کریں کہ اللہ پاک اسے بیرونی سازشوں اور اندرونی خلفشار، انارکی اور بدامنی سے بچائے آمین۔ اگلے شمارے کے تبصرے کے ساتھ انشاءاللہ حاضری یقینی ہوگی۔

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ السلام علیکم، نیک دعاؤں اور خیر وعافیت کے ساتھ حاضر ہوں۔ چند دن ہوئے شہر جانے کا اتفاق ہوا بک اسٹال پر نئے افق کا تازہ پرچہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ سرورق بہت ہی خوب صورت تھا۔ اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوئی۔ تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ بہتر ہیں کہانیاں بھی معیاری تھیں، فیصل آباد میں پرچہ بہت مشکل سے ملتا ہے غزل شائع کرنے کا شکریہ آپ کا خلوص اور محبت ہی ہمیں خط لکھنے پر مجبور کرتی ہے آپ ہم سے ہزاروں میل دور ہیں مگر ہمارے دلوں کی دھڑکنوں میں سمائے رہتے ہیں۔ اگر پرچہ میں کچھ تبدیلیاں کرلیں تو بہتر ہوگا۔ خدا کرے پرچہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ زندگی نے وفا کی تو دوبارہ حاضر ہوں گا، جب تک کے لیے اللہ حافظ۔

انجم فاروق ساحلی...... لاہور۔ السلام علیکم! امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب بخیر وعافیت ہوں گے۔ نئے افق میں تبدیلیاں خوش آئند ہیں جنوری 2015ء کے سلسلے میں جن نمبرز کا اعلان کیا گیا ہے وہ نام میں نے نوٹ کرلیے ہیں۔ اس سلسلے کی تحریریں روانہ کردی جائیں گی۔ والسلام



مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب لکھیں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجے جانے والے تمام انتخاب کے کتابی حوالے ضرور دیں
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔

اقرا

ترتیب: طاہر قریشی

مؤلف مشتاق احمد قریشی

اللہ

اللہ

ترجمہ:۔ وہ اللہ جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزیں پیدا کیں، پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو ٹھیک ٹھاک سات آسمان بنایا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ (البقرۃ:۲۹)

تفسیر:۔ آیتِ مبارکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت وکمالِ اقتدار کی مظہر ہے اللہ تعالیٰ کی ہستی ہی ہے جس نے کائنات کی تمام چیزوں کو پیدا فرمایا، آیتِ مبارکہ سوچ وفکر کی دعوت عام دے رہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے'' یہاں لفظ ''لکم'' کا استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں ''تمہارے لئے'' یہ لفظ اپنے اندر ایک گہری معنویت لئے ہوئے ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کی تخلیق کا منصوبہ بنایا تو اس منصوبے میں اس کے لئے ایک پورے نظام کائنات کی تخلیق بھی شامل تھی۔ اس سے انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کیوں پیدا کیا ہے؟ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، اس کی پیدائش کا مقصد زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب اور خلیفہ کے لئے نہ صرف یہ زمین وآسمان پیدا کئے اور یہ اس کی ملکیت وتصرف میں دے دیئے۔ کیونکہ اس طویل وعریض کائنات میں انسان ہی اس کائنات کی اعلیٰ ترین، اشرف ترین مخلوق ہے، اس وسیع میراث کا پہلا وارث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی تمام نعمتوں سے نوازا ہے۔

ترجمہ:۔ وہ زمین اور آسمانوں کا ابتداً پیدا کرنے والا ہے، وہ جس کام کو کرنا چاہتا ہے حکم دیتا ہے کہ ''ہو جا'' وہ فوراً ہی ہو جاتا ہے۔ (البقرۃ:۱۱۷)

تفسیر:۔ آیتِ مبارکہ سے انسان بخوبی رہنمائی اور سمجھ بوجھ حاصل کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کیسی قوت والی ہے، وہ زمین وآسمانوں اور پوری کائنات کا موجد، پیدا کرنے کی طاقت رکھنے والا اور اسے چلانے والا ہے اور یہ سب کچھ بنانے، پیدا کرنے کے لئے اُسے انسانوں کی مانند کسی بھی قسم کی محنت یا مشقت کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی، وہ تو جب حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے، اس کی اس خوبی، اس طاقت میں، یا اس کے کسی بھی طرح کے اختیار میں، اس کا کوئی کسی بھی طرح شریک یا مددگار قطعی نہیں ہے۔ انسان کے غور وفکر کی حدود سے وہ ماوراء ہے، وہ ایسا مالک وخالق ہے جو صرف اپنے حکم سے سب کچھ پیدا فرما دیتا ہے اور وہی ذاتِ عالی تمام چیزوں زمین وآسمان کی مالک ومختار ہے ہر چیز اس کی فرمانبردار، اطاعت گزار ہے وہ ایسا پیدا کرنے والا بنانے والا ہے جسے کسی چیز کو بنانے کے لئے کسی نمونے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کی بنائی ہوئی ہر ہر چیز خود ایک نمونہ ایک مثال ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اس کے وجود پر جس طرح استدلال کیا ہے وہ اہل فکر کی نہ صرف رہنمائی کرتا ہے بلکہ دعوتِ فکر دیتا ہے کہ وہ سوچیں سمجھیں کہ ذاتِ الٰہی کیا ہے؟ کون ہے اللہ تعالیٰ کے تصور کے بارے میں اقوامِ عالم نے جتنا تجسس کیا اتنی ہی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی موجود ہے بلکہ وہی ذات تمام کائنات اور تمام مخلوقات اور اپنے خلیفہ فی الارض انسان جسے اس مالک الملک نے اپنی تمام مخلوقات میں اشرف وممتاز درجہ عطا فرمایا ہے کی روزمرہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک معاملے اور لمحے سے اتنا گہرا اور قریبی واسطہ رکھتا ہے کہ وہ مالک انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ٹوکتا ہے انہیں ہدایات دیتا ہے ان کے اعمال کے برے بھلے پہلو نمایاں کرکے دکھاتا ہے۔ قرآنِ کریم قدم قدم پر اللہ کی طاقت وقوت کے بارے میں آگاہی دے رہا ہے کہیں وہ عدل احسان اور اقربا سے محبت کی نصیحت کرتا ہے تو کہیں نفاق بزدلی اور مفاد پرستی سے روکتا ہے۔ تو کہیں عورت مرد کو گھر کی فضا پاکیزہ رکھنے کی ہدایت کررہا ہے۔ تو کہیں میراث وآدابِ مجلس اور حدود کے قانون بتا رہا ہے۔

سورۂ انعام۔۱۶۴ میں "وہ ہر شے کا رب ہے جو چاہے پیدا کرے۔ (آل عمران۔۴۷) اور جیسے چاہے اضافہ کرے (فاطر۔۱) سب اس کے مطیع وفرمانبردار ہیں۔ (الروم۔۲۶) کوئی نہیں جو اس کی بندگی سے آزاد ہو۔ (مریم۔۹۳) اس کے ہاتھ میں ہر شے کی حکومت ہے۔ (المومنون۔۸۸) یہ ہے اللہ برحق۔ (یونس۔۳۲) وہی اول ہے وہی آخر۔ (الحدید۔۳) قرآن کریم کے پیش کردہ تصورِ الوہیت اور صفاتِ الٰہیہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک ایسا تصور قائم ہوتا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل مرغوب مطلوب اور ادراک ووجدان کے عین مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں سے اپنے تعلق وقرابت کا اپنے اختیار کا اور اپنے علم کا قرآنِ کریم میں اس طرح اظہار فرما رہا ہے کہ جسے انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کیسی اور کیا ہے۔

ترجمہ:۔ کیا تم کو خبر نہیں کہ زمین وآسمان کی ہر چیز کا علم اللہ کو ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو یا پانچ لوگوں کے درمیان سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چھٹا اللہ نہ ہو خفیہ باتیں کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ جہاں کہیں بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے پھر وہ قیامت کے دن انہیں بتادے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ (المجادلہ۔۷)

(جاری ہے)

حصہ دوم

مستقبل ساز

خورشید پیرزادہ

انسان کو رب تعالیٰ نے اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر دنیا میں اتارا اسے عقل و شعور کے ہتھیار سے لیس کیا پھر جس نے بھی محنت کر کے اس صلاحیت کو استعمال کیا اس نے کائنات کے سربستہ رازوں تک رسائی حاصل کرلی۔
وہ بھی اک ایسا ہی نوجوان تھا لیکن کوئی اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔
کمپیوٹر کی دنیا کے ماہر سائنس دان کا احوال، اس نے مستقبل کو اپنے تابع کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔
نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص ایک خوب صورت ناول جس کی ہر سطر آپ کو چونکا دے گی۔

"اور اسی لیے تم نے ان کو باہر نکلوایا؟"
"میرا فرض تو یہی تھا سر۔"
"ہم ابھی تم کو تمہارا فرض بتاتے ہیں حرامزادے۔"
امیر جان جیسے پاگل سا ہو رہا تھا۔ اس نے ہاشم کا گریبان چھوڑا اور دروازہ کھول کر چیخا۔
"اندر آ جاؤ تم تینوں۔ ہم تمہیں اس کمینے کی کمینگی بتانا چاہتے ہیں۔"
وہ تینوں کچھ نہ سمجھتے ہوئے امیر جان کی حالت دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ نہ صرف امیر جان کے بلانے کے انداز پر بلکہ کمرے کے اندر اس کی حرکت دیکھ کر۔ یہ سب کچھ ان کے وہم و گمان سے باہر کی بات تھی۔
انہوں نے زندگی میں کبھی امیر جان کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ تینوں دوڑ کر کمرے کے اندر آئے اور تینوں کے منہ سے ایک ہی بات نکلی۔
"کیا ہوا سر آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟"
"اس حرامزادے کی بات سنو۔ یہ کہہ رہا ہے کہ کاشف سلیم کے اکاؤنٹ میں جو رقم تھی وہ میں نے دھوکے سے اپنے ایچ ڈی ایف کی بینک کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر لی ہے اور یہ بات ہم تم لوگوں سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے اس نے تم لوگوں کو یہاں باہر نکلوایا اور تنہائی میں بتا رہا تھا کہ وہ اس راز کو جانتا ہے کہ یہ کام ہم نے کیا ہے۔"
تینوں نے ایک ساتھ بوکھلائی ہوئی نظروں سے ہاشم کی طرف دیکھا۔ ہاشم کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ وہ گڑگڑانے لگا۔
"میں نے یہ بات آپ پر ظاہر کرنے کے لیے نہیں۔ آپ کا راز رکھنے کے لیے کہی تھی سر۔ بلکہ یہ۔"
"چپ کرو کمینے۔" امیر جان دہاڑا۔
"لیکن سر اس نے کس بنیاد پر اتنی بڑی بات کہی ہے۔" بابر نعیم دھیمے لہجے میں بولا۔
امیر جان نے غصے میں پوری بات بتا دی۔ پھر بولا۔ "یہ حرامی اتنا بھی نہیں سمجھ سکا کہ سی آئی اے والے کاشف کو فرضی لیٹر دکھا کر مجبور کر رہے تھے۔ جسے دیکھ کر کاشف وہ سب بتا دے جو وہ جانتا تھا۔"
"لیکن سر وہ تو کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔" سراج صدیقی نے کہا۔
"ہاں لیکن اس حقیقت کو صرف ہم لوگ ہی جانتے ہیں۔" ڈاکٹر بابر نعیم بولا۔
"سی آئی اے والے اس بات کو مان ہی نہیں رہے

ہیں کہ ایسا کوئی انجیکشن اس دنیا میں ہے۔''
وہ سب بابر نعیم کی بات سے متفق نظر آرہے تھے۔
تب امیر جان بولا۔
''ہم ابھی ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ لیٹران کی ایک چال تھی۔''
یہ کہتے ہوئے امیر جان نے میز پر رکھے ہوئے لیپ ٹاپ پر اپنا ایچ ڈی ایف سی بینک کا اکاؤنٹ اوپن کیا۔ اس نے ایسا کرتے ہوئے لیپ ٹاپ کی اسکرین کسی سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی اور سب کی نظر اسکرین پر پڑی تو وہ سب حیرت کے مارے اچھل ہی پڑے تھے۔
امیر جان آنکھوں میں حیرت کا سمندر لیے مری ہوئی آواز میں بولا۔
''اوہ یہ تو واقعی سچ ہے۔ اس کی ساری رقم ہمارے اکاؤنٹ میں آ گئی ہے۔ مگر کیسے۔''



''جھمپیر۔'' شیشے کی چمچماتی میز کے بیچ میں رکھے ٹیپ ریکارڈ سے لعل بخش کی آواز گونج رہی تھی۔ سی آئی اے نے کاشف اور لعل بخش کی پوری بات چیت ریکارڈ کر لی تھی۔
''تمہاری دانش مندی کا میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں معراج علی۔'' چیف افسر نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''تھینک یو سر۔'' چیف کے منہ سے اپنی تعریف سن کر معراج علی پھولے نہیں سما رہا تھا۔
''بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات ہے سر۔ میں نے بس اندازہ لگا لیا تھا کہ دیر سویر وہ اپنے ملازم سے رابطہ ضرور کرے گا اور یہی سوچ کر میں نے ایکسچینج والوں کی مدد سے اس کا فون آبزرویشن پر لگا دیا تھا۔''
''لیکن یہ چھوٹی سی بات کسی اور کے دماغ میں نہیں آئی تھی۔'' چیف نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے جگی کی طرف دیکھا۔

جگی نے چیف کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے جلے بھنے لہجے میں کہا۔
''یہ کوئی بڑی بات تو نہیں ہے سر۔ کاشف جھمپیر کے اسٹیشن پر اترا ہے۔ یہ بات تو ہمیں پہلے سے پتہ ہے۔''
''تو کیا ہم جھمپیر کے ایک ایک مکان میں اسے تلاش کرتے۔ اس ٹیپ سے ہمیں اس کی صحیح لوکیشن کا پتہ چلا ہے جہاں وہ پہنچنے والا ہے۔'' معراج علی نے فوراً اپنے کارنامے کا دفاع کرتے ہوئے سمجھایا۔
''معراج علی ٹھیک کہہ رہا ہے جگی۔''
''یس سر۔ مطلب تو کام ہونے سے ہے۔ میں کروں یا معراج علی کرے یا کوئی اور۔'' جگی کہہ ضرور رہا تھا لیکن سچائی یہ تھی کہ نہ تو اسے معراج علی کی کامیابی اچھی لگی تھی اور نہ ہی اس کی تعریف کرتے وقت چیف کا اس کی طرف دیکھنے کا انداز۔
معراج علی مطمئن تھا۔''
''کام ختم۔ قصہ ختم۔'' ویسے بھی وہ اس وقت کچھ سرور میں تھا۔
''ختم کہاں۔'' جگی کو معراج علی پر پلٹ کر وار کرنے کا موقع مل گیا۔
''کام تو اب شروع ہوا ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ اب کیا کریں۔''
''اس میں سوچنا کیا ہے۔'' معراج بولا۔
''ہمیں بغیر دیر کیے حیدر آباد کی سی آئی اے برانچ کو حکم دینا چاہیے کہ جھمپیر میں فلاں پتے پر پہنچ کر چھاپہ مار کے کاشف کو پکڑ لے۔ ادھر سے ہم وہاں پہنچتے ہیں اور اسے اسی ٹارچر چیئر پر لا کر بٹھانا ہے جس پر بیٹھ کر اس نے ہمیں بے ہوش کیا تھا۔''
''سر ہمارا بنیادی مقصد صرف کاشف کو پکڑنا ہے یا اس کے ذریعے امیر جان تک پہنچنا ہے؟''
''ظاہر ہے امیر جان تک پہنچنا۔ کاشف تو اس کا صرف ایک مہرہ ہے۔''

"تو پھر ہمیں ابھی اس پر ہاتھ ڈالنے کی بے وقوفی نہیں کرنی چاہیے۔ معراج علی کی یہ بات ٹھیک ہے کہ حیدرآباد کی سی آئی اے برانچ کی مدد لی جانی چاہیے لیکن اسے گرفتار کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف اس پر نظر رکھنے کے لیے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم ایسا بندوبست کریں کہ وہ جہاں بھی جائے اور جس سے بھی بات کرے وہ ہم سن سکیں۔"

چیف افسر نے معراج علی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"جگی بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے اور اس کی بات میں دم ہے۔"

"خاک دم ہے۔" معراج علی کو اس بات میں اگر دم نظر بھی آیا تھا تو وہ اسے قبول نہیں کر پایا تھا۔

"چیف آپ بھی نا بس' جو سامنے ہے۔ اسے گرفتار کر کے سیدھے امیر جان تک پہنچنے کا منصوبہ بنالیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اسے ذرا بھی شک ہو گیا کہ اس پر نظر رکھی جارہی ہے تو وہ ہماری آنکھوں سے ایسا اوجھل ہو جائے گا کہ پھر کبھی نظر ہی نہیں آئے گا۔"

"نظر رکھنے کا کام میں اور میرے جیسے انٹیلی جینٹ لوگ اچھی طرح کر سکتے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ اس کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہیں ہو پائے گا۔" جگی نے کہا۔

"چاہے جتنی بھی ہوشیاری دکھاؤ لیکن۔"

"اس معاملے میں' میں جگی کی بات کی تائید کرتا ہوں۔ ہمیں بڑی مشکل سے ایک ایسا مہرہ ہاتھ لگا ہے۔ جس کے کندھے پر سوار ہو کر ہم امیر جان اور اس کے ٹھکانے تک پہنچ سکتے ہیں اور ہمیں اس موقع کو گنوانا نہیں چاہیے۔ یہ بات تو طے ہے کہ کاشف کے دل میں امیر جان کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے اور وہ ضرور اس تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور وہی موقع ہوگا ہمارے لیے۔" چیف افسر جگی کی طرفداری کرتا ہوا بولا۔

یہ بات سن کر معراج علی کا چہرہ اتر گیا اور جگی اس کا منہ چڑانے لگا۔ پھر معراج دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

"امیر جان تک یہ اطلاع پہنچا کر تیرے منصوبے کی دھجیاں اڑا دوں گا سالے۔"

لیکن اپنے دل کی بات دل میں ہی رکھتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال سے ہمیں ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے حیدرآباد کی سی آئی اے برانچ کو الرٹ کر دینا چاہیے۔"

"وہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔" چیف افسر نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"ایسا انتظام کر دیا ہے میں نے کہ اس کا مطلوبہ مکان اس کے لیے انوکھی جیل ثابت ہوگا۔" چیف کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تیر رہی تھی۔



"تت...... تم......" انیتا کے منہ سے چیخ سی نکلی۔

کاشف کوشش کے بعد بھی کچھ نہیں بول پایا۔ بس انیتا کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اب وہ اس سے کئی گنا زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی جتنی وہ شادی سے پہلے تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی نہائی تھی۔ بال گیلے تھے اور ان پر پانی کی بوندیں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"ارے بولتے کیوں نہیں ہو کچھ۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" یہ کہتے ہوئے اس نے کاشف کی کلائی پکڑی اور اسے اندر کھینچتی ہوئی بولی۔

"آؤ نا۔" اور کاشف کے قدم گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

انیتا یوں اچانک کاشف کو اپنے سامنے دیکھ کر پاگل ہوئی جارہی تھی۔ وہ اسے ڈرائنگ میں لاتی ہوئی چلائی۔

"عمران' عمران' کہاں ہو تم۔ یار دیکھو تو کون آیا ہے۔"

"باتھ روم میں ہوں بھئی۔" آواز آئی۔

"تم کو پتہ نہیں ہے کیا؟"

"چھوڑو نا باتھ روم واتھ روم۔ جلدی سے باہر آؤ۔" کاشف نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو انیتا۔ اسے نہانے دو۔"

اسی وقت باتھ روم کا دروازہ کھلا اور عمران انصاری باہر آ گیا۔ اس کا پورا بدن گیلا تھا اور اس نے صرف ایک تولیہ ہی لپیٹ رکھا تھا۔

''ایسا کون سا مہمان آ گیا ہے میڈم جو تم پاگل ہوئی جا رہی ہو؟''

''پہچانو..... کون ہو سکتا ہے یہ؟'' انیتا بولی۔

''بھائی تم ہی بتا دو کہ تم کون ہو جسے دیکھ کر یہ اتنی خوش ہو رہی ہے۔ جتنی یہ مجھے دیکھ کر بھی نہیں ہوتی۔'' عمران نے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کاشف ابھی کچھ بولنے ہی والا تھا کہ انیتا نے عمران کے کندھے پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''اس سے مت پوچھو..... خود بتاؤ..... کون ہو سکتا ہے یہ؟''

''ہیلو کاشف سلیم۔'' ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ لیے ہوئے اس نے اپنا گیلا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے عمران انصاری کہتے ہیں۔''

''یاہووو۔'' یہ سنتے ہی انیتا خوشی سے چیخ اٹھی۔

''یہ ہوئی نا میرے شوہر والی بات۔''

''اسے کیوں نہیں پہچانوں گا بھئی۔ اس کی تعریفیں سن سن کر تو میں بڑھا ہونے والا ہوں۔ آج میں ان کو پہلی بار ہی دیکھ رہا ہوں' مگر تمہارے پاگل پن نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ یہ کاشف کے علاوہ اور کوئی ہو نہیں سکتا۔''

''پاگل ہے یہ تو۔'' کاشف کو بڑی مشکل سے کچھ کہنے کا موقع ملا۔

''جیسی پہلے تھی۔ ویسی ہی ہے۔''

''مگر تم بدل گئے ہو۔ پہلے سے کچھ موٹے ہو گئے ہو اور یہ بال جنگلیوں کے سے کیوں بنا رکھے ہیں۔''

کاشف چپ رہا۔ کہتا بھی تو کیا۔

''اب کاشف صاحب کی اجازت ہو تو اپنا نہانے کا کام پورا کر لوں۔'' عمران بولا۔

''جلدی آنا۔'' یہ کہہ کر انیتا نے اسے باتھ روم کی طرف دھکیل دیا۔

''تم بھی عجیب ہو یار۔ اسے گیلے ہی۔''

''عجیب تو ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے انیتا نے اسے صوفے پر دھکیل دیا۔ ''کہاں غائب ہو گئے تھے اور اچانک کہاں سے ٹپک پڑے اور تم نے اپنا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟'' انیتا ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔

''اوہ ہو۔ ایک ساتھ اتنے سوال۔'' کاشف سنبھل کر بیٹھتا ہوا بولا۔

''سوال تو ابھی کیے ہی کہاں ہیں۔ چار سال کے اکٹھے کیے ہوئے سوالوں کے جواب ایک ساتھ دینے ہوں گے۔''

''انیتا تم۔''

''یہ تم کیسے اجنبیوں والے لہجے میں بول رہے ہو۔ ویسے ہی بولو نا جیسا پہلے بولتے تھے۔'' انیتا اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

کاشف نے محسوس کیا کہ واقعی وہ انیتا سے پہلے جیسا نہیں بول رہا تھا۔ ''میں سوچتا تھا کہ پتہ نہیں تمہارا شوہر کیسا ہوگا۔ اسے میرا یہاں آنا اچھا لگے گا بھی یا نہیں۔''

''یہ تو ہے۔ میں نے بھی شروعات میں سوچا کہ پتہ نہیں کیسا کھڑوس ہوگا۔ مگر تھینکس گاڈ۔ عمران بہت اچھا ہے۔ بالکل تم جیسا۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ کبھی کبھی بڑھا چڑھا کر بھی بتا دیتی تھی لیکن وہ کبھی جیلس نہیں ہوا۔ اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ اچھے دوست قسمت سے ہی ملتے ہیں۔''

''چلو اچھا ہے' تم خوش تو ہو نا؟''

''بہت.....''

ابھی کاشف کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ عمران باتھ روم سے باہر آتا دکھائی دیا۔ کاشف نے اس بار اسے غور سے دیکھا۔ چھ فٹ کا لانبا قد۔ کالی جینز پر بادامی ٹی شرٹ پہنے وہ بہت جچ رہا تھا۔

''کچھ چائے پانی کا بھی پوچھا یا ابھی تک صرف دماغ چاٹ رہی ہو۔'' عمران نے کہا۔

"پانی' ارے پانی کا پوچھوں گی اس سے' پیاس لگے گی تو خود پی لے گا۔"

عمران ہنستا ہوا بولا۔ "اچھا بابا۔ میں کچھ لے آتا ہوں۔"

کاشف جلدی سے بولا۔ "ارے' تم۔"

"تم بیٹھو نا یار۔ ذرا انہیں ہلنے ڈلنے دو۔ دیکھو نا کتنا موٹا ہو رہا ہے۔"

"انیتا۔ تم بھی نا بس۔"

وقت گزرنے کے ساتھ کاشف خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگا تھا اور وہ ان دونوں میاں بیوی کی انڈراسٹینڈنگ سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد جب اس نے فریش ہونا چاہا تو انیتا نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "صرف فریش نہیں ہونا ہے۔ بلکہ یہ جو بالوں کا جنگل ہے اسے بھی صاف کروانا ہے۔ نائی کی دکان گلی کے کونے پر ہے۔"

"اچھا بابا۔ جو تم کہو گی ہو جائے گا۔" کاشف نے کہا اور باتھ روم میں گھس گیا۔



"کیسا لگا میرا دوست؟" انیتا نے عمران سے پوچھا۔

"اچھا ہے۔" عمران اسے بانہوں میں بھرتا ہوا بولا۔

"مگر کیا تم کچھ زیادہ ہی نہیں پھدک رہی ہو۔"

"اور تم جلے بھنے سے نظر آ رہے ہو۔" انیتا آنکھیں مٹکاتی ہوئی بولی۔

"تم مجھے ایسا سمجھتی ہو؟" عمران نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"نہیں' بالکل اپنے جیسا۔ جو دل میں' وہی زبان پر۔"

"اچھا اب یہ ڈائیلاگ بازی بند کرو اور میرا بریف کیس اٹھا لاؤ۔"

"یعنی۔ تم آفس جا رہے ہو؟"

"جانا تو ہے جان من۔ بہت ضروری کام ہے۔"

"ارے مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا دوست آیا ہے اور تم۔"

"او کے۔ میں لنچ تک واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد کہیں گھومنے چلیں گے۔ ویسے بھی میری موجودگی میں تم دونوں کھل کر باتیں نہیں کر سکو گے' اسے تو اپنی اسی پرانی انیتا سے باتیں کرنی ہوں گی نا۔"

"ایسی کی تیسی تمہاری۔" انیتا چڑ کر بولی۔ "اگر تمہاری موجودگی میں وہ خود کو پرسکون محسوس نہیں کرتا تو مجھے اس سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

"او کے بابا۔ میں لنچ تک لوٹ آؤں گا۔"

"او کے۔ میں تمہارا بستہ لاتی ہوں۔"

انیتا کے اندر جاتے ہی عمران کے تاثرات ایک دم بدل گئے اور اس نے تیزی سے حرکت میں آتے ہوئے ایک مائیکروفون صوفے کے نیچے سرکا دیا۔



کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ کہنے کے لیے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ امیر جان کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے چوری کرتا ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ جیسے وہ بیچ بازار میں ننگا ہو گیا ہو۔ کافی دیر سن رہنے کے بعد اس نے بابر نعیم' سرتاج صدیقی اور الوینہ کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں؟"

"نہیں۔" تینوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"پھر یہ کیسے ہو گیا؟" امیر جان بڑبڑایا۔

"ہم آپ کو برسوں سے جانتے ہیں سر۔" سرتاج صدیقی بولا۔

"کم سے کم روپے پیسے کے معاملے میں آپ نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ ہر ایک کے ساتھ کی گئی ڈیل کو پوری ایمانداری سے نبھایا ہے آپ نے۔"

"اور پھر کاشف کے ساتھ۔" امیر جان ایسے لہجے میں بولا جیسے خود کو سمجھا رہا ہو۔

''کاشف کے ساتھ تو ہم دھوکا کر ہی نہیں سکتے۔ اس نے تو ایسا کام کیا ہے ہمارے لیے کہ کسی نے نہیں کیا اور پھر ہم ایسا کریں گے ہی کیوں اس نے ہمارا کام کر دیا اور پیسے اس کے ہو گئے۔ کنٹریکٹ کے مطابق اگر وہ یہ کام نہ بھی کر پاتا تب بھی وہ پیسے اسی کے ہوتے۔ وہ تو ہمارا خواب تھا اور ضروری تو نہیں کہ ہر خواب کو تعبیر بھی ملے لیکن کاشف نے ہمارا خواب سچ کر دکھایا۔ تو پھر ہم اس کے ساتھ دھوکا کیوں کرتے؟''

''نہیں سر۔'' الوینہ نے کہا۔

''ہم سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتے کہ یہ رقم آپ نے اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کی ہے۔ آپ نے ہر قدم پر وہی کیا جو کنٹریکٹ میں لکھا تھا۔ آپ نے چار سال پورے ہوتے ہی اسے اس کے فلیٹ پر پہنچا دیا تھا ورنہ۔''

''کیوں نہ پہنچاتے۔'' امیر جان بولا۔

''آدمی کسی سے دھوکا تب کرتا ہے جب اسے سامنے والے سے کوئی خطرہ ہو۔ کاشف سے تو ہمیں کوئی خطرہ ہی نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیسے، جب اسے کچھ یاد ہی نہیں رہنا تھا کہ اس نے کہاں' کیا کام کیا ہے۔ وہ اپنے اکاؤنٹ میں رقم دیکھ کر مطمئن ہو جاتا۔ ایسے میں ہم اس کا نقصان کیوں کرنا چاہیں گے۔ لیکن ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ وہ رقم دوبارہ ہمارے اکاؤنٹ میں آ گئی ہے۔ تو اس بات کا کوئی تو مطلب ہو گا ہی؟''

''سر اس کے علاوہ اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ سی آئی اے والے کاشف کو آپ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' سرتاج صدیقی نے کہا۔

''سی آئی اے والے؟''

''یقیناً سر۔'' سرتاج صدیقی نے اپنی بات کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''یہ لوگ اکثر ایسا کھیل کھیلتے آئے ہیں۔ ایک شکار کے ذہن میں دوسرے کے خلاف زہر بھر کے' اس کے ہاتھوں دوسرے کو ختم کرنے کا کھیل۔''

''لیکن کاشف کو ہمارے پیچھے لگا کے بھی وہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟''

''ایسا صرف ہم جانتے ہیں سر' وہ نہیں۔ دوسری بات۔ وہ آج ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتا' لیکن ضروری تو نہیں کہ اپنی کوشش سے کل معلوم نہ کر سکے۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''کسی نے مجھے دھوکا دیا اور ایسا دھوکا دیا کہ میری ساری زندگی برباد ہو گئی ہو۔ یہ آگ ایسی ہوتی ہے کہ اس آگ میں گھرا شخص جو کر جائے وہ کم ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اور سی آئی اے والوں نے کاشف کے اندر وہی آگ بھر کر اسے ہمارے خلاف کھڑا کر دیا ہے۔'' بابر نعیم بولا۔

''میں آپ کی اس کی بات سے متفق ہوں ڈاکٹر صاحب۔'' سرتاج صدیقی بولا۔

''کاشف ہمارے لیے ایک بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔ کیونکہ ہم اس کا دماغ دیکھ ہی چکے ہیں اور اب تو اس کے پیچھے سی آئی اے بھی ہے۔''

''جب تک سامنے والے سے خطرہ نہ ہو تب تک اسے نقصان پہنچانے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر وہ خطرہ بن چکا ہے تو اسے بغیر دیر کیے ختم کر دینا چاہیے۔'' امیر جان نے سخت لہجے میں کہا۔

''کوئی رحم نہیں۔ شوٹرز سے کہو کاشف کو تلاش کریں اور جہاں نظر آئے۔ مار دو اسے۔''



کاشف باتھ روم سے نکلا تو انیتا اسے دیکھ کر ہنس پڑی۔ وہ جانتا تھا کہ اس ہنسی کی وجہ کیا ہے۔ وہ پہلے ہی آئینے میں اپنا عکس دیکھ چکا تھا۔ اسے خود بھی بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا' مگر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

''بہت چالو ہو تم۔'' کاشف نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ''پہلے خود کہا کہ الماری میں عمران کے کپڑے رکھے ہیں وہ پہن لوں اور اب دانت نکال کر میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ کیا تم کو پتہ نہیں تھا کہ کہاں وہ چھ فٹ کا سائڈ اور کہاں میں ساڑھے پانچ فٹ کا مینہ۔''

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ اب بیٹھو۔ کچھ کام کی باتیں بھی کر لیں۔" دونوں صوفے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"ہاں اب بتاؤ' تم چار سالوں تک کہاں رہے اور تمہارے پروجیکٹ کا کیا بنا؟"

کاشف نے ایک سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔

"میری کہانی بڑی عجیب اور طویل ہے۔ پہلے یہ بتاؤ الوینہ کہاں ملے گی؟"

"الوینہ؟" وہ چونکی۔

"الوینہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو۔ اس سے تمہارا کیا لینا دینا؟"

"اسی نے میری زندگی برباد کر کے رکھ دی ہے انیتا۔ اس نے مجھے ایک ایسے آدمی سے ملوایا' جس نے میری یہ حالت کر دی ہے جو آج ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ سب تمہارا نام لے کر کیا تھا۔"

"مم..... میرا نام لے کر؟"

"تمہیں یاد ہے۔ ایک بار جب ہم سنے پلیکس سے کوئی فلم دیکھ کر نکلے تھے تو وہ ملی تھی؟"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے لیکن اس بات کا یہاں کیا ذکر؟ ایک منٹ' دوبارہ ملی' میں اس سے دوبارہ کب ملی؟"

"نہیں ملیں؟" اب چونکنے کی باری کاشف کی تھی۔

"ارے ملی ہوتی تو بتاتی نہیں تمہیں۔"

"تم اس کے دیئے ہوئے ایڈریس پر جا کر کبھی نہیں ملیں۔" کاشف نے انیتا کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

"ارے میں کیوں ملتی اس سے' میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔" انیتا بولی۔

"دیکھو کاشف۔ کال سینٹر میں کام کرتے ہوئے وہ میری روم پارٹنر ضرور تھی لیکن سچ یہ ہے کہ میں اسے کبھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کی اور میری نیچر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ پیسے کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی تھی۔ سمجھ رہے ہونا۔ کچھ بھی۔"

"تب تو وہ بالکل ٹھیک جگہ پہنچ گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آج اس کی حیثیت ایک ایسے کھرب پتی کی بن بیاہی بیوی جیسی ہے جو اس سے دوگنی عمر کا ہوگا۔"

انیتا برا سا منہ بنائے کاشف کی باتیں سن رہی تھی۔

"خیر' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سراسر جھوٹ بولتی رہی اور میں احمق بنتا گیا۔" کاشف پاگلوں کی طرح بڑبڑایا۔

اس کی یہ حالت انیتا سے نہ دیکھی گئی۔ فوراً اس کے نزدیک پہنچی اور اس کے کندھے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔

"کاشف۔ کاشف۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ ایسے ری ایکٹ مت کرو یار۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"24 اگست 2008ء کو وہ مجھے ایک تھری اسٹار ہوٹل کے بار میں ملی تھی اور وہ۔" اور کاشف نے تب سے لے کر جھمپیر پہنچنے تک کی ساری کہانی اسے سنا دی۔ اس کی کہانی سن کر انیتا کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر رہے تھے جیسے ساری دنیا کی حیرت اس کے چہرے پر سمٹ آئی ہو۔ وہ اس پارسل کے بارے میں بھی متجسس تھی جس نے جگہ جگہ کاشف کی مدد کی تھی۔

اچانک ہی جانے کیوں انیتا کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہوگیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور فون کے پاس جا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"کیا ہوا' کسے فون کر رہی ہو؟" کاشف نے پوچھا۔

تب تک دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"عمران۔ فوراً گھر آ جاؤ۔" دوسری طرف سے عمران نے شاید وجہ پوچھی تو بولی۔

"یہاں آؤ گے تو بتا دوں گی۔" اس بار شاید عمران نے اپنی کوئی مجبوری بیان کی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں سننا۔" انیتا نے اٹل لہجے میں کہا۔

"اگر سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ہو تب بھی میں کچھ نہیں سنوں گی۔ تمہاری انیتا کو تمہاری ضرورت ہے۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے تیزی سے ریسیور کریڈل پر پٹخ جیسے کوئی اور بات سننا نہ چاہتی ہو۔

کاشف نے چونک کر پوچھا۔

"بات کیا ہے انیتا تم نے عمران کو۔"

انیتا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دماغ کی رگوں کو ہلا دینے والے ایک اور جھٹکے کے لیے تیار ہو تم؟"

"کک کیا مطلب؟"

"عمران حیدرآباد کی سی آئی اے برانچ کا چیف ہے۔"

یہ سن کر کاشف جیسے بت سا بن گیا۔



"معراج علی بول رہا ہوں۔"

"ہیلو۔"

"تت تم کون ہو۔" آواز کی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے جلدی سے کہا۔

"تم ہاشم تو نہیں لگتے؟"

"ہاشم نہیں رہا۔ اب یہ موبائل میرے پاس ہے۔"

"نہیں رہا مطلب۔" معراج نے چونکنے کے سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں رہا۔ مطلب نہیں رہا۔ اوپر چلا گیا۔"

"مر۔سے۔ مگر کیا ہوا تھا؟"

"اس نے کوئی غلطی کر لی تھی۔ جس کا مجھے بھی نہیں پتہ۔ باس سے سوال کرنے کی جرأت بھلا کس میں ہے۔ موبائل مجھے تھماتے ہوئے بس اتنا کہا تھا کہ ہاشم نہیں ہے۔ اس کے جتنے بھی رابطے ہیں ان سے اب تمہیں ڈیل کرنا ہے۔"

"تمہارا نام؟"

"ہمت خان۔"

"میں کیسے مان لوں کہ میں صحیح آدمی سے بات کر رہا ہوں۔"

"تمہاری پیٹھ پر ایک ساتھ تین تل ہیں اور تمہیں ہم پچیس ہزار روپے منتھلی اور پچاس ہزار روپے انفارمیشن کے دیتے ہیں۔"

"گڈ۔" معراج کی آواز میں اطمینان لوٹ آیا کہ وہ صحیح آدمی سے بات کر رہا ہے۔

"فون کرنے کی وجہ؟" ہمت خان نے پوچھا۔

"آپ لوگوں کو کاشف سلیم کی تلاش ہے۔"

"ہے۔"

"میں اس کا پتہ بتا سکتا ہوں۔"

"بتاؤ۔"

اور معراج نے اسے انیتا کے گھر کا پتہ دے دیا۔

"وہ وہاں کیا کر رہا ہے۔"

"عمران کی بیوی انیتا۔ کاشف کی پرانی دوست ہے۔"

"اوہ۔ تو اب اس نے یہ جائے پناہ ڈھونڈی ہے۔"

"میں نے ہی اس کے گھر کا فون ٹیپ کر کے یہ پتہ نکالا ہے۔"

"تم نے یہ انفارمیشن اپنے چیف کو تو نہیں دے دی؟" ہمت خان نے پوچھا۔

"دے دی ہے۔ پہلے انہی کو دی ہے۔ کیونکہ ڈپارٹمنٹ کو بھی تو کام کر کے دکھانا ہوتا ہے نا۔ ورنہ ناکارہ سمجھ کر نکال دیا جاؤں گا اور ایسا ہو گیا تو تمہارے بھی کسی کام کا نہیں رہوں گا۔" معراج علی سچائی بیان کرتے ہوئے کہا۔

"تب تو ہم سے پہلے سی آئی اے والے اسے دبوچ چکے ہوں گے۔"

"نہیں دبوچیں گے۔"

"کیوں؟"

"بڑے بڑے اعلیٰ دماغ پائے جاتے ہیں ہمارے ڈپارٹمنٹ میں۔ کسی نے مشورہ دیا ہے کہ اس پر نظر رکھ کر ہم امیر جان تک پہنچ سکتے ہیں۔"

''وہ کیا خاک پہنچیں گے امیر جان صاحب تک۔ ان سے پہلے وہ بیچارہ کاشف وہاں پہنچا دیا جائے گا جہاں ہاشم ہے۔'' ہمت خان نے بے رحم لہجے میں کہا۔

''تمہیں کیا کرنا ہے وہ تم جانو۔ میرا کام صرف انفارمیشن دینا تھا۔ وہ دے دی۔''

''تمہارے پچاس ہزار پکے۔'' ہمت خان نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

♥♥♥

''ارے رے کہاں جا رہے ہو؟'' انیتا کاشف کے پیچھے لپکی۔

''نہیں انیتا۔ اب میں یہاں ایک پل کے لیے بھی نہیں رک سکتا۔'' اس کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ ''پتہ نہیں تقدیر میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ جہاں جاتا ہوں وہیں ایک نئی مصیبت میرے انتظار میں ہوتی ہے۔ یہاں کیا سوچ کے آیا تھا اور کہاں آ پھنسا۔ وہیں جن سے بھاگ رہا ہوں۔''

''نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا جیسا تم سوچ کر بھاگ رہے ہو۔ عمران سی آئی اے کا چیف ہے تو میرا شوہر بھی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میں اس سے تمہارے لیے مدد مانگوں گی۔ اس کے بعد اس کا رویہ سی آئی والے کی بجائے میرے شوہر والا ہوگا۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ تمہارے ساتھ ان الجھی ہوئی پہیلیوں جیسے واقعات کی ڈور کو وہی سلجھا سکتا ہے اور وہی پارسل میں موجود چیزوں کا مطلب بھی بتا سکتا ہے۔''

''نہیں انیتا۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم ان سی آئی اے والوں کو نہیں جانتیں۔ ان کے لیے فرض ہر بات سے مقدم ہے۔''

''اسے آنے تو دو۔ تمہارے سامنے سے ساری بات بتاؤں گی اور کہوں گی کہ سارے فرض ورض بھول کر اسے صرف تمہاری مدد کرنی ہے۔ کیونکہ تم میرے بچے دوست ہو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ تمہاری بات مان لے گا۔''

''خیال صرف تم کر سکتے ہو۔ مجھے تو یقین ہے۔''

کاشف ظہیر کچھ کہے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن اب تک اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ جو اس وقت سے اڑی ہوئی تھیں جب اسے پتہ لگا کہ عمران کا تعلق سی آئی اے سے ہے۔

''میرے اور عمران کے پیار پر نہ سہی۔ ہماری دوستی پر تو بھروسہ رکھو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یقین کرو دوست کے گھر مدد کی امید سے آئے ہو تو ناامید نہیں ہونے دوں گی۔'' انیتا پختہ لہجے میں بولی۔

اس سے پہلے کہ کاشف کچھ کہتا۔ کمرے میں عمران کی آواز گونجی۔

''خالی ہاتھ تو میں بھی نہیں جانے دوں گا۔''

آواز سن کر دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ عمران اپنے ہاتھ میں پانچ ڈبے اٹھائے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔

عمران کو دیکھ کر کاشف کا چہرہ پہلے سے سپید پڑ گیا اور اس کی یہ حالت دیکھ کر انیتا کے چہرے پر مسکراہٹ اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا وہ کاشف کی اس حالت سے خوب انجوائے کر رہی تھی۔

کاشف کو اپنے کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر عمران نے ایک قہقہہ لگایا اور ڈبوں کو صوفے پر پھینکتے ہوئے بولا۔

''میں تو بیکار ہی تمہارے ناپ کے کپڑے لے آیا۔ تم تو میرے کپڑوں میں ہی ایک دم ہیرو لگ رہے ہو۔ کیوں انیتا؟''

دور سے پھینکنے کی وجہ سے کئی ڈبے کھل گئے تھے۔ ان میں نئی شرٹس اور ٹراوزر تھے۔ انیتا اور کاشف نے ایک ساتھ انہیں دیکھا۔ یہ اور بات ہے کہ کاشف کو ابھی تک تھرتھری چڑھی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے بھائی؟'' عمران نے کہا۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہو تم اور کیا مدد کی امید لے کر آئے تھے تم۔"

اینا جھٹ سے بولی۔

"کاشف ایک بہت ہی گہرے مسئلے میں پھنسا ہوا ہے اور اسی سلسلے میں یہ میری مدد لینے آیا تھا اور اس مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ "تمہارے کراچی والے مرکز کو کسی کی تلاش ہے۔ نہ صرف تلاش ہے بلکہ بری طرح خار کھائے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ کاشف وہ شخص ہے جو سی آئی اے سینٹر کے ٹارچر روم سے تمہارے چیف افسر سمیت چار اہلکاروں کی شہ رگیں صاف کر کے ان کا ایک ریوالور ساتھ لے کر فرار ہوا ہے۔ اب بولو۔ ایسی حالت میں تم اسے گرفتار کر کے سی آئی اے سینٹر کے حوالے کر دو گے یا میرے دوست کی مدد کرو گے؟"

کمرے میں ایک دم سناٹا سا چھا گیا۔ کاشف کا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے اس کے دماغ پر ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔ وہ ملتجی نگاہوں سے عمران کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عمران کے چہرے پر کرخت تاثرات پھیل چکے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اینا کی اعتماد کی بنیاد ہلنے لگی اور اس نے پوچھ ہی لیا۔

"بولو عمران۔ تمہیں فیصلہ کرنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟"

عمران بنا کچھ بولے صوفے کے پاس جھکا اور صوفے کے نیچے سے مائیکروفون نکال کر کھڑا ہوتے ہوئے انہیں دکھاتے ہوئے بولا۔

"میں اسے آن کر کے یہاں چھوڑ گیا تھا۔"

"مم مائیکروفون؟" دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

اینا پر تو جیسے بجلی سی گر پڑی تھی۔ منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

"یہ تم نے کیا کیا عمران۔"

"یہ پوچھو کہ ایسا کیوں کیا میں نے۔" عمران سپاٹ لہجے میں بولا۔

"کیوں کیا؟"

"کیونکہ میں پہلے سے ہی جانتا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جو ہمارے ہیڈکوارٹر میں اتنی بڑی واردات کر کے بھاگا ہے۔"

"تب تم یہ بات کیسے جانتے تھے؟"

"مجھے رات کو ہی رپورٹ مل گئی تھی کہ رات اس نے کہاں گزاری ہے۔ مگر میں نے اسے گرفتار نہیں کیا اور اسے سکون کی نیند لینے کا موقع دیا۔"

"یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمہیں خبر مل گئی تھی کہ یہ چھمپیر میں مجھ سے ملنے والا ہے۔ تم نے سوچا کہ جب پنچھی خود ہی جال میں آ رہا ہے تو باہر گرفتار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بالکل صحیح کہا تم نے۔" عمران نے بغیر لگی لپٹی کے کہا۔

"مجھے پتہ لگ چکا تھا کہ یہ کس پتے پر پہنچنے والا ہے۔ انہوں نے مجھے تمہارا نام بھی بتا دیا تھا مگر میں نے چیف کو یہ بات نہیں بتائی کہ یہ میرا ہی گھر ہے اور کاشف کی وہ دوست تم ہی ہو۔ بس اتنا کہا کہ اگر کاشف چھمپیر میں ہے تو جلد ہی سی آئی اے کی گرفت میں ہوگا۔"

"جو کہ ہے۔" اینا نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سوچنے کی بجائے یہ سوچو کہ چیف کو میں نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ کاشف میرے ہی گھر آ رہا ہے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں جانتا تھا کہ کاشف تمہارا کتنا گہرا دوست ہے اور تم اسے کسی بھی صورت میں تکلیف نہیں پہنچنے دو گی بلکہ اس کی مدد کرنے کی کوشش کرو گی۔"

"تو پھر تم نے مائیکروفون کیوں لگایا؟"

"وہ میری ڈیوٹی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ اصلیت کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ ٹارچر چیئر پر یہ بھلے ہی حقیقت بتائے نہ بتائے لیکن تنہائی میں اپنی سب سے گہری دوست کے سامنے حقیقت ضرور بیان کرے گا۔"

''تو ساری حقیقت پتہ لگ گئی تمہیں۔'' انیتا کا انداز اب بھی طنزیہ تھا۔

''ایک بات اور بتانی ہے جو اسے نہیں معلوم۔ اگر ٹرین میں وہ لڑکا اس کی ہیرے کی انگوٹھی چھین کر نہ بھاگتا تو حیدر آباد کے اسٹیشن پر سی آئی اے نے اسے گرفتار کرنے کے لیے پورا جال بچھا رکھا تھا۔ یوں سمجھو کہ اس انگوٹھی نے نہ صرف اسے تمہارے پاس پہنچنے میں مدد کی ہے بلکہ گرفتار ہونے سے بھی بچایا ہے۔''

''مگر بچا کہاں۔ یہاں تم جو ہو۔''

''وہ تو ہے۔'' عمران مسکرایا۔

''مگر میرا اسے گرفتار کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کیونکہ میری بیوی اس سے وعدہ کر چکی ہے۔''

''اوہ عمران۔'' انیتا نے خوشی سے جھپٹ کر عمران کا منہ چوم لیا۔

کاشف ہکا بکا سا انہیں دیکھ رہا تھا۔ عمران کی باتوں سے اسے کچھ سکون سا ملا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایک فیصد بھی بھروسہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ چاہے وہ ایک چھوٹی برانچ کا ہی سہی۔ مگر ایک چیف آفیسر اپنے فرض سے غداری کیسے کر سکتا ہے۔

ادھر انیتا تو لگتا تھا جیسے خوشیوں کے رتھ پر سوار تھی۔

''دیکھا گھونچو۔ دیکھا میرے عمران کو۔ میں نے کہا تھا نا کہ میری محبت عمران کے فرض سے بڑھ کر ہے۔''

کاشف کہتا بھی تو کیا کہتا۔

عمران نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہیرے کی انگوٹھی نکال کر دیتے ہوئے بولا۔

''یہ لو اور سب سے پہلے یہ کپڑے چینج کر کے آؤ۔''

''یہ...... یہ۔'' کاشف اس کے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھ کر چونک گیا تھا۔

''یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گئی؟''

''سی آئی اے والا ہوں دوست۔'' عمران نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''وہ لڑکا حوالات میں ہے۔''

♥♥♥

ایک نئے مسئلے نے تینوں کے دماغ گھما کر رکھ دیئے تھے اور یہ مسئلہ کاشف نے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ان کے سامنے رکھا تھا۔

اور یہ مسئلہ تھا۔ ایک کاغذ۔

ایک ایسا کاغذ جس پر صرف چھ بے ترتیب خانوں میں انگلش کے چھ حروف لکھے ہوئے تھے اور یہ کمپیوٹر پرنٹ تھا۔

کچھ دیر تک تو عمران اور انیتا اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جب کافی متھا ماری کے بعد بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو عمران نے پوچھا۔

''یہ کاغذ تمہیں کہاں سے ملا؟''

''میری داڑھی کے بالوں میں سے۔'' کاشف بولا۔

''داڑھی کے بالوں میں سے۔'' انیتا نے حیرت سے کہا۔

پہلے میں نے شیو بنائی اور کپڑے بدلنے کے بعد ان کے فلیپ ڈسٹ بن میں ڈالنے گیا تو میری نظر داڑھی کے ان بالوں کے بیچ الجھے اس کاغذ پر پڑی جو میں نے قینچی سے کاٹ کر ڈسٹ بن میں ڈالے تھے۔ یہ چند بالوں سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے کھول کر پڑھا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو تمہارے پاس لے آیا۔''

''اس کا مطلب تو میری کھوپڑی میں بھی نہیں گھس رہا ہے۔'' عمران نے ایک بار پھر کاغذ پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہاری عقل دانی بھی ہمارے برابر ہی ہے تو تم کیا خاک سی آئی اے والے ہو۔'' انیتا جھلا کر بولی۔

عمران خاموشی سے مسکراتا ہوا کاغذ کو دیکھ کر دماغ کے تمام گھوڑے ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔

''چھ خانوں میں چھ حروف۔'' کاغذ پر نظریں ڈالتے ہوئے عمران بڑبڑایا۔

''اوپر کے خانوں میں I-U-Y اور نیچے کے خانوں میں H-J-K۔ نہ ان حروف کا کوئی مطلب ہے اور نہ

ہی ان سے کوئی ایسا لفظ بنتا نظر آرہا ہے جس کا کوئی مطلب نکلتا ہو۔"

"ہر حرف کو دو الگ خانوں میں لکھا گیا ہے۔ اس کا بھی کوئی مطلب ہوگا۔" انیتا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"خانے برابر میں تو ہیں لیکن ایک دوسرے کے ٹھیک نیچے نہیں ہیں۔" کاشف نے کہا۔

"اور غور کرو کہ حروف بھی خانوں کے بیچ میں نہیں بلکہ اوپر والے بائیں کونے میں لکھے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کس بات کی طرف اشارہ کررہے ہیں اور سبھی حروف کیپٹل میں ہیں۔ اس کا بھی کوئی مطلب۔"

"تم مجھے اپنا پارسل دکھاؤ۔" عمران نے اچانک اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"شاید اس میں موجود چیزوں کو دیکھ کر میں کچھ سمجھ سکوں۔ شاید اندازہ ہی لگا سکوں کہ تمہارا آگے کا سفر کس طرف بڑھنے والا ہے۔"

جانے کیوں کاشف کو ایسا لگا کہ عمران یہ ساری میٹھی میٹھی باتیں صرف اس کا پارسل دیکھنے کے لیے بنا رہا ہے۔ کچھ بھی کہو۔ ہے تو سی آئی اے والا نا۔

یہ سوچ کر کاشف کے جبڑے بھنچ گئے اور چہرہ پتھر کی طرح سخت ہوگیا۔

"سوری عمران۔ میں یہ پارسل کسی کو نہیں دکھاؤں گا۔"

"کیوں؟" عمران بری طرح چونکا۔

"میری مرضی۔ وہ میرا ہے۔ بینک میں میرے نام سے آیا تھا۔ اس میں موجود چیزیں میرے کام آرہی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں کوئی اور دیکھے۔"

چہرے پر حیرانی لیے ہوئے عمران نے پہلے انیتا کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی بھی ہم پر بھروسہ نہیں کیا ہے۔"

"ہاں۔ یہ سچ ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس وقت میرے چاروں طرف حالات ہی ایسے ہیں کہ میں کسی اور پر تو کیا خود پر بھی بھروسہ نہیں کر پا رہا ہوں۔"

"مگر پارسل میں موجود چیزوں کو تو ہمارے چیف بھی دیکھ چکے ہیں۔" عمران نے کہا۔

"میں نے بھی دیکھ لیا تو ایسا کیا۔"

"جب اس نے ان چیزوں کو دیکھا تو ان کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ دیکھ کر بھی ہر چیز پر اتنا غور نہیں کیا ہوگا۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہ ہو کہ اس میں کیا کیا تھا۔ مگر اب' جب تم دیکھو تو ایک ایک چیز کو بہت باریکی سے دیکھو گے۔ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو گے۔ نہیں میں وہ چیزیں اب کسی کو نہیں دکھانا چاہتا۔"

"عجیب بات ہے یار۔"

"کاشف" عمران کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی انیتا نے کہا۔

"تمہاری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم عمران کو دکھا کیوں نہیں دیتے۔ یقین مانو یہ تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔"

"ہوسکتا ہے دے' مگر؟"

"مگر؟"

"مجھے لگتا ہے کہ یہ سی آئی اے والا ہے اور سی آئی اے والے سی آئی اے والے ہی ہوتے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اب تک اس نے جتنی بھی باتیں کی ہیں اس کا مقصد ہی اس پارسل کی چیزوں کو دیکھنے کا تھا۔ بس اس کی ترکیب الگ تھی اور یہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے انیتا۔ یہ تمہارے کندھے پر بندوق رکھ کر مجھے پھنسانا چاہتا ہے۔"

"یہ کیسی باتیں کررہے ہو کاشف۔ عمران ایسا نہیں ہے۔"

"دیکھو انیتا۔ یہ تمہارا شوہر ہے۔ تم اس پر بھروسہ کرسکتی ہو۔ مگر میں جن حالات میں ہوں۔ میں خود پر بھی اعتماد کھو بیٹھا ہوں۔"

''تو نکل جاؤ' نکل جاؤ میرے گھر سے۔'' انیتا بپھر کر بولی۔ ''اگر تم میرے شوہر پر ہی اعتماد نہیں کر سکتے تو اس گھر کے اندر ایک پل بھی رکنے کے لائق نہیں ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں یہاں رہنے دیا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں ہے۔''

''سوری انیتا۔ سوری۔'' کاشف نے درد بھرے لہجے میں کہتے ہوئے غصے سے بھری انیتا کی طرف دیکھا اور کھڑا ہو کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''نہیں۔'' عمران نے کہا۔

''تم اس طرح نہیں جا سکتے۔''

''مطلب؟'' کاشف نے چونک کر پلٹتے ہوئے پوچھا۔

''اسے جانے دو عمران۔''

''نہیں انیتا۔ اسے یہ پارسل مجھے دکھانا ہی پڑے گا۔''

''تم اس پارسل کے لیے اتنا بے چین کیوں ہوئے جا رہے ہو؟''

''یہ اسی کے حق میں بہتر ہوگا۔ میں واقعی میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''جب میں اس سے سارے رشتے توڑ چکی ہوں تو پھر ہم اس کی مدد کیوں کریں۔ جاؤ کاشف۔ نکل جاؤ یہاں سے۔''

کاشف ایک بار پھر دروازے کی طرف مڑ گیا۔

''جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔'' عمران ریوالور نکالتے ہوئے غرایا۔

''ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو گولی مار دوں گا۔''

کاشف کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''مم مطلب جو میں نے سوچا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ تم کسی بھی قیمت پر میرے پارسل کے سامان کو دیکھنا چاہتے ہو؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

"عمران پلیز۔ اگر وہ جانا چاہتا ہے تو اسے جانے دو۔ ہمیں اس کے ساتھ زبردستی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"سوری انیتا۔"

"کیا مطلب؟" انیتا چونکی۔

"تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر میں نے اسے اس طرح سے جانے دیا تو نہ صرف میری ملازمت چلی جائے گی بلکہ فرض سے غفلت برتنے کے جرم میں جیل بھی جا سکتا ہوں۔"

انیتا کو ایسا لگا جیسے آسمان اس کے سر پر آ پڑا ہو۔

"تو یہ سب تم صرف اپنا فرض نبھانے کے لیے کر رہے تھے؟"



"کوئی رحم نہیں۔" ہمت خان نے کہا۔

"ہم کسی کو کوئی موقع نہیں دیں گے۔ جو سامنے آئے اسے شوٹ کرنا ہے۔"

"مگر اس طرح تو وہاں بہت ہنگامہ مچ سکتا ہے سر۔" ایک گھنی داڑھی والے نے کہا۔

"میں نے تو سنا تھا کہ تم ہنگاموں سے ڈرنے والے شخص نہیں ہو۔ اس لیے اس کام کے لیے میں نے تمہیں منتخب کیا اور نہ میرے پاس آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔"

"میں صرف آگاہ کر رہا ہوں۔ آپ لوگ یہاں نئے ہو لیکن میں تو پیدا ہی یہیں ہوا ہوں۔ جس محلے میں ہم جا رہے ہیں وہ اس چھوٹے سے قصبے کا سب سے گنجان محلہ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہماری یہ گاڑی ہی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے بعد ہم نے وہاں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تو وہاں افراتفری۔"

ہمت خان اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"میں صرف اتنی فائرنگ کی بات کر رہا ہوں جس سے وہاں کی بھیڑ تتر بتر ہو جائے اور ہم اپنا کام نمٹا کر تیر کی طرح وہاں سے نکل جائیں۔ تمہارا کام صرف راستہ بتانا ہے۔ باقی کا کام ہمارے آدمی خود کر لیں گے۔" یہ بات سن کر داڑھی والا چپ ہو گیا۔

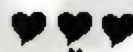
ہمت خان کوسٹر خود ڈرائیو کر رہا تھا اور اس سمیت گاڑی میں گیارہ افراد موجود تھے۔ سب ہی جدید اسلحہ سے لیس تھے۔

"اصلی ٹارگٹ کا فوٹو تم سب کو دکھا دیا گیا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے جتنی بھی لاشیں گرانی پڑیں ہچکچانا مت۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب۔" کئی افراد نے ایک ساتھ کہا۔

"نہ ہم آج سے پہلے کبھی ناکام ہوئے ہیں اور نہ آج ہوں گے۔"

ہمت خان کے ہونٹوں پر خونخوار مسکراہٹ تیر رہی تھی۔



"یعنی میں ہی بے وقوف تھی۔" انیتا نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ تم یہ سب سی آئی اے والے کی حیثیت سے نہیں بلکہ میرے شوہر ہونے کی حیثیت سے کر رہے ہو۔"

"اف..... تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔" عمران نے جز بز ہو کر کہا۔

"میں چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔"

"تو میں بھی مجبور ہوں۔" انیتا کے جبڑے کس گئے۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"گھر آئے دوست کی اگر مدد نہیں کر سکتی تو اسے اپنے شوہر کے ہاتھوں گرفتار بھی نہیں ہونے دوں گی۔ یہ کتنی امیدیں لے کر آیا تھا میرے پاس۔ یہ تو دوست سے غداری ہو گی اور تمہاری بیوی غدار نہیں ہے۔" انیتا جذبات کی رو میں بہہ کر کہے چلی جا رہی تھی۔

"تم کرنا کیا چاہتی ہو؟"

"اگر تم نے اسے روکنے کی کوشش کی تو تمہاری چلائی ہوئی گولی اپنے سینے پر کھالوں گی۔" یہ کہتے ہی انیتا اٹھی اور کاشف کے آگے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی۔

اس کی اس حرکت سے عمران بوکھلا گیا۔

"یہ کیا بے وقوفی ہے۔ ہٹو سامنے سے۔"

"عمران۔ بات اگر فرض ہی کی ہے تو جہاں تمہارا فرض ہے اسے گرفتار کرنا' وہیں میرا فرض ہے اپنے دوست کی مدد کرنا۔ میں مدد کے طلب گار دوست کو اس طرح بے یارومددگار نہیں چھوڑ سکتی۔"

عمران آپے سے باہر ہو گیا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا۔ اتنا سمجھ گئی ہو تو اتنا بھی سمجھ لو کہ ہم اپنا فرض نبھاتے وقت اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ سامنے کون کھڑا۔" اس کا جملہ مکمل ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ تینوں چونک پڑے۔

اچانک باہر سے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگی تھیں جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت آ گئی ہو۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی گاڑی کا دروازہ زور سے بند کیا گیا ہو اور پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کئی لوگ بھاگتے ہوئے انہی کے گھر کی طرف آ رہے ہوں۔ کاشف اور انیتا ہکا بکا کھڑے تھے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ باہر ہو کیا رہا ہے۔

عمران نے اپنے حواس پر قابو پایا اور وہ فوراً کھڑکی کی طرف لپکا۔

اور باہر کا نظارہ دیکھتے ہی اس کے ہوش اڑنے لگے۔ وہ زور سے چیخا۔

"انیتا...... بچو۔" ساتھ ہی اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر دو فائر جھونک دیے۔ باہر سے دو افراد کے چیخنے کی آوازیں آئیں اور اس کے بعد تو فضا گولیوں کی بوچھاڑ سے گونجنے لگی۔

کھڑکی کے راستے کئی گولیاں اندر کی دیواروں آ کر ٹکرانے لگیں۔ اگر عمران عین وقت پر نیچے نہ ہو جاتا تو اس کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ پھر عمران سانپ کی طرح تیزی سے رینگتا ہوا آگے بڑھا اور مرکزی دروازہ بند کر کے چلایا۔

"لگتا ہے امیر جان کے آدمیوں نے حملہ کر دیا ہے۔"

اسی وقت کھڑکی پر کسی کا سر نظر آیا اور اس سے پہلے کہ باہر سے کوئی کارروائی کی جاتی۔ عمران کے ریوالور نے پھر آگ اگلی اور کھڑکی پر نظر آنے والا سر تربوز کی طرح بکھرتا چلا گیا۔ اسی وقت کاشف نے اندرونی کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ یہ دیکھ کر عمران بولا۔

"انیتا اس کے ساتھ جاؤ۔"

"اور تم؟" انیتا بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی۔

"میری فکر مت کرو۔ ایسے غنڈوں سے نمٹنا مجھے خوب آتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کھڑکی پر نظر آنے والے دوسرے غنڈے کے چہرے کے پرخچے اڑا دیے۔

وہ فرش پر رینگتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

"جاؤ انیتا۔ جلدی کرو۔"

اس بار انیتا نے اس کی بات ماننے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی۔ وہ کمرے میں گئی تو کاشف بوکھلایا ہوا کمرے میں ادھر سے ادھر دوڑ رہا تھا۔ اس جیسے کمپیوٹر کے کیڑے نے بھلا کہاں ایسی مار دھاڑ کا منظر دیکھا تھا اور اگر دیکھا بھی تو صرف فلموں کی حد تک۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جان بچانے کے لیے کہاں جائے۔

"کاشف۔ میرے ساتھ آؤ۔" انیتا بیڈ روم کے ساتھ بنے باتھ روم کی طرف لپکی۔ کاشف بھی اس کے پیچھے لپکا۔

مکان کے سامنے کے حصے سے اب بھی فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ باتھ روم میں آ کر انیتا نے پیچھے کھلنے والا وہ دروازہ کھولا جو نہ جانے کب سے بند پڑا تھا۔ دروازے سے نکل کر وہ مکان کے پیچھے ایک تنگ سی گلی میں پہنچی۔

"جلدی کرو کاشف۔ وقت نہیں ہے۔"

کاشف کو تو اس سے زیادہ اپنی جان بچانے کی

جلدی تھی۔ وہ انیتا کے پیچھے دوڑتا چلا آیا اور پھر دونوں اس سنسان گلی میں سر پر پیر رکھ کر بھاگنے لگے اور ہر دوڑتے قدم کے ساتھ وہ گولیوں کی آواز سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

کئی موڑ مڑنے کے بعد انیتا نے اپنی رفتار کم کر لی۔

"اب ہمیں بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی کا بھی دھیان بے وجہ ہم پر نہیں جانا چاہیے۔" کاشف بھی تھک چکا تھا اس لیے اس نے اس بات کو غنیمت جانتے ہوئے اپنے قدم سست کر لیے۔

دونوں کی سانسیں بری طرح سے پھولی ہوئی تھیں۔

"انیتا...... میرا خیال ہے ہم نے اچھا نہیں کیا۔ وہ کئی لوگ لگ رہے تھے اور عمران اکیلا؟" کاشف نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اس نے خود ہی بھاگنے کو کہا تھا۔ وہ ایسے معاملوں میں ماہر ہے۔"

"مگر اس نے تمہیں میرے ساتھ کیوں بھیجا؟"

"اس کا مقصد شاید یہ تھا کہ تم جو حملے کا فائدہ اٹھا کر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے میں ویسا نہ ہونے دوں۔"

"لیکن تم تو۔"

"ہاں میں تمہیں نکال لائی۔ کیونکہ میں جان چکی ہوں کہ تم ٹھیک کہہ رہے تھے کہ وہ میرا شوہر نہیں صرف اور صرف فرض شناس سی آئی اے والا ہے۔"

"میں وہاں سے نکل تو آیا ہوں۔ بس اب تم واپس جاؤ۔"

"میں کیوں واپس جاؤں؟"

"وہ فرض شناس ہے تو تمہارا بھی فرض ہے اس کا ساتھ دینا۔ وہ شوہر ہے تمہارا۔"

"اور تم میرے دوست ہو۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے۔"

"آج سے نہیں۔ تم شروع سے جانتے ہو کہ میں بھی کنفیوز نہیں رہی۔" انیتا اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"مجھے کوئی بھی فیصلہ لینے میں کبھی وقت نہیں لگتا۔ جب میں نے تمہاری زبان سے یہ سنا کہ تم اس پر بھروسہ نہیں کر رہے ہو تب میری نظر میں وہ ہی ٹھیک تھا اس لیے میں نے تمہیں فوراً گھر سے نکل جانے کو کہا تھا لیکن یہ پتہ چلا کہ وہ نہیں تم اپنی جگہ صحیح کہہ رہے تھے اور وہ صرف سی آئی اے کے لیے کام کر رہا ہے تو دیکھ لو میں تیرے ساتھ ہوں۔ اپنے دوست کے ساتھ۔"

"مگر یہ ٹھیک نہیں ہے انیتا۔ جتنا تم نے میرے لیے کر دیا ہے اتنا ہی کافی ہے۔ اب تم واپس چلی جاؤ۔ جاؤ اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ انیتا۔"

"تم بار بار میرے شوہر کا لفظ استعمال کر کے مجھے چڑا رہے ہو۔ اس نے ٹھوک بجا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ میرا شوہر نہیں صرف سی آئی اے والا ہے۔"

"ارے مگر۔"

"اور یہ مت سمجھنا کہ اس گلی کو پار کرتے ہی تم اس کے چنگل سے نکل گئے ہو۔ امیر جان کے آدمیوں سے نمٹتے ہی وہ ہر جگہ تمہاری تلاش شروع کر دے گا۔"

"میرے مقدر میں جو لکھا ہے ہو جائے گا۔"

کاشف نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں کوئی الزام نہیں دوں گا۔"

"میں تیرے ساتھ رہوں گی۔ ہر مصیبت میں تیرے ساتھ رہوں گی۔" انیتا کا لہجہ اٹل تھا۔

"تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ جب تک میں تمہاری ڈھال بنی رہوں گی۔ وہ تم پر گولی نہیں چلائے گا۔"

کاشف نے کچھ کہنا چاہتا لیکن تب تک مرکزی سڑک آ چکی تھی اور انیتا نے وہاں سے گزرنے والی ایک پرائیویٹ ٹیکسی روک چکی تھی۔

وہ ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

"جلدی کرو۔ دیر کرنے کا مطلب ہے پھنس جانا۔" کاشف بھی اس حقیقت کا اندازہ لگا چکا تھا وہ جھٹ سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

سانسیں بحال ہونے پر کاشف نے کہا۔

"پارسل میں موجود ایک اور چیز کے بارے میں سنو

جلدی تھی۔ وہ امینا کے پیچھے دوڑتا چلا آیا اور پھر دونوں اس سنسان گلی میں سر پر پیر رکھ کر بھاگنے لگے اور ہر دوڑتے قدم کے ساتھ وہ گولیوں کی آواز سے دور ہوتے جارہے تھے۔

کئی موڑ مڑنے کے بعد امینا نے اپنی رفتار کم کر لی۔

"اب ہمیں بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی کا بھی دھیان بے وجہ ہم پر نہیں جانا چاہیے۔" کاشف بھی تھک چکا تھا اس لیے اس نے اس بات کو غنیمت جانتے ہوئے اپنے قدم سست کر لیے۔

دونوں کی سانسیں بری طرح سے پھولی ہوئی تھیں۔

"امینا..... میرا خیال ہے ہم نے اچھا نہیں کیا۔ وہ کئی لوگ لگ رہے تھے اور عمران اکیلا؟" کاشف نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اس نے خود ہی بھاگنے کو کہا تھا۔ وہ ایسے معاملوں میں ماہر ہے۔"

"مگر اس نے تمہیں میرے ساتھ کیوں بھیجا؟"

"اس کا مقصد شاید یہ تھا کہ تم جو حملے کا فائدہ اٹھا کر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے میں ویسا نہ ہونے دوں۔"

"لیکن تم تو۔"

"ہاں میں تمہیں نکال لائی۔ کیونکہ میں جان چکی ہوں کہ تم ٹھیک کہہ رہے تھے کہ وہ میرا شوہر نہیں صرف اور صرف فرض شناس سی آئی اے والا ہے۔"

"میں وہاں سے نکل تو آیا ہوں۔ بس اب تم واپس جاؤ۔"

"میں کیوں واپس جاؤں؟"

"وہ فرض شناس ہے تو تمہارا بھی فرض ہے اس کا ساتھ دینا۔ وہ شوہر ہے تمہارا۔"

"اور تم میرے دوست ہو۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے۔"

"آج سے نہیں۔ تم شروع سے جانتے ہو کہ میں کبھی کنفیوز نہیں رہی۔" امینا اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"مجھے کوئی بھی فیصلہ لینے میں کبھی وقت نہیں لگتا۔ جب میں نے تمہاری زبان سے یہ سنا کہ تم اس پر بھروسہ نہیں کر رہے ہو تب میری نظر میں وہ ہی ٹھیک تھا اس لیے میں نے تمہیں فوراً گھر سے نکل جانے کو کہا تھا لیکن یہ پتہ چلا کہ وہ نہیں تم اپنی جگہ صحیح کہہ رہے تھے اور وہ صرف سی آئی اے کے لیے کام کر رہا ہے تو دیکھ لو میں تیرے ساتھ ہوں۔ اپنے دوست کے ساتھ۔"

"مگر یہ ٹھیک نہیں ہے امینا۔ جتنا تم نے میرے لیے کر دیا ہے اتنا ہی کافی ہے۔ اب تم واپس چلی جاؤ۔ جاؤ اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ امینا۔"

"تم بار بار میرے شوہر کا لفظ استعمال کر کے مجھے چڑا رہے ہو۔ اس نے ٹھوک بجا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ میرا شوہر نہیں صرف سی آئی اے والا ہے۔"

"ارے مگر۔"

"اور یہ مت سمجھنا کہ اس گلی کو پار کرتے ہی تم اس کے چنگل سے نکل گئے ہو۔ امیر جان کے آدمیوں سے نمٹتے ہی وہ ہر جگہ تمہاری تلاش شروع کر دے گا۔"

"میرے مقدر میں جو لکھا ہے ہو جائے گا۔" کاشف نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں کوئی الزام نہیں دوں گا۔"

"میں تیرے ساتھ رہوں گی۔ ہر مصیبت میں تیرے ساتھ رہوں گی۔" امینا کا لہجہ اٹل تھا۔

"تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ جب تک میں تمہاری ڈھال بنی رہوں گی۔ وہ تم پر گولی نہیں چلائے گا۔"

کاشف نے کچھ کہنا چاہتا لیکن تب تک مرکزی سڑک آچکی تھی اور امینا نے وہاں سے گزرنے والی ایک پرائیویٹ ٹیکسی روک چکی تھی۔

وہ ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

"جلدی کرو۔ دیر کرنے کا مطلب ہے پھنس جانا۔" کاشف بھی اس حقیقت کا اندازہ لگا چکا تھا وہ جھٹ سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

سانسیں بحال ہونے پر کاشف نے کہا۔

"پارسل میں موجود ایک اور چیز کے بارے میں سنو

گی تو تمہاری کھوپڑی ناچ اٹھے گی۔"

"وہ کیا بھلا؟"

"میں جان چکا ہوں کہ یہاں سے ہمیں سکھر اور وہاں سے لاہور جانا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"پارسل میں آج دوپہر کی فلائیٹ کے سکھر سے لاہور کے دو ٹکٹ ہیں۔"

"دو دو۔"

"ایک تمہارے نام اور ایک میرے نام کا۔"

"نن...... نہیں......" یہ بات انیتا کے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ نہیں میں نہیں مان سکتی۔"

"ایسا ہی ہے انیتا۔" کاشف بولا۔

"جب میں فریش ہونے گیا تھا تب مجھے پہلی بار تسلی سے پارسل کی چیزیں جانچنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے تب ہی دیکھ لیے تھے وہ ٹکٹ۔ مگر اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرے ٹکٹ کی حد تک تو بات ٹھیک ہے۔ لیکن تمہارے نام کے ٹکٹ کا کیا مطلب ہے۔ اس وقت تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم میرے ساتھ جاؤ گی۔ مگر دیکھ لو۔ حالات ایسے بن گئے کہ تم میرے ساتھ ہو۔ میں تمہیں کتنا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میرے ساتھ مت چلو۔ اپنا بیوی ہونے کا فرض نبھاؤ۔ مگر تم نے بھی ساتھ ہی چلنے کی ضد پکڑی ہوئی ہے۔"

انیتا کو چکر سے آنے لگے تھے۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ کاشف جو کہہ رہا ہے وہ سچ ہے۔ مگر وہ جھوٹ بولے گا بھی تو کیوں؟

♥♥♥

عمران کے گھر پر جو واقعہ ہوا اس کی پوری رپورٹ دینے کے بعد ہمت خان نے کہا۔

"اس مقابلے میں ہمارے چار آدمی مارے گئے سر۔"

"اور باقی بھاگ گئے۔" امیر جان کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔

"حالات ہی ایسے ہوگئے تھے۔ وہاں پولیس بھی پہنچ گئی تھی۔ شاید اسی نے فون کیا تھا اور یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ عمران سی آئی اے کی حیدرآباد برانچ کا چیف ہے۔ دو بندے گرفتار ہیں اور اگر فرار نہ ہوتے تو ہم بھی ان کی حراست میں ہوتے۔"

"گھر کے اندر کی رپورٹ کہاں سے ملی؟"

"جس وقت عمران نے کراچی سینٹر پر رپورٹ دی معراج علی چیف افسر کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اسی نے یہ ساری رپورٹ دی ہے۔"

"مطلب یہ کہ نہ ہی آئی اے کو اور نہ ہمیں پتہ ہے کہ اب وہ دونوں کہاں ہیں؟" امیر جان نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں سر اور آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ اس بار ہم سے کوئی چوک نہیں ہوگی۔ اور ہاں سر، میں ایک بہت ہی اہم بات تو بتانا ہی بھول گیا۔"

"کیا۔" امیر جان جیسے غراتا ہوا بولا۔

اور پھر ہمت خان نے کاغذ کے ٹکڑے والی پوری بات بھی بتادی۔

"کیا سی آئی اے والے ان کا کوئی مطلب سمجھ پائے ہیں؟"

"نہیں۔ لیکن عمران نے ویسا ہی ایک دوسرا کاغذ بنا لیا ہے۔ تاکہ خفیہ کوڈز کو ڈی کوڈ کرنے والے ماہرین اس پر کوشش کرتے رہیں۔" ہمت خان بولا۔

"معراج علی سے کہنا دوسری باتوں کے علاوہ اس بات پر بھی گہری نظر رکھے۔" سر تاج صدیقی نے کہا۔

"اور جیسے ہی ماہرین اسے ڈی کوڈ کرلیں فوراً ہمیں خبر کردے۔"

"وہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں سر۔"

"مگر یہ بات ہے بہت خطرناک۔" گہری سوچ میں ڈوبے ڈاکٹر بابر نعیم نے کہا۔

''اس سے تو لگتا ہے کہ یہاں رہتے وقت اس نے ایسے بیج بونے کی کوشش کی، جس سے انجیکشن کا اثر ختم ہونے کے بعد بھی اس وقت کی باتیں یاد آ سکیں۔''

''ہم میں سے کسی نے بھی اس کے بڑھتے ہوئے بالوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔ کسی کو ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ اچانک پچھلے چھ مہینے سے اس نے بال کیوں نہیں کٹوائے۔ شیو کیوں نہیں بنوائی؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساڑھے تین سال تک اس کے دماغ میں ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ یعنی یہ خیال اس کے ذہن میں چھ مہینے پہلے ہی وارد ہوا تھا اور اس نے ارادتاً بال بڑھا لیے تھے۔ ماننے کی بات ہے کہ وہ بہت ذہین تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ یہاں سے کاغذ کے علاوہ کوئی بھی دوسری چیز لے جانے کی کوشش کرے گا تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہوگا۔ داڑھی میں بندھے بال ہی ایسی چیز تھے جسے نہ میٹیل ڈی ٹیکٹر پکڑ سکتا تھا اور نہ ہم نے دھیان دیا۔'' امیر جان کے لہجے میں کاشف کے لیے توصیف تھی۔

''اور اس کے ساتھ ہی اس نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ اگر ہم اتفاق سے اسے پکڑ بھی لیتے تو کچھ سمجھ نہ پاتے۔ تب ہی تو اس نے کوڈ کا استعمال کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کوڈ اب خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے۔'' سرتاج صدیقی نے کہا۔

''لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ دیر یا سویر کوئی اور سمجھے نہ سمجھے، وہ ضرور سمجھ جائے گا۔ بہر حال دماغ تو اس کا اب بھی وہی کام کر رہا ہے۔'' ڈاکٹر نعیم نے وضاحت کی۔

''اسی لیے میں نے کہا یہ بہت خطرناک بات ہے۔ پتہ نہیں وہ اس کوڈ سے یہاں کے بارے میں کیا معلوم کر لے گا؟''

''آخر چھ حروف سے وہ کتنی معلومات لے سکتا ہے۔'' سرتاج صدیقی بولا۔

''اصل خطرہ مجھے پارسل سے ہے۔ بالوں میں کاغذ والی حرکت یہ بتاتی ہے کہ سی آئی اے والے صحیح کہہ رہے ہیں کہ پارسل اسی نے بھیجا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اس پارسل میں بہت کچھ ہے۔ اگر کسی دن اسے ان چیزوں کا مطلب سمجھ میں آ گیا تو یقیناً وہ ہمارے لیے دنیا کا سب سے بڑا خطرہ بن جائے گا۔'' ڈاکٹر بابر نعیم نے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کاشف نے تو دماغ گھما کر رکھ دیا ہے۔'' امیر جان بولا۔

''پتہ نہیں وہ یہ سب کیسے اور کس طرح کر گیا۔''

''یہ دماغ کو چکرا دینے والی بات تو ہے سر کہ اگر کسی طرح وہ یہ کام کر گیا ہے تو اسے کیسا پتہ تھا کہ اسے سی آئی اے والے پکڑنے کی کوشش کریں گے اور وہاں سے فرار کے لیے ایسی سگریٹ کی ضرورت پڑے گی جس سے اس کے علاوہ باقی لوگ بے ہوش ہو جائیں۔ اب یہ تو کسی صورت بھی نہیں ہو سکتا کہ اس میں سی آئی اے کا ہی ہاتھ ہو۔ تو سوال یہ اٹھتے ہیں کہ آخر اسے پہلے سے ہی کیسے معلوم تھا کہ وہ فلاں ٹرین کی فلاں برتھ پر بیٹھ کر سفر کرے گا؟ کہ اس نے پہلے سے اس کا ٹکٹ پارسل میں رکھ دیا۔ پھر وہ انگوٹھی۔'' الوینہ کہتی رہی۔

''انگوٹھی والا واقعہ تو قطعی حیرت انگیز ہے۔ کیا وہ اس چور میں بھی گھس گیا تھا؟''

امیر جان اور سرتاج صدیقی نے ایک دوسرے کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال کلبلا رہا ہو۔

''سرتاج۔ کیا وہ ہو سکتا ہے جو ہم سوچ رہے ہیں۔'' امیر جان نے پوچھ لیا۔

''میں تو کہتا ہوں سر صرف اور صرف وہی ہو سکتا ہے۔'' سرتاج نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے بغیر کاشف کو اتنی ساری باتیں کسی اور ذریعے سے معلوم ہو ہی نہیں سکتیں۔''

''تو آؤ ہمیں چیک کرنا چاہئے۔'' یہ کہتے ہی امیر جان ایڑھی پر گھوما اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

ابھی امیر جان دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ

ڈاکٹر بابر نعیم نے کہا۔

"سر ایک منٹ۔"

"کیا ہے؟" امیر جان گھوما۔

"آپ دونوں کس بارے میں بات کر رہے ہیں۔ ایسی کیا بات تھی جو آپ کو جس سے کاشف کو دونوں پہلے سے معلوم ہوئی تھیں۔"

"ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیوں الوینہ۔" بابر نعیم نے کہا اور الوینہ نے بھی نفی میں گردن ہلا دی۔

"سمجھ میں اس لیے نہیں آیا کہ تمہارے سمجھنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔" امیر جان نے یہ الفاظ اتنے سخت انداز میں کہے تھے کہ ڈاکٹر بابر نعیم چونک گیا۔ کیونکہ آج سے پہلے امیر جان نے کبھی اس کے ساتھ اتنے سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

اتنا ہی نہیں۔ امیر جان نے اس سے بھی زیادہ سخت لہجے میں ہمت خان کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"جتنی جلدی ہو سکتے پتا لگاؤ اور ختم کر دو اسے۔ تم سن ہی چکے ہو کہ وہ ہمارے لیے دنیا کا سب سے بڑا خطرہ بن چکا ہے۔"

"جج جی سر۔" ہمت خان نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"اگر اس بار بھی چوک ہوئی تو تمہیں بھی وہیں بھیج دیا جائے گا جہاں ہاشم گیا ہے۔" امیر جان کا لہجہ مزید خونخوار ہو گیا تھا۔ اس بار ہمت خان کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔

"تم ہمارے ساتھ آؤ۔ اب اس کی بنائی ہوئی مشین کو چیک کرنا ضروری ہو گیا ہے۔" سرتاج سے مخاطب ہونے کے بعد امیر جان ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سرتاج صدیقی بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔

♥♥♥

"میں نے پہلے ہی کہا تھا سر۔" معراج نے کن انکھیوں سے بغل میں بیٹھے جگی کی طرف دیکھا اور اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے چیف سے بولا۔

"جگی کی عادت ہے ایسا کرنے کی۔ یہ دماغ کی بجائے پیٹ سے سوچنے کا عادی ہے۔ مگر آپ نے بھی میری ایک نہ سنی۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اب کاشف ہماری آنکھوں سے پوری طرح سے اوجھل ہو چکا ہے۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے۔"

عمران بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ کہتے ہوئے معراج کے لہجے میں ہلکا سا غرور اور خوشی کا احساس تھا۔ جب اس سے رہا نہ گیا تو بول ہی پڑا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے جو کچھ بھی ہوا تم اس سے بہت خوش ہو۔ ہیں نا؟"

"خ...... خوش......" معراج ایسے بوکھلایا جیسے عمران نے اس کا ذہن پڑھ لیا ہو۔

"جو کچھ بھی ہوا اس سے سی آئی اے کا کون سا اہلکار خوش ہوگا سر۔"

"وہی تو۔" عمران اسے گہری نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

"کسی بھی سی آئی اے والے کو خوش نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود تم خوش اور مطمئن نظر آ رہے ہو۔ جیسے سب کچھ تمہاری منشا اور خواہش کے مطابق ہوا ہو۔"

"آ...... آ...... آپ کیسی بات کر رہے ہیں سر۔" عمران نے اسے پوری طرح سے بوکھلا دیا تھا۔

"میں کہاں سے خوش نظر آ رہا ہوں اور مجھے خوش ہونا بھی کیوں چاہئے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے جو اندازہ لگایا تھا وہی ہوا اور۔"

"چیف مجھے پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ تم نے کیا کہا تھا اور جگی نے کیا۔" عمران نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں بھی یہی کہتا ہوں کہ جگی کی بات ہی ٹھیک تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کاشف ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لیکن صحیح وہی تھا جو ہم لوگوں نے کیا۔ تمہارا مشورہ

انتہائی احمقانہ تھا۔"

معراج اپنے غصے کو اندر ہی اندر پینے پر مجبور ہو گیا۔ تلخ لہجہ اس لیے استعمال نہیں کر سکتا تھا کہ عہدے کے لحاظ سے عمران اس سے اوپر تھا۔

"وہ پارسل دو بار ہمارے ہاتھوں سے گزرا۔" چیف بولا۔

"افسوس تو یہ ہے کہ اس میں موجود چیزوں کو دیکھنے کے بعد بھی ہم نے زیادہ غور سے نہیں دیکھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت ہمارے ذہن میں ان چیزوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ پھر یہ بھی سوچا تھا کہ کاشف کو پکڑنے کے بعد اسی سے ان چیزوں کا مطلب پوچھ لیں گے۔ مجھے ٹرین کا ٹکٹ یاد تھا تو فوراً ہی اس کا پیچھا بھی کروایا لیکن انگوٹھی کی کرامت نے اسے کھمبیر پر ہی اتار دیا۔ آخر کس برتے پر ہم یہ سوچ سکتے تھے کہ وہ انگوٹھی ایسا کام دکھائے گی؟"

"لیکن کم سے کم اب تو یاد کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ اس پارسل میں اور کیا کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی چیز دھیان میں آ جائے جس سے ہمیں پتہ لگے کہ وہ کس طرف گیا ہے۔" عمران نے کہا۔

"جب سے وہ تمہارے گھر سے فرار ہوا ہے۔" چیف یاد کرتے ہوئے بولا۔

"تب سے یادداشت کو ہی ٹٹول رہا ہوں۔ پوری تو نہیں۔ لیکن کچھ کچھ چیزیں یاد آ رہی ہیں۔ جیسے کہ اس میں ایک چشمہ تھا۔ ایک آتشی شیشہ اور فلائیٹ کے دو ٹکٹ بھی تھے۔"

"فلائیٹ کے ٹکٹ؟" عمران چونکا۔

"ہاں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اس میں لاہور کے دو ہوائی ٹکٹ بھی تھے۔"

"دو ٹکٹوں کا کیا مطلب ہوا۔" عمران الجھتا ہوا بولا۔

"ایک تو خود کاشف کا تھا۔ دوسرا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔"

"کیا نام تھا سر۔" عمران بے چینی سے بولا۔

"پلیز سر یاد کرنے کی کوشش کریں۔"

"کر چکا ہوں۔ مگر یاد ہی نہیں آ رہا۔"

"کہیں وہ نام انیتا تو نہیں تھا؟"

"یس۔" کہنے کے ساتھ چیف کرسی سے اچھل پڑا۔

"انیتا۔ یہی نام تھا عمران۔ مجھے یاد آ گیا۔ یہی نام تھا اس پر۔"

"تاریخ کیا تھی؟"

"بہت یاد کر چکا ہوں۔" چیف کی جمی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ان کا پورا دھیان پارسل کی چیزوں کی طرف ہے۔

"اس میں ربر کے دستانے بھی تھے۔"

"میں ٹکٹ کی تاریخ پوچھ رہا ہوں سر۔" عمران نے پھر کہا۔

"وہی تو یاد نہیں آ رہی۔"

"اس کے باوجود کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ اس میں انیتا کے نام کا بھی ٹکٹ تھا۔ خاص طور پر یہ دیکھتے ہوئے کہ اس وقت وہ اسی کے ساتھ ہے۔ پارسل میں پہلے سے اس کے نام کا ٹکٹ۔ کسی جادو کی طرح لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا چکر۔ کیا کاشف کو پہلے سے علم تھا کہ میرے گھر پر کیا واقعات پیش آئیں گے۔ اگر ہاں تو کیسے؟ وہ یہ بات کس طرح جان سکتا تھا؟ کیا اب وہ لاہور گئے ہیں؟ ہمیں وقت گنوائے بغیر لاہور برانچ کو مطلع کر دینا چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" چیف نے کہا۔

"جلد یا بدیر وہ لاہور تو پہنچیں گے ہی۔ اگر وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہے تو پھر معراج کا کہنا بھی ٹھیک ہے کہ ہمیں اس فیصلے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"میں آپ سے متفق ہوں سر۔" عمران بولا۔

"یہ کام تو ہمیں پہلی فرصت میں کر لینا چاہیے اور میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی ٹیم لے کر میں بھی جلد از جلد لاہور پہنچ جاؤں۔"

''ٹھیک ہے۔ میں اس کا انتظام کر دیتا ہوں۔''
چیف نے کہا۔



امیر جان اور سرتاج صدیقی تیز تیز قدموں سے ایک کوریڈور سے گزر رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر تناؤ صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ چلتے چلتے امیر جان نے پوچھا۔

''سرتاج۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟''

''ایسا ہی ہے سر۔'' سرتاج نے اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے کہا۔

''اور شاید اس کا فائدہ سب سے پہلے خود اسی نے اٹھالیا ہے۔ ہم نے تو ابھی تک اس کا تجربہ بھی نہیں کیا ہے۔''

امیر جان ایک دیوار کے قریب رک کر بولا۔

''کیا تم نے کاشف کے جانے کے بعد اس کی مشین کو چیک کیا تھا؟''

''بھلا آپ کی اجازت کے بغیر میں ایسا کیسے کر سکتا تھا۔''

امیر جان نے ایک کارڈ نکال کر دیوار میں لگی ڈیوائس میں لگایا۔ ایک کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ دیوار میں ایک گزرگاہ بنتی گئی۔ پہلے امیر جان اور پیچھے سرتاج صدیقی اندر داخل ہو گئے۔ اندر اسٹیل سے بنی ایک لفٹ سی تھی۔ تھوڑی دیر نیچے کی جانب سفر کرنے کے بعد لفٹ رکی تو امیر جان نے پھر کارڈ کا استعمال کیا اور سامنے کی چھوٹی اسکرین پر مطلوبہ نمبر ڈائل کر کے دروازہ کھول دیا۔

''آخر ایسا کیا ہوگا اس میں؟'' امیر جان ابھی بھی عجیب مخمصے میں تھا۔ یہ کہتے ہوئے وہ سرتاج کے ساتھ لفٹ سے باہر آ چکا تھا۔

''مگر یہ بات بھی اہم ہے کہ وہ چوری چھپے یہاں داخل ہوا بھی تو کیسے؟'' سرتاج بھی بری طرح سے الجھا ہوا تھا۔

''چوبیس گھنٹوں کی نگرانی میں ایک لمحے کی بھی کوتاہی نہیں دیکھی گئی۔'' امیر جان نے ایک کوریڈور میں قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نگاہ تو الوینہ پر بھی رہتی تھی سر۔ پھر بھی۔ اگر سی آئی اے کی بات مان لی جائے تو وہ گوادر تک گیا اور پارسل کی رجسٹری کروا کر واپس بھی آ گیا اور کسی کو اس کی بھنک تک نہیں لگی۔''

انہی باتوں کے دوران وہ کوریڈور کے انتہائی سرے پر پہنچ چکے تھے۔ سامنے کی دیوار کے پاس پہنچ کر امیر جان نے کارڈ ایک درز میں گھمایا اور خود بخود جگہ بنتی گئی اور نیچے کی طرف جانے والی سیڑھیاں نظر آنے لگی تھیں۔ دونوں نے اپنے قدم ڈھلان پر بڑھا دیے۔

سیڑھیاں کافی چوڑی تھیں اور ان میں کہیں کہیں ستون آویزاں تھیا اور چاروں طرف سفید دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے امیر جان پھر بولا۔

''اگر یہ سب اسی کی وجہ سے ہو رہا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاشف نے یہ سب کیوں کیا۔ آخر اس کے دماغ میں کیا خناس تھا۔ کیا وہ ہمیں کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے سر۔''

''مگر کیوں؟'' امیر جان نے ذہن میں کلبلاتا ہوا سوال پوچھا۔

''تم خود جانتے ہو کہ ہم نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ ہم نے اس کا اتنا خیال رکھا جتنا کہ آج تک ہم نے کسی کا نہیں رکھا اور وہ بھی جب تک یہاں رہا بہت خوش رہا۔ کیا تم نے کبھی اسے افسردہ حالت میں دیکھا؟''

''نہیں۔''

''تو پھر وہ ہمارا برا کیوں سوچنے لگا؟''

''ایسا لگتا تو نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو بہت خوش تھا کہ چار سال بعد ملنے والی رقم سے وہ اپنا مستقبل کا کمپیوٹر تیار کر لے گا۔ لیکن کس کے دل میں کیا ہے۔ یہ بھی تو

جھانک کر نہیں دیکھا جا سکتا نا سر۔"

سیڑھیوں کے کئی موڑ مڑنے کے بعد وہ اسٹیل کے بنے ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ چاروں طرف کئی طرح کی الیکٹرانک مشینیں اور بیچ میں ایک بڑی سی میز تھی جس پر کئی کمپیوٹرز رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان سب کو نظر انداز کرتے ہوئے اس مشین کی طرف بڑھے جو حجم کے لحاظ سے سب سے بڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کا پچھلا حصہ لگ بھگ بیس فٹ اونچا تھا۔

اس مشین میں تاروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا اور لاتعداد سوئچ نظر آ رہے تھے۔ ڈیش بورڈ کافی اونچا تھا اور اس تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر والی سیڑھی پر ایک چبوترہ بنا ہوا تھا اور اس چبوترے پر ایک بڑی سی الیکٹرانک چیئر رکھی ہوئی تھی۔ یہ چمڑہ منڈھی ریوالونگ چیئر تھی جس پر دو موٹے کیبلو کی مدد سے کئی آلات جڑے ہوئے تھے۔

چیئر کے ٹھیک سامنے کسی کلاس کے بلیک بورڈ کی سائز کی اسکرین لگی ہوئی تھی اور یہی وہ مشین تھی جو انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔



کاشف سلیم کے بائیں ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا اور دائیں ہاتھ میں موبائل۔ لاہور ائرپورٹ لابی میں پہنچتے ہی اس نے موبائل پر وہ نمبر لگایا جو اس کاغذ کے ٹکڑے میں درج تھا۔

اس نے موبائل کان سے لگایا۔ دوسری جانب رنگ جا رہی تھی۔ انیتا برابر میں کھڑی اسی کی طرف متوجہ تھی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

دوسری طرف سے فون اٹھانے کے ساتھ ہی کسی لڑکی کی مدھر سی آواز آئی۔

"گڈ مارننگ سر۔"

"کہاں سے بول رہی ہیں آپ؟" کاشف نے پوچھا۔

"سمانا ہوٹل سر۔"

"میں کاشف سلیم بول رہا ہوں۔"

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں سر۔"

"آپ کے ہوٹل میں میرے نام سے ایک کمرہ بک ہے۔"

"ایک منٹ سر۔ ابھی دیکھ کر بتاتی ہوں۔" دوسری طرف تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

کاشف کو اپنا دل پسلیوں میں پھڑکتا ہوا صاف محسوس ہو رہا تھا۔ دھڑکنیں اس کے بس سے باہر ہوئی جا رہی تھیں اور اس وقت تو مانو اس کے دل نے دھڑکنا ہی بند کر دیا تھا جب دوسری طرف سے کہا گیا۔

"یس سر آپ کے نام پورا سوئیٹ بک ہے۔"

کاشف کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ لیکن زبان جیسے اس کا ساتھ ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی خاموشی دیکھ کر دوسری جانب سے پھر پوچھا گیا۔

"بکنگ میں دی گئی ہدایات کے مطابق آپ کو لینے کے لیے کار بھیج دی گئی ہے سر۔ امید ہے آپ ایئرپورٹ پر ہی ہوں گے۔"

"م..... میرے سوئیٹ کا نمبر 525 ہے نا؟" اس نے اپنی ذہنی رو کو قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔

"یس سر۔"

"تھینک یو۔" کاشف نے لائن کاٹتے ہوئے کہا۔

"اس کی حالت دیکھ کر انیتا بھی پریشان ہو رہی تھی۔

"کیا رہا؟"

"پورا سوئیٹ بک ہے۔" کاشف بڑی مشکل سے صرف اتنا ہی کہہ سکا اور مشکل میں کیوں نہ ہوتا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب کسی جادوئی الف لیلیٰ سے کم تو نہیں تھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔" انیتا بھی حیرت سے چیخ سی پڑی۔

"یہ کیا معجزات ہو رہے ہیں؟"

"آج کی بکنگ کی رسید کا لفافہ بھی پارسل میں ہی تھا اور ٹھیک آج ہی کے دن ہم یہاں آئے ہیں۔" کاشف کے لہجے سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کا ذہن بری طرح چکرایا ہوا ہے۔

''اور ہوٹل والوں نے ہمیں لینے کے لیے کار بھی ایئرپورٹ کے لیے روانہ کر دی ہے۔ ہوسکتا ہے ڈرائیور باہر پہنچ کر ہمارا انتظار کر رہا ہو۔''

''اس سے ایسا لگتا ہے کہ یہ پارسل ہمیں کسی خاص سمت کی طرف لے جا رہا ہے۔'' انیتا نے کہا۔

''لگتا ہے کوئی مشن ہے۔ جسے تم نے پورا کرنا ہے۔''

''اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ پارسل جو کروانا چاہتا ہے' ہمارے پاس اس کے علاوہ کرنے کو کچھ ہے بھی تو نہیں۔ بس ہمیں کرتے جانا ہے۔'' کاشف نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ سماناہوٹل چلتے ہیں۔ اب تک جو ہوا ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ آگے بڑھنے کا راستہ وہیں سے ملے گا۔''



کافی دیر خاموش رہنے کے بعد امیر جان گویا ہوا۔

''چیک کرو۔''

''کیا آپ کا مطلب اس چیئر پر بیٹھ کر مشین کو چیک کرنے سے ہے؟'' سرتاج نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں۔''

یہ سن کر سرتاج کو اپنی پیشانی پسینے سے تر ہوتی محسوس ہونے لگی۔ وہ امیر جان کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

''سس......سر......اس طرح تو میرا۔''

''تم خود بھی تو ایسا ہی چاہتے تھے۔'' امیر جان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اس وقت سے' جب سے کاشف نے یہ مشین بنائی ہے۔ تم تب سے ہی اس کرسی پر بیٹھ کر اس مشین کو آپریٹ کرنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ وہ تو ہم ہی ٹالتے رہے۔ پھر اب' جبکہ ہم خود ہی کہہ رہے ہیں تو اتنا کیوں ہچکچا رہے ہو۔ تمہاری ایسی حالت ہو رہی ہے جیسے ہم تمہیں ٹارچر چیئر پر بیٹھنے کو کہہ رہے ہیں۔''

''مم......مجھے ثمن کے انجام کی یاد آرہی ہے سر۔''

''اوہ۔'' ان الجھے ہوئے لمحوں میں بھی جانے کس پل کو یاد کر کے امیر جان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم اس کی وجہ جانتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ وہ وجہ تم پر لاگو نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ میں ایک ہی کام اوپر والے دو آدمیوں کو نہیں سونپا کرتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے سر اور یہ بھی ہے کہ میں اس کا استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کسی کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''تو تم ہمیں خود سے الگ سمجھتے ہو؟''

''نن......نہیں سر۔'' سرتاج کے منہ سے ایسی آواز نکلی جیسے وہ یہی کہنے پر مجبور تھا۔

''تو پھر آگے بڑھو' چیک کرو مشین کو۔'' امیر جان نے حتمی لہجے میں کہا۔

''خدا کرے یہ ٹھیک کام کر رہی ہو۔''

سرتاج کے پاس اب کوئی چارہ ہی نہیں تھا سوائے امیر جان کی بات ماننے کے۔ حکم جاری کر کے امیر جان اپنا سگار سلگانے لگا۔

سرتاج سیڑھیاں چڑھ کر کرسی پر بیٹھ تو گیا لیکن اس کی حالت ایسی تھی کہ اگر اس کا بس چلے تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہو۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کئی تاروں سے بنے ہیٹ نما آلے کو اپنے سر پر رکھ لیا جس نے ہیلمٹ کی طرح اس کے سر کو ڈھانپ لیا تھا۔ پھر ڈیش بورڈ پر لگا سبز رنگ کا ایک بڑا سا بٹن دبا دیا۔

سبز بٹن دبتے ہی پورے کمرے میں مشین کے ایکٹو ہونے کی آواز گونجنے لگی۔ ساتھ ہی مشین میں لگے سیکڑوں چھوٹے بڑے بلب رہ رہ کر جلنے بجھنے لگے۔ سامنے لگی اسکرین بھی اب روشن ہوگئی تھی۔

اور پھر۔

سرتاج نے کرسی کے دائیں ہتھے پر لگے ایک اور بٹن کو دبایا اور اسکرین پر جیسے تاروں بھرا آسمان روشن ہوگیا۔ رنگ بکھرنے لگے اور اسکرین پر بڑے بڑے

الفاظ میں ''ERROR'' لکھا ہوا نظر آنے لگا۔ یہ دیکھ کر امیر جان اور سرتاج دونوں ہی خاموش تھے مگر ان کی آنکھیں ان کی حیرت کی کہانی سنا رہی تھیں۔

سرتاج کی آنکھوں کی حیرت بتا رہی تھی جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ اچھا ہی ہوا۔ وہیں امیر جان کے تو جیسے ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ جیسے کوئی سیٹھ اس خالی تجوری کو دیکھ رہا ہو جس نے کچھ ہی دن پہلے اس میں اپنی زندگی بھر کی کمائی رکھی دیکھی تھی اور اب جمع پونجی لٹنے جیسی حالت ہو رہی تھی امیر جان کی۔

زبان تالو سے ایسے جا لگی تھی کہ کوشش کے باوجود کافی دیر تک وہ کوئی الفاظ بولنے پر قادر ہی نہ ہو پایا تھا اور جب بولا تو ایسے جیسے قبر سے مردہ بول رہا ہو۔

''ایسا ہی ایسا ہی اندیشہ تھا مجھے وہ وہ ہی یہ شرارت کر گیا ہے۔ اب ہم اس پر کچھ نہیں دیکھ سکتے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہے سر کہ کاشف نے اس کے سرکٹ میں کوئی گڑبڑ کر دی ہے۔'' سرتاج نے تاروں سے بنا ہیٹ اپنے سر سے اتار کر ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اور اگر اس نے ایسا کیا ہے۔''

''اس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے' دھوکا۔'' امیر جان غصے سے دانت بھینچتا ہوا بولا۔ ''ہم نے اس کے ساتھ کچھ برا نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ہمارے سے اتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر Error ڈالا ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس نے یہ کام ہمیں اس کا کامیاب تجربہ دکھانے کے بعد کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سرتاج نے ڈیش بورڈ پر لگا بڑا سا سرخ بٹن دبا کر مشین کو آف کر دیا۔

''اور پھر چپکے سے یہاں آ کر اس نے گڑبڑ کر دی۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ آپ کی نظروں کو دھوکا دینے میں کامیاب رہا ہے۔''

''مگر اس نے ایسا کیوں کیا' اسے ہماری کون سی بات بری لگی تھی۔ کام کے دوران وہ پوری طرح سے خوش تھا۔ شاید ہم سے بھی زیادہ خوش۔''

اب مشین آف ہوتے ہی اسکرین بھی بجھ گئی تھی اور ساتھ ہی سارے بلب بھی۔

سرتاج سیڑھیاں اتر کر واپس آتا ہوا بولا۔

''وہ اتنا ہی خوش تھا سر جتنا کہ کوئی بھی سائنسدان اپنی کوئی نئی ایجاد کرتے وقت ہوتا ہے۔ لیکن صرف تبھی تک' جب تک آپ نے ثمن کو شوٹ نہیں کیا تھا۔''

''ثمن کو۔'' امیر جان چونکا۔

''اس کا بھلا کاشف سے کیا واسطہ؟ ثمن کو شوٹ کرنے سے کاشف کو کیا ناراضگی تھی اور پھر ہم نے تو ایسا کچھ محسوس بھی نہیں کیا تھا۔''

''بعد میں تو میں نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا تھا سر۔'' سرتاج صدیقی' امیر جان کے قریب آتا ہوا بولا۔

''لیکن اس وقت' ٹھیک اس وقت میں نے محسوس کیا تھا۔ جس وقت آپ نے اسکرین پر فلم دیکھنے کے فوراً بعد ثمن کو شوٹ کر دیا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ کاشف کو یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔ مگر اگلے ہی پل وہ نارمل نظر آنے لگا تھا۔ اس کے بعد آپ نے اس کی کامیابی کی پارٹی دی تھی۔ اس میں بھی وہ پورا مست تھا۔ تو میں نے سوچا کہ شاید مجھے ہی غلط فہمی ہوئی ہے۔ لیکن' اس کی یہ حرکت بتا رہی ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور آ گئی تھی۔ جسے وہ اپنی اداکاری سے چھپانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔''

''خیر...... جو بھی ہوا۔ لیکن جو بھی ہوا بہت غلط ہوا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے امیر جان کمرے کے بیچوں بیچ رکھی میز کی طرف بڑھا۔ اس پر انٹرکام جیسے کچھ بٹن دبائے اور کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر بابر نعیم کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

''ڈاکٹر بابر نعیم ہیئر۔''

''ہم بول رہے ہیں ڈاکٹر۔''

''یس سر۔''

"ہمت خان کہاں ہے۔" امیر جان نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ تو چلا گیا سر۔"

"وہ جہاں کہیں بھی ہو۔ بغیر ایک لمحہ گنوائے اسے ہماری طرف سے یہ حکم دے دو کہ کاشف سلیم کا بال بھی بانکا نہیں ہونا چاہیے۔"

"یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟" ڈاکٹر بابر نے چونک کر پوچھا۔

"خود آپ ہی نے تو اسے ختم کرنے کا فرمان جاری کیا تھا۔"

"اور ہم ہی اب یہ کہہ رہے ہیں کہ کاشف پوری طرح سے محفوظ رہنا چاہیے۔" امیر جان کے لہجے میں عجیب سا شور تھا۔

"نہ صرف ہماری طرف سے محفوظ رہنا چاہیے بلکہ سی آئی اے والوں کے شوٹرز سے بھی۔ دھیان رہے ہمت خان کی ٹیم کو جلد سے جلد اسے تلاش کرنا ہے اور اس کی پوری طرح سے حفاظت کرنی ہے۔ اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"سر۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ایسا کیوں؟"

"کچھ سمجھنے کی کوشش مت کرو ڈاکٹر۔ صرف وہ کرو جو ہم کہہ رہے ہیں۔ بغیر وقت گنوائے۔"

"تو سر۔"

امیر جان نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی انٹرکام آف کر دیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر عجیب سا تناؤ نظر آ رہا تھا۔ ایسا تناؤ کہ اپنے ذہن میں سیکڑوں سوالات ہونے کے باوجود سر تاج صدیقی کی کچھ ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد امیر جان نے سوال کیا۔

"کیا تم کچھ کر سکتے ہو؟"

"م..... میں؟" اس اچانک سوال نے سر تاج کو بوکھلا دیا تھا۔

"ہاں۔ تمہاری ہی بات کر رہے ہیں ہم۔"

"کک..... کس بارے میں کہہ رہے ہیں آپ؟"

"اس مشین کے علاوہ ہم اور کس بارے میں کہہ سکتے ہیں۔" امیر جان نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس میں آئے ایرر کی بات کر رہے ہیں ہم۔ تم نے وہ ایرر دیکھتے ہی کہا تھا کہ کاشف نے شاید اس کا سرکٹ توڑ دیا ہے۔ تم بھی تو انجینئر ہو۔ کیا تم اس سرکٹ کو پورا کر سکتے ہو۔ اس کا ایرر ختم کر سکتے ہو؟"

"کوشش تو کی ہی جا سکتی ہے سر۔" سر تاج کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

"تو کرو کوشش' ابھی سے۔" امیر جان کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"جب تک تم اس مشین کا ایرر نہیں نکال لیتے تب تک تم اس لیبارٹری سے نہیں نکلو گے۔ ہمیں دیکھنا ہے سر تاج' ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم جو پیسہ تم پر خرچ کرتے ہیں تو کس قدر درست خرچ کر رہے ہیں اور ایک وعدہ بھی کرتے ہیں' اگر تم نے اس کا سرکٹ مکمل کر دیا تو منہ مانگی دولت کے حقدار ٹھہرو گے۔ کسی بھی طرح' کسی بھی طرح ہمیں یہ مشین مکمل حالت میں چاہیے۔ بس۔"



"پورے پچاس ہزار کی ایک اور انفارمیشن نوٹ کرو۔" صوفے پر نیم دراز معراج نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف سے ہمت خان کی آواز ابھری۔

"اپنے بھولنے کی عادت کو سدھارنے کی کوشش کرو۔ میں پہلے بھی تم کو بتا چکا ہوں کہ میں کوئی بھی انفارمیشن کاغذ پر نوٹ نہیں کرتا۔ اس کے لیے میرے پاس اوپر والے کا دیا ہوا دماغ موجود ہے۔"

معراج صوفے پر کچھ اور پھیل گیا اور اپنے پاؤں سامنے پڑی میز پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

"انفارمیشن سن کر امیر جان صاحب کی طبیعت بھی

اسی طرح پھڑک اٹھے گی ہمت خان، جیسے سی آئی اے والوں کی پھڑکی ہوئی ہے۔"

"ایسی کیا بات بتانے والے ہو؟"

"کاشف سلیم کے پارسل میں دو ہوائی ٹکٹ موجود تھے۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"چیف کو یہ بات یاد آ گئی ہے۔ ادھر چیف کو یاد آئی ادھر میں تم کو بتا رہا ہوں۔ اگر یہ اطلاع درست نہ ہوتی تو اس وقت فون پر تمہارے ساتھ جھک نہ مار رہا ہوتا۔" معراج فل موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

"اپنے فلیٹ پر پہنچتے ہی پہلا کام یہی کیا ہے میں نے۔"

"یعنی انفارمیشن لیٹ دے رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"اب تک تم ہر انفارمیشن ملتے ہی اپنے آفس کے آس پاس سے ہی ہم تک پہنچا دیتے تھے۔ مگر یہ فون گھر پہنچ کر کر رہے ہو تو ظاہر ہے۔ وہاں سے چلے ہو گے۔ اپنے گھر پہنچے ہو گے۔ راستے میں جو ٹائم لگا وہ تو ضائع ہی ہوا نا۔"

"ہاں۔ اس بار ایسا کرنا پڑا۔" معراج ایک گہری سانس لیتا ہوا بولا۔

"اور اس لیے کرنا پڑا کہ وہ سالا عمران انصاری، جس سالے کی بیوی اپنے پرانے یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی چلتا پرزہ نظر آ رہا ہے۔ اس کی کئی باتوں سے مجھے لگا کہ وہ مجھ پر شک کر رہا ہے۔ اس لیے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم سے بات کر رہا ہوں اور وہ میرا ایکسٹینشن دبوچ لے۔ اس لیے گھر پہنچ کر فون کیا ہے۔"

"خیر۔ یہ بتاؤ کہ وہ ٹکٹ کہاں کے تھے؟"

"اس سے پہلے یہ سنو کہ وہ ٹکٹس کس کس کے ہیں۔"

"یعنی۔"

"یعنی ایک کاشف سلیم کے نام اور دوسرا انیتا کے نام کا۔"

"اس انیتا کے نام کا؟"

"انیتا عمران انصاری کی بیوی ہے۔ جو اسے ٹھینگا دکھا کر بھاگ گئی ہے۔"

"مگر پارسل میں پہلے سے ہی انیتا کے نام کا ٹکٹ کہاں سے آ گیا؟" ہمت خان کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز اسپیکر میں گونجی۔

"کیا پارسل تیار کرنے والے کو پہلے سے پتہ تھا کہ عمران انصاری کی بیوی اسے چھوڑ کر کاشف کے ساتھ بھاگ جائے گی؟"

"یہی تو ہے وہ سوال جس نے سی آئی اے والوں کو گھن چکر بنا کر رکھ دیا ہے اور انفارمیشن سن کر شاید امیر جان صاحب بھی چکرا کر رہ جائیں گے۔"

دوسری طرف کافی دیر تک خاموشی رہی، جو اس بات کی غماز تھی کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی ہمت خان اپنی حیرت پر قابو نہیں کر پا رہا ہے۔

"کیا ہوا ہمت خان۔" معراج ہنسا۔

"تمہیں تو لگتا ہے سانپ سونگھ گیا۔"

"یہ بتاؤ وہ ٹکٹس کہاں سے کہاں تک کے ہیں؟"

"سکھر سے لاہور تک کے۔" یہ کہتے ہی اس نے دوسری طرف سے جواب سنے بغیر لائن کاٹ دی اور موبائل کو صوفے پر ایسے پھینکا جیسے وہ کوئی فالتو چیز ہو۔

اسی لمحے چھنک چھنک، ایک ساتھ کئی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی زوردار آواز گونجی۔ معراج بوکھلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اسے بوکھلانے تک کا موقع نہیں ملا۔

کمرے میں جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔ کانچ کے کئی ٹکڑے اس کے جسم سے بھی ٹکراتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس نے تین انسانی جسم فرش پر قلابازیاں کھاتے نظر آئے۔ وہ ابھی اس صورت حال کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ تینوں ربر کے بالس کی طرح اچھل کر سیدھے کھڑے ہوتے نظر آئے۔

وہ تینوں عمران انصاری۔ جگی اور افضل تھے۔
دوسری ہی نظر میں ان کے ہاتھوں میں ریوالور بھی نظر آنے لگے تھے۔
معراج کے جسم کے رونگٹے جنگلی گھاس کی طرح اکڑ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ عمران نے غراتے ہوئے کہا۔
''ذرا بھی ہلے یا بھاگنے کی کوشش کی تو بھیجہ اڑا دوں گا۔''
معراج جہاں تھا۔ ساکت کھڑا رہا۔ سب سے زیادہ جگی خوش نظر آ رہا تھا۔
''میں بھی تو کہوں سر کہ اس سالے کی ہر بات کیسے پوری ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا کاشف پر نظر رکھنے کے چکر میں رہے تو وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے گا اور وہی ہوا۔''
''اب آیا سمجھ میں۔'' افضل ایسے انداز میں بولا جیسے جگی کو سمجھا رہا ہو۔
''کیسا سیانا بنا ہوا تھا یہ چیف کی نظروں میں' کیسے حملہ ہو گیا عمران سر کے گھر پر۔''
ایسا لگ رہا تھا جیسے معراج کے منہ میں زبان ہی نہ رہی ہو۔
عمران نے جیب سے موبائل نکال کر نمبر ملاتے ہوئے کہا۔
''میرا شک سو فیصد صحیح نکلا سر۔ ہم نے معراج علی کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔''
دوسری طرف سے جانے کیا کہا گیا۔ عمران نے ہنس کر جواب دیا۔
''نہیں سر۔ میری نظر سے کاشف ذرا بھی اوجھل نہیں ہے۔ اس کے وہاں سے نکلنے سے پہلے ہی میں اپنا کھیل کھیل چکا تھا۔ اس کے بارے میں معراج کے سامنے صرف اس لیے نہیں بتایا کہ شک تو ہو ہی گیا ہے اس پر۔ سوچا اگر اس کے سامنے کہا تو یہ انفارمیشن امیر جان تک بھی پہنچ جائے گی۔''
دوسری طرف سے پھر کچھ کہا گیا۔
''آفس آ کر بتاتا ہوں کہ میں کیا کھیل کھیل چکا ہوں۔ سن کر آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔'' عمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔



امیر جان خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے۔ وہ اس وقت اپنے بیڈروم میں تھا۔ اس بیڈروم کی تفصیل بتانے کی بجائے صرف یہ لکھ دینا کافی ہے کہ وہاں ہر وہ چیز موجود تھی جو کسی کھرب پتی شخص کے بیڈروم میں ہو سکتی تھی۔
وہ کچھ دیر لیٹ کر اپنی تھکن اتارنا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے دنیا کے مہنگے ترین گدوں سے مزین کنگ سائز بیڈ بچھا ہوا تھا۔ مگر وہ اپنی پوری خواہش کے باوجود اس پر لیٹ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں سوالات کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ اس کی بے چینی اپنے پورے عروج پر تھی۔ کمرے میں پڑے ایرانی قالین پر چہل قدمی کے علاوہ اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ بس وہ بیچ بیچ میں رک کر اس اسکرین کی طرف دیکھتا جس پر سرتاج صدیقی ایرر نکالنے کے لیے مشین کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ اپنا دماغ استعمال کر کے اس مشین کے سرکٹ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
یہاں کمرے میں امیر جان دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی کامیابی کا منتظر تھا۔ پھر وہ سونے کی بنی ایک چھوٹی میز کی طرف بڑھا اور اس پر رکھے خوبصورت طلائی فون کا ریسیور اٹھا کر ایک بٹن دبایا۔ بیل جانے کے فوراً بعد ہی کال ریسیو کر لی گئی۔
''وینا۔''
''جی۔'' الوینہ کی مدھر آواز گونجی۔
''ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔''
''حاضر ہو جاتی ہوں۔'' صرف اتنا ہی کہا گیا۔
امیر جان نے بغیر کچھ کہے ریسیور رکھ دیا اور تھوڑی ہی دیر میں الوینہ اس کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ اندر آتے ہی بولی۔
''لیس سر۔''

امیر جان اس طرف مڑا تو الوینہ نہایت قاتل ادا سے مسکرائی لیکن جواب میں مسکرانا تو در کنار وہ کچھ بولا تک نہیں۔ وہ ہونٹوں میں دبے سگار کا کش تک نہیں لگا رہا تھا۔

امیر جان کے تاثرات جانچ کر الوینہ چونکی۔ کم سے کم اس بیڈ روم میں وہ اس کے ساتھ ہمیشہ تازگی سے بھرا ملتا تھا۔ ہنستا' کھلکھلاتا۔ اس کمرے میں وہ باہر والے امیر جان سے بالکل الگ ہوتا تھا۔ الگ اس وقت بھی تھا مگر دوسرے تاثرات کے ساتھ۔ الوینہ نے اس کے چہرے پر اتنا تناؤ۔ اتنی فکر۔ اتنی پریشانی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"کیا بات ہے سر؟"

"پلیز وینا۔ اس وقت ہم اپنے ذاتی بیڈ روم میں ہیں۔ ویسے پیش مت آؤ جیسے سب کے سامنے۔"

"مگر لگ نہیں رہا۔" الوینہ اس کی بات کاٹ کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"آپ تو ایسے لگ رہے ہیں جیسے اپنے آفس میں بھی کبھی ایسے نظر نہیں آئے۔ یہاں اس کمرے میں تو ہمیشہ۔"

"چینج کرلو۔" امیر جان نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

"او کے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک کونے کی طرف بڑھ گئی جہاں منقش لکڑی کا پارٹیشن لگا ہوا تھا۔ مگر وہاں پہنچنے سے پہلے اس کی نظر اسکرین پر پڑی اور وہ ٹھٹک گئی اور کچھ دیر تک اس پر نظر آنے والے منظر کو دیکھتی رہی۔ پھر جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو امیر جان کی طرف گھومتی ہوئی بولی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"پہلے چینج تو کرلو۔"

"لیکن جان۔"

"پلیز وینا۔ باقی باتیں بعد میں۔"

اس بار الوینہ بغیر کچھ کہے پارٹیشن کے پیچھے چلی گئی۔ امیر جان نے اس پر سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر اسکرین کی طرف دیکھا۔ مگر جو کچھ وہ دیکھنا چاہتا تھا اس کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ صرف سرتاج صدیقی کا پریشان چہرہ نظر آ رہا تھا جو مشین کے پیچیدہ سرکٹ کو سمجھنے کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں الوینہ بھی لباس تبدیل کر کے باہر آ گئی۔ ہلکے گلابی گاؤن میں اس کا بدن کھلتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا اور ہونٹوں پر قاتل مسکراہٹ تھی۔ مگر امیر جان کا ذہن اب بھی اتنا الجھا ہوا تھا کہ وہ اس مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دینے سے قاصر تھا۔

الوینہ نے ایک نظر پھر اسکرین پر دوڑائی اور کمرے میں بنے بار کی طرف بڑھ گئی اور دو پیگ بنا کر امیر جان کے قریب آتی ہوئی بولی۔

"مجھے لگتا ہے کہ اس وقت تم کو اس کی سخت ضرورت ہے۔" اس نے ایک پیگ امیر جان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تم ہماری ہر ضرورت کو بخوبی سمجھ جاتی ہو۔ اسی لیے تو ہم تمہاری قدر کرتے ہیں۔" امیر جان نے جام ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"وینا' تم نہ صرف یہ جانتی ہو کہ ہمیں کب کس چیز کی ضرورت رہتی ہے بلکہ ذہین بھی ہو۔ ہم جب بھی کسی الجھن میں ہوتے ہیں تو تم سے بات کرنا اچھا لگتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ تم سے بات کر کے ہمیں ہمیشہ سکون ملا ہے۔"

"میں خوش نصیب ہوں جان۔ کہ تم مجھے اتنی اہمیت دیتے ہو۔" الوینہ نے کہا۔

"ویسے جو لوگ میرے اور تمہارے تعلق کے بارے میں جانتے ہیں وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ میں تمہاری دولت اور حیثیت کی وجہ سے۔"

"بے وقوف ہیں وہ لوگ' گدھے ہیں۔" امیر جان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہ یہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ جب پیار ہوتا ہے تو اونچ نیچ۔ ذات پات۔ امیری غریبی اور عمر کی تمام حدوں کو

امیر جان اس طرف مڑا تو الوینہ نہایت قاتل ادا سے مسکرائی لیکن جواب میں مسکرانا تو درکنار وہ کچھ بولا تک نہیں۔ وہ ہونٹوں میں دبے سگار کا کش تک نہیں لگا رہا تھا۔

امیر جان کے تاثرات جانچ کر الوینہ چونکی۔ کم سے کم اس بیڈ روم میں وہ اس کے ساتھ ہمیشہ تازگی سے بھرا ملتا تھا۔ ہنستا، کھلکھلاتا۔ اس کمرے میں وہ باہر والے امیر جان سے بالکل الگ ہوتا تھا۔ الگ اس وقت بھی تھا مگر دوسرے تاثرات کے ساتھ۔ الوینہ نے اس کے چہرے پر اتنا تناؤ۔ اتنی فکر۔ اتنی پریشانی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"کیا بات ہے سر؟"

"پلیز وینا۔ اس وقت ہم اپنے ذاتی بیڈ روم میں ہیں۔ ویسے پیش مت آؤ جیسے سب کے سامنے۔"

"مگر لگ نہیں رہا۔" الوینہ اس کی بات کاٹ کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"آپ تو ایسے لگ رہے ہیں جیسے اپنے آفس میں بھی کبھی ایسے نظر نہیں آئے۔ یہاں اس کمرے میں تو ہمیشہ۔"

"چینج کر لو۔" امیر جان نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

"اوکے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک کونے کی طرف بڑھ گئی جہاں منقش لکڑی کا پارٹیشن لگا ہوا تھا۔ مگر وہاں پہنچنے سے پہلے اس کی نظر اسکرین پر پڑی اور وہ ٹھٹک گئی اور کچھ دیر تک اس پر نظر آنے والے منظر کو دیکھتی رہی۔ پھر جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو امیر جان کی طرف گھومتی ہوئی بولی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"پہلے چینج تو کر لو۔"

"لیکن جان۔"

"پلیز وینا۔ باقی باتیں بعد میں۔"

اس بار الوینہ بغیر کچھ کہے پارٹیشن کے پیچھے چلی گئی۔ امیر جان نے اس پر سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر اسکرین کی طرف دیکھا۔ مگر جو کچھ وہ دیکھنا چاہتا تھا اس کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ صرف سر تاج صدیقی کا پریشان چہرہ نظر آ رہا تھا جو مشین کے پیچیدہ سرکٹ کو سمجھنے کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں الوینہ بھی لباس تبدیل کر کے باہر آ گئی۔ ہلکے گلابی گاؤن میں اس کا بدن کھلتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا اور ہونٹوں پر قاتل مسکراہٹ تھی۔ مگر امیر جان کا ذہن اب بھی اتنا الجھا ہوا تھا کہ وہ اس مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دینے سے قاصر تھا۔

الوینہ نے ایک نظر پھر اسکرین پر دوڑائی اور کمرے میں بنے بار کی طرف بڑھ گئی اور دو پیگ بنا کر امیر جان کے قریب آتی ہوئی بولی۔

"مجھے لگتا ہے کہ اس وقت تم کو اس کی سخت ضرورت ہے۔" اس نے ایک پیگ امیر جان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تم ہماری ہر ضرورت کو بخوبی سمجھ جاتی ہو اسی لیے تو ہم تمہاری قدر کرتے ہیں۔" امیر جان نے جام ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"وینا، تم نہ صرف یہ جانتی ہو کہ ہمیں کب کس چیز کی ضرورت رہتی ہے بلکہ ذہین بھی ہو۔ ہم جب بھی کسی الجھن میں ہوتے ہیں تو تم سے بات کرنا اچھا لگتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ تم سے بات کر کے ہمیں ہمیشہ سکون ملتا ہے۔"

"میں خوش نصیب ہوں جان۔ کہ تم مجھے اتنی اہمیت دیتے ہو۔" الوینہ نے کہا۔

"ویسے جو لوگ میرے اور تمہارے تعلق کے بارے میں جانتے ہیں وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ میں تمہاری دولت اور حیثیت کی وجہ سے۔"

"بے وقوف ہیں وہ لوگ، گدھے ہیں۔" امیر جان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہ یہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ جب پیار ہوتا ہے تو اونچ نیچ۔ ذات پات۔ امیری غریبی اور عمر کی تمام حدوں کو

پھلانگ جاتا ہے۔"

"میں تو محض لوگوں کی سوچ کے بارے میں کہہ رہی تھی ورنہ۔"

"لوگ جو سوچتے ہیں انہیں سوچنے دو۔ ہم ان کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔" یہ کہتے ہوئے امیر جان نے اپنا جام الوینہ کے جام سے ٹکرایا۔

"چیئرز۔"

"چیئرز۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک ایک گھونٹ لیا۔ پھر الوینہ نے نہایت رسانیت سے پوچھا۔

"بات کیا ہے جان؟"

"سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہاں یعنی امیر آباد میں رہنے والا کوئی بھی شخص باہر کی دنیا میں کیسے جا سکتا ہے؟"

الوینہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"میں سمجھ نہیں پائی کہ تم پوچھنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"پلیز وینا۔ جو پوچھ رہا ہوں۔ اس کا جواب دو۔"

"مگر پوچھ تم وہ رہے ہو جس کا جواب تم پہلے سے ہی اچھی طرح جانتے ہو۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ساری حدود اور قواعد و ضوابط خود تمہارے بنائے ہوئے ہیں۔"

"اس کے باوجود پوچھ رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی نا۔" امیر جان کے جبڑے کھچے ہوئے سے تھے۔

"سوال مت کرو۔ صرف جواب دو۔ کوئی یہاں سے باہر کیسے جا سکتا ہے؟"

"ایک ہی راستہ ہے۔" الوینہ نے کہا۔

"ہماری بوٹس۔"

"کیا اس میں چھپ کر کوئی باہر جا سکتا ہے۔"

"کسی حالت میں بھی نہیں۔"

"وجہ؟"

"بوٹس جب یہاں سے باہری دنیا کے لیے روانہ ہوتی ہیں یا باہری دنیا سے اندر آتی ہیں تو اس میں موجود ایک ایک آدمی کا نام اس لسٹ میں ہوتا ہے۔ جسے خود تم دیکھتے ہو۔ بوٹ روانہ ہی اس وقت ہوتی ہے جب تم اس فہرست پر دستخط کرتے ہو۔ اسی طرح باہری دنیا سے آیا کوئی بھی فرد تب تک امیر آباد کی زمین پر قدم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ تم اس فہرست کو او کے نہ کر دو۔"

"کیا باہر کی دنیا میں جانے والے کسی بھی شخص کو یہ پتہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟" امیر جان نے پوچھا۔

"کیا وہ کسی کو بتا سکتا ہے کہ امیر آباد کہاں ہے؟"

"نہیں۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ سمندری سفر کر کے باقی دنیا کے فلاں شہر میں پہنچا ہے۔ اسے نہ تو سمت کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ فاصلے کا۔ یہاں تک کہ اسے یہ تک پتہ نہیں ہوتا کہ اس نے یہ سفر کتنے وقت میں طے کیا ہے۔"

"مگر بوٹ چلانے والے تو اس بات کو جانتے ہیں نا۔"

"انہیں بوٹ سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔"

"امیر آباد میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو باہر کی دنیا میں آتے جاتے بھی رہتے ہیں اور ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ امیر آباد کہاں واقع ہے؟"

"بس گنتی کے چند لوگ۔ ڈاکٹر بابر نعیم۔ سرتاج صدیقی، میں اور تم۔"

"تم ثمن کا نام بھول گئیں۔"

"اب وہ ہے ہی کہاں۔"

"کیا ہم لوگ بھی ضرورت پڑنے پر بوٹ کے ذریعے نہیں جاتے؟"

"نہیں۔ ہم لوگوں کے لیے ہیلی کاپٹر ہے۔"

"اس کے علاوہ باہری دنیا میں جانے کا کوئی اور طریقہ؟"

"نہیں ہے۔"

''ہے۔'' امیر جان نے چیختے ہوئے کہا اور اپنا گھونسہ پاس رکھے صوفے کی ہتھی پر دے مارا۔ جیسے اپنا غصہ اس پر نکال رہا ہو۔ اس کی اس حرکت نے الوینہ کو بوکھلا دیا۔ امیر جان دانت پیستے ہوئے بولتا رہا۔

''کوئی اور طریقہ بھی ضرور ہے وینا۔ وہ طریقہ جس کے ذریعے کاشف گوادر تک چلا بھی گیا اور رجسٹری کروا کے واپس بھی آ گیا اور ہم میں سے کسی کو بھنک تک نہیں لگی۔ بوٹ اور ہیلی کاپٹر وہ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ تو پھر اس نے کون سا طریقہ استعمال کیا ہوگا؟''

''پلیز جان، سنبھالو خود کو۔'' الوینہ نے اپنا جام سینٹر ٹیبل پر رکھا اور اس کے نزدیک آتی ہوئی بولی۔

''میں نے تمہیں اتنا اپ سیٹ کبھی نہیں دیکھا۔''

''اس نے ہمیں برباد کر دیا ہے وینا، تباہ کر دیا ہے ہمیں۔'' وہ ایک بار پھر چیختا ہوا بولا۔

''اس مشین میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف لوہے اور کباڑ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے وہ مشین۔ اس مشین میں، جسے ہم نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھ رہے تھے۔''

''کہنا کیا چاہ رہے ہو۔ کیا اس نے کوئی کام نہیں کیا اس مشین پر؟'' الوینہ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''پھر وہ پارٹی۔''

''وہ پارٹی ہم نے مشین کی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد دی تھی۔ اس نے وہ سب کچھ بنا لیا تھا جو ہم چاہتے تھے۔ لیکن جاتے جاتے وہ سب کچھ برباد کرتا چلا گیا۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ مجھے تو تم نے آج تک یہ بھی نہیں بتایا کہ اس نے کیا بنایا تھا اور اس مشین سے کیا کام لیا جا سکتا تھا۔''

''میں خود اس مشین کو استعمال کر کے تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس حرامزادے نے وہ دن ہی نہیں آنے دیا۔ صرف یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ جو شخص چوبیس گھنٹے تمہاری ہی نہیں ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ وہ گوادر تک کیسے پہنچ گیا؟''

''میرے خیال سے تو وہ گوادر گیا ہی نہیں جان۔'' الوینہ نے بھی چیختے ہوئے کہا۔

''یہ..... اتنی بڑی بات تم کس بنیاد پر کہہ رہی ہو اس نے گوادر سے رجسٹری بھی کروائی ہے۔''

''بتاتی ہوں۔ لیکن پہلے خود کو سنبھالو۔'' الوینہ نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔



''کاشف۔''

''ہوں۔'' اس نے سگریٹ سلگائی۔

''کیا تم کو مجھ پر بھی بھروسہ نہیں ہے؟''

''مطلب؟''

''اگر میں یہ کہوں کہ میں پارسل میں موجود چیزوں کو دیکھنا چاہتی ہوں تو کیا وہ سب تم مجھے دکھا سکتے ہو؟''

کاشف نے اس سوال کا کوئی فوری جواب نہیں دیا۔ بس انیتا کی طرف دیکھتا رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ کیا جواب دے۔ پھر بغیر کچھ کہے ٹرالی پر رکھے ٹی وی کی طرف بڑھا اور اس کے اوپر رکھا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔

ٹی وی پر اس وقت کسی لاٹری کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا انیتا کی طرف آیا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے؟''

''تم بیٹھو تو سہی۔'' اس نے انیتا کی کلائی پکڑ کر اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ سگریٹ ہونٹوں میں پھنسائی اور جیب سے پارسل نکال کر اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''چاہے مجھے خود پر بھی بھروسہ نہ رہا ہو۔ مگر تم پر ہے۔''

جانے کیوں کاشف کے ہاتھ سے پارسل لیتے وقت انیتا کے ہاتھ کانپ اٹھے تھے۔

''کیا میں اس میں موجود سامان کو دیکھ سکتی ہوں؟''

"ہاں۔" کاشف مسکرایا اور پارسل واپس لے کر صوفے کے نزدیک رکھی شیشے کی سینٹر ٹیبل پر الٹ کر پارسل میں موجود تمام چیزیں میز پر پھیلا دیں۔ یہ سوچ کر انیتا کے دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی کہ جس سامان کو دیکھنے کے لیے وہ مری جا رہی تھی وہ سامان اس کے سامنے بکھرا پڑا ہے۔ اس سامان میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جسے دیکھ کر اسے حیرت ہوتی یا وہ چیز اسے کچھ سوچنے پر مجبور کرتی۔ وہ میز پر بکھری چیزوں کو نہایت غور سے دیکھ رہی تھی۔

اگر اس سامان کی فہرست بنائی جائے تو وہ کچھ اس طرح بنتی۔

۱۔ مخصوص برانڈ کے سگریٹ کا پیکٹ جس میں ابھی اٹھارہ سگریٹ باقی تھے۔
۲۔ ہیروں سے جڑا ایک طلائی لائٹر۔
۳۔ ٹرین کے ٹکٹ پر ٹی ٹی کا نشان تھا۔
۴۔ موبائل فون۔
۵۔ کاشف کی داڑھی سے ملا کاغذ کا ٹکڑا۔
۶۔ کاشف اور انیتا کے نام کے وہ دو بورڈنگ کارڈز جو انہیں ایئر ٹکٹ کے بدلے ملے تھے۔
۷۔ سانا ہوٹل کی بکنگ کی رسید۔
۸۔ گوادر کے پوسٹ آفس میں بھری ہوئی کاشف کے ہاتھ کی رجسٹری کی رسید۔
۹۔ آتشی شیشہ۔
۱۰۔ اے ٹی ایم کے کارڈ جیسا ایک کارڈ۔
۱۱۔ ایک کاغذ جس پر آٹھ عدد کا ایک نمبر لکھا ہوا تھا۔
۱۲۔ کالا چشمہ۔
۱۳۔ ایک روپے کے سکے کے برابر کا ایک سکہ۔
۱۴۔ ایک گول پلاسٹک کا بلا۔ جس پر بھاگتا ہوا گھوڑا بنا ہوا تھا' گھوڑے پر ایک سوار اور سوار کے ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا۔
۱۵۔ ایک کاغذ کے نیچے لکھا تھا۔
"چڑیا کے نیچے۔"
۱۶۔ ایک اور کاغذ پر لکھا تھا۔ "مظاہرہ" یہ لفظ سرخ۔ پیلے اور سیاہ رنگ کے تین پینوں سے لکھا ہوا تھا۔
۱۷۔ الوینہ کی ایک تصویر۔
۱۸۔ ٹھیک اسی پوز میں الوینہ کی ایک اور تصویر۔
۱۹۔ ریموٹ والے چابی کے گچھے میں لگی ایک چابی۔
۲۰۔ ایک ایسے گچھے میں لگی چابی جس پر لال رنگ سے ایک تکون گدی ہوئی تھی جس پر سفید رنگ سے خطرے کا نشان بنا ہوا تھا اور نیچے "1100 volt" لکھا تھا۔
۲۱۔ ربر کے دستانے۔
۲۲۔ دستانوں کے اندر انگریزی کے حرف Z کی شکل میں کٹا ہوا تار کا ٹکڑا۔

"تم جانتی ہو کہ اس پارسل میں ان کے علاوہ یہ انگوٹھی اور گھڑی بھی تھی۔ جو میں نے پہن رکھی ہے۔" کاشف نے اپنے ہاتھ میں پہنی گھڑی اور انگوٹھی اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات تو ہے نہیں اس میں۔" انیتا گھڑی کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"راڈو کی عام سی گھڑی ہے۔ بیس پچیس ہزار کی ہوگی۔ اس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔"

"یہی کیا۔ میرے خیال سے تو اس میں کوئی بھی خاص چیز نہیں ہے۔" کاشف بولا۔

"تم کسے خاص کہو گی۔ اس سگریٹ کو اس لائٹر کو یا اس ٹکٹ کو؟"

"واقعی سب عام سی چیزیں ہیں۔ خاص تو یہ تب محسوس ہوتی ہیں جب یہ کوئی کرشمہ دکھاتی ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کا جب تک ویسا کوئی استعمال نہ ہو جیسا کئی چیزوں کا ہو چکا ہے تب تک ہر چیز معمولی سی ہے۔ شاید اسی لیے سی آئی اے کے چیف نے ان پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ اچٹتی سی نظر ڈال کر واپس پارسل میں رکھ دی ہوں گی ساری چیزیں۔"

"بس ایک بات نے دھیان کھینچا ہوگا اس کا۔"

کاشف نے کہا۔

"یہ تمام چیزیں بھلا کسی نے یا خود میں نے ایک پارسل میں ڈال کر بینک کو کیوں بھیجی ہیں تا رچ چیئر پر بٹھا کر وہ لوگ مجھ سے اسی الجھن کا جواب مانگ رہے تھے۔"

"اس میں سے کچھ چیزیں تو استعمال میں آ چکی ہیں۔ جیسا کہ سگریٹ۔ لائٹر۔ ریل ٹکٹ۔ انگوٹھی۔ موبائل۔ ہوائی ٹکٹ۔ ڈاک خانے کی رسید اور جس ہوٹل کے سوئیٹ میں ہم بیٹھے ہیں اس کی بکنگ کی رسید۔" انیتا چیزیں گنواتی ہوئی کہتی گئی۔

"باقی چیزوں کا استعمال ہونا ابھی باقی ہے۔ جیسا کہ ڈائری میں ملا کاغذ آتشی شیشہ۔ اے ٹی ایم کارڈ جیسا کارڈ چشمہ سکہ بلا اور الوینہ کی تصویر۔ ریموٹ والے گچھے کی چابی۔ دستانے۔ زیڈ کی شکل کا تار۔ خطرے کا نشان والے گچھے کی چابی۔ تین کاغذ جن میں سے ایک پر آٹھ عدد لکھے ہیں۔ دوسرے پر چڑیا کا نشان اور تیسرے پر تین رنگوں سے مظاہرہ لکھا ہے۔"

"گھڑی کو بھول گئی ہو تم۔" کاشف نے مسکرا کر کلائی آگے کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا صرف یہ استعمال تو نہیں ہو سکتا کہ میں اس میں ٹائم دیکھا کروں۔ اب تک کام آئی چیزوں کا اگر ریکارڈ دیکھیں تو یہ طے ہے کہ وقت آنے پر اس گھڑی نے بھی کوئی کرشمہ دکھانا ہی ہے اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ صرف باقی چیزوں کو ہی کرشمہ دکھانا ہے۔ کیا پتہ ایک بار کام آ چکی چیز بھی دوبارہ کام میں آ جائے۔ بہر حال سگریٹ کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے اور یہ ہیرے کی انگوٹھی بھی دوبارہ لوٹ کر میرے پاس آ گئی ہے۔"

"تم ٹھیک تجزیہ کر رہے ہو۔"

"اسی لیے تو ہر چیز کو سنبھال کر رکھے ہوئے ہو۔"

"ہمیں باقی کی چیزوں کے استعمال کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے ہمیں اپنے آگے کے سفر کا کوئی اندازہ ہو جائے۔"

"تو سوچو۔"

"یہ ریموٹ میں لگی چابی کسی گاڑی کی لگتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کہیں کوئی ایسی گاڑی ہے جس کا لاک اس ریموٹ سے کھلے گا اور وہ ہمارے کام آئے گی۔"

"اوہ......!" انیتا بولی۔

"گاڑی صرف ایک کام آتی ہے۔"

"کس کام؟"

"سیر سپاٹا کرنے کے۔" کاشف کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔

"لگتا ہے ہم دونوں لانگ ڈرائیو پر نکلنے والے ہیں۔ مگر پہلے پتہ تو لگے کہ یہ کم بخت گاڑی ہے کہاں؟"

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔" انیتا نے اسے گھورا۔

"ساری زندگی ہی مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ اب ایسے میں مذاق ہی نہیں سوجھے گا تو اور کیا سوجھے گا۔"

"پہلی بات تو الوینہ کی ایک ہی پوز میں دو تصویریں۔ بات سمجھ سے باہر ہے۔ فوٹو اگر دو ہی ہونے تھے تو دو الگ الگ پوز میں ہونے چاہئے تھے۔ بھلا ایک ہی فوٹو کی دو کاپیاں کیوں؟"

"آتشی شیشہ اٹھاؤ اور تصویروں کو پاس پاس رکھ کے دیکھو۔"

اس سے کیا ہوگا؟"

"جو ہوگا سامنے آ جائے گا۔ دیکھو تو سہی۔ میں یہ کام کر چکا ہوں۔" کاشف کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

انیتا نے لینس اٹھایا اور تصویریں پاس پاس رکھ کر شیشے سے انہیں غور سے دیکھنے لگی۔

"کمال ہے۔" وہ بول پڑی۔

"ان میں سے ایک کی آنکھیں براؤن اور دوسری کی بالکل سیاہ ہیں۔"

"یہی فرق مجھے نظر آیا تھا۔"

"اور اس فرق کا مطلب کیا ہوا؟" انیتا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مطلب گیا تیل لینے۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"بکواس اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ اس کا مطلب میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔"

"اور کیا اس آتشی شیشے کا کام بس یہی تھا۔ ان تصویروں کا فرق پہچاننے کی حد تک۔"

"جو بات میں نہیں جانتا وہ میں تمہیں کیسے سمجھا سکتا ہوں۔"

انیتا نے اسے پھر گھورا اور پھر ایک کاغذ اٹھا کر بولی۔

"ایک پرچے پر چڑیا کے نیچے لکھا اور دوسرے پر مظاہرہ۔ وہ بھی تین رنگوں میں۔ ان الفاظ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔"

"تم مجھے تیسرے کاغذ پر لکھے اعداد کا مطلب بتا دو۔ میں تمہیں الفاظ کا مطلب بتا دوں گا۔" کاشف نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" انیتا نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ میری جان کہ خواہ مخواہ میں کیوں اپنی کھوپڑی کھپا رہی ہو۔ کچھ سمجھ میں آنے والا نہیں ہے۔ میں اپنے سارے کس بل پہلے آزما چکا ہوں۔ جب دماغ کا دیوالیہ نکلنے لگا تو سوچا دماغ کا کچومر بنانے کا کیا فائدہ۔ جب جو ہوگا دیکھا جائے گا اور ویسے بھی جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ تمہارے یا میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔" یہ کہہ کر کاشف نے ٹی وی کی آواز اتنی تیز کر دی کہ انیتا کچھ کہنا بھی چاہے تو نہ کہہ سکے۔ وہ پارسل کے سامان کے بارے میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ارے۔ پاگل ہو گئے ہو کیا۔" انیتا کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے چیخی۔

"آواز تو دھیمی کرو۔"

مگر کاشف جانتا تھا کہ آواز ہلکی ہوتے ہی انیتا پھر سے انہی چیزوں کے بارے میں پوچھنا شروع کر دے گی۔ وہ سوال جن کے جواب اس کے پاس بھی نہیں تھے۔ اس لیے اس نے انیتا کے چیخنے پر کوئی توجہ نہیں دی۔

انیتا نے پھر کچھ کہا لیکن اس کی آواز ٹی وی سے ابھرتی اینکر کی جوش میں ڈوبی تیز آواز تلے دب گئی تھی۔

"اور اب نمبر ہے ملک کی سب سے بڑی لاٹری کے جیک پاٹ کا۔ جیک پاٹ یعنی پورے پچاس کروڑ روپے۔ ان پچاس کروڑ روپے کا حقدار ہوگا وہ خوش نصیب شخص جس کے ٹکٹ کا نمبر کروڑوں ٹکٹوں کے نمبروں میں سے ہمارے کمپیوٹر نے رینڈملی سلیکٹ کیا ہے۔"

اینکر سانس لینے کے لیے رکی اور دوبارہ اسی جوش و خروش سے بولی۔

"دل تھام کے بیٹھیے اور دیکھیے وہ نمبر۔ جس کے ٹکٹ کا مالک چند لمحوں میں پچاس کروڑ روپے کا مالک بن جائے گا۔"

اب اسکرین پر لڑکی کی جگہ کمپیوٹر نظر آنے لگا۔ پہلا نمبر ابھرا۔

"پانچ۔" لڑکی کی آواز ابھری۔

"ایک۔" دوسری بار آواز ابھری۔

اسی طرح چار نمبر اسکرین پر آ چکے تھے اور لڑکی وہ نمبر دوہراتی بھی جا رہی تھی۔ تب اچانک کاشف سینٹر ٹیبل پر پڑے کاغذ پر جھپٹا اور چیخ کر بولا۔

"یہ نمبر تو اس کاغذ پر لکھا ہے۔"

یہ سنتے ہی انیتا دنگ رہ گئی۔

اس وقت تک ٹی وی پر پانچواں نمبر بھی بتایا جا چکا تھا۔

"یہی ہے۔ یہی ہے۔" کاشف دیوانوں کی طرح چلایا۔

اپنے کاغذ پر لکھا چھٹا نمبر اس نے لڑکی کی آواز کے ساتھ اونچی آواز میں پڑھا اور ساتواں نمبر اسکرین پر ابھرنے سے پہلے ہی چیخا اور اسکرین پر وہی نمبر ابھرا اور پھر اس نے آٹھواں نمبر بھی چیخ کر پکارا جبکہ وہ نمبر

اسکرین پر کافی دیر بعد ابھرا۔
ٹی وی پر نمبر بتانے کے بعد جیتنے والے خوش نصیب کو مبارک باد دی جا رہی تھی اور اس نمبر کے ٹکٹ ہولڈر کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔
اور ہوٹل کے سوئیٹ میں کاشف کاغذ کو ہوا میں لہراتے ہوئے ناچتا پھر رہا تھا۔
''میرے پاس ہے۔ میرے پاس ہے یہ نمبر۔ میں پچاس کروڑ کا مالک بن گیا ہوں۔''
اور انیتا' اس کے تو جیسے اوسان ہی ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس سے تو کچھ کہتے بھی نہیں بن پڑ رہا تھا۔
''تم نے سنا' تم نے سنا انیتا۔'' کاشف پاگلوں کی طرح چیخے جا رہا تھا۔
''یہ نمبر میرے پاس ہے۔ یہ جیک پاٹ میں نے جیتا ہے۔''
اچانک انیتا اٹھی اور اس نے تیزی سے کاشف کے ہاتھ سے کاغذ جھپٹ لیا اور ایک ایک نمبر کو اسکرین پر لکھے نمبروں کے ساتھ ملانے لگی۔
''5146341''۔ نمبر مکمل ہونے کے بعد جیسے اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔
''دیکھا...... دیکھا میرے پارسل کا کمال۔ پچاس کروڑ کے جیک پاٹ کا نمبر بھی ہے اس میں۔''
''مگر کاشف۔ یہ لاٹری کا ٹکٹ نہیں ہے۔'' انیتا بولی۔
''صرف ایک سادے کاغذ پر یہ نمبر لکھا ہوا ہے اور ٹکٹ کے بغیر تم جیک پاٹ کے حقدار نہیں ہو سکتے۔''
یہ سنتے ہی کاشف ناچتے ناچتے رک گیا۔ کافی دیر تک تو انیتا کو یوں دیکھا رہا جیسے دماغ کام ہی نہ کر رہا ہو۔
اور پھر سینٹر ٹیبل کی طرف لپکا۔
''ایسا نہیں ہو سکتا۔ ٹکٹ بھی یہیں کہیں ہوگا۔''
لیکن ٹکٹ کہیں نہیں ملا۔ اس کا دماغ ایک بار پھر جام ہو کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ جب اس جیک پاٹ کا نمبر اس کے پاس ہے تو ٹکٹ کیوں نہیں ہے۔



الوینہ نے امیر جان کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے اسے کنگ سائز بیڈ پر بٹھا دیا۔ اس کی حالت ایسے بچے کی سی ہو رہی تھی جسے ہمدردی کی ضرورت ہو۔
''وینا۔ تم نے کس بنیاد پر کہی یہ بات کہ وہ گیا ہی نہیں۔'' اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔
''وہی بنیاد کیا کم ہے جو تم نے میرے منہ سے اگلوائی ہے۔ اس بات کے بارے میں سوچنا تک بے وقوفی ہے کہ وہ خود گوادر جا کر رجسٹری کر کے آیا ہوگا۔'' الوینہ نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔
''اور تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ اس پر نظر رکھنے کی ذمہ داری تم نے مجھے سونپی تھی۔ اس لیے اس کی رہائش گاہ بھی میری رہائش گاہ کے قریب ہی رکھی تھی اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اپنی لیبارٹری کے علاوہ وہ جتنا وقت بھی باہر رہتا تھا میری نظروں کے سامنے رہتا تھا اور وہ کبھی اتنے وقت کے لیے میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوا کہ گوادر جا کر واپس آ سکے۔ میں ہر جگہ سائے کی طرح اس کے پیچھے لگی رہتی تھی۔''
''اور لیبارٹری کے اندر اس ٹی وی کے ذریعے ہماری نظروں میں رہتا تھا جس پر اس وقت سرتاج کو دیکھ رہے ہیں۔'' امیر جان بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔
''اور تم بھی جانتی ہو کہ یہ اسکرین ہر وقت آن رہتی ہے۔''
''تو پھر تم اس بات پر کیسے یقین کر سکتے ہو کہ۔''
''اس کا ٹھوس ثبوت ہے وینا' ڈاک خانے کی وہ رسید بہت ہی ٹھوس ثبوت ہے۔ جسے رجسٹری کرتے وقت خود اس نے اپنے ہاتھ سے بھری تھی۔''
''سچ پوچھو جان تو یہ ذرا بھی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔''
''کیا مطلب؟'' امیر جان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''مجھے نہیں لگتا کہ رجسٹری کی تو بات ہی دور ہے۔ تم

کبھی کسی کام سے پوسٹ آفس بھی گئے ہو گے۔" الوینہ بولی۔

"اس لیے نہیں جانتے کہ ڈاک خانے میں کام کیسے ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ رجسٹری کے لیے ایک سلپ بھری جاتی ہے لیکن یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ اس سلپ کو وہاں کھڑا شخص ہی بھرے جو رجسٹری کروا رہا ہے۔ تمہیں اگر رجسٹری کروانی ہے تو اپنے ہاتھ کی بھری سلپ مجھے دے کر بھیج سکتے ہو اور میں رجسٹری کروا کے آؤں گی۔ ڈاک خانے والوں کو اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ سامنے کھڑا شخص وہی ہے جس نے سلپ بھری ہے یا کوئی اور ہے۔"

الوینہ کی بات سن کر امیر جان کے چہرے پر حیرت کے بادل مزید گہرے ہو گئے تھے۔

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ کاشف نے اپنے ہاتھ سے سلپ بھر کر کسی اور کو رجسٹری کے لیے بھیجا ہوگا؟"

"اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوا ہے۔" الوینہ نے پھر وثوق کے ساتھ کہا۔

"مجھے تو حیرت ہے کہ سب اس کے ہاتھ کی بھری سلپ کو اتنا ہوا کیوں بنا رہے ہیں۔ کسی اور کے دماغ میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اس نے یہ کام کسی اور سے کروایا ہوگا۔ چاہے اس پر لاکھ کڑی نظر رکھی جا رہی تھی۔ مگر اس بات کے لیے اس کے پاس کئی مواقع موجود ہوتے تھے کہ وہ چپکے سے سلپ کسی اور کے حوالے کر دے۔"

"لیکن پارسل کی جتنی بھی چیزیں ابھی تک سامنے آئی ہیں۔ ان میں کئی ایسی ہیں جنہیں وہ یہاں رہتے ہوئے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے کہ ریل اور ہوائی ٹکٹ۔"

"ہہ..... ہوائی ٹکٹ؟"

"ہاں۔" امیر جان بولا۔

"معراج علی کی آخری اطلاع کے مطابق اس کے پارسل میں سکھر سے لاہور تک کے دو ہوائی ٹکٹ تھے۔ ایک اس کا اور دوسرا اس کی بچپن کی دوست اور عمران انصاری کی بیوی انیتا کا۔ وہ جو اپنے شوہر سے بغاوت کر کے کاشف کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ہمیں یہ بھی پتہ لگا ہے کہ وہ لاہور کے سانا ہوٹل پہنچ چکے ہیں۔ ہمت خان اپنی پوری ٹیم کے ساتھ اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔"

"کیا بات کر رہے ہو جان؟" الوینہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔

"انیتا کے نام کا ٹکٹ اس کے پارسل میں کیسے ہو سکتا تھا۔ کیا اسے پہلے سے معلوم تھا کہ۔"

"اس بات کو چھوڑ دینا۔" امیر جان نے کہا۔

"سوچنے والی بات یہ ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعے یہاں سے ٹکٹ بک کروائے جا سکتے تھے۔ لیکن یہاں ٹکٹس اس کے ہاتھ میں نہیں آ سکتے تھے۔ پھر پارسل میں بند کر کے کیسے بھیج دیے کسی کو؟"

"ہو سکتا ہے کہ جس سے اس نے یہاں کام لیا ہو۔ اسے پارسل مہر بند کر کے نہ دیا ہو صرف وہ چیزیں ڈالی ہوں جو یہاں مہیا ہو سکتی تھیں اور باقی چیزوں کے لیے اسی سے کہا ہو کہ فلاں فلاں جگہ سے کلیکٹ کر کے پارسل میں ڈال کر مہر بند کر کے رجسٹری کر دینا۔"

"مگر کیسے اس نے یہ کام کیسے کروایا ہوگا؟" امیر جان کی الجھن ہی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

"کسی سے بھی کروا سکتا ہے۔ بہر حال۔ لوگ یہاں سے جاتے ہی رہتے ہیں اور یہ بات اس کے علم میں بھی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارے درمیان کوئی غدار موجود ہے۔" امیر جان نے غراتے ہوئے کہا۔

"اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے جان کہ۔" الوینہ بولی۔ "کاشف کو کیسے پتہ تھا کہ اسے فلاں تاریخ کو فلاں ٹرین سے یا فلاں پلین سے سفر کرنا پڑے گا اور ان چار سالوں کی یادداشت نا ہوتے ہوئے بھی اس نے ٹھیک وقت پر پہنچ کر وہاں ٹرین اور جہاز کیسے پکڑ لیا؟"

"ایسے سوالوں کے جواب ہمارے پاس ہیں۔"

"تمہارے پاس؟" الوینہ کے منہ سے حیرت بھری چیخ نکل گئی۔ "تمہارے پاس ایسے سوالوں کے جواب ہیں جن کے جواب کسی کے پاس نہیں ہیں؟"

"ہاں۔ ہم جانتے ہیں۔" امیر جان نے صرف اتنا ہی کہا۔

"کیا جانتے ہو مجھے بتاؤ جان۔" الوینہ بولی۔ "مجھے بتاؤ کہ یہ کرشماتی کام کیسے ہو رہے ہیں؟"



دھڑ کی زور دار آواز کے ساتھ دروازہ بند ہوا اور کاشف چونک گیا اور تیزی سے گھومتے ہوئے وہ ریوالور نکال چکا تھا اور اس کا رخ اس شخص کی طرف تھا جو باتھ روم کے دروازے کے نزدیک کھڑا تھا۔ اسی شخص نے اندر سے دروازہ بند کیا تھا۔

"کون ہو تم؟" کاشف کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

جواب میں اس شخص کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے چیک دار شرٹ اور بلیو جینز پہنی ہوئی تھی۔ اور گلے میں ایک بڑا سا تعویز بھی کالی ڈوری سے لٹکا نظر آ رہا تھا۔

کاشف کو حیرت اس بات پر تھی کہ اس کے ہاتھ میں دبے ریوالور کو اپنی طرف تنا دیکھ کر بھی وہ بال برابر خوفزدہ نہیں تھا۔ وہ یوں مسکرا رہا تھا جیسے کاشف کے ہاتھ میں حقیقی ریوالور کی بجائے بچوں کا کھلونا ہو۔

"تمہیں شاید یہ ریوالور نظر نہیں آ رہا ہے۔" کاشف نے پھر غرا کر کہا۔

"اگر تم نے فوراً اپنے بارے میں نہیں بتایا تو گولی مارتے دیر نہیں کروں گا۔"

"خدا جانے۔" وہ شخص اسی طرح مسکراتے ہوئے بولا۔

"میرا نام خدا جانے ہے صاحب۔"

"یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"یہ کون سا طریقہ ہے باتیں کرنے کا۔" کاشف نے اپنے لہجے میں مزید تلخی بھرتے ہوئے کہا۔

"میں کافی دیر سے نوٹ کر رہا ہوں۔ ڈائننگ ہال میں بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ تم مسلسل مجھے ہی دیکھ رہے ہو۔"

"تم باتھ روم کی طرف آئے تو پیچھے پیچھے چلا آیا اور باتھ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔"

"مطلب کیا ہے اس حرکت کا؟" کاشف بولا۔

"آپ تو ایک ایک وہی لفظ کہہ رہے ہو صاحب جو اس آدمی نے کہا تھا کہ آپ کہو گے۔"

"آ۔۔۔ آدمی نے کہا تھا؟" کاشف نے حیرت سے پوچھا۔

"کون سے آدمی نے کہا تھا تم سے؟"

اس آدمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہوتی گئی۔

"یہ 19 اگست کی بات ہے صاحب۔ وہ مجھے سیکن سانا ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ملا تھا۔"

"19 اگست کو تمہیں یہاں کوئی آدمی ملا تھا" کاشف کی کھوپڑی ناچ گئی۔

"مگر اس سے میرا کیا تعلق؟"

"آپ ہی کے بارے میں بات کی تھی اس نے۔"

"میرے بارے میں؟ کیا کہا تھا؟"

"اس نے مجھے آپ کا فوٹو دکھایا تھا اور کہا تھا کہ 26 اگست کی رات کو ٹھیک نو بجے آپ مجھے ڈائننگ ہال میں ایک لڑکی کے ساتھ نظر آئیں گے۔ میں کچھ دوری پر جا کر بیٹھ جاؤں اور لڑکی کے سامنے کوئی بات نہ کروں۔ کچھ دیر بعد آپ اٹھ کر باتھ روم میں جائیں گے۔ میں آپ کے پیچھے پیچھے باتھ روم میں چلا جاؤں اور یہ دروازہ زور سے بند کر دوں۔ یہ بھی کہا تھا کہ دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر آپ تیزی سے میری طرف گھومیں گے اور ساتھ ہی جیب سے ریوالور بھی نکال لیں گے۔ مگر میں ڈروں نہیں۔ آپ مجھے گولی نہیں ماریں گے۔ صرف دھمکائیں

گے۔ وہ جو پوچھے گا آپ نے پوچھا ہے اور جواب میں میں وہی سب کہوں جو اس وقت کہہ رہا ہوں۔"

خدا جانے کی باتیں ہی ایسی تھیں کہ انہیں سن کر کاشف کو اپنا دماغ سن ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ جو کچھ آج یہاں ہوا ہے وہ اس آدمی نے تمہیں 19 اگست کو ہی بتا دیا تھا کہ ایسے ایسے ہوگا۔"

"اس وقت میں نے بھی حیرت سے یہی کہا تھا کہ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔" خدا جانے نے کہا کہ آپ ٹھیک نو بجے کسی لڑکی کے ساتھ ڈائننگ ہال میں نظر آئیں اور ٹھیک اسی وقت پر باتھ روم میں بھی جائیں جو وہ بتا رہا ہے تو اس کے جواب میں اس نے یہی کہا تھا کہ 26 اگست کو میرے منہ سے یہ سب سننے کے بعد آپ بھی یہی کہیں گے کہ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے اور جواب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ آپ کو اپنی پچھلی چار سال کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔"

کاشف کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔

"اور کیا کہا تھا اس نے؟"

"یہی کہ آپ کو آپ کے ساتھ والی لڑکی کا نام بتا دوں۔"

"کیا مطلب؟"

"ان کا نام انیتا ہے۔"

"تم کو اس کا نام کیسے پتہ چلا؟" کاشف کو اب اپنا دماغ دور کہیں ہواؤں میں سیر و تفریح کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"ابھی بتایا نا صاحب۔ 19 اگست کو ملے آدمی نے ہی کہا تھا کہ آج مجھے آپ کو آپ کے ساتھ والی لڑکی کا نام بتانا ہے اور یہ بھی بتانا ہے کہ وہ سی آئی اے حیدرآباد برانچ کے چیف عمران انصاری کی بیوی ہے۔"

"یہ.....! یہ بھی پتہ ہے تمہیں۔" کاشف ہکلا سا گیا۔

"مجھے کچھ نہیں پتہ تھا صاحب۔ سب اسی آدمی نے بتایا تھا۔"

"اس کے علاوہ اور کچھ بھی بتایا تھا اس نے؟"

"ہاں۔ یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنی جیب سے نکال کر یہ آپ کو دکھاؤں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پلاسٹک کا ایک بلا نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

کاشف وہ بلا دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ بالکل ویسا ہی بلا تھا جیسا اس کے پارسل میں بھی تھا۔ بلے پر بھاگتا ہوا گھوڑا بنا ہوا تھا۔ گھوڑے پر سوار شخص کے ہاتھ میں جھنڈا۔

کاشف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ اس آدمی کے ہاتھ میں لہراتے ہوئے بلے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے ایفل ٹاور کو اپنے سامنے ٹھمکے لگاتا ہوا دیکھ رہا ہو۔

"یہی بالکل یہی کہا تھا اس آدمی نے۔" وہ شخص بولا۔

"یہی کہا تھا کہ یہ بلا دیکھ کر آپ کی حالت ویسی ہی ہو جائے گی جیسی کہ دیکھ رہا ہوں۔"

"اوہ.....اور کیا کہا تھا اس نے؟" کاشف حیرت سے مرا جا رہا تھا۔

"کہا تھا کہ تھوڑی دیر میں آپ نارمل ہو جائیں گے اور اپنا ریوالور بھی جیب میں رکھ لیں گے اور میری باتوں پر یقین کر لیں گے۔"

کاشف نے سوچا کہ اس شخص کے پاس بھی بالکل ویسا ہی بلا ہے جیسا میرے پاس ہے تو شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ یاد نہیں ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ یہ بلا میرے کسی مددگار نے پہچان کے طور پر اسے دیا ہوگا۔

کاشف پھر حیران رہ گیا۔ وہ یہ سوچ کر اور بھی زیادہ

حیران ہوگیا کہ اس لیے وہ ٹھیک وہی سوچ رہا تھا جو خدا جانے کہہ رہا تھا۔
اس نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔
''اس نے یہ بلا دیتے ہوئے کیا کہا تھا؟''
''اس نے کہا تھا کہ جب آپ یہ سوال پوچھیں تو میں کہوں کہ روم نمبر 712 میں آ کر مجھ سے ملیں۔''
''کیوں؟''
''وہاں مجھے آپ کو ایک لیٹر دینا ہے جو آپ پر کوئی بڑا راز افشا کرے گا۔ ایسا روم نمبر 712 میں اس لیے کرنا ہے کہ کیونکہ یہاں ہماری باتیں پوری نہیں ہو پائیں گی۔ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کسی نے اس روم کا دروازہ کھٹکھٹایا اور عین اسی وقت بیچ میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹا کر اس کی بات پوری نہ ہونے دی۔ دونوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ اب حیرت کے آثار صرف کاشف کے چہرے پر ہی نہیں تھے بلکہ خدا جانے بھی حیرت کا مارا نظر آنے لگا تھا۔
''و...... وہی ہوا'' اس نے بوکھلا کر کہا۔
''ایک بار پھر وہی ہوا ہے صاحب جو اس آدمی نے 19 اگست کو ہی کہہ دیا تھا۔ یا خدایا۔ یہ سب کیسے ہو رہا ہے' میں اپنی بات پوری بھی نہیں کر سکا کہ دروازہ کھٹکھٹانے والے نے کھٹکھٹا بھی دیا اور اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ جو اس وقت دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے' ابھی دروازے کے اس طرف ہے' کچھ دیر بعد ہم اسے دیکھیں گے وہ مجھے ڈانٹے گا اور صاحب' وہ سفید پینٹ اور لال شرٹ پہنے ہوئے ہوگا۔''
''کیا بک رہے ہو تم۔'' کاشف پر مانو کسی نے حیرت کے ٹنوں وزنی پہاڑ رکھ دیے ہوں۔
''تم بھلا ابھی سے اس آدمی کے کپڑوں کے بارے میں کیسے بتا سکتے ہو جو دروازے کے باہر ہے؟''
''ٹھیک یہی' یہی کہا تھا اس نے کہ آپ کہیں گے اور۔''
دروازے پر دوبارہ دستک ہونے لگی۔

''اور یہ بھی کہ ٹھیک تبھی دوبارہ دستک ہوگی۔'' خدا جانے نے جلدی جلدی اپنی بات پوری کی۔
''یہ بھی کہا تھا اس نے کہ میں آپ سے کہوں کہ روم نمبر 712 میں آپ کو اکیلے آنا ہے۔ اس کے بارے میں یا میرے ملنے کے بارے میں انیتا کو کچھ نہیں بتانا ہے۔''
جواب میں کچھ کہنے کے لیے کاشف نے منہ کھولا ضرور تھا لیکن کہنے کا موقع نہیں ملا اس سے پہلے ہی خدا جانے اپنی بات پوری کر کے جھپٹ کر دروازہ کھول چکا تھا۔
''کیا حرکت ہے یہ؟'' کسی کے دہاڑنے کی آواز آئی۔
''کیسے نان سینس آدمی ہو تم۔ تم نے دروازہ اندر سے کیوں بند کر لیا تھا؟''
بغیر کچھ کہے خدا جانے اس آدمی کے برابر سے گزر کر تیر کی تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ باہر والا آدمی بھناتا ہوا اندر داخل ہوا۔ پہلے سے ہی سنسناتے کاشف کے دماغ پر جیسے کسی نے زور کا ہتھوڑا دے مارا۔
وہ دیکھتا ہی رہ گیا اس آدمی نے سفید پینٹ اور لال شرٹ پہن رکھی تھی۔



باتھ روم سے نکل کر کاشف ڈائننگ ہال کی طرف آیا جہاں انیتا بیٹھی تھی۔ کاشف کو اپنے دماغ میں عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ یقین کی حدوں سے بہت آگے کی بات تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہال پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی کہ شاید خدا جانے نظر آ جائے مگر وہ ہال میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگرچہ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ باتھ روم جانے سے پہلے چھوڑ کر گیا تھا' ڈم لائٹ' دھیما میوزک' مگر جانے کیوں اسے کچھ بدلاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ابھی بھی ہال کا طواف کر رہی تھیں۔
''کیا بات ہے کاشی؟''

''آں۔'' وہ ایسے چونکا جیسے بچھو لڑ گیا ہو۔

''ارے۔'' اسے چونکتا دیکھ کر انیتا بولی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں۔ میری آواز سن کر ایسے کیوں چونکے ہو؟''

''کک...... کچھ نہیں۔'' وہ انیتا سے نظریں چراتا ہوا بولا۔

انیتا نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''کچھ تو ہے۔''

اپنی حالت پر قابو پانے کے لیے کاشف نے جیب سے سگریٹ لائٹر نکال کر خود کو اسے سلگانے میں مصروف رکھنے کی کوشش کی مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے چہرے پر اڑی ہوئی ہوائیاں اتنی گھنی تھیں کہ انیتا تو انیتا کسی بچے سے بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھیں۔

''باتھ روم میں کچھ ہوا تھا کیا؟'' وہ کاشف کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

''بب...... باتھ روم میں۔'' وہ مزید بوکھلا گیا۔

''نہیں تو' بھلا باتھ روم میں کیا ہو سکتا ہے۔ سوائے ایک کام کے۔'' اس نے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔''

''پپ...... پاگل ہو تم' بھلا تم سے کیا چھپاؤں گا میں' تمہیں تو اپنا پارسل تک دکھا دیا میں نے۔''

''کچھ تو ہے۔ میں تمہیں آج سے نہیں بچپن سے جانتی ہوں۔ جب تم باتھ روم میں گئے تھے تو بالکل نارمل تھے۔ مگر واپس آئے ہو تو ہوش گنوا کر۔ آخر ہوا کیا ہے؟''

''کہا نا۔'' کاشف جھنجلا گیا۔

''کچھ نہیں ہوا۔''

''اوہ۔ تو اب تم مجھے ڈانٹنے بھی لگے ہو۔'' انیتا حیران ہو کر بولی۔

کاشف کو لگا کہ وہ جھنجلاہٹ میں کچھ زیادہ ہی تیز بول گیا ہے۔ اتنا تیز کہ آس پاس کی نشستوں پر بیٹھے لوگ مڑ کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔

''سس...... سوری' انیتا! اصل میں تم بلاوجہ ایک ہی بات کے پیچھے پڑ رہی ہو کہ باتھ روم باتھ روم باتھ روم۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا باتھ روم میں۔''

''مجھے پاگل سمجھتے ہو کیا۔'' اس بار انیتا نے قدرے غصے سے کہا لیکن لہجہ دھیما ہی رکھا۔

''وہ چیک دار شرٹ والا کون تھا؟''

''چچ چیک دار شرٹ والا۔'' اب تو بوکھلانا کاشف کا حق بنتا تھا۔

''کون شرٹ والا؟ کس کی بات کر رہی ہو تم؟''

''یہ جو تم کر رہے ہو نا۔ اسے اوورایکٹنگ کہتے ہیں۔'' انیتا ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے بولی۔

''چیک دار شرٹ والے کو نہیں جانتے تم' اسے جو تمہارے پیچھے پیچھے باتھ روم میں گیا تھا اور تم سے پہلے واپس آ گیا تھا۔''

''مم...... میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔'' کاشف سے کوئی جواب بنے نہیں بن پڑ رہا تھا۔

''اب میں سمجھ گئی۔'' انیتا بولی۔

''ضرور اسی نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ وہ باتھ روم سے اتنی تیزی سے نکلا تھا جیسے ہزاروں بھوت اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ وہ سیدھا لفٹ ایریا کی طرف بھاگا تھا۔''

''لفٹ کی طرف۔'' کاشف نے لفٹ ایریا کی طرف گردن گھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' انیتا نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔

''اس لیے بتا رہی ہوں کہ تمہاری نظریں اسی کو تو ڈھونڈ رہی ہیں۔ ہیں نا؟''

''کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ مجھے کیا ضرورت ہے کسی کو ڈھونڈنے کی۔'' کاشف خود کو بوکھلاہٹ سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

''اور جب تم دونوں باتھ روم کے اندر تھے تو دروازہ اندر سے بند کیوں تھا؟''

"دد...... دروازہ بند تھا۔" اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔

"ہاں۔ جیسے تم کو یہ بھی پتہ نہیں تھا۔ مگر مجھے پتہ ہے۔ اس لیے پتہ ہے کہ مجھے پل پل تمہاری فکر رہتی ہے۔ تمہارے لیے مجھے ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ اس ڈر کے مارے لگاتار باتھ روم کی طرف ہی دیکھتی رہی کہ کہیں کوئی تمہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا دے۔ لال شرٹ والے کو اندر جانے کے لیے دروازہ کھٹکھٹانا پڑا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ اندر سے بند تھا۔ جبکہ عام طور پر باتھ روم کا بیرونی دروازہ کوئی بند نہیں کرتا۔ اس نے چیک دار شرٹ والے کو ڈانٹا بھی تھا۔"

کاشف چپ رہنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا اور نہ ہی وہ انیتا سے نظریں ملا پا رہا تھا۔ اس لیے خود کو سگریٹ کے کش لگانے میں مصروف رکھے ہوئے تھا۔

"کاشف! تم کچھ بھی کہو۔ مگر میں سمجھ گئی ہوں کہ باتھ روم میں تمہارے اور اس چیک دار شرٹ والے کے بیچ میں کوئی کھچڑی پکی ہے۔ دکھ ہوا مجھے یہ محسوس کر کے دکھ ہوا ہے کہ تم مجھ سے اپنی اس دوست سے کچھ چھپا رہے ہو جو تمہاری خاطر اپنے شوہر سے بغاوت کر کے آئی ہے۔" انیتا نے کہا۔

کاشف کی زبان تالو سے چپکی ہوئی تھی۔

"پتہ نہیں تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟" وہ دوبارہ بولی۔

"کچھ دیر پہلے تک تو مجھ پر پورا یقین کر رہے تھے۔ باتھ روم میں اس نے پتہ نہیں کون سی گھٹی پلا دی ہے۔ مگر تم یہ اچھا نہیں کر رہے ہو دوست۔ تم کسی مصیبت میں پھنس گئے تو مجھ سے زیادہ دکھ کسی کو نہیں ہوگا۔"

کاشف اب بھی خاموش رہا۔

"کسی انجان آدمی کے بہکاوے میں آ کر جو تم مجھ سے یوں کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو، ایسا کر کے تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔"

کاشف کا دماغ جھنجلا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کی بات مانے جس کا کہنا تھا کہ اسے وہ سب کہنے کے لیے 19 اگست کو کسی نے پیغام دیا تھا یا پھر اپنے بچپن کی دوست کی بات مانے۔ اس دوست کی جو کسی حالت میں اس کا برا نہیں چاہ سکتی تھی۔ مگر خدا جانے نے کہا تھا کہ انیتا سے سب کچھ چھپانا ہے۔ کچھ نہیں بتانا اسے۔

کاشف ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک ویٹر شاندار ٹرے میں جوس کے دو گلاس لے کر آ گیا۔ کاشف کو یاد آ گیا کہ باتھ روم جانے سے پہلے اس نے اپنے اور انیتا کے لیے جوس کا آرڈر کیا تھا۔ وہ جوس کے بعد ڈنر کا آرڈر بھی دے گیا تھا مگر اب' اب اسے خدا جانے سے ملنے کی جلدی تھی۔

وہ بے چین ہو رہا تھا وہ سب جاننے کے لیے جو خدا جانے اس سے کہنے والا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اسے کوئی لیٹر دے گا۔ ایسا لیٹر جو اس کی الجھنوں بھری زندگی کا کوئی راز کھولنے والا ہے اور اس وقت کاشف خود بھی یہی تو چاہتا تھا کہ اس کی پچھلی زندگی پر سے کچھ پردہ اٹھے۔

وہ اچانک کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آؤ انیتا۔"

"ارے۔" انیتا چونکی۔

"جوس اور ڈنر نہیں لینا کیا؟"

"نہیں۔ یہ سب ہم روم میں منگوا لیں گے۔"

"اور اس کے باوجود کہہ رہے ہو کہ باتھ روم میں کچھ نہیں ہوا۔ تم بالکل نارمل ہو۔" انیتا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس وقت روم میں میں نے خود کہا تھا کہ ہمارا یوں ہال میں بیٹھ کر ڈنر کرنا اچھا نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے عمران اور اس کی ٹیم کو ہمارے لاہور آنے کی خبر مل گئی ہو اور وہ ہمیں تلاش کر رہے ہوں۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ امیر جان کے گروپ کے کسی آدمی کی نگاہ ہم پر پڑ جائے۔ وہ پہلے بھی ایک جان لیوا حملہ کر چکے ہیں۔ مگر تم نہیں مانے تھے۔ تمہیں اس وقت تو کمرے میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی اور اب۔"

"بحث مت کرو انیتا۔ چلو۔" اور وہ انیتا کا جواب

سنے بغیر ہی تیزی سے ڈائننگ ہال سے باہر کی طرف چل پڑا۔ مجبوراً انیتا کو بھی اس کے پیچھے لپکنا پڑا۔



امیر جان چپ تھا۔ اس نے الوینہ کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ انتظار طویل ہوتا گیا تو الوینہ نے دوبارہ پہلے سے زیادہ زور دے کر پوچھا۔

''بتاؤ نا جان۔ کاشف کو پہلے سے کیسے پتہ تھا کہ وہ فلاں دن کی فلاں ٹرین میں سفر کرے گا؟''

''وہ سب بعد میں۔'' امیر جان نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

''ہمارے لیے بڑے سوال یہ ہیں کہ اس نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں اور کیسے کیا؟''

اس سوال کا جواب تو الوینہ کے پاس بھی نہیں تھا۔

''ویٹا۔ صدیقی کا کہنا ہے کہ اس میں یہ تبدیلی ثمن کی موت کے بعد آئی تھی۔'' امیر جان ٹوٹی کڑیاں جوڑتا ہوا بولا۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے' سوچ کر بتاؤ کہ کیا یہاں رہتے رہتے کاشف اور ثمن اتنے نزدیک آ گئے تھے کہ ثمن کی موت نے اس کے دماغ کو بدل دیا ہو۔ وہ ہمارے خلاف اس قدر بھڑک گیا ہو اور وہ کرنے کی ٹھان لی ہو جو اس نے کیا؟''

''جب مجھے یہی نہیں معلوم کہ ثمن کی موت کیسے ہوئی تو میں اس بارے میں کیسے کچھ کہہ سکتی ہوں؟''

''اسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے شوٹ کیا تھا۔'' امیر جان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تت...... تم نے۔'' الوینہ چونک گئی۔

''کیوں؟''

''اس میں اتنا چونکنے والی کون سی بات ہے؟''

''کیا یہ چونکنے والی بات نہیں ہے جان' عام طور پر تم ایسی حرکت نہیں کرتے۔ کم از کم میرے علم میں تو یہ بات تو ہے کہ تم نے کبھی اپنے کسی ملازم کو اپنے ہاتھوں سے نہیں مارا۔ پھر ثمن کے ساتھ' اس ثمن کے ساتھ ایسا کیوں کیا جسے تم بے حد پسند کرتے تھے۔ جو کسی بھی قسم کا وائرس بنانے کی مہارت کی وجہ سے تمہیں بہت عزیز تھی۔''

''اس کے بارے میں ہمیں کوئی ایسی بات پتہ لگی تھی جس کے بعد وہ اور صرف وہ ہی کیا جا سکتا تھا جو ہم نے کیا۔''

''ایسی کیا بات پتہ لگ گئی تھی؟''

''اوپر سے بھلے ہی وہ ہماری وفادار رہی ہو' لیکن اندر سے ایسی نہیں تھی۔ وہ مستقبل میں ہمیں قتل کرنے والی تھی۔''

''کک...... کیا بات کر رہے ہو؟''

''یہ سچ ہے۔''

''مگر کیسے۔'' الوینہ نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہ بات تمہیں کیسے پتہ لگی کہ وہ تمہیں قتل کرنے والی ہے؟''

''اس بات کو چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا ثمن اور کاشف اتنے قریب آ گئے تھے کیا؟''

''نہیں۔'' الوینہ نے کہا۔

''کم از کم میرے علم میں تو نہیں ہے کہ ان کے درمیان ایسا کوئی تعلق بنا تھا' مگر۔''

''مگر کیا؟''

''سر تاج کی کہی یہ بات سچ لگتی ہے کہ اگر کاشف میں کوئی تبدیلی آئی تھی تو وہ ثمن کی موت کے بعد ہی آئی تھی۔''

''تم یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہی ہو؟''

''میں نے پہلے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن اب یہ بات سنی ہے تو ذہن میں آ رہا ہے کہ اس نے اپنے بال ثمن کی موت کے بعد ہی بڑھانے شروع کیے تھے۔ اس سے پہلے وہ کلین شیو رہتا تھا اور بالوں کی کٹنگ بھی کرواتا رہتا تھا۔''

''یقیناً۔'' امیر جان بولا۔

''وہیں سے اس کے دماغ میں یہ خرابی آئی تھی اور اس نے مشین میں ایرر ڈال دیا۔ آگے چل کے اس نے

بینک میں دو پارسل بھیجا۔ جو ہمیں اور سرتاج کے علاوہ سب کو کر شانی لگ رہا ہے۔ اب تو صاف ہے۔ بالکل صاف ہے کہ وہ ہمارے خلاف بیٹی ہوئی کسی اسکیم پر کام کر رہا ہے۔ مگر اس کے بعد جتنے بھی دن وہ یہاں رہا۔ کم بخت نے ذرا بھی شک نہیں ہونے دیا کہ اس کی سوچ میں تبدیلی آ چکی ہے۔ کیا شاندار ایکٹنگ کر رہا تھا وہ۔ ہمیں بھی دھوکا دے گیا۔"

"مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں کیسے پہنچ گئی۔ خود اس نے تو یہ کام کیا نہیں ہوگا۔"

"واقعی یہ سوچنے والی بات ہے۔" امیر جان کو اپنے دماغ کی رگیں پھٹتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔

"ہم نے ایسا کیا نہیں اور کاشف بھلا ایسا کیوں کرنے لگا۔ وہ کیوں اتنی بڑی رقم اپنے اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرے گا۔ یہ بات صاف ہے کہ اس بیچ میں کوئی تیسرا ملوث ہے۔ کون ہے وہ تیسرا اور وہ چاہتا کیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ ہلو پنہ کچھ کہتی۔ امیر جان کے پرائیویٹ فون کی گھنٹی گنگنانے لگی۔ امیر جان نے ریسیور اٹھایا۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہمت خان بول رہا ہوں سر۔"

"بولو۔"

"بہت زبردست خبر ہے سر۔ اتنی کہ آپ کو دکھ بھی ہوگا اور حیران بھی رہ جائیں گے۔"

"تم جانتے ہو کہ ہمیں پہیلیاں پسند نہیں ہیں۔" امیر جان نے سرد لہجے میں کہا۔

"صرف خبر سناؤ۔"

"سانا ہوٹل کے باتھ روم میں کاشف کو خدا جانے نام کا ایک آدمی ملا۔ جس نے اس سے ایسی باتیں کی ہیں جنہیں سن کر وہی نہیں میں بھی بری طرح حیران ہوں۔"

"کون سی باتیں؟"

دوسری طرف سے ہمت خان نے جلدی جلدی سب کچھ بتا دیا۔ حیرت کے مارے امیر جان کا برا حال ہو رہا تھا۔

"ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ تم کیا بک رہے ہو۔ اگر خدا جانے سچ بول رہا تھا تو کون تھا وہ آدمی جس نے اسے آج ہونے والے واقعے کے بارے میں 19 اگست کو ہی بتا دیا تھا؟"

"وہی تو کہہ رہا ہوں سر کہ نام سن کر آپ کو حیرت بھی ہوگی اور دکھ بھی۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ۔"

"نام بتاؤ۔"

"سرتاج صدیقی۔" ہمت خان نے ایک جھٹکے سے نام بتا دیا۔

"کیا بک رہے ہو۔" امیر جان کو لگا جیسے اس پر آسمان گر پڑا ہو۔

"یہ سچ ہے سر۔"

"لیکن کیسے، کس بنیاد پر یہ بات کر رہے ہو تم؟"

"بتا ہی چکا ہوں سر۔ باتھ روم میں ان کا روم نمبر 712 میں ملنا طے ہوا تھا۔ حالانکہ وہاں سے کاشف سیدھا انیتا کے پاس ڈائننگ ہال میں گیا مگر میں سمجھ چکا تھا کہ دیر سویر وہ 712 میں ضرور پہنچے گا اور میرے کام کی بات وہیں ہوگی۔ اس لیے میں خدا جانے سے پہلے جا کر اس کمرے میں چھپ گیا تھا۔ وہاں جو کچھ ہوا اس کے بعد ذرا بھی شک نہیں رہا کہ خدا جانے سرتاج صدیقی کا آدمی تھا۔ جسے اس نے کاشف کی مدد کے لیے متعین کیا تھا۔"

"712 میں کیا ہوا؟"

ہمت خان نے ساری داستان امیر جان کے گوش گزار کر دی اور وہ داستان ایسی تھی جسے سن کر امیر جان غصے سے پاگل سا نظر آنے لگا۔

"تم کاشف کو مسلسل اپنی نظر میں رکھو اور آئندہ بھی اسی طرح رپورٹ کرتے رہنا اوکے۔" یہ کہہ کر امیر

جان نے لائن کاٹ دی۔

الوینہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ صرف امیر جان کا چہرہ ہی آگ کا گولہ نہیں بنا ہوا بلکہ اس کا سارے کا سارا وجود ہی جوالہ مکھی کی طرح دھک رہا ہے۔

''کیا ہوا جان۔'' الوینہ نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''ہمت خان نے کیا بتایا ہے؟''

''غدار کا پتہ لگ گیا ہے وینا۔'' امیر جان کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ ایک لمحے کے لیے تو الوینہ کو بھی جھرجھری سی آ گئی۔

''کون ہے؟'' الوینہ ایک جھٹکے سے بولی۔

''ہم وہاں جا رہے ہیں۔'' امیر جان نے ٹی وی اسکرین کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

''تم یہیں سے وہاں کا منظر دیکھو گی اور سب سمجھ جاؤ گی کہ کیا ہوا ہے۔''

''لل...... لیکن جان۔''

''یہ ریموٹ ہے۔ تم وہاں کی آواز بھی سن سکتی ہو۔ امیر جان نے بیڈ سے اٹھ کر ریموٹ الوینہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت کچھ مت پوچھو۔ جو دیکھنا ہے اس ٹی وی میں دیکھنا۔ تمہارے دماغ میں گھوم رہے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔''

اس سے پہلے کہ الوینہ کچھ اور کہتی امیر جان تیزی سے کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا اور الوینہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔



سوئیٹ میں پہنچتے ہی انیتا کچھ ایسے انداز میں کاشف پر برس پڑی جیسے ڈائننگ ہال کی ساری بھڑاس ایک ہی جھٹکے میں نکال ڈالنا چاہتی ہو۔ وہ ایسی ایسی باتیں کر رہی تھی کہ کاشف سے کچھ کہتے نہیں بن پڑ رہا تھا۔ جب وہ بار بار یہ کہنے لگی کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر اس کے ساتھ آنے پر پچھتا رہی ہے اور یہ کہتے کہتے رو ہی پڑی کہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی تو کاشف کو اپنے لب کھولنے ہی پڑے۔

''اوکے بابا۔ اوکے۔ بتاتا ہوں کہ باتھ روم میں کیا ہوا تھا؟'' اور پھر کاشف نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

یہ سب سن کر انیتا کی کھوپڑی ایسے ناچ اٹھی جیسے اس کا سر کانچ کا پیپرویٹ ہوا اور اسے پوری طاقت سے گھما کر چکنی میز پر دے مارا ہو۔

''اس کمرے سے ڈائننگ ہال تک مجھے کوئی کھینچ کر نہیں لے گیا تھا۔ تم جانتی ہو۔ اپنی مرضی سے گیا تھا میں۔ اگرچہ تمہاری مرضی شامل نہیں تھی۔ اس کے بعد ڈائننگ ہال میں مجھے حاجت محسوس ہوئی تو جانا پڑا اور خدا جانے کہتا ہے کہ اس آدمی نے اسے 19 اگست کو ہی بتا دیا تھا کہ ایسا ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ ٹھیک نو بجے ڈائننگ ہال میں بیٹھا ہوں گا۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر باتھ روم میں جاؤں گا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے انیتا۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ سب؟ یہ سوچ سوچ کر تبھی سے میری عقل چکرا رہی ہے کہ جو اتفاق ہوا وہ کسی کو 19 اگست کو ہی کیسے پتہ تھا اور کیسے اس نے یہ سب اسی دن خدا جانے کو بتا دیا تھا۔ خدا جانے کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ میرے اور اس کے بیچ جو باتیں ہوئی ہیں وہ سب بھی اسے 19 اگست کو ہی بتا دی گئی تھیں۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟''

انیتا بڑی مشکل سے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں لانے کے بعد بولی۔

''اس نے ایک انجان آدمی نے تم سے کہا کہ تمہیں اس کے اور اس سے ہوئی باتوں کے بارے میں انیتا کو اس انیتا کو کچھ نہیں بتانا ہے۔ جس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہارے ساتھ آنے کے بعد اپنی باقی کی زندگی کیسے گزارنی پڑے گی اور تم نے اس کی بات مان لی۔ کچھ بھی نہیں بتا رہے تھے مجھے۔ کیا یہی ہے تمہاری دوستی؟ اسی دوستی کے دم پر تم میرے شوہر کے گھر تک پہنچے تھے؟''

''اب چھوڑو نا انیتا۔ تم کو اب سب کچھ بتا تو دیا ہے نا۔'' کاشف بولا۔

''اب تم ہی بتاؤ کیا کرنا ہے؟''

بھنائی ہوئی انیتا چپ رہی۔ اس کا چہرہ اور دماغ دونوں بھڑک رہے تھے۔

"اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے کوئی لیٹر دے گا۔"

"جانتی ہوں۔ یہ بات میں اچھی طرح جان چکی ہوں کہ اس سے ملنے سے تجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ مگر تم اس سے اس طرح ملو جیسے میں کہوں گی۔"

"بولو؟"

"سب سے پہلی بات۔ تم یہ پارسل لے کر اس کے پاس نہیں جاؤ گے۔"

"وہ کہاں رہے گا؟"

"میرے پاس۔"

"تت..... تمہارے پاس؟"

"انکار کیا تو کان کے نیچے اتنی زور کا تھپڑ ماروں گی کہ تمہاری اولاد بھی بہری پیدا ہوگی۔ کیونکہ تمہارے انکار کا مطلب ہوگا کہ تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے ہو اور یہ صدمہ میرے لیے اتنا ہی زبردست ہوگا جتنا کسی ماں کے لیے اس کے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ ہوتا ہے۔"

"مگر ایسا کیوں۔ تم اس کا کیا کروگی؟"

"اچار ڈالوں گی، تم سے مطلب؟"

"لیکن انیتا۔"

"کرلو کوشش۔ مجھے سمجھانے کی۔ اگر وہ امیر جان گروپ کی چال ہوئی تو اس کا سب سے پہلا مقصد پارسل حاصل کرنا ہوگا کیونکہ یہاں تک آتے آتے سب سمجھ گئے ہیں کہ یہ پارسل جادو کا پٹارہ ہے اور جب پٹارہ ہوگا ہی میرے پاس تو تم سے چھیننے کا ان کا مقصد ٹائیں ٹائیں فش ہوجائے گا۔"

کاشف کو لگا کہ انیتا ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔

"اوکے۔" کاشف نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"دوسرے یہ کہ جب تم اس سے ملنے جاؤ گے تو وہ تم سے ضرور پوچھے گا کہ انیتا کو کچھ بتایا تو نہیں، تو تمہارا جواب ہوگا نہیں۔ جبکہ اس وقت میں کمرے کے باہر ہی موجود رہوں گی۔"

"تم وہاں کیا کروگی؟"

"تمہارا سر پھاڑوں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"ارے گدھے۔ پہریداری کروں گی۔"

"مگر اس سے کیا فائدہ؟"

"اگر اس نے تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اس کی بوٹیاں نوچ لوں گی۔" یہ کہتے ہوئے انیتا کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اس نے یہ بات اتنے کٹھور انداز میں کہی تھی کہ کاشف کے رونگٹے بھی کھڑے ہوگئے تھے اور اسے احساس ندامت ستانے لگا کہ انیتا اس کے لیے اتنی فکرمند رہتی ہے اور وہ

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "وہی ہوگا۔ جو تم چاہوگی۔"



"آؤ صاحب۔" خداجانے نے 712 کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

کمرے کے اندر قدم رکھتے ہوئے کاشف کے دماغ میں دونوں ہی باتیں تھیں۔ یہ بھی کہ وہ انیتا کے شک کے مطابق امیر جان کے گروپ کی چال بھی ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے وہ سچ بول رہا ہو۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا لیکن وہ ہوشیار بھی تھا اور اپنے اوپر ہونے والے ہر حملے کے لیے تیار تھی۔

اچانک پیچھے سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی، وہ گھوما، دروازہ بند کرنے کے بعد خدا جانے اس پر پردہ ڈال رہا تھا۔

کاشف نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ خداجانے کی حرکت دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ خداجانے پراسرار مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے دبے پاؤں اس کی طرف آرہا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے صاحب۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"میں نے دروازہ بند کرنے کے بعد پردہ کیوں ڈالا

ہے؟''

''کیوں؟'' کاشف نے حیرت سے پوچھا۔

''اب وہ کی ہول کے ذریعے ہمیں نہیں دیکھ سکے گی۔''

یہ سن کر کاشف ہکا بکا رہ گیا۔

''کک..... کون' کون نہیں دیکھ سکے گی؟''

''انیتا اور کون۔''

کاشف کو ایک بار پھر بھک سے اپنا دماغ اڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''تت..... تمہیں کیسے معلوم۔''

''مجھے سب معلوم ہے صاحب۔ آپ نے اسے میرے بارے میں نہ بتانے کی بھرپور کوشش کی ہوگی لیکن وہ نہیں مانی ہوگی۔ ایسی ایسی باتیں کی ہوں گی اس نے کہ تنگ آ کر آپ کو بتانا ہی پڑا ہوگا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت آپ کا پارسل اس کے پاس ہے اور دروازہ بند ہوتے ہی وہ دروازے کے نزدیک آ گئی ہوگی۔ اس نے آپ سے کہا ہوگا کہ وہ یہ سب آپ کی حفاظت کے لیے کر رہی ہے۔''

''مگر کیسے؟'' حیرت کے مارے کاشف کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

''تم کو یہ سب کیسے پتہ ہے؟''

''دھیرے بولیں صاحب۔ اس بارے میں مجھے کچھ نہیں پتہ صاحب۔ سچ یہ ہے کہ میں آپ سے زیادہ حیران ہوں۔ یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی رگیں پھٹ رہی ہیں کہ وہ ساری کی ساری باتیں ٹھیک ویسے کی ویسی ہوتی چلی جا رہی ہیں جیسا اس آدمی نے 19 اگست کو کہہ دیا تھا۔ اس وقت وہ کیسے جانتا تھا کہ میری یہ بات سن کر آپ اتنا جھنجھلا لیں گے اور مجھے کہنا پڑے کہ دھیرے بولیں صاحب۔ اتنی اونچی آواز دروازے کے دوسری طرف کان لگائے کھڑی انیتا سن لے گی۔''

''یہ سب بھی تمہیں اس آدمی نے اس وقت بتا دیا تھا؟'' کاشف کی آواز بھلے ہی دھیمی ہو گئی تھی لیکن حیرت کا سمندر اس کی آنکھوں میں لہراتا ہوا صاف محسوس ہو رہا تھا۔

''ہاں صاحب۔ جو ہو رہی ہیں۔ ایک ایک بات اس نے بتا دی تھی۔''

''اب تم یہ بتاؤ کہ ایسا کرشمہ دکھانے والا وہ آدمی کون تھا۔''

''سرتاج۔'' وہ بولا۔

''سرتاج۔'' کاشف اچھل پڑا۔

''ہاں صاحب۔ اس نے ہی بتایا تھا یہ سب۔ یہ بھی بتایا تھا کہ آپ اس کا نام سن کر چونکیں گے۔ اس نے کہا تھا کہ آپ اس کا پورا نام بھی پوچھ سکتے ہیں۔ جو مجھے بتا دینا ہے۔ اس کا پورا نام سرتاج صدیقی ہے۔''

سرتاج صدیقی کا نام سن کر کاشف سچ مچ سناٹے میں آ گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کی ہر نس میں خون کی جگہ چیونٹیاں دوڑ رہی ہوں۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ امیر جان کا وفادار انجینئر اس کا ساتھ کیوں دے رہا ہے؟

نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی چال ہے' انیتا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں کسی سازش میں پھنستا جا رہا ہوں۔ لیکن' اگر یہ چال ہوتا اور سرتاج صدیقی مجھے کسی چال میں پھنسانا چاہتا تو اس نے مجھے اپنا پورا نام بتانے کو کیا کہا؟ کاشف کا ذہن بری طرح سے الجھ رہا تھا۔ آخر یہ کیا چکر ہے۔

جب وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تو بولا۔

''کیا تم یہ بھی بتا سکتے ہو کہ میرے اور تمہارے بیچ کی باتیں اس نے انیتا سے چھپانے کے لیے کیوں کہا تھا۔''

''واللہ واللہ۔ آپ نے یہ سوال بھی ٹھیک اسی وقت پوچھا ہے جس کے بارے میں اس نے انیس اگست کو ہی کہہ دیا تھا کہ آپ پوچھیں گے اور یہ بھی کہا تھا کہ جب آپ یہ پوچھیں تو میں آپ کو اپنی جیب سے نکال کر یہ دے دوں۔'' یہ کہہ کر خدا جانے نے اپنی جیب سے براؤن رنگ کا ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

کاشف لفافے پر یوں جھپٹا جیسے بھوکی چیل گوشت

پر جھپٹتی ہے۔ اسی لفافے کی خاطر تو آیا تھا وہ یہاں۔ لفافہ ٹیپ لگا کر مہر بند کیا ہوا تھا۔ ایسا بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ کسی نے لفافے کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کی ہو۔ پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔

"تم نے اسے کھول کر دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں صاحب۔"

کاشف نے ایک کنارے سے لفافہ چاک کیا۔ اسی وقت خدا جانے نے کہا۔ اگر میں پہلے سے یہ بتادوں کہ اس میں موجود کاغذ کو پڑھ کر آپ کا کیا رویہ ہوگا تو آپ کو حیرت تو نہیں ہوگی؟"

"کیا رویہ ہوگا؟"

"آپ جھپٹ کر میری گردن پکڑ لیں گے اور کہیں گے جو کچھ اس میں لکھا ہے ویسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں آپ کو کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش کررہا ہوں' لیکن۔"

"لیکن؟"

"اس نے کہا تھا کہ آپ کی ایسی حرکت پر مجھے ڈرنا نہیں ہے۔ آخر میں خود کو سچا ثابت کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔"

کاشف نے اسے ایسی نظروں سے گھورا جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پھر اس پر سے دھیان ہٹا کر لفافے میں سے کاغذ نکالا۔ یہ کمپیوٹر سے ٹائپ کیا ہوا سفید کاغذ تھا۔ وہ تحریر دیکھ کر چونک گیا اور اس کے دماغ میں بڑی تیزی سے سوال کوندا کہ بھلا سرتاج صدیقی کو اس خفیہ تحریر کے بارے میں کیا پتہ؟

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ چاہے اس کی کھوپڑی کا بھرتہ بن جائے لیکن اسے کہیں سے اس سوال کا جواب ملنے کی امید نہیں تھی۔ اس لیے وہ غور سے لیٹر پڑھنے لگا۔

لیٹر کو پڑھنے اور سمجھنے تک کاشف کا چہرہ لوہار کی بھٹی کی طرح تپ چکا تھا۔ اس نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے خدا جانے کی گردن دبوچ لی۔ اور چلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"مم..... میں نے پہلے ہی کہا تھا صاحب کہ۔"

"شٹ اپ۔" کاشف حلق پھاڑ کر چیخا۔

"زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی تو میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔ انیتا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ تم لوگ مجھے اس کے خلاف بھڑکانا چاہتے ہو۔ میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا کہ سرتاج' امیر جان کے خلاف کچھ کرسکتا ہے۔"

"اسی نے مجھ سے کہا تھا صاحب کہ آپ ایسا کریں گے اور کہیں گے۔ تو۔"

"بند کرو' بند کرو اپنی یہ بکواس۔" کاشف اس کی بات کاٹتا ہوا چلایا۔

"میں سب سمجھ چکا ہوں کہ اب تک تم نے جتنی بھی بکواس کی ہے کس بل بوتے پر کی ہے۔ 19 تاریخ کو کوئی نہیں ملا تھا تمہیں۔ کسی نے تم سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ سرتاج کوئی جادوگر ہے کیا جو آنے والی باتوں اور واقعات کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ یہ سارا کرشماتی کھیل تم مجھے حیران پریشان کرنے کے لیے کھیل رہے ہو۔ اس ڈھنگ سے کہ میں آخر میں اس کاغذ کے لکھے پر یقین کرلوں۔"

"مم..... مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں ہے صاحب کہ اس لیٹر میں کیا لکھا ہے۔" خدا جانے نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر بات کاٹ کر کہا۔

"بس اتنا ہی کہا تھا اس نے کہ آخری بار میری بات مان کر دبے پاؤں دروازے کے نزدیک چلیے۔ انیتا کو پتہ نہ لگ پائے کہ آپ وہاں ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا۔" کاشف نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"ایمانداری کی بات یہ ہے صاحب کہ مجھے نہیں پتہ کہ وہاں کیا ہوگا۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا مجھ سے کہ ایک بار ایسا کرلیں تو آپ کو میرے سچا ہونے کا ثبوت مل جائے گا۔"

کاشف کی آنکھیں سوچنے والے انداز میں سکڑ گئیں۔



"نہیں۔ مجھے کی ہول سے کچھ نظر نہیں رہا ہے۔" روم نمبر 712 کے بند دروازے کے نزدیک کھڑی انیتا اپنے کان میں لگے ہینڈ فری پر سرگوشیانہ انداز میں بول رہی تھی۔

"دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے پردہ بھی ڈال دیا تھا۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ جسے سن کر انیتا نے کہا۔ "نہیں۔ اندر کی آواز بھی نہیں آرہی۔ شاید وہ بہت دھیمی آواز میں بات کررہے ہیں۔"

دوسری طرف سے دوبارہ کچھ کہا گیا۔

"ہاں۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے وہ شاید کاشف کو اپنی باتوں پر یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا ہے' ورنہ' ورنہ کاشف کو تو پتہ ہے کہ میں یہاں ہوں۔ کم سے کم اسے تو اتنی اونچی آواز میں بات کرنی چاہیے تھی کہ آواز مجھ تک پہنچ جائے۔"

پھر کچھ کہا گیا۔

"ہاں عمران۔ یہ تو حیرت کی بات۔ مگر یقین کرو۔ کم از کم میری کسی غلطی کی وجہ سے اسے مجھ پر شک نہیں۔"

بس!

انیتا اتنا ہی کہہ پائی۔

دھڑ کی زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ وہ دروازہ جس سے لگ کر وہ کھڑی تھی۔ انیتا بوکھلائی ہوئی جیسی تھی ویسی کھڑی رہی۔ سامنے کاشف کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار ہورہی تھیں۔

ہیڈ فری سے اب بھی عمران کی جھنجھناتی آواز ابھر رہی تھی۔

"کیا ہوا انیتا تم چپ کیوں ہوگئیں؟"

انیتا کے منہ میں زبان ہوتی تو کچھ بولتی۔ کاشف کو دیکھ کر اس کی یہ حالت ہورہی تھی جیسے اس پر جاڑا چڑھ گیا ہوں۔ پورے بدن پر کپکپی سی طاری ہوگئی تھی اور آنکھوں میں خوف ہی خوف۔

سب سے پہلے تو کاشف نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔ اور انیتا بال برابر بھی روک نہیں پائی۔ کاشف نے ایک ہاتھ سے موبائل آف کیا اور دوسرے ہاتھ سے انیتا کی کلائی پکڑ کر اسے اتنی زور سے اپنی طرف کھینچا کہ اس کے حلق سے چیخ ہی نکل گئی۔

ایک ہی جھٹکے میں وہ کمرے کے اندر تھی۔

"خدا جانے' دروازہ بند کرلو۔" کاشف نے غراتے ہوئے کہا۔

"آج میں اسے دوستی کا مطلب سمجھاؤں گا۔"



"گڑبڑ ہوگئی۔" یہ کہتے ہوئے عمران صوفے سے ایسے انداز میں اچھل کر کھڑا ہوا جیسے کسی طاقتور اسپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو۔

"کیا ہوگیا؟" جگی نے اسے اچھلتے دیکھ کر پوچھا

عمران نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے انیتا پھنس گئی ہے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد مکمل خاموشی۔ میں ہیلو ہیلو کرتا رہا' پوچھتا رہا کہ کیا بات ہے لیکن اس کی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا اور پھر موبائل بھی آف ہوگیا۔"

"اس کا مطلب ہے سر کہ یقیناً کچھ گڑبڑ ہے۔" افضل نے کہا۔

"ہمیں اس کی مدد کے لیے پہنچنا چاہیے سر۔" جگی بولا۔

"واقعی۔" افضل نے بے چینی سے کہا۔

"اگر کاشف کو پتہ لگ گیا ہوگا کہ بھابھی جی ہمارے لیے کام کررہی تھیں تو اسے بہت ہی تگڑا جھٹکا لگا ہوگا۔"

"اور اس جھٹکے سے بوکھلا کر وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

"آیئے سر۔" افضل دروازے کی طرف لپکا۔

"ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔"

"نہیں افضل۔" عمران نے تیزی سے کہا۔

"اس طرح بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھانے سے ہماری اب تک کی ساری محنت پر پانی پھر سکتا ہے۔"

افضل جہاں تھا ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"پانی تو پھر چکا ہے سر۔" جگی بولا۔

"بھابھی کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"نہیں۔" عمران نے کہا۔

"میرے خیال سے وہ ایکدم اتنا سخت قدم نہیں اٹھائے گا۔ پہلی بات تو وہ اس کی بچپن کی دوست ہے اور دوسرے یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ کاشف کوئی غنڈہ یا معاش نہیں ہے۔ اس نے اب تک کسی کی جان نہیں لی بلکہ اس کے پاس مواقع بھی تھے۔"

"ان حالات میں وہ دوستی کا خیال کہاں کرے گا سر۔" افضل نے کہا۔

"لیکن ابھی ہم یہ بھی تو نہیں کہہ سکتے نا کہ کاشف نے اسے پکڑ ہی لیا ہے۔ کوئی اور بات بھی تو ہو سکتی ہے۔" عمران نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے خود دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جس دروازے کے نزدیک وہ تھی اس کے پاس خدا جانے اور کاشف ہی تھے۔" افضل نے بھی توجیہہ پیش کی۔

"سو فیصد یہی ہوا ہے سر۔" جگی نے کہا۔

"سو فیصد یہی ہوا کہ کاشف نے اسے پکڑ لیا ہے اور اب ہماری طرف سے ذرا بھی دیر کرنے کا مطلب بھابھی کو خطرے میں ڈالنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمیں وہاں چلنا تو چاہیے۔" عمران دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"لیکن یاد رہے۔ جب تک میں اشارہ نہ کروں تب تک کوئی ایسا کام مت کرنا جس سے بات بگڑ جائے۔ کسی کی بھی جان ہمارے اس مشن سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔"

جگی اور افضل بھی اس کے پیچھے لپکے۔

♥♥♥

"انیتا! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا تم، تم بھی میرے ساتھ کھیل کھیل رہی ہو گی۔" حیرت اور افسوس کا مارا کاشف چیختا ہوا بولا۔ "تم تو اپنے شوہر سے بغاوت کر کے میرے ساتھ چلی آئی تھیں نا۔ تم نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی تھی کہ اب تمہاری آئندہ کی زندگی کیسے گزرے گی۔ واہ واہ کیا ڈائیلاگ بولے تھے تم نے۔ کس کس طرح تم نے مجھے اموشنل بلیک میل کیا۔ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی، یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری اس حرکت کے بعد دنیا کا کوئی شخص دوستی لفظ پر یقین ہی نہیں کرے گا۔ لوگوں کو دوستی کے نام سے ہی نفرت ہو جائے گی۔"

"مم...... میری بات سنو کاشف۔" گھبراہٹ اور ڈر کے مارے انیتا نے کہا۔

"کیا سنوں، اب تمہارے پاس کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔" دہاڑتے ہوئے کاشف نے اسے زور کا دھکا دیا اور وہ صوفے سے الجھتی ہوئی فرش پر گر گئی۔

"میں سب سمجھ چکا ہوں۔ دیکھو، دیکھو اس لیٹر میں سب کچھ صاف صاف لکھا ہے۔" کاشف نے فرش پر پڑا ہوا لیٹر اٹھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو اس لیٹر پر بھی یقین نہیں کیا تھا۔ الٹا خدا جانے کی گردن ہی دبوچ لی تھی کہ یہ مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر جب اس کے کہنے پر دروازے کے قریب جا کر تمہاری آواز سنی، وہ لفظ سنے جو تم عمران سے کہہ رہی تھیں تو سوچو، ذرا سوچو کہ میرے پر کیا گزری ہو گی، تمہارے وہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اتر گئے تھے۔"

آنکھوں میں آنسو لیے انیتا اس لیٹر کو دیکھ رہی تھی جو کاشف نے اس کے چہرے کے سامنے پھیلا رکھا تھا۔

"کسی اور کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ تحریر ضرور آ جائے گی جس میں یہ لکھا گیا ہے۔" اس کے لہجے کی غراہٹ ابھی بھی

برقرار تھی۔ اس لیے آ جائے گی کہ لفظوں کو توڑ مروڑ کر تیار کی گئی اس تحریر کو میں نے ہی ایجاد کیا تھا اور تم میری دوست ہونے کے ناتے اس زبان سے بخوبی واقف ہو۔" لفظ دوست میں جیسے کاشف نے سارے جہان کا زہر بھر دیا تھا۔

"میں نے ہی تمہیں اپنی اس ایجاد کے بارے میں بتایا تھا۔ پڑھو، پڑھو اس میں کیا لکھا ہے۔"

انیتا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نہ ہی اس سے کچھ بولا جا رہا تھا۔ بس آنسو بھری آنکھوں سے کاشف کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔

"اوہ، سوری۔ میں نے ابھی تک اس کاغذ کو سیدھا پکڑا ہوا ہے۔ کاغذ کو سیدھا رکھنے پر تو خود میں بھی ٹھیک نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کیونکہ کاغذ کو اس پوزیشن میں رکھنے پر الفاظ بھلے ہی سیدھے نظر آتے ہیں مگر سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ سب سے نیچے کی لائن سب سے اوپر اور سب سے اوپر کی لائن نیچے رہ جاتی ہے۔ یہ زبان کاغذ کو الٹا پکڑنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ سب سے پہلی لائن کو اگر اوپر لانا ہے تو کاغذ کو الٹا پکڑ لینا چاہیے۔" کاشف کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ زہر میں گھلا ہوا تھا۔ وہ کاغذ کو الٹا کرتے ہوئے بولا۔

"یوں۔ یہ لو۔ تمہاری آسانی کے لیے الٹا کر دیا ہے میں نے۔ اب پڑھو۔ اب تو تم اسے پڑھ سکتی ہو نا' اب بھی میرے علاوہ صرف تم ہی اسے پڑھ سکتی ہو۔ کیونکہ ایسی تحریر کے بارے میں' میں نے صرف تمہیں ہی بتایا تھا۔ اپنی ان آنکھوں سے پڑھو اور' مزا تو تب آئے گا جب تم اسے زور زور سے پڑھ کر سناؤ گی کیونکہ اس میں تمہارے کرتوت لکھے ہیں۔"

انیتا نے کاغذ کی طرف دیکھا۔ ابھی وہ اسے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کاشف پھر چیخا۔

"نہیں سمجھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا کہ اس میں کیا لکھا ہے' ہاں ہو سکتا ہے سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ میں بھی کتنا باؤلا ہوں۔ اس بات کو ایک لمبا عرصہ جو بیت چکا ہے کہ میں نے تمہیں ایسی تحریر کے بارے میں بتایا تھا۔ زبان کی بات تو دور' اتنے وقت میں تو لوگ ان تک کو بھول جاتے ہیں جن کے ساتھ بچپن گزارا ہو۔ لیکن دیکھو میں تمہیں سمجھاتا ہوں تمہیں یاد دلاتا ہوں۔ کاغذ کو الٹا کرنے پر اس پر لکھے الفاظ بھلے ہی الٹے نظر آتے ہوں مگر پہلی لائن سب سے اوپر اور آخری لائن سب سے نیچے پہنچ جاتی ہے۔ تمہیں یہ تو یاد ہوگا کہ اس زبان میں لفظ الٹے لکھے جاتے ہیں۔ دیکھو۔ دیدے پھاڑ کر دیکھو۔ اس کاغذ پر لکھا پہلا لفظ ہے fihsak مگر تمہیں لفظ نہیں پڑھنا۔ حرف پڑھنے ہیں۔ تو جس سیریل میں لکھے ہیں اسی سیریل میں پڑھنے ہیں۔ اس طرح جو سب سے پہلا الٹا حرف لکھا نظر آ رہا ہے وہ ہے K دوسرا A' تیسرا S' چوتھا H' پانچواں I اور چھٹا F اب ان حروف کو جوڑ دیں تو پہلا لفظ بنتا ہے KASHIF۔ یعنی میرا نام۔ بس اب اسی طرح پڑھتی جاؤ۔ تمہاری سب سمجھ میں آ جائے گا۔ پورا دماغ کھل جائے تمہارا۔"

انیتا کے دل میں بھی اسے پڑھنے کا تجسس جاگ رہا تھا۔ وہ اسے پڑھنا چاہتی تھی مگر کاشف اس سے جس لہجے میں بات کر رہا تھا' اس کے ہوتے ہوئے وہ ایسا کر نہیں پا رہی تھی۔

اور کاشف' کاشف بھلا اپنے ہوش و حواس میں کہاں تھا۔

وہ چار سیکنڈ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ دوبارہ بولا۔

"تمہیں شاید اس لیٹر کو پڑھنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ چلو میں تمہاری مشکل حل کر دیتا ہوں۔ تم کچھ بھی سہی لیکن میں تو دوست ہوں ہی۔ بے وقوف ہوں نا۔ اس لیے میں ہی پڑھ کر سنا دیتا ہوں کہ اس لیٹر میں کیا لکھا ہے۔"

اور پھر اس نے اونچی آواز میں لیٹر پڑھنا شروع کیا۔

"کاشف! میں یہ چھوٹا سا پیغام اس زبان میں لکھ رہا ہوں جسے تم اور صرف تم ہی سمجھ سکتے ہو۔ تم جو اس

وقت یہ سمجھ رہے ہو کہ انیتا اپنے شوہر سے بغاوت کرکے تمہارے ساتھ آئی ہے۔ یہ غلط ہے۔ تم ایک سازش کا شکار ہو رہے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے اپنے شوہر کے حکم پر کر رہی ہے۔ اس لیے جتنی جلدی ہو سکے انیتا سے پیچھا چھڑا لو۔ تمہارا۔ سرتاج صدیقی۔''

لیٹر پڑھنے کے بعد کاشف نے انیتا کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی نیولا اپنے سامنے آنے والے ناگ کو دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں غصے دکھ اور نفرت کی ایسی آگ جو انیتا کو اس کی اپنی نظروں میں ہی جھلسائے دے رہی تھی۔

کاشف نے دانت پیستے ہوئے جھپٹ کر انیتا کے بال پکڑ لیے اور ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔

''آیا کچھ سمجھ میں۔ آیا سمجھ میں کہ مجھے تمہاری حقیقت کیسے پتہ چلی۔''

''کاشف تم سرتاج پر کیسے یقین کر سکتے ہو؟''

''میں نے کسی پر یقین نہیں کیا۔ صرف اپنے کانوں پر یقین کیا ہے۔ اسے سچ مانا ہے جو میری آنکھوں نے دیکھا ہے اور خبردار جو تم نے کسی کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا۔ میں تم سے کسی بھی بارے میں ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔''

''لیکن کاشی۔ میں نے جو کچھ کیا تمہاری بھلائی کو ذہن میں رکھ کر کیا تھا۔ میں نے بھی اور عمران نے بھی۔''

''شرم کرو اب تو شرم کرو انیتا۔'' دانت کچکچاتے ہوئے کاشف نے اسے ایک بار پھر اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی کاشف نے انیتا کے شانے سے لٹکتا ہوا اپنا پارسل بھی اتار لیا۔

''تم نے تو ڈھیٹ پنے کی حد ہی کر دی ہے۔ اب بھی مجھے اپنی جھوٹی دوستی کے ساتھ باندھے رکھنا چاہتی ہو۔''

دیوار سے ٹکرا کر انیتا کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا تھا۔

''ہاں۔ یہ سچ ہے۔'' وہ پلٹ کر دھاڑی۔

''یہ سچ ہے کہ سی آئی اے والے تمہارے ذریعے امیر جان تک پہنچنا چاہتے تھے۔ عمران بھی انہی میں شامل تھا۔ بلکہ یہ پلان ہی عمران کا تھا۔ اس نے سوچا کہ سی آئی اے کے کسی ایجنٹ کے ذریعے تم پر نظر رکھنا بہت مشکل ثابت ہوگا اور دوسری بات یہ کہ سی آئی اے کی یہ حرکت کسی بھی وقت امیر جان کے آدمیوں کی نظر میں آ سکتی تھی۔''

''اس لیے تمہیں چنا گیا اور مجھ پر نظر رکھنے کی ساری ضرورت ہی ختم، تمہیں میرے ساتھ ہی چپکا دیا گیا اور تم موبائل کے ذریعے عمران کو ہر پل کی خبر دیتی رہیں۔'' کاشف زہر خند لہجے میں بولے جا رہا تھا۔

''میرے پارسل میں موجود سامان کی فہرست بھی لکھوا دی ہوگی۔ ہیں نا۔''

''ہاں۔'' انیتا نے کہا۔

''اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس سارے پلان کو اس انداز میں انجام دیا گیا کہ امیر جان تو امیر جان خود تمہیں بھی علم نہ ہو سکے۔ اکیلے میں عمران نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے کس طرح اس سے بغاوت کرکے تمہارے ساتھ شریک ہو جانا ہے۔ ہونا یہ تھا کہ وہ ہمیں روکتا رہ جاتا اور میں تمہاری ڈھال بن کے تمہیں وہاں سے نکال لیتی۔ اتفاق سے اسی وقت امیر جان کے آدمیوں نے حملہ کر دیا۔ میں بوکھلا گئی ان حالات میں عمران کو اکیلا چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھی۔ تب عمران نے ہی کہا تا کہ اس کی فکر چھوڑ کر میں اپنا کام کروں۔''

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



غزہ کی سسکیاں

زرین قمر

زندگی اپنے اندر تلخیوں کے ساتھ ہزار خوب صورتیاں لیے ہوئے ہے اور اس زندگی میں جڑے انمول رشتے جو ہمیں خوش رہنا سکھاتے ہیں۔
مگر وہ بچی تو ابھی ان سب سے آشنا ہونا چاہتی تھی کہ یہ ڈر یہ دھماکوں نے اسے گہری نیند سلا دیا

اسرائیل کے بارڈر کے قریب غزہ کی پٹی پر واقع چھوٹی سی بستی "ہرتحون" کے ماحول میں ہر طرف خاموشی تھی بڑی بڑی عمارتیں یوں لگ رہی تھیں جیسے ویران ہوں کسی کوئی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی ہر طرف سو بجھ مُسلسل کبھی کبھی کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ گلیوں میں بھی سناٹا تھا کوئی چہل پہل نہیں تھی یوں لگ رہا تھا جیسے غزہ کی اس بستی "ہرتحون" سے لوگ کہیں چلے گئے ہیں یہاں کوئی ذی روح موجود نہیں۔

اچانک ایک زہر دار دھماکا ہوا اور سفید رنگ کی ایک عمارت سے آگ کے شعلے نکلنے لگے اس کے ساتھ ہی لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دی تھی پھر کے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے اور آس پاس کی کئی عمارتیں گر گئیں ان سے شعلے نکل رہے تھے لوگوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ لوگ گلیوں میں بھی نظر آ رہے تھے جو منظر کچھ دیر پہلے بالکل ساکت اور خاموش تھا اب وہاں ٹوٹی ہوئی عمارتوں کا ڈھیر تھا اور اس ڈھیر سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے بادل آگ کی چنگاریاں اور لوگوں کے لاشے پڑے نظر آ رہے تھے ان لاشوں میں کوئی تمیز نہیں تھی بوڑھے جوان عورتیں بچے سب شامل تھے۔ ہر طرف سے آہ و بکا سنائی دے رہی تھی بہت سے جسم بے حرکت تھے جن کی موت واقع ہو چکی تھی اور بہت سے تڑپ رہے تھے جو شدید زخمی تھے۔ ان دھماکوں سے پہلے کوئی خطرے کا سائرن نہیں بجا تھا کسی جنگ کا اعلان نہیں ہوا تھا یہ ان حملوں میں سے ایک تھا جو اسرائیل کی طرف سے غزہ کے لوگوں پر بغیر اطلاع اور بغیر قصور کے کیے جا رہے تھے جن میں بے شمار لوگوں کی موت ہو چکی تھی۔ اس حملے کے بعد بھی لوگ زخمیوں اور مرنے والوں میں اپنے رشتے داروں کو تلاش کر رہے تھے۔

"ممی..... ممی....." ایک دس سال کی بچی جو زخمی تھی اپنی ماں کو آوازیں دے رہی تھی۔ وہ اسے دیوانہ وار ڈھونڈ رہی تھی۔

"ممی....." وہ ایک عورت کی لاش کے قریب جا کر رک گئی پھر اس کا چہرہ دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔

"ممی..... ممی....." وہ برابر رو رہی تھی اس کے اطراف میں جو لوگ موجود تھے وہ اس کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا کوئی رو رہا تھا کوئی لاشوں کو جھک جھک کر دیکھتا تھا اور آگے بڑھ جاتا تھا' کوئی آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کو پکار رہا تھا۔

"یا اللہ..... اللہ اکبر..... یا اللہ..... اللہ اکبر....." ہر طرف یہی شور تھا۔

بچی زخموں سے نڈھال ہونے کی وجہ سے ایک پتھر پر ہی بیٹھ گئی تھی' اندھوں ایمبولینس آ گئی تھی اور لوگوں کی لاشوں اور زخمیوں کو اٹھایا جا رہا تھا' بچی ہر عورت کی لاش کے پیچھے بھاگ رہی تھی لیکن پھر مایوس ہو کر واپس آ جاتی تھی۔

"ممی..... تم کہاں ہو..... ممی آ جاؤ۔" وہ مسلسل رو رہی تھی۔

پھر اچانک اس کی نظر وہاں کھڑی اسرائیلی فوجی جیپ پر پڑی جس کے قریب کئی اسرائیلی فوجی خوش گپیوں میں

مصروف تھے ان کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں اور کچھ فاصلے پر عورتیں موجود تھیں جنہیں شاید بستی ہی سے گرفتار کیا گیا تھا وہ ان کو باری باری گھسیٹ کر قریب کھڑی گاڑیوں میں بٹھا رہے تھے انہی عورتوں میں بچی کو اپنی ماں بھی نظر آئی اور وہ والہانہ اس کی طرف بھاگی۔

”ممی..... ممی.....“ اس کی ماں سفید عبایا پہنے ہوئے تھی اس کے ساتھ ایک اور عورت جو سیاہ گاؤن میں تھی اسے ایک فوجی گھسیٹ کر لا رہا تھا اور اس کے بعد بچی کی ماں کی باری تھی بچی نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کو پکڑ لیا۔

”نہیں..... تم میری ماں کو نہیں لے جا سکتے۔“ اس نے روتے ہوئے کہا وہ فوجی اور ماں کے درمیان آ گئی تھی۔

”ہٹو..... راستے سے ہٹو۔“ فوجی نے غصے سے کہا اور اسے ہٹانے کی کوشش کی اور رائفل کی طرف دھکیلا وہ ڈھٹائی سے ہنس بھی رہا تھا۔

”میری ممی کو چھوڑ دو۔“ بچی نے پھر غصے سے کہا لیکن فوجی ہنستا رہا بچی فوجی کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی اور وہ اس کے غصے سے لطف اندوز ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب اس کے لیے مزاح کا ذریعہ ہو۔

”تم پر خدا کی مار ہو..... میری ممی کو چھوڑ دو۔“ بچی نے پھر غصے سے کہا تو دوسرے فوجی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے راستے سے ہٹانا چاہا۔

”چھوڑو..... مجھے چھوڑ دو..... میری ممی کو چھوڑو تم نے انہیں کیوں پکڑا ہے؟“ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی اور فوجی ہنس رہے تھے۔

”چلو ہٹو۔“ ایک فوجی نے اسے زور سے تھپڑ مارا اور بچی اس کے پیروں سے چمٹ گئی۔

”میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی..... میں تمہیں مار دوں گی۔“ بچی نے غصے سے کہا۔

”کیا تمہارے بہادر بھی کہتے ہیں۔“ فوجی نے طنز کیا اس کا اشارہ فلسطینی مجاہدین کی طرف تھا۔

”تم ظالم ہو تم نے میری ممی کو کیوں پکڑا ہے..... ان کا کیا قصور ہے..... انہیں چھوڑ دو۔“ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی اس کا گال اسرائیلی فوجی کے تھپڑ سے لال ہو گیا تھا مگر اس کی فریاد کا ان فوجیوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا پھر ایک فوجی نے زبردستی اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور دوسرے فوجیوں نے اس کی ماں اور اس کے ساتھ دوسری عورت کو بھی اس جیپ میں سوار کروا دیا۔ اس جیپ میں دوسری عورتیں بھی تھیں اور پھر جیپ وہاں سے روانہ ہو گئی جب جیپ کافی آگے چلی گئی تو فوجیوں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ دیوانہ وار اس جیپ کی طرف بھاگی۔

”ممی..... ممی..... نہ جاؤ آ جاؤ.....“ وہ رو رہی تھی اور تیز دوڑ کر جیپ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جیپ تھوڑی ہی دیر میں اس کی پہنچ سے بہت دور نکل گئی تھی۔

”ممی..... ممی..... میری ممی کو چھوڑ دو۔“ اب وہ جھک کر زمین پر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے فوجی اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ روتی ہوئی وہاں سے اٹھی تھی اور اس سمت چلی گئی تھی جہاں چند لمحوں پہلے اس کا گھر تھا جو اب ایک کھنڈر بن چکا تھا جس وقت دھماکا ہوا تھا وہ اپنے گھر میں اپنے والد اور بھائی کے ساتھ موجود تھی۔ اس کی والدہ اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک فضا خوفناک دھماکوں سے گونج اٹھی تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا اس کا گھر لرزنے لگا تھا اور سب باہر کی طرف بھاگے تھے اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی جب اسے ہوش آیا تو وہ ملبے کے ڈھیر پر پڑی تھی اور رو رہی تھی۔ ہر طرف گرد اور دھوئیں کے بادل تھے لوگوں کی چیخ و پکار تھی ایسے میں اسے صرف ماں کا خیال آیا تھا اور وہ انہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی اب جب گھر کے ملبے کے پاس پہنچی تو اسے بھائی اور والد کا بھی خیال آیا وہ ابھی ماں کی جدائی اور گھر کی تباہی کے صدمے سے باہر نہیں نکلی تھی کہ یہ افتاد بھی آ پڑی کہ والد اور بھائی بھی لاپتا تھے۔ وہ نڈھال ہو کر گھر کے ملبے پر ہی بیٹھ گئی اس کے چاروں طرف لوگ بھاگتے پھر رہے تھے وہ بھی گھروں کے ملبے کے ڈھیروں میں کچھ تلاش کرتے پھر رہے تھے ایمبولینس ہر طرف سائرن بجاتی پھر رہی تھیں اور زخمیوں کو

اٹھا کر ہسپتال لے جا رہی تھیں۔ کوئی مرنے والوں کے غم میں رو رہا تھا کوئی بچوں کو ڈھونڈ رہا تھا کے یکے بعد دیگرے پھر کئی دھماکے ہوئے اور وہ پھر بے ہوش ہوگئی۔

پھر اس کی آنکھ ہسپتال کے بیڈ پر کھلی تھی اس کے پیروں اور ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چہرے پر زخموں کے نشان تھے اس کے سامنے سفید لباس میں ایک نرس کھڑی تھی جس نے ابھی ابھی اسے انجکشن لگایا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' نرس نے اس سے پوچھا تو وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' نرس نے دوبارہ اس سے پوچھا۔

''مس..... سارہ علی'' اس نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''تم ٹھیک ہو جاؤ گی سارہ! تمہیں کچھ زخم آئے ہیں تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' نرس نے اس کی ہمت بندھائی۔

''وہ..... وہ میری امی کو لے گئے۔'' سارہ نے ہمدردی پا کر اپنا دکھ کہہ دیا اور رو پڑی۔

''کک..... کون.....؟'' جانتے ہوئے بھی نرس نے پوچھا' سب ہی جانتے تھے کہ غزہ کی پٹی پر رہنے والے مسلمانوں کے لیے یہ معمول کی بات ہے کہ اسرائیلی فوجی جب چاہتے ہیں اپنی گاڑیوں میں مردوں' عورتوں اور بچوں کو بٹھا کر لے جاتے ہیں پھر ان سے ناکردہ گناہوں کی پوچھ گچھ ہوتی ہے انہیں ٹارچر کیا جاتا ہے پھر چاہا تو کچھ کو چھوڑ دیا اور چاہا تو گولی کا نشانہ بنا دیا' الزام یہ ہوتا ہے کہ یہ دہشت گرد ہیں۔

''وہ..... اسرائیلی فوجی..... میں نے بہت منع کیا۔'' وہ رو پڑی۔

''نہیں سارہ! تم مت رو' میں نے بہت لوگ دیکھے ہیں جو ان کی قید سے چھوٹ کر آئے ہیں' میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں' تمہاری امی بھی آ جائیں گی۔'' اس نے سارہ کی ہمت بندھائی۔ ''اچھا یہ بتاؤ تمہارے والد یا کوئی اور..... تمہارے گھر میں کتنے لوگ

لاٹری

شوہر: ''میری لاٹری لگی تو تم کیا کرو گی؟''

بیوی: ''آدھے پیسے لے کر ہمیشہ کے لیے میکے چلی جاؤں گی۔''

شوہر: ''سو روپے کی لگی ہے۔ یہ لو پچاس روپے اور نکلو شاباش!''

محمد حذیفہ..... ناظم آباد

تھے؟'' نرس نے پھر پوچھا۔

''ہمارے گھر میں صرف چار افراد تھے میں' میرا بھائی' میری والدہ اور میرے والد.....'' سارہ نے کہا اور رونے لگی۔ ''جب راکٹوں کا حملہ ہوا تو میں اپنے گھر میں تھی۔'' دس سالہ سارہ نے کہنا شروع کیا جیسے وہ واقف ہو کہ راکٹوں کا حملہ کیا ہوتا ہے اور اس کی تباہی کیا ہوتی ہے اس کا بچپن انہی حالات میں گزر رہا تھا۔

''ہوں..... پھر؟'' نرس نے پوچھا۔

''پھر مجھے پتا نہیں' ہمارا سارا گھر کانپ گیا تھا پھر سب کچھ نیچے آ گیا۔ چھت' دیواریں..... سب کچھ اس وقت گھر میں میری امی' ابو بھیا سب تھے پھر میں بے ہوش ہوگئی۔''

''اچھا.....'' نرس نے اداسی سے کہا وہ اس کے سر میں پیار سے انگلیاں پھیر رہی تھی۔

''دیکھو سارہ! تم اکیلی نہیں ہو' ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ وہ دیکھو اس کونے میں.....'' نرس نے سارہ کے بیڈ کے سامنے کمرے کے دوسرے کونے میں لگے بیڈ کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک زخمی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ ''وہ ہدیٰ طفیل ہے' اس کی بیٹی تمہاری ہی عمر کی تھی بینش طفیل جو اس حادثے میں ماری گئی۔ وہ بھی اپنی امی کے ساتھ میں تھی لیکن راکٹ حملے کے بعد جب گھر تباہ ہو گیا تو اس کا کوئی پتا نہیں چلا' اس کے والد خالد احمد طفیل نے اسے بہت ہی ڈھونڈا لیکن کچھ پتا نہیں چلا اس کے دادا احمد عبد الرحمٰن تو بہت پریشان ہیں وہ اسے بہت چاہتے تھے۔''

نرس اسے بتا رہی تھی اور وہ غم سے نڈھال اس فیملی کی طرف دیکھ رہی تھی جن کی بیٹی ان سے چھن گئی تھی۔ ہدیٰ طفیل کے قریب اس کا شوہر خالد طفیل اور سسر عبدالرحمن طفیل بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی زخمی تھے۔

''اور وہ دیکھو اُدھر...... دوسری طرف۔'' نرس کے کہنے پر اس نے دوسری دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے بیڈ پر نظر ڈالی جہاں تقریباً سات سال کی بچی لیٹی تھی۔

''وہ نسیمہ خلیجی ہے۔'' نرس نے اسے بتایا' نسیمہ کے چہرے پر سکون تھا کوئی تاثرات نہیں تھے وہ کھلی آنکھوں سے چھت کو تک رہی تھی اس کے قریب اس کی والدہ خاموش کھڑی تھیں۔ ''وہ اس کی امی عالیہ ہے تم دیکھ رہی ہو وہ بھی زخمی ہیں اور اس کی دیکھ بھال کرنے سے قاصر ہیں۔'' نرس نے کہا۔

نسیمہ کی ماں اپنی بیٹی کو آوازیں دے رہی تھی لیکن وہ خاموش تھی اور چھت کو تکے جا رہی تھی۔

''وہ سکتے میں ہے' جب سے اسے اسپتال لایا گیا ہے وہ اسی حالت میں ہے جس وقت دھماکا ہوا تو وہ اپنی امی کے ساتھ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ دھماکے کے ساتھ ہی وہ فضا میں اچھلی تھی اور نیچے کنکریٹ کے فرش پر جا گری تھی تب سے وہ اسی حالت میں ہے' اس جیسے اور بھی بہت سے بچے ہیں جو کومے کی حالت میں ہیں۔'' نرس نے کہا۔

''ہاں...... اور ہم انتظار کر رہے ہیں کہ ہماری فلسطینی امن کمیٹی' امن کے لیے جو کوششیں کر رہی ہے اس کا رزلٹ ہمیں کب ملتا ہے۔'' نرس کے جواب میں اس اسپتال کے ایک ڈاکٹر نے کہا جو ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس نے نرس کی بات سن لی تھی۔

''جی ڈاکٹر! آپ نے درست کہا۔'' نرس نے جواب دیا۔

ڈاکٹر اشرف القدر اس اسپتال الشفاء کے سینئر ڈاکٹر تھا اور دوسرے ڈاکٹروں کی طرح اسپتال آنے والے ایمرجنسی مریضوں کو دیکھ رہا تھا وہ سارہ کو دیکھنے کے بعد ہدیٰ طفیل کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''شدید زخمی ہیں۔'' ڈاکٹر اشرف القدر نے ہدیٰ طفیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہم لوگ اپنے گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک حملہ ہوا بھلا ہم کیا کرتے جب ہمارے اردگرد بغیر اطلاع کے راکٹ فائر کیے جا رہے ہوں' ہمیں کوئی اطلاع نہیں تھی کوئی وارننگ نہیں دی گئی تھی۔ ہمیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جب خالد طفیل ڈاکٹر کو اپنی افتاد بتا رہے تھے ڈاکٹر اشرف القدر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا' انداز تسلی دینے والا تھا۔

''اللہ بڑا ہے' اللہ بہتر کرے گا۔'' ڈاکٹر نے انہیں تسلی دی۔

''اس بار اسرائیل ہمارے بچوں' ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ یہ جنگ نہیں یہ کھلا ظلم ہے' دہشت گردی ہے۔'' قریب بیٹھے خالد طفیل کے والد عبدالرحمن طفیل نے کہا۔

''ہاں ہماری اتھارٹیز کوشش کر رہی ہیں کہ اس سفاکی کو رکوا سکیں لیکن اسرائیل کچھ ماننے کو تیار ہی نہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ہاں آپ دیکھ ہی رہے ہیں اگر بیرونی طاقتیں دباؤ ڈال کر جنگ بندی کرواتی ہیں تو وہ پھر جنگ بندی توڑ دیتا ہے وہ کوئی قانون نہیں مانتا' من مانی کر رہا ہے۔'' خالد طفیل نے کہا' ڈاکٹر تسلی دینے والے انداز میں اس کا کندھا تھپتھپاتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا' اس کے پاس بھی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ڈاکٹر نسیمہ خلیجی کے بیڈ کی طرف بڑھ گیا تھا اور نرس سارہ کے قریب سے ہٹ کر نسیمہ خلیجی کے بیڈ کے قریب چلی گئی تھی۔

''یہ بھی حملے کے بعد سے کومے میں ہے' ابھی اس نے آنکھیں کھولی ہیں لیکن یہ کچھ بول نہیں رہی ہے' اس کی والدہ عالیہ بھی زخمی ہیں لیکن وہ اس کے قریب سے ہٹنے کو تیار نہیں۔'' نرس نے نسیمہ کی والدہ کی طرف اشارہ کیا

جو قریب ہی کھڑی تھی۔

"پتا نہیں میری بیٹی کبھی بول بھی سکے گی یا نہیں؟" عالیہ نے روتے ہوئے کہا۔

"اس کے سر میں بہت خطرناک چوٹیں آئی ہیں۔" ڈاکٹر اشرف القدر نے نسیمہ کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اندرونی چوٹیں ہیں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس کو کس قسم کے علاج کی ضرورت ہے اور اس علاج کے لیے ہمیں کہاں سے مدد مل سکتی ہے۔" ڈاکٹر اشرف القدر نے کہا اور عالیہ رونے لگی۔

"فکر مند مت ہو ان شاء اللہ ضرور کوئی نہ کوئی صورت نکلے گی۔ اللہ رحم کرے گا۔" نرس نے اسے تسلی دی اسی وقت کمرے میں مختلف ٹی وی چینلز کے نمائندے داخل ہوگئے ان کے ساتھ کیمرے بھی تھے انہوں نے کمرے میں موجود زخمیوں کی فلم بنانا شروع کردی اور ایک شخص جو اس پروگرام کا اینکر تھا مائیک لیے ہوئے ڈاکٹر کی طرف بڑھا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کا کیا خیال ہے یہ مریض جو یہاں موجود ہیں انہیں علاج کی سہولتیں مل رہی ہیں آپ اس سے مطمئن ہیں؟"

"نہیں، میں خود مطمئن نہیں، آپ جانتے ہیں یہاں ہنگامی صورت حال ہے اسرائیل بغیر وارننگ کے حملے کررہا ہے۔ کچھ پتا نہیں کہ کب کہاں سے کتنے لوگ زخمی یا مُردہ حالت میں ہمارے پاس آجائیں۔ ہمارا عملہ محدود ہے اور وسائل بھی ہمارے پاس دواؤں کی قلت ہے اور ضروری آلات بھی کم ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"آپ اس سلسلے میں کیا کررہے ہیں؟"

"دیکھیں اس طرح کے حالات سے ہم اکثر دوچار ہوتے رہتے ہیں اور ہمیشہ کی طرح ہم نے مخیّر حضرات اور امدادی اداروں سے اپیل کی ہے کہ وہ ہماری مدد کریں لیکن اس بار ہمیں حیرت ہے کہ ہمارے پاس بہت زیادہ زخمی اور مردہ لوگ آرہے ہیں اور امداد اتنی نہیں آرہی۔ ہمیں خون دینے والوں کی بھی ضرورت ہے وہ تو خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں جوائنٹ فیملی سسٹم ہے اور لوگوں میں بھی ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ ہے چنانچہ لوگ ایک دوسرے کی مدد کررہے ہیں۔"

"لیکن اسرائیلی ڈیفنس منسٹری تل ابیب کا کہنا ہے کہ وہ بہت تحقیق کے بعد صرف فوجی اور دہشت گردوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنارہے ہیں۔" ٹی وی اینکر نے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

"یہ تو آپ کے سامنے ہے آپ اپنی ہی آنکھوں سے دیکھ لیں یہاں اسپتال میں بھی اور باہر بھی کیا یہ فوجی ٹھکانے ہیں یا عام آبادی کے گھروں پر بمباری کی گئی ہے۔ خاندان کے خاندان ختم ہوگئے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا پھر اس کی توجہ دوسری طرف ہوگئی تھی اس ہال میں مزید زخمی لائے جارہے تھے جو زخموں سے چُور چُور اور لہولہان تھے کیونکہ اسرائیلیوں نے ایک بار پھر شہری آبادی پر تابڑتوڑ کئی راکٹ فائر کیے تھے۔

عام ڈاکٹر اور نرسیں پہلے سے زیادہ مصروف ہوگئے تھے اور سارہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے سب دیکھ رہی تھی اسے ان لوگوں کے درمیان اپنی امی کی تلاش تھی۔

دوسرے روز اسپتال کے اس ہال میں بہت زیادہ رش تھا جس میں سارہ ایک بیڈ پر موجود تھی کل والی نرس اس کے قریب موجود تھی۔

"سارہ! تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔" اس نے سارہ سے کہا تو وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"وہ سامنے جو خالد طفیل کی فیملی ہے نا؟" نرس نے سامنے اشارہ کیا جہاں بیڈ پر خالد طفیل کی بیوی ہدیٰ طفیل لیٹی تھی اور سارہ ہی کی طرف دیکھ رہی تھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی سارہ نے گردن گھما کر پھر سوالیہ نظروں سے نرس کی طرف دیکھا۔

"ان کی خواہش ہے کہ وہ تمہیں اپنی بیٹی بنالیں، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ان کی بیٹی بینش طفیل اس حادثے میں ماری جاچکی ہے ان کی کوئی اور اولاد نہیں ہے اور تمہاری بھی فیملی ختم ہوگئی ہے۔"

"لیکن میری ممی..... وہ زندہ ہیں وہ انہیں پکڑ کر لے

گئے ہیں۔ میں انہیں ڈھونڈوں گی۔" سارہ نے روتے ہوئے کہا۔

"ہاں ضرور ڈھونڈنا لیکن ابھی تم زخمی ہو جب ٹھیک ہو جاؤ گی تو کہاں جاؤ گی؟ تمہارا گھر بھی تباہ ہو گیا ہے۔" نرس نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"میں وہیں جاؤں گی چاہے جو بھی ہو۔ میں وہی جاؤں گی اسی ملبے کے ڈھیر پر جو بھی میرا گھر تھا شاید میری امی وہاں میرا انتظار کر رہی ہوں۔" سارہ نے روتے ہوئے کہا۔

"دیکھو سارہ! ایک مسلمان ہونے کے ناطے میں یہ اپنی ذمہ داری سمجھتی ہوں کہ خالد طفیل کی فیملی سے تمہارے لیے بات کروں اور میں نے بات کر بھی لی صرف اس لیے کہ تم اکیلی ہو چھوٹی ہو۔ تم اکیلے اپنی والدہ کو نہیں ڈھونڈ سکتیں۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ابھی انسانوں کے دل میں اتنی ہمدردی رکھی ہے کہ وہ بڑھ کر ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔" نرس کہہ رہی تھی اور سارہ اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"خالد طفیل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ یہاں سے فارغ ہونے کی تمہاری والدہ کو ضرور تلاش کریں گے تب تک تم ان کی حفاظت میں رہو گی۔ تمہارا تنہا رہنا ٹھیک نہیں۔" نرس نے اسے سمجھایا اور سارہ خاموش ہو گئی اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے لیکن اس کے پاس بھی اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

نرس وہاں سے ہٹ کر دوسرے مریضوں میں مصروف ہو گئی تھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ شدید قسم کے دھماکے سنائی دیئے تھے اور اسپتال کی عمارت لرزنے لگی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین بھی اپنی جگہ موجود نہ ہو جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اس بار اسرائیل کی طرف سے ڈائریکٹ اسپتال کو نشانہ بنایا گیا تھا خاص اس حصے کو جہاں زخمی عورتیں اور بچے تھے پلک جھپکتے میں وہ حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ اسپتال کے عملے کو اتنی بھی مہلت نہیں ملی تھی کہ وہ مریضوں کو وہاں سے دوسری طرف شفٹ کر سکیں سب کچھ اچانک ہی ہوا تھا۔

اسپتال کے اس حصے سے جو تباہ شدہ ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا، مسلسل زخمیوں کی سسکیوں اور کراہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسپتال کا عملہ جو خود بھی زخمی ہوا تھا وہاں زندہ بچ جانے والے زخمیوں کو ڈھونڈ کر نکال رہا تھا اور انہیں محفوظ حصے کی طرف منتقل کر رہا تھا۔ اس عملے میں وہ نرس بھی شامل تھی جو سارہ کو ڈھونڈ رہی تھی لیکن سارہ اور خالد طفیل کی فیملی کے بیڈز کے قریب بس گوشت کے کچھ لوتھڑے پڑے تھے وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا، نرس سمجھ گئی تھی کہ اس اسپتال کے اس حصے کی طرح یہاں موجود مریض بھی ختم ہو چکے تھے نہ سارہ تھی نہ ہدیٰ طفیل نہ خالد طفیل اور نہ نسیمہ خلیجی..... کوئی بھی نہیں تھا۔ نرس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے وہ ایک نیکی کرنا چاہتی تھی لیکن اس کا موقع اس سے چھن گیا تھا اب نہ سارہ کو ماں کی ضرورت رہی تھی اور نہ ہدیٰ طفیل کو بیٹی کی.....

"اللہ اکبر....." نرس کی سسکیاں نکل گئیں۔ "اللہ بہت بڑا ہے وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔" وہ رو رہی تھی۔

"ہمیں اللہ سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے پھر کہا وہ جانتی تھی کہ اسرائیل کے ان حالیہ حملوں میں اسرائیل کے بارڈر کے قریب غزہ کی پٹی پر واقع یہ چھوٹی سی بستی "زیتون" تباہ ہو چکی تھی اس کے لوگ غزہ کی سڑکوں پر بغیر کھانے..... بغیر پانی..... بغیر ٹھکانے کے بے یار و مددگار موجود تھے اور اسرائیلی راکٹ ان کے تعاقب میں تھے۔

"اللہ بہت بڑا ہے۔" اس نے ایک بار پھر آسمان کی طرف منہ کر کے کہا اس کے چہرے پر مایوسی نہیں تھی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ امید کی ایک کرن بھی تھی اسے یقین تھا کہ اللہ اپنی مدد ضرور بھیجے گا۔



انوکھا استاد

شہنی ارشاد

غفلت کی زندگی انسان کو گناہ اور بے راہ روی کی طرف لے جاتی ہے، لیکن اس لڑکی کے استاد نے اسے گمراہی سے بچا کر اللہ کی راہ پر لگا دیا۔

شام کا وقت تھا اس وقت گلی میں بچے کھیل رہے تھے وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ان بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اسکول کا ہوم ورک ختم کرنے کے بعد ان دونوں بہن بھائی کو تھوڑی دیر گلی میں کھیلنے کی اجازت ملتی تھی لیکن امی کی جانب سے سخت ہدایت تھی کہ مغرب کی اذان ہوتے ہی وہ گھر واپس آ جائیں۔

ندا ایک بہت خوب صورت اور پیاری سی بچی تھی۔ خوب گورا رنگ، براؤن بال اور براؤن بڑی بڑی آنکھیں اسے دیکھتے ہی ہر دیکھنے والے کی آنکھوں میں اس کے لیے پیار امڈ آتا۔ اوپر سے اس کی بڑی پیاری اور میٹھی میٹھی باتیں ہر ایک کا دل موہ لیتی تھیں۔ وہ تیسری جماعت کی طالبہ تھی۔

اس روز وہ سب برف پانی کا کھیل کھیل رہے تھے، کھیل کچھ یوں ہوتا کہ دو ٹیمیں بنائی جاتی تھیں ایک ٹیم کے دو بندے دوسرے ٹیم کے افراد قید کر لیتے تھے یعنی ایک دائرے میں انہیں کھڑا کر دیتے تھے اور پھر ان کے ساتھی انہیں چھڑانے کے لیے آتے اور انہیں دائرے کے قریب جا کر اپنے ساتھی کو چھونا ہوتا تھا اس طرح وہ آزاد ہو جاتا جبکہ دوسری ٹیم کے افراد اپنے ساتھی کو چھڑانے کے لیے آنے والوں کو بھی پکڑنا چاہتے تھے تاکہ انہیں بھی دائرے میں قید کر دیں اس طرح یہ بھاگ دوڑ کا کھیل تھا برف پانی نجانے اس کھیل کا نام کیوں رکھ دیا تھا۔

ندا کا بھائی احسان دائرے میں قید تھا اور ندا کو اسے چھڑانے کی کوشش کرنی تھی۔ وہ دائرے کے نزدیک جاتی مگر دوسری ٹیم کے افراد اسے پکڑنے آتے تو وہ بھاگ جاتی۔ اس وقت بھی جب وہ دائرے کے نزدیک آئی تو دوسری ٹیم کی کشور اسے پکڑنے کے لیے بھاگی تو وہ تیز رفتاری سے بھاگ نکلی کشور بھی آج اسے چھوڑنے والی نہیں تھی وہ اس کے پیچھے بھاگی۔

ندا اپنی پوری قوت سے دوڑ رہی تھی اسے اس وقت صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا بس وہ دوڑتی جا رہی تھی۔

دوڑتے دوڑتے وہ درختوں کے اس جھنڈ کی جانب نکل آئی جہاں بچے کھیلتے ہوئے بھی نہیں جاتے تھے۔

شام گہری ہو چلی تھی اور درختوں کی وجہ سے اس جگہ پہلے ہی اندھیرا پھیل گیا تھا اچانک اسے کسی چیز سے زور سے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑی اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔

لیکن وہ اس خیال سے کہ وہ گر پڑی ہے اور کشور آ کر اسے پکڑ لے گی وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو کشور کا دور دور تک پتا نہیں تھا پھر اسے خیال آیا کہ وہ کس جگہ آ گئی ہے اس نے محسوس کیا کہ اندھیرا ہو رہا ہے اور دور دور تک سناٹا پھیلا ہوا ہے وہ کسی اجنبی جگہ پر آ گئی ہے یہاں سے وہ گھر کیسے جائے گی اسے ڈر بھی لگ رہا تھا اس کا ننھا سا دل خوف سے کانپنے لگا پھر وہ گھبرا کر رونے لگی۔

وہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر زور زور سے رو رہی تھی اور مسلسل کہہ رہی تھی

''امی......ابو......بھیا......!''

''کیا ہوا ندا؟'' اچانک اسے اپنے قریب سے ایک بہت متحمّانہ آواز سنائی دی تو وہ رونا بھول کر آواز کی سمت نگاہ گھما کر دیکھنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ سفید لباس میں ملبوس ایک بزرگ صورت اس کے سامنے کھڑے ہیں۔

''آپ کون ہیں؟'' اس نے معصومیت سے سوال کیا۔

''میں!'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے پھر مسکرانے لگے اور بولے۔

''میں یہاں سے گزر رہا تھا تمہارے رونے کی آواز سنی تو رک گیا کیا ہوا، تم رو کیوں رہی ہو؟''

''وہ......میں ناں......!'' اس نے سارا قصہ سنا دیا۔

''اچھا تم کھیل رہی تھیں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن میں اپنا گھر بھول گئی ہوں اب گھر کیسے جاؤں گی۔'' اس نے منہ بسور کر کہا۔

''کوئی بات نہیں میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر چلیں۔'' وہ خوش ہوگئی۔

''ایسے تھوڑی پہلے تم میرے گھر چلو تمہیں پتا ہے میرے گھر ایک بہت بڑا باغ ہے وہاں بہت سے پھلوں کے درخت ہیں اور وہاں بچوں کے جھولنے کے لیے ایک بہت بڑا جھولا ہے۔

''اچھا۔'' اس نے پر مسرت اور اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

''کہاں ہے آپ کا گھر۔''

''یہیں تو ہے تم میرے باغ میں تو کھڑی ہو، آؤ میرے ساتھ میں تمہیں جھولا دکھاتا ہوں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اس نے دیکھا کہ وہ ایک بہت گھنے درخت کے نیچے کھڑے ہیں اور اس کی ایک موٹی سی ڈال پر ایک جھولا لٹکا ہوا ہے وہ خوشی خوشی اچک کر اس جھولے پر بیٹھ گئی اور جھولے لینے لگی۔ اسے بہت مزہ آرہا تھا اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔



فیضان صاحب اور ان کی بیگم بہت بے چینی اور بے قراری سے اسے آوازیں دے رہے تھے۔ بظاہر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی بس بے ہوش تھی۔

''ندا...... ندا بیٹے آنکھیں کھولو...... ندا...... ندا......!'' لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تیز بخار میں تپنے لگی۔ ہوا کچھ یوں کہ مغرب کی اذان ہوتے ہی سب بچے اپنے اپنے گھر چلے گئے احسان اپنی بہن ندا کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں نہ ملی تو وہ پریشان ہوا امی کے پاس پہنچا اور بتایا کہ ندا پتا نہیں کہاں چلی گئی۔ امی نے بوکھلا کر ابو سے اس کا ذکر کیا اور پھر باہر اس کی تلاش جاری ہوگئی۔ سب ساتھ کھیلنے والے بچوں سے پوچھا تب کشور نے بتایا کہ وہ بھاگتے بھاگتے درختوں کے اس گھرے جھنڈ کی جانب نکل گئی تھی۔ لیکن مجھے وہاں جاتے ہوئے ڈر لگا تو میں اس کے پیچھے نہیں گئی اور واپس آگئی لیکن ندا واپس نہیں آئی تب ندا کے ابو ہاتھ میں ٹارچ لے کر وہاں گئے تو انہیں ندا زمین پر بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوئی ملی۔

دراصل یہ بستی متوسط طبقے کے لوگوں کی تھی زیادہ تر لوگ ملازمت پیشہ تھے بستی کے مکانات ختم ہوتے تو سامنے دور تک کھلا میدان تھا اور اس میدان ہی میں درختوں کا یہ جھنڈ تھا جہاں عام طور پر دن میں بھی کوئی نہیں جاتا تھا۔

ندا کے والد اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے ڈاکٹر نے کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا سوائے اس کے کہ یہ موسمی بخار ہے ایک دو دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔

اور ہوا بھی ایسا ہی دو دنوں کے بعد اس کا بخار اتر

گیا اور وہ پہلے جیسے ہی ہوگئی۔ اس کے ذہن سے اس دن والا واقعہ بھی محو ہوگیا۔

بچوں کا کھیل اب بھی اسی طرح جاری تھا کہ اچانک ندا کی نگاہ اس بزرگ پر پڑی وہ دور کھڑے ہاتھ کے اشارے سے ندا کو اپنی جانب بلا رہے تھے اور ندا جیسے مقناطیسی کشش کے زیر اثر خود بخود بابا جی کے پاس پہنچ گئی۔

''ارے، بابا آپ......!'' ندا نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔ ''آپ اتنے دن سے کہاں تھے مجھے بھولا بھولنا ہے۔''

''میں تو یہیں تھا لیکن تم کھیل میں اتنی مگن ہوتی ہو کہ میں تمہیں نظر ہی نہیں آتا۔'' بابا نے شفقت بھرے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا......!'' اس نے بے پروائی سے سر ہلایا۔

''اچھا دیکھو تو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں تمہیں انگور پسند ہیں نا۔'' بابا کے ہاتھوں میں اس نے انگوروں کا گچھا دیکھا۔

''ارے واہ، انگور، ہاں مجھے بڑے مزے کے لگتے ہیں میٹھے میٹھے۔'' ندا نے خوش ہو کر کہا اور بابا کے ہاتھوں سے انگور اٹھا اٹھا کر کھانے لگی۔

''ارے ندا وہاں کیا کر رہی ہو، ادھر آؤ نا۔'' اسے احسان کی آواز سنائی دی تو وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

امی کی احسان کو سخت ہدایت تھی کہ باہر ندا کو اپنے ساتھ ہی رکھنا ادھر ادھر ہونے نہ دینا اس لیے اس نے دور اور تنہا کھڑی ندا کو آواز دے کر بلایا۔

''کیاں کر رہی تھیں وہاں کھڑی۔'' احسان نے پوچھا جو ندا سے ایک سال چھوٹا ہونے کے باوجود بڑے بھائیوں والا رعب جمایا کرتا تھا۔

''بھیا وہ بابا......!'' اس نے مڑ کے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا لیکن وہاں بابا موجود نہیں تھے وہ یہ سمجھی کہ بابا چلے گئے ہیں احسان نے بھی ندا کی بات کو اہمیت نہیں دی اس لیے کہ اسے وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا اور ویسے بھی وہ دونوں تھے تو بچے ہی بچوں کے مزاج میں بے پروائی ہوتی ہے اور ان کی سوچ بھی محدود ہوتی ہے۔

اس رات سونے سے پہلے ندا کو بابا سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ اسے بابا بہت اچھے لگے تھے۔ اتنے اچھے اور محبت سے پیش آنے والے، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بابا کے بارے میں کسی کو نہیں بتائے گی امی ابو اور احسان کو بھی نہیں...... امی ویسے بھی منع کرتی تھیں کہ اجنبی لوگوں سے بات نہیں کرتے اور نہ ان سے کوئی چیز لے کر کھاتے ہیں۔

بابا کے ساتھ اس کے بعد بھی ان کی کئی اور ملاقاتیں ہوئیں بابا ہمیشہ اس کے لیے کھانے کی اچھی اچھی چیزیں لاتے کبھی اس کی پسندیدہ مٹھائی اور کبھی پھل۔

پھر تھوڑا وقت آگے سرک گیا امی نے اب باہر گلی میں جا کر کھیلنے پر پابندی لگا دی تھی۔ وہ گھر میں سہیلیوں کو بلا کر کھیلتی۔ اب وہ پانچویں کلاس میں آ گئی تھی گھر سے باہر نہیں نکلی تو بابا سے بھی ملاقات نہیں ہوئی وقت کے ساتھ ساتھ بابا اور اس کی باتیں اس کے ذہن سے محو ہوتی چلی گئیں۔

اس کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا سب نماز روزے کے پابند تھے وہ بھی کلام پاک ختم کر چکی تھی اب اس کے مزاج میں تھوڑی سنجیدگی آ گئی تھی ایک دن اسکول جاتے ہوئے اسے دیر ہوگئی اس کی سہیلیاں اس کا انتظار کر رہی تھیں وہ تیار ہو کر دیر ہونے کی وجہ سے بغیر ناشتہ کیے ہی اسکول جا رہی تھی تب امی نے زبردستی اس کے ہاتھ میں سلائس اور چائے کا کپ تھما دیا کہ جلدی سے یہ سلائس چائے کے ساتھ کھالو اس کی ساتھی لڑکیاں شور کر رہی تھیں کہ تم دیر کر رہی ہو اسکول لگ جائے گا تو فائن دینا پڑے گا گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ گر گیا اور ساری چائے

کپڑوں پر گر گئی۔ وہ منہ بسورنے لگی اور فرینڈز سے کہا کہ تم ابھی کپڑے بدل لیتی ہوں مگر ساری فرینڈز چلی گئیں یہ کہہ کر تم آج چھٹی کرلو اب ہم تمہارا انتظار نہیں کر سکتے۔

اسکول گھر سے کافی دور تھا وہ تنہا نہیں جا سکتی تھی اس لیے اس نے چھٹی کرلی۔ سردیوں کے دن تھے اس لیے وہ کپڑے تبدیل کر کے بستر میں گھس گئی اور ذرا دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد امی اس کو جگانے کے لیے آئیں تو دیکھا کہ وہ تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔ انہوں نے اسے آواز بھی دیں لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔

ابو کو بلایا وہ آفس سے دوڑے دوڑے آئے امی ڈاکٹر کے پاس لے گئے ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ سردی کا اثر ہے ایک دو دن میں بخار ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن وہ بخار ایک دو دن تو کیا پورے دو ہفتوں پر محیط ہو گیا بخار نے اسے بری طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا وہ بہت کمزور بھی ہو گئی تھی امی اور ابو اس کی جانب سے بہت پریشان تھے۔ دو تین ڈاکٹرز تبدیل کیے مگر اس کا بخار نہ اترا۔

اس روز صبح کے دس بج رہے تھے ابو آفس اور احساس اسکول جا چکا تھا امی اسے ناشتہ اور دوا کھلانے کے بعد کچن میں مصروف تھیں وہ تنہا بستر پر لیٹی تھی تب اس کے کانوں میں آواز آئی کوئی بہت پیار بھرے لہجے میں اسے آواز دے رہا تھا۔

"ندا...... ندا...... تم کیسی ہو؟" اس نے کمرے میں چاروں جانب گردن گھما کر دیکھا کہ کون اسے آواز دے رہا ہے لیکن کمرہ کسی بھی انسانی وجود سے خالی تھا اسے پھر آواز سنائی دی۔

"ندا، میری بات سنو۔" آواز بہت قریب سے سنائی دی ہلکہ ایسے جیسے کوئی اس کے بہت قریب کھڑا ہو لیکن کسی کے دکھائی نہ دینے پر وہ خوف کے مارے بستر سے اٹھ کر لڑکھڑاتی ہوئی تیز قدموں سے امی کے پاس کچن میں آ گئی۔

"ارے ندا میری بچی تم بستر سے کیوں اٹھ کر آ گئیں ابھی بخار بھی نہیں اترا ہے۔" امی نے اسے دیکھتے ہی گھبرا کر کہا۔

"امی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے کوئی مجھے میرا نام لے کر آوازیں دے رہا ہے۔"

"نہیں بیٹا تم بخار کی وجہ سے ڈر گئی ہو دیکھو گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے صرف میں اور تم ہیں۔" امی نے پیار سے اسے سمجھانا چاہا۔

"نہیں امی، سچ مچ مجھے کسی نے آواز دی تھی امی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے میں کمرے میں اکیلی نہیں جاؤں گی آپ میرے ساتھ چلیں۔" اس نے امی کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں بیٹا اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے اگر تمہیں ڈر لگ رہا تھا تو آیتہ الکرسی پڑھ لیتیں میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا نا۔" امی اسے تھامے ہوئے کمرے میں آئیں اور اسے بستر پر لٹا کر اس کے پاس بیٹھ گئیں اور آیتہ الکرسی پڑھ کر اس پر دم کر دیا اس نے امی کو اس وقت تک اپنے پاس سے اٹھنے نہیں دیا جب تک احسان اسکول سے نہیں آ گیا۔

اس سارے دن اس قسم کا کوئی دوسرا واقعہ نہیں ہوا لیکن اگلے دن پھر ایسا ہوا ندا اس وقت بھی کمرے میں تنہا تھی امی کچن میں مصروف تھیں آج پھر کل کی طرح اس کے کانوں میں بالکل قریب سے آواز آئی کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا وہ پھر خوفزدہ ہو کر کمرے سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

امی ابھی تک یہی سمجھ رہی تھیں کہ یہ صرف اس

کے اندر کا ڈر اور خوف ہے انہوں نے اسے باہر ورانڈے میں چارپائی پر بستر بچھا کر لیٹا دیا امی کو اس کی چارپائی کچن کے دروازے سے دکھائی دے رہی تھی۔ ورانڈے میں اسے کوئی آواز سنائی نہیں دی تو وہ مطمئن ہوگئی۔ امی نے اس بات کا ذکر ابو سے کیا تو وہ تھوڑے سے فکر مند ہوگئے اور امی سے کہا کہ اس پر ہر نماز کے بعد دم کر دیا کرو۔

چند روز گزرے پھر ایک دن اسے سامنے دیوار پر کچھ دکھائی دینے لگا بالکل ایسے جیسے ٹی وی کی اسکرین روشن ہوگئی ہو وہاں اسے سفید لباس میں تین بزرگ دکھائی دیئے جو مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جانب بلا رہے تھے وہ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔

اور پھر یہ واقعہ بار بار ہونے لگا کبھی دیوار پر کبھی دروازے پر اسے وہی بزرگ دکھائی دیتے ابو نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ندا بہت زیادہ ڈرنے لگی ہے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ندا کو بہت زیادہ کمزوری ہوگئی ہے اسی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔

پھر اللہ کے کرم سے اس کا بخار اتر گیا ڈاکٹر نے طاقت کے سیرپ بھی لکھ کر دیے ساتھ ہی بہترین غذا کا مشورہ بھی دیا۔

ندا پورے ایک ماہ اسکول نہیں جا سکی تھی اس کی پڑھائی کا بہت نقصان ہوا تھا ان دنوں وہ آٹھویں کلاس میں تھی سالانہ ایگزام ہونے والے تھے اسی لیے ابو نے پورے ہفتے کی چھٹی لی اور ندا کو اس کی اسٹڈی میں مدد دینے لگے۔

حیرت انگیز طور پر ندا بہت تیزی سے سارا کور کر رہی تھی صحت بھی تیزی سے بحال ہونے لگی اس کے ایگزام ہوئے اور پھر رزلٹ آیا تو وہ پوری کلاس میں فرسٹ آئی تھی سب بے حد خوش تھے اس کا کھویا ہوا رنگ و روپ تیزی سے واپس آ رہا تھا بلکہ اب وہ عمر کے اس حصے میں آ گئی تھی کہ جب بچیاں نئی نئی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہیں۔

وہ دن بدن مزید حسین ہوتی جا رہی تھی دیکھنے والے حیران رہ جاتے کہ بیماری کے بعد تو ندا پر اللہ کا کچھ زیادہ ہی کرم ہو گیا ہے۔

ندا اب بڑی ہو گئی تھی گھر کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹانے لگی تھی اس دن وہ گھر پر ہی تھی اس کے رشتہ داروں میں کسی کا انتقال ہو گیا امی کو فوری جانا پڑا ابو سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ تم احسان کو لے کر ان کے گھر پہنچ جاؤ میں آفس سے وہیں آ جاؤں گا پھر ہم ساتھ ہی واپس آ جائیں گے۔

امی نے ندا کو اچھی طرح ہدایات دیں گھر کے بہت سے کام تھے وہ ندا کو کرنے تھے دروازہ اندر سے لاک رکھنے کی ہدایات دے کر امی احسان کو ساتھ لے کر چلی گئیں تو وہ تنہا رہ گئی۔

سارے گھر کا کام پڑا تھا کام دیکھ کر ہی اس کے اوپر تھکن سوار ہو گئی دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اس نے سوچا کہ پہلے لیٹ کر کوئی کتاب پڑھنی چاہیے وہ ابن صفی کی عمران سیریز کی دیوانی تھی وہ سیریز پڑھنے لگی کہ امی تو شام تک ہی آئیں گی میں بعد میں کام کر لوں گی۔

کتاب پڑھتے پڑھتے اسے نیند آ گئی۔ کتاب ہاتھ سے گر گئی اور وہ سو گئی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی کہ پتا نہیں کیا ٹائم ہوا ہے اگر امی آ گئیں اور انہوں نے گھر بکھرا ہوا اور کچن پھیلا ہوا دیکھا تو ٹھیک ٹھاک ڈانٹ پڑ جائے گی۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی اسے کمرے میں غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا وہ کمرے سے باہر نکل کر لاؤنج میں آئی پھر تیزی سے کچن کی جانب بھاگی۔ شدید ترین حیرانی سے اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

سارا گھر صاف ستھرا تھا ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی تھی جھاڑو دلی ہوئی تھی۔ کچن جگمگا رہا تھا سالن

چولہے پر پک کر تیار رکھا تھا ہاٹ پاٹ میں گرم گرم روٹیاں تیار رکھی تھیں۔

"کہیں امی تو واپس نہیں آ گئیں۔" اس نے سوچا اور سارے گھر میں امی کو آوازیں دیں اگر امی وہاں ہوتیں تو جواب دیتیں۔ وہ خوف زدہ سی واپس کمرے میں آ گئی سوچ رہی تھی کہ یہ کیا ماجرہ ہوا ہے تب ایک بار پھر اس کے کانوں میں وہی پرانی آواز آئی۔

"ندا پریشان مت ہو، یہ سارا کام بس ہو گیا تمہارا دل نہیں چاہ رہا تھا نا یہ سارے کام کرنے کے لیے۔"

"کک...... کون...... کون ...... ہے؟" ندا نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تم مجھے بھول گئیں لیکن میں تمہیں نہیں بھولا، جب تم چھوٹی تھیں تب ہماری ملاقات ہوئی تھی بس یہ سمجھ لو کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تمہاری ہر مشکل گھڑی میں تمہارے کام آؤں گا۔ تمہیں کبھی میری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

ندا دم سادھے اس کی بات سن رہی تھی اس کے ذہن کے دھندلکوں پر ایک شبیہہ ابھری اور اس کے لبوں سے آہستہ سے پھسلا۔

"بابا......!"

"ہوں...... یاد آ گیا نا، تم ایک اچھی لڑکی ہو، نیک والدین کی اولاد ہو، نماز کی پابندی کیا کرو اور ہمیشہ با وضو رہا کرو، اللہ تم پر رحم کرے۔"

اچانک ہی ڈور بیل بجنے لگی تو بابا کی آواز خاموش ہو گئی۔ ندا نے دروازہ کھولا تو امی ابو اور احسان آئے تھے امی ابو نے بہت خوش ہو کر کھانا کھایا اور کھانے کی ڈھیروں تعریف کی۔ لیکن ندا بہت چپ چاپ اور خاموش تھی۔ اس بات کو دونوں نے ہی محسوس کیا اور سمجھا کہ آج پہلی دفعہ ندا اتنی دیر کے لیے تنہا گھر میں رکی ہے اس لیے شاید ڈری ہوئی ہے۔

"آپی آج تو تمہیں اس آواز نے نہیں ڈرایا۔" احسان نے شوخ لہجے میں اسے چھیڑا تو وہ بری طرح چونک گئی۔

"آں...... ہاں...... نہیں۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

اور اس دن کے بعد سے اس نے نماز کی پابندی شروع کر دی اور فجر کے بعد وہ قرآن کی تلاوت بھی کرنے لگی کوشش کرتی کہ ہر وقت با وضو رہے۔

امی اس سے بہت زیادہ خوش تھیں وہ اسے بار بار نماز کی پابندی کی تاکید کرتی تھیں لیکن وہ روزانہ ایک نہ ایک نماز چھوڑ دیا کرتی تھی لیکن اب امی کو اسے نماز کے لیے کہنا نہیں پڑتا تھا۔

اس نے گھر کے بہت سے کاموں کی ذمہ داری بھی لے لی تھی۔ ایک دن وہ محلے کی ایک شادی کی تقریب میں شریک تھی ندا نے پیچ کلر کا کامدار سوٹ پہنا ہوا تھا چھوٹے آویزے کانوں میں تھے۔ لمبے بال پشت پر پھیلے ہوئے تھے وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں لہک لہک کر تالیاں بجا رہی تھی اور گانے گا رہی تھی۔

تب قریب سے گزرتے ہوئے دلہن کے کزن کی نگاہ ندا پر پڑی تو وہ وہی رک گیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اتنا حسین اور مکمل حسن آج پہلی مرتبہ دکھائی دیا ہے لگتا ہے چاند زمین پر اتر آیا ہے۔" اور اسی لمحے اس کے کانوں میں بابا کی آواز گونجی۔

"ندا اٹھو...... اپنے چہرے کو حجاب سے ڈھانپ لو۔" ندا پریشان ہو گئی کہ وہ اس وقت ایسا کیسے کر سکتی ہے وہ تو سرے سے حجاب لیتی ہی نہیں تھی البتہ اس نے اتنا کیا کہ سر کو دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانک لیا اور خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ اگلے دن اس نے امی سے فرمائش کی کہ وہ اس کے لیے حجاب والی چادر لے

آ ئیں اب وہ بنا حجاب گھر سے باہر نہیں جائے گی۔
وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا ندا تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے بی اے میں آ گئی ان دنوں اس کے بہت رشتے آ رہے تھے لیکن ابو ہر رشتہ کے لیے انکار کر دیتے تھے اور ندا کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ابو ایسا کیوں کر رہے ہیں ندا کے تایا ابو نے اپنے بیٹے یاسر کے لیے کہا ہوا تھا یاسر کی آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک بھی ندا واضح طور پر محسوس کر چکی تھی۔ لیکن نجانے کیوں یاسر ندا کو قطعی پسند نہیں تھا وہ ایک آزاد خیال اور ماڈرن لڑکا تھا۔ اسے ندا کا پردہ کرنا پسند نہیں تھا وہ باتوں باتوں میں اس بات کا اظہار بھی کر چکا تھا۔
پھر پتا چلا کہ آج شام تایا ابو اور تائی امی ندا اور یاسر کی شادی کی بات پکی کرنے آ رہے تھے امی ابو کو یاسر پسند بھی تھا ندا کو پتا تھا کہ ابو یہ رشتہ پکا کر دیں گے امی نے اس روز خصوصی کھانے کا اہتمام کیا تھا مہمان آ چکے تھے ندا اپنے کمرے میں آ گئی وہ بہت اداس تھی لیکن یہ اس کی سعادت مندی تھی کہ وہ ابو کے فیصلے کے آگے زبان نہیں کھول سکتی تھی۔
کمرے میں آئی تو بابا کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ "پریشان ہو؟" تو ندا نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔
"یاسر سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟" بابا نے سوال کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر بہت ہی حیرت انگیز بات ہوئی ابو نے تایا ابو کو ندا کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ تایا ابو اور تائی امی اور خود اس کی امی حیران تھیں۔ تایا ابو نے انکار کی وجہ پوچھی تو ابو نے صرف اتنا کہا "دونوں کا جوڑ نہیں بنتا" اور یہ جملہ کہہ کر اٹھ گئے تایا ابو اور تائی امی اس انکار کی وجہ سے ابو سے بہت دن ناراض رہے لیکن ندا بہت زیادہ خوش تھی۔
ایک روز رات کو ندا گہری نیند سو رہی تھی کہ کسی نے ندا کے پاؤں کا انگوٹھا ہلا کر اسے جگا دیا اس کی آنکھ کھل گئی تو اس کے کانوں میں بابا کی آواز آئی۔
"ندا اٹھو اور نماز پڑھو اللہ کو بندے کا رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا پسند ہے۔ تہجد کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ یہ مومن کا احسان عمل ہے۔"
ندا بلا چوں و چرا اٹھی اور وضو کر کے نوافل ادا کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد فجر کی اذان ہو گئی تو وہ نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کرنے لگی۔ تب بابا نے ایک بار پھر کہا۔
"قرآن کو بلا سمجھے پڑھنے کا زیادہ فائدہ نہیں صرف تلاوت کرنے سے نیکیاں ملتیں ہیں جبکہ اصل فائدہ تو اس کو سمجھ کر پڑھنے میں ہے تم اس کا علم حاصل کرو اور اللہ کی محکم آیات پر مکمل عمل کرو۔"
اس وقت ندا بی اے کے فائنل ایئر میں تھی اس نے امی سے کہا کہ بی اے کی ڈگری لے کر کیا کروں گی میں قرآن کا علم حاصل کروں گی اس نے ابو کے مشورے سے مولانا عبدالحئی صاحب سے قرآن کا علم سیکھنا شروع کر دیا۔
اس کے چہرے پر بے پناہ نور تھا۔ وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد سارا ٹائم قرآن کو سمجھنے میں لگا دیتی تھی۔
اس کی عمر پچیس سال ہو چکی تھی امی کو دن رات اس کی فکر کھائے جاتی۔ کتنے لوگ جو اسے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے اس کے اتنے زیادہ مذہبی رجحان کی وجہ سے اس سے دور ہٹنے لگے بقول ان کے دنیا آگے کی جانب بڑھ رہی ہے اور یہ لڑکی پیچھے جا رہی ہے۔ ایک دن اسی جملے کا اس نے جواب دیا۔
"دنیا واقعی آگے جا رہی ہے لیکن لوگ یہ بھول گئے ہیں کہ آگے ان کا سفر ختم کہا ہو رہا ہے آگے صرف زندگی کا اختتام ہے اور پھر آخرت کا نیا سفر شروع ہو جائے گا سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم نے آخرت میں سرخرو ہونے کی کیا تیاری کی ہے دنیا جو انسان کی مستقل قیام گاہ نہیں ہے اس کے لیے اتنے اہتمام اتنی

تیاریاں اور جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں گویا ہم خوشی خوشی آخرت کے خسارے کے لیے تیار ہیں۔"

"توبہ توبہ یہ لڑکی تو بہت خوفناک باتیں کرتی ہے۔" وہ خاتون اپنے کان پکڑ کر اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔

ایک دن وہ قیام الیل میں مصروف تھی اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ساتھ بہت سارے لوگ نماز پڑھ رہے ہوں یعنی وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہی ہو وہ کون لوگ تھے مرد تھے یا عورتیں اسے نہیں پتا چلا اس کی ناک میں بہت تیز بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی لیکن اس نے جیسے ہی سلام پھیرا وہ پہلے کی طرح تنہا نماز پڑھ رہی تھی البتہ اس کے دوپٹے سے وہی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔

ایک دن اس کے ابو اس دنیا سے رخصت ہو گئے وہ امی اور احسان کے ساتھ رہنے لگی۔ احسان بھی اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا اس نے امی سے کہا۔

"جیسے ہی احسان کی جاب لگے آپ اس کی شادی کر دیجیے گا۔"

"لیکن ندا میری خواہش ہے کہ پہلے تمہاری شادی ہو جائے دنیا والے کیا کہیں گے کہ بیٹی کو بٹھا رکھا ہے اور چھوٹے بیٹے کی شادی کر دی۔"

"امی انسان کو صرف اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ اس کے اس عمل سے اس کا اللہ ناراض نہ ہو۔" ندا نے بہت متانت بھرے لہجے میں کہا۔

اور پھر ندا کے لہجے میں نجانے ایسا کیا تھا کہ امی آگے کچھ اور نہ بول سکیں انہوں نے اپنے بھائی کی بیٹی سے احسان کی شادی کر دی۔

امی اب بہت بوڑھی ہو گئی تھیں ندا کی عمر اب چالیس سال ہو گئی وہ زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی زیادہ سے زیادہ وقت قرآن کو سمجھنے میں گزارتی گھر والوں سے بھی بات چیت کم کرتی تھی۔

حیران کن بات یہ بھی کہ جب اللہ نے احسان کے ہاں اولاد کی خوشخبری سنائی تو ندا نے اپنی بھابی شاہین کو کام کرنے سے منع کر دیا اس نے کہا کہ وہ خود سارے کام کرے گی لیکن امی اور شاہین حیران رہ جاتیں جب ذرا سی دیر میں سارے کام ہو جاتے گویا ندا نہ ہو کوئی تیز رفتار مشین ہو اور ندا سب کاموں سے فارغ ہو کر پھر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

امی دن رات اس بات پر کڑھا کرتیں اور ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں کہ ان کی اتنی پیاری بیٹی ابھی تک کنواری بیٹھی ہے جبکہ اس کے ساتھ کی لڑکیاں کئی بچوں کی مائیں ہیں۔

اس روز امی کسی کام سے ندا کے کمرے میں جا رہی تھیں تو انہیں ایسی آواز آئی جیسے ندا کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ وہ اندر داخل ہوئی تو ندا کمرے میں تنہا تھی۔

امی نے ندا سے کچھ بھی نہیں پوچھا وہ جس کام سے گئی تھیں اسے بھی بھول گئی اور واپس لوٹ آئی انہیں ندا کا لہجہ بہت پراسرار لگا جب ندا نے انتہائی سنجیدگی سے ان سے کہا۔

"جی امی..... آپ کو کوئی کام ہے مجھ سے۔"

وہ بیڈ پر چپ چاپ لیٹی ندا کے بچپن کی باتیں سوچنے لگیں انہیں سب کچھ یاد آنے لگا اور بہت کچھ ان کی سمجھ میں آ گیا۔

ایک دن ندا کی امی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے کمرے کی جانب گئیں کمرے کا دروازہ بند تھا اندر سے ندا کے بات کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں ندا کی گفتگو کا لب لباب ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ وہ کسی کو قرآن کا درس دے رہی ہے۔ وہ بہت موثر انداز میں سورۃ الجاثیہ کی تشریح سمجھا رہی تھی۔

اچانک ان کے کانوں میں ندا کی آواز آئی، "امی اندر آ جائیں۔"

وہ ایک دم گھبرا گئیں پلٹ کر واپس جانے لگیں پھر واپس آ گئیں خیال آیا کہ دیکھیں کیا واقعی ندا کے پاس کمرے میں کوئی موجود ہے یا نہیں۔

وہ دروازہ کھول کر اندر گئیں تو ندا قرآن ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ بہت سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''امی اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات میں تجسس کرنے سے منع فرمایا ہے اور کسی کے دروازے سے لگ کر اندر کی باتیں سننا بھی منع ہے آئندہ احتیاط کیجیے گا کہ ایسا کوئی کام نہ کریں جس میں اللہ کی حکم عدولی ہو۔''

''لیکن ندا تمہیں پتا کیسے چلا کہ میں باہر کھڑی ہوں دروازہ تو بند تھا۔'' امی نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

''چھوڑیں امی، آپ اس بات کو نہیں سمجھیں گی۔'' ندا نے آہستگی سے جواب دیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ندا کو ایک پیارے سے بھتیجے کی پھپو بنا دیا اب وہ کمرے سے باہر نکلتی تو ارمان کو دیر تک گود میں لے کر کھلاتی رہتی۔ وہ بھی اس کی گود میں خوش رہتا۔

ایک دن شاہین بہت گھبرائی ہوئی ارمان کو گود میں لیے ہوئے اس کے کمرے میں آئی ارمان کی آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں اور وہ پورا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''آپی...... آپی...... ذرا دیکھیں ارمان کو کیا ہو گیا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' ندا نے مطمئن انداز میں پوچھا اور شاہین کے ہاتھوں میں بے سدھ پڑے ارمان کو دیکھا پھر کہا۔

''اس کو ڈاکٹر کے پاس فوراً لے کر جاؤ۔''

''لیکن مجھے لگتا ہے اس کو ڈاکٹر کی نہیں آپ کی ضرورت ہے آپ اس پر دم کر دیں۔''

''میں دم کر دوں۔'' ندا نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''میں دم کر دوں مگر کیا کروں۔'' اچانک اس کے کانوں میں بابا کی آواز گونجی وہ ایک قرآنی آیت کو پڑھ رہے تھے بولے یہ پڑھ کر ارمان پر دم کر دو، تم کسی پریشان حال پر یہ آیت پڑھ کر دم کرو گی اللہ کے حکم سے وہ شفایاب ہو گا۔''

ندا نے بسم اللہ پڑھ کر بابا کی بتائی ہوئی آیات پڑھ کر ارمان پر پھونک ماری۔ حیرت انگیز طور پر ارمان نے آنکھیں کھول دیں اور ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ شاہین خوشی خوشی ارمان کو لے کر چلی گئی۔

اور پھر اس کے بعد خاندان کے دوسرے افراد ندا کے پاس آنے لگے۔ ندا انہیں سمجھاتی کہ اللہ کی آیات صرف پڑھ کر پھونک مارنے کے لیے نہیں اتری ہیں یہ تو ایک اس کی ادنیٰ سی فضیلت ہے۔ یہ تو ہمیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتی ہیں۔ برے اور بھلے میں تمیز کرنا سکھاتی ہیں۔ اللہ کو کیسے راضی کرنا ہے یہ بتاتی ہیں آپ لوگوں نے قرآن کو صرف اس کام کے لیے مختص کر رکھا ہے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے قرآن کی تشریح سیکھنے اور سمجھنے کے لیے آئیں اور اس کا اصل فائدہ اٹھائیں۔

پھر اس کی باتوں کا لوگوں پر اثر ہوا اور محلے اور خاندان کی بہت سی لڑکیاں اور عورتیں اس کے پاس قرآن کا علم حاصل کرنے کے لیے آنے لگیں۔ وہ جمعرات کے دن کی چھٹی خود کیا کرتی تھی اس کے علاوہ کسی اور کو دوسرے دن کی چھٹی نہیں کرنے دیتی تھی۔ وہ دن بھر بند کمرے میں گزارتی ایک دن امی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''تم جمعرات کے دن قرآن کی کلاس نہیں لیتیں اور سارا دن بند کمرے میں گزار دیتی ہو آخر کیوں؟''

''امی آپ کو مجھ سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اب آپ نے پوچھا ہے تو میں جھوٹ نہیں بولوں گی اور ہاں میری آپ سے ایک گزارش ہے کہ اس بات کا ذکر آپ کسی سے نہیں کریں گی۔ میرے پاس قوم اجناء کی بہت سی خواتین قرآن سیکھنے کے

لیے آتی ہیں۔"

ندا کا جواب سن کر امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ کتنی دیر ندا کو تکتی رہیں پھر بولیں۔

"ندا بچپن میں وہ جو تمہیں آوازیں سنائی دیتی تھیں تو کیا وہ......!" امی پوری جان سے کپکپا رہی تھیں۔

"جی امی۔" اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "پلیز اب آپ اس سے آگے مجھ سے کچھ مت پوچھیے گا۔"

امی ندا کا جواب سن کر مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔

وقت کا کام گزرنا ہے وہ کچھ اور آگے سرک گیا۔ ایک دن امی بھی اللہ کے پاس چلی گئیں۔ امی کے جانے کے بعد ندا بھی اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھی احسان کے ہاں مزید دو بچوں کا اضافہ ہو گیا۔

بچے کھیلتے کھیلتے ندا کے کمرے میں چلے جاتے اور باہر آتے تو ان کے ہاتھ میں کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز ہوتی، کبھی مٹھائی اور کبھی پھل۔

وہ قرآن کے علم کی روشنی اللہ کے بندوں میں پھیلا رہی تھی...... دور دور سے لوگ اس کے پاس آتے تھے اس کے چہرے پر پھیلا ہوا نور اور لہجے کی مٹھاس لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔

اس کا کہنا تھا کہ علم سیکھنے کے بعد اس کو اپنے تک محدود نہیں رکھنا چاہیے اللہ کی مخلوق میں بے دریغ لٹانا چاہیے، جس جگہ بھی رہو بس قرآن کی روشنی پھیلاؤ۔

وہ رمضان کی اکیسویں شب تھی جب ندا کی بہت سی شاگرد لڑکیاں ماہ رمضان کی پہلی شب بیداری کے لیے اس کے پاس رکی ہوئی تھیں۔

درس قرآن دیتے دیتے اس کی آنکھیں بار بار موندھ جاتیں سانس کبھی تیز ہو جاتی کبھی مدھم اس نے نحیف لہجے میں ایک حدیث سنائی۔

حدیث، "آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے وہ سدھر جائے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے سن لو، جان لو یہ دل ہے۔"

پھر وہ قرآن ہاتھ میں پکڑے پکڑے سیدھی لیٹ گئی قرآن سینے پر رکھ لیا اس نے اونچی آواز میں کلمہ طیبہ اور شہادت پڑھا اور ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئی۔

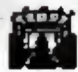
اس کے جنازے میں بے تحاشہ لوگ شامل تھے۔ بہت سے اجنبی مرد اور عورتیں جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس کے انتقال کے بعد اس کے کمرے سے سسکیاں لے کر رونے کی آوازیں سنائی دیتیں تھیں تب ایک دن ہمت کر کے احسان اور شاہین اس کے کمرے میں گئے اور کہا۔

"آپ جو لوگ بھی ہیں ندا آپی کے جانے کے بعد صبر کریں۔ دیکھیں ہم بھی تو صبر کر رہے ہیں، اگر آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ انہیں جنت میں بلند درجہ عطا فرمائے تو قرآن کے علم سے اللہ کی مخلوق کو آراستہ کریں۔

اور اس دن کے بعد سے کبھی اس کمرے سے رونے کی آوازیں سنائی نہیں دیں۔ البتہ کبھی رات کے اندھیرے میں ایک سفید ہیولہ اس کمرے میں آتا اور جاتا دکھائی دیتا ہے کبھی اور بہت سے قدموں کی چہل پہل سنائی دیتی ہے کبھی بہت سے لوگوں کے قرآن پڑھنے کی آوازیں آتی ہیں۔

احسان نے ایک بہتر کام یہ کیا کہ ندا آپی کے کمرے کے آگے دیوار کھنچوا کر اسے سارے گھر سے علیحدہ کر دیا ہے۔



زخم دل

سلمیٰ غزل

سائنس و ٹیکنالوجی بہت تیزی سے دنیا میں پھیل رہی ہے اور اس کی ایجادات سے ہر شخص فائدہ اٹھا رہا ہے' لیکن اس کی اچھائی و برائی دونوں ہی معاشرے میں ساتھ ساتھ پھیل رہی ہیں۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جو لیپ ٹاپ اور آئی فون کے زیر اثر آکر اپنا ہوش کھو بیٹھا تھا۔

بہت دنوں کے بعد ایک مرتبہ پھر گھر میں ہنگامہ سا جاگ اٹھا تھا آج پھر واصف پر دورہ پڑ گیا تھا اگر بروقت موبل کی آنکھ نہ کھل جاتی تو جانے وہ معصوم سی نورالعین کے ساتھ کیا کرتا' وہ خود بھی گھبرا کر مسہری سے اتر گیا۔ اس کے چہرے پر وحشت سی طاری تھی وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو دیوار پر مارتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

''میں کیا کروں' میں کیا کروں؟'' موبل عینی کو سینے سے لگائے خود بھی پریشان کھڑی تھی' وہ عینی جس میں واصف کی جان تھی وہ اس کی قہر آلود نگاہوں کا نشانہ بن جاتی اور وہ اس کی جان لینے کی کوشش کرنے لگتا' شور کی آواز سن کر عینی کے تینوں بھائی بھی بھاگتے ہوئے کمرے میں آگئے۔

''کیا ہوا مما' پاپا اور عینی کیوں رو رہی ہے؟'' انہوں نے بے قراری سے پوچھا کیونکہ یہ چھوٹی معصوم سی بہن ان کی آنکھوں کا تارا تھی۔

''جاؤ بیٹا! تم جا کر سو جاؤ' صبح اسکول بھی جانا ہے شاید تمہاری بہن نیند میں ڈر گئی۔'' عینی کو کاٹ میں سلا کر وہ واصف کی طرف گھومی جو نگاہیں جھکائے شرمسار' حیران و پریشان اور پسینہ میں شرابور کھڑا تھا' موبل نے غصے اور نفرت پر قابو پاتے ہوئے پہلے واصف کو بٹھا کر پانی پلایا پھر نرمی سے بولی۔

''آج پھر آپ پر عینی سے نفرت کا دورہ پڑا ہے' آخر اس ننھی سی معصوم جان نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ تین بیٹوں کے بعد بڑی منتوں مرادوں سے تو ہمیں یہ گڑیا ملی ہے' میں جانتی ہوں آپ کو لڑکیاں کبھی بھی پسند نہ تھیں اور آپ میری بیٹی کی خواہش پر مجھ سے ناراض بھی ہو جاتے تھے مگر جب سے نورالعین پیدا ہوئی ہے آپ کی تو اس میں جان ہے آپ کی محبت کی شدت' چاہت اور والہانہ پن پر تو میں بھی حیران ہو جاتی ہوں۔ عینی کو سینے سے لگا کر بے تحاشہ چومنا' گھنٹوں اس کو لے کر ٹہلنا بلکہ کبھی کبھی تو تینوں بچے بھی شاکی ہو جاتے ہیں کہ جب سے عینی آئی ہے ہم تو پاپا کو نظر ہی نہیں آتے۔ عینی کے کمرے کی سجاوٹ' قیمتی کپڑے اور کھلونے آپ کی بے پناہ چاہت کا ثبوت ہیں پھر یہ اچانک آپ کو کیا ہو جاتا ہے۔''

واصف کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہ تھا کیونکہ ایسا دورہ اسے کبھی کبھار ہی پڑتا تھا جب اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے' سانس

پھولنے لگتا' آنکھیں وحشت زدہ ہوجاتیں اور چہرے پراس قدر بھیانک تاثرات ہوتے کہ اگر کوئی اجنبی دیکھ لیتا تو ڈر جاتا۔ کئی مرتبہ عینی کے رونے پراس نے اس کا گلہ دبانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن شاید اللہ تعالیٰ کو اس کی زندگی مقصود تھی اس لیے عین موقع پر موہل آ گئی اور اس کی جان بچ گئی پھر وہ اس کو سینے سے لگا کر زار وقطار رونے لگتا۔

''میری بچی' میری جان مجھے معاف کردے' جانے مجھے کیا ہوجاتا ہے مجھ سے تیرا رونا برداشت نہیں ہوتا۔''

''مگر یہ بچی کو چپ کرانے کا کون سا طریقہ ہے کہ آپ اس کا منہ ہی بند کرنے لگتے ہیں۔ واصف مجھے تو آپ نفسیاتی مریض لگنے لگے ہیں کسی ماہر نفسیات کو دکھایئے ورنہ آپ کا یہ رویہ مجھے پاگل کردے گا۔''

بات بھی ایسی تھی کہ کسی سے اپنا دکھ شیئر نہیں کرسکتی تھی مگر عینی کو اب واصف کے پاس اکیلا چھوڑنے سے وہ ڈرنے لگی تھی۔ کیا پتا کبھی اس پر دورہ پڑ جائے' کبھی کبھی تو واصف جھنجلا بھی جاتا تھا۔

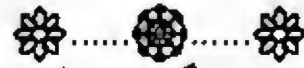
''تم کیوں میری بیٹی کو مجھ سے دور رکھنے لگی ہو' میں اسے گود میں لینے کو ترس گیا ہوں۔ میں اگر اس کے نزدیک آؤں تو ہر کام چھوڑ کر اس کے چاروں طرف منڈلانا شروع کردیتی ہو جیسے میں کوئی بھیڑیا یا ڈراکولا ہوں جو اسے کھا جائے گا۔''

کبھی کبھی موہل کو بھی اپنے رویہ پر ندامت و شرمندگی محسوس ہونے لگتی' بھلا ایک باپ اپنی بیٹی کا دشمن کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ڈر اور خوف سا بیٹھ گیا تھا وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر عینی کو چیک کرتی' کبھی واصف کو دیکھنے لگتی جو سوتے میں بے حد معصوم اور خوب صورت لگتا اور یہ بھی حقیقت تھی کہ شکلاً اور عادتاً دونوں میں ہی واصف کا کوئی ثانی نہیں تھا مردانہ وجاہت کا نمونہ' دولت مند لیکن بے حد منکسر المزاج اور عاجز۔ کبھی کبھی تو موہل کو حیرت ہوتی تھی' غریبوں کے لیے جس قدر واصف کے دل میں درد تھا ایسا بہت کم اس نے کسی متمول کے دل میں دیکھا تھا۔ پورا محلہ اس کے اخلاق اور انکساری کا معترف تھا' ہر قسم کی نوجوانی والی خرافات سے دور' نمازی و پرہیز گار۔

موہل کو اپنی خوش بختی پر ناز تھا مگر شاید اس کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔ واصف کے آباؤ اجداد کا تعلق گاؤں سے تھا لیکن تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس نے ہمیشہ شہر میں نوکروں کے ساتھ اکیلا رہنا پڑا۔ اکلوتی اور لاڈلی اولاد ہونے کے باوجود وہ اپنی زمینیں اور حویلی چھوڑنے کو تیار نہیں تھے' وہ ڈیفنس کے بڑے سے گھر میں نوکروں کے ساتھ اکیلا رہتا تھا پھر یونیورسٹی میں اسے موہل پسند آ گئی۔ واصف کے ماں باپ کو اس کی پسند پر اعتراض نہ تھا لیکن موہل کے والدین اس کے دیہاتی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھے مگر واصف کے والدین کی یقین دہانی پر کہ وہ بہو کو گاؤں میں نہیں شہر میں رکھیں گے تو ان کے پاس انکار کی گنجائش نہیں رہی۔

نجیب الطرفین اور خاندانی رکھ رکھاؤ کے باوجود مالی طور پر واصف کے ہم پلہ نہ تھے' بہت دھوم دھام اور چاہ سے وہ اسے بیاہ کرلے گئے۔ موہل اللہ کی اس عنایت پر شکر ادا کرتے نہ تھکتے کہ

واصف ایک اچھا شوہر ہی نہیں داماد بھی تھا اور بہانے بہانے سے سسرال والوں کی اس طرح مدد کرتا تھا کہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔



اس دن تو حد ہی ہوگئی بچے اسکول گئے ہوئے تھے' واصف بھی گھر پر تھے وہ عینی کو کاٹ میں سلا کر کچن کی طرف بڑھی تو اسے لگا کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے کیونکہ موحل نے عینی کی ساتھ اب علیحدہ کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا' وہ کمرے میں آئی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ واصف کے دونوں ہاتھ عینی کی گردن پر جمے ہوئے تھے اور وہ ایک بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی اس کی چیخ پر واصف نے گھبرا کر عینی کو چھوڑ دیا۔ موحل نے اسے اوندھا لٹا کر کمر پر کس کس کر تھپکیاں دیں تب اس کا سانس بحال ہوا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ واصف نے اسے لینا چاہا تو موحل نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

''خبردار جو میری بچی کو ہاتھ لگایا' ظالم اگر اتنی ہی نفرت تھی تو اسے پیدا ہی کیوں کیا تھا۔'' آہستہ آہستہ عینی کی چیخیں اب ہچکیوں اور سسکیوں میں بدل گئی تھیں۔

چھ ماہ کی ننھی سی جان سسک سسک کر سو گئی اور اب موحل بلک بلک کر رو رہی تھی واصف آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے موحل کی طرف آیا اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

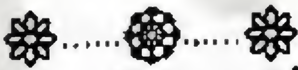
''خدا کی قسم موحل مجھے خود نہیں پتا کہ مجھے کیا ہو جاتا ہے' کیوں ایسی گھناؤنی حرکت کرنے لگتا ہوں۔ دل کرتا ہے خود کو ختم کر ڈالوں' خود کشی کرلوں۔ میں عینی کو بے پناہ چاہتا ہوں پھر بھی اس کی جان کے درپے ہوں' آخر ایسا کیوں ہے تم نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی' مجھ سے پوچھا نہیں۔''

''بند کریں یہ ڈرامہ بازی۔'' موحل روتے روتے چیخ پڑی۔ ''میں آپ کی ایک نہیں سنوں گی' خدا کی پناہ اگر میں بروقت نہ آ جاتی تو میری تو بچی گئی تھی جان سے مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ آپ اس کے سگے باپ ہیں۔''

''موحل کیوں خود کو داغ دار کر رہی ہو تم جانتی ہو میں ہی اس کا سگا باپ ہوں' میں لحہ پہلے بھیڑیا اور درندہ ضرور بن گیا تھا لیکن اب اپنے پورے ہوش و حواس میں ہوں' خدارا میری بات سن لو۔''

''نہیں سننی مجھے آپ کی بات اور نہ رہنا ہے آپ کے ساتھ کیونکہ یہ ایک دن کا نہیں روز کا معمول ہے۔ کب تک اپنی معصوم بچی کی آپ سے حفاظت کروں گی' بہتر یہی ہے کہ میں اپنے بچوں کو لے کر یہاں سے چلی جاؤں۔''

''خدارا موحل ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ میری بات سن لو' پھر تمہارا ہر فیصلہ مجھے منظور ہوگا۔''



میں اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے والدین کی چاہتوں اور محبتوں کا محور تھا وہ خود تو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر انہیں مجھے اعلیٰ تعلیم دلانے کا شوق ہی نہیں جنون تھا۔ گاؤں سے آٹھویں تک پڑھنے کے بعد مجھے شہر آنا پڑا اور سفارشوں سے مجھے ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں او لیول میں داخلہ مل گیا اور میں نے ٹیوشن پڑھ کر اپنی تعلیمی استعداد بڑھالی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ دونوں بھی

میرے ساتھ شہر آتے مگر میرے اصرار کے باوجود وہ اپنی زمینیں چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئے۔

"نہ پتر! یہ شہر کی گہما گہمی، نفسا نفسی اور افراتفری ہمیں پسند نہیں۔ ایسا لگتا ہے شہر میں کسی نے ہر شخص کے پیچھے کتا چھوڑ دیا ہے' بھاگا جارہا ہے ایک اضطرابی کیفیت میں مبتلا۔ انسانی جذبات اور احساسات سے محروم دولت کا پجاری، نہ محبت نہ رواداری نہ بھائی چارگی نہ خلوص کسی نے صحیح کہا ہے "شہر میں پڑوس نہیں صرف محلّہ ہوتا ہے" کیونکہ کسی کو پڑوس کے بارے میں کوئی علم ہی نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنی ذات میں گم' خود غرض مطلبی اور موقع پرست...... نہ بابا ہم اس ماحول میں نہیں رہ سکتے' قربِ قیامت کی نشانی ہر گھر سے ڈھول تماشوں کی آوازیں' شور و غوطاں' گاڑیوں کی پی پاں...... کسی کے پاس اپنے سوا دوسرے کے لیے ٹائم ہی نہیں ہے بھلا بتاؤ لگتا ہے شہر والوں نے کبھی سورج نکلتے نہیں دیکھا نیند کی دوا کھا کر سوتے ہیں دن دہاڑے اور رات بھر جاگتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے اور گاؤں میں......" ان کی آنکھوں میں فخر تھا۔ "صبح کتنی سہانی ہوتی ہے' پرندوں کی چہچہاہٹیں' گائے بیلوں کی گھنٹوں کی مدھر آوازیں' مرغوں کی بانگیں' کھلا آسمان' سرسبز کھیت کھلیان' سب کے دکھ سکھ سانجھے۔"

بابا سائیں کی بات غلط نہیں تھی مگر اس عمر میں مجھے والدین کی قربت ان کی تربیت اور رہنمائی کی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ نوکر خدمت تو کرسکتے ہیں لیکن تربیت نہیں۔ میرے پاس لیپ ٹاپ' آئی فون' آئی پیڈ کیا کچھ نہیں تھا۔ تم سوچو موبل! اتنے بڑے گھر میں تنہا' کوئی روک ٹوک نہیں' کوئی پوچھنے والا نہیں کہ کب آرہا ہوں کب جارہا ہوں اور کہاں جارہا ہوں۔ ساری رات ٹی وی دیکھوں یا لیپ ٹاپ پر بیٹھا رہوں' مجھے کوئی فکر نہیں تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں بے راہ روی کی طرف مائل ہوگیا' عملی طور پر نہیں ذہنی طور پر یہ لیپ ٹاپ' موبائل فون اور آئی فون بچوں کی تعلیم اور سہولت کے لیے والدین مہیا کرتے ہیں وہ اب ذہنی عیاشی کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ کوئی چیز غلط نہیں ہوتی' اس کا استعمال غلط ہوتا ہے صرف میں ہی نہیں نہ جانے کتنے نوجوان اب بے راہ روی کا شکار ہیں' خود کو تباہ کررہے ہیں اور والدین کو پتا ہی نہیں کہ ان کی ناک کے نیچے کیا ہورہا ہے۔ اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک کے اٹھارہ کروڑ عوام کے لیے یہ شرم کا مقام ہے کہ کرپشن سے لے کر ہر برائی میں نمبرون ہیں۔ ہر دن معصوم بچیاں زیادتیوں کا شکار ہوتی ہیں اور ہم ان محرکات کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے کہ ایسا کیوں ہورہا ہے اس کا پس منظر کیا ہے اس کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں جس نے انسان کو بھیڑیا اور پھر شیطان بنادیا اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا میرا دل چاہتا ہے جب لوگ میری تعریف کریں تو ان کا منہ بند کردوں اور ان سے کہوں مجھے پتھر ماریں' مجھے سنگسار کریں میں ان تعریفوں کا مستحق نہیں۔" واصف نے پانی پیا پھر دوبارہ گویا ہوا۔

"میں اولیول کررہا تھا' بھرپور جوان تھا' ساری رات فحش فلمیں دیکھ دیکھ کر میری عجیب سی حالت ہوجاتی تھی' کروٹیں بدل بدل کر تھک جاتا

تھا' ایک الاؤ تھا جس نے تن من جلا ڈالا تھا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا ہفتے کی پوری رات میں جاگتا رہا پھر دن چڑھے سو کر اٹھا' عموماً اتوار کو تمام نوکر چھٹی کرتے تھے سوائے گارڈ اور حلیمہ بی بی کے جو اتوار کے اتوار مجھے کھانا دینے اور صفائی کرنے آتی تھی۔ میں نے آواز دی تو وہ کمرے میں آ گئی وہ اپنے ساتھ اپنی چھ سالہ بیٹی بھی لائی تھی۔

"صاحب جی یہ میری بیٹی ہے اسکول میں پڑھتی ہے اور ہر ماہ اول آتی ہے۔ اس کو آپ کا گھر دیکھنے کا بڑا شوق تھا اس لیے زبردستی میرے ساتھ آ گئی۔" حلیمہ بی بی کے لہجے میں شرمندگی تھی اور وہ معصوم بچی سر جھکائے شرما رہی تھی۔

"صاحب جی آپ نہا دھولیں تب تک میں آپ کی پسند کا چیز آملیٹ بنالیتی ہوں اور ثمینہ اتنی دیر میں آپ کے کمرے کی صفائی کردے گی۔"

وہ بے وقوف عورت اپنی نادانی میں معصوم بچی میرے رحم و کرم پر چھوڑ گئی حالانکہ کم از کم ماؤں کو لڑکیوں کے معاملے میں ہمیشہ چوکس اور محتاط رہنا چاہیے۔ مجھ پر رات کی فلموں کا خمار تھا' بے چینی حد سے سوا تھی میں انسان سے وحشی درندہ بن گیا۔ شیطان نے میرے ہوش و حواس گم کردیے اور کمرہ بند کرکے میں اس معصوم بچی پر پل پڑا اس کو تو چلانے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ ہوش آیا تو وہ معصوم بچی لاش کی صورت میں میرے سامنے تھی' میں نے اس کی لاش کو اسٹور میں چھپادیا اور حلیمہ سے کہا کہ ثمینہ گھر چلی گئی ہے۔ وہ حیران تو ہوئی لیکن اس کا گھر قریبی خالی پلاٹ میں جھونپڑی کی شکل میں تھا اس لیے مطمئن ہو کر وہ کام میں لگ

گئی۔ میں نے فوراً بابا سائیں کو فون کیا کیونکہ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ بعد کی کہانی بالکل عام سی ہے ''پیسے میں بڑی طاقت ہے۔''

بابا سائیں کی دھمکیوں اور دولت نے حلیمہ کا منہ بند کردیا اور وہ کہیں اور چلی گئی کیونکہ اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ شور واویلے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ بچی تو گئی کم از کم اس پیسے سے وہ اپنی غربت سے ہی نجات حاصل کرلے گی اور اس کی کوئی اور بچی کسی امیر کے ہتھے نہیں چڑھے گی۔

میں زندگی میں مصروف ہوکر سب کچھ بھول گیا' تبدیلی تو مجھ میں اسی دن سے آگئی تھی جس دن مجھ سے یہ مکروہ فعل سرزد ہوا تھا' ہر برائی سے میں تائب ہوچکا تھا مگر عینی کی پیدائش نے ثمینہ کو زندہ کردیا۔ میری عینی بھی تو ایک لڑکی ہے کل کو خدانخواستہ کوئی درندہ میری بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کرے گا تو میں کیا کروں گا' جیتے جی مرجاؤں گا۔ میرا تو یہ حال ہوگیا ہے کہ جس نوجوان کے ہاتھ میں اسمارٹ فون یا لیپ ٹاپ دیکھتا ہوں مجھے اپنا ماضی یاد آنے لگتا ہے۔ میری عینی ثمینہ بن جاتی ہے اور یہ ڈر اور خوف مجھے اسے جان سے مارنے پر مجبور کرنے لگتا ہے۔ خدا کے لیے مومل میرے دکھ کو سمجھو میں کن عذابوں سے گزر رہا ہوں' سمجھنے کی کوشش کرو مجھے تمہاری ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے اس اذیت سے تمہارے سوا مجھے کوئی نہیں نکال سکتا۔ میرا دل چاہتا ہے لوگ میری عزت کرنے کے بجائے مجھ پر تھوکیں' مجھے لعنت ملامت کریں۔ دل کرتا ہے چیخ چیخ کر سب کو بتاؤں کہ میں کس قدر گھٹیا' کمینہ اور انسانیت سے گرا ہوا انسان نہیں شیطان ہوں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور مومل تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''حلیمہ اب کہاں ہے؟'' مومل نے پوچھا۔

''بابا سائیں نے اسے خدا کی بستی میں گھر لے دیا تھا' بے شک یہ اس بچی کی جان کا نعم البدل نہیں لیکن اس نے مجھے معاف کردیا ہے کیونکہ اس کے تمام بچے اسکول میں پڑھ رہے ہیں' سارا خرچہ میں اٹھاتا ہوں اور اب حلیمہ کو گھر گھر جاکر کام نہیں کرنا پڑتا۔ میں تو اللہ کے آگے گڑگڑا کر اور توبہ کرکر کے بھی تھک گیا ہوں' خدا کے لیے تم بھی مجھے معاف کرکے میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا کردو۔''

''جب حلیمہ نے معاف کردیا تو میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی...... ہاں اللہ سے معافی کے طلب گار رہیے' وہ غفورالرحیم ہے یقیناً معاف کردے گا۔ میرے لیے اگرچہ آپ کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے اور ساتھ نبھانا اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ کیونکہ آپ میری نظروں سے گرچکے ہیں مگر میں اپنے بچوں کی وجہ سے مجبور ہوں کیونکہ میں ایک باپ کو بچوں کی نظروں میں ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ جس دن آپ کا مقام میری نظروں میں بلند ہوگیا میں آپ کے کمرے میں واپس آجاؤں گی۔'' یہ کہتی ہوئی مومل عینی کو اٹھا کر کمرے سے نکل گئی اور واصف پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

آخری قسط

دیدبان

ارشد علی ارشد

صیہونی قوتیں صدیوں سے مسلم امہ کے خلاف ہر محاذ پر سرگرم ہیں۔ مسلمانوں میں جنم لینے والے فرقوں اور فسادات کے پس پشت میں بھی انہی کا ہاتھ کارفرما ہے۔ کبھی ان کی سازشیں حسن بن صباح کے روپ میں سامنے آتی ہیں تو کبھی غلام احمد قادیانی کی شکل میں خلافت ترکی کا خاتمہ کر کے انہوں نے پورے عالم کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور اب ان کا نشانہ مسلم دنیا کی واحد ایٹمی طاقت پاکستان ہے' جو ہمہ وقت خار کی طرح تکلیف پہنچا رہا ہے زیر نظر ناول انہی سازشوں کے پس منظر میں ہے۔ گو اس کے حالات و واقعات خیالی ہیں' اس کے کسی کردار و علاقہ کا تعلق حقیقت سے نہیں ہے لیکن اس کا مواد اور خمیر اصل واقعات سے ہی اٹھایا گیا۔

وطن پرستوں کے لیے بطور خاص' دلوں کو جھنجوڑتا ہوا ایک دلچسپ ناول

آج شانی نے اس کا فیصلہ کرنا تھا۔ جب اسے بروج کی غداری کا خیال آتا تو جی چاہتا اس کی تکہ بوٹی کر دے اور جب پیار کی موجیں دل کے ساحل سے ٹکراتیں تو خود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر تل جاتا۔ اسے تمام چیزوں کو بالائے طاق رکھ کر فیصلہ کرنا تھا۔ سر جی نے اسے بروج کی غداری کا ثبوت دے دیا تھا۔ طارق نے بھی بروج کی پراسراریت کی تصدیق کر دی تھی۔ بروج کی غداری کا ثبوت بھی انتہائی عجیب و غریب اور پراسرار تھا لیکن بہرحال انہیں پتہ چل گیا تھا کہ آج تک جو ناکامیاں ان کے حصے میں آئی ہیں وہ بروج کی مرہون منت تھیں۔ سر جی کو بروج کے فلیٹ سے ایک کیسٹ ملی تھی۔ کیسٹ میں بروج کی عجیب و غریب آوازیں، قہقہے اور چیخ و پکار ریکارڈ تھی۔ ان کے بیچ کچھ واضح باتیں بھی ریکارڈ تھیں۔

"شانی! میں تمہیں تباہ و برباد کر دوں گی، میں تمہیں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی، تم میرے پیار میں پاگل مست رہنا میں تمہیں ذلت و رسوائی اور پستی کی نچلی ترین سطح پر لے جاؤں گی۔ تم لوگ ہمارے عظیم مشن کے خلاف برسرپیکار ہو جس کے سامنے جو بھی آتا ہے مٹ جاتا ہے۔"

یہ وہ باتیں تھی جو پوری کیسٹ میں جا بجا چیخ و پکار اور قہقہوں کے دوران ریکارڈ شدہ تھیں۔ کیسٹ کو ہر زاویے سے دیکھ لیا گیا تھا۔ یہ آواز بروج کی ہی تھی۔ کیسٹ سے ایک اور پراسرار انکشاف بھی سامنے آیا تھا۔ الیکٹرونک انجینئر نے کیسٹ کو بیک ٹریکنگ کے ذریعے مانیٹر کیا تو بروج کے قہقہوں کے بیچ مزید الفاظ سنے گئے تھے۔

"ہاں ہاں میں شیطان ہوں۔ ہاں میں شیطان ہوں۔" یہ الفاظ پوری کیسٹ میں پانچ بار سنے گئے تھے۔ شانی، سر جی اور حمزہ کی اس معاملے پر کافی ڈسکس ہوئی تھی۔ بروج جو بھی تھی بہرحال اس کی ذات مشکوک تھی اور پراسرار ہونے کے ساتھ ساتھ غداری کے زمرے میں بھی آتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صحت یابی کے فوراً بعد شانی یہاں پہنچ آیا تھا۔ دروازے کے لاک میں چابی گھماتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

بروج نے دھیرے دھیرے کھلنے والے دروازے سے شانی کو داخل ہوتا دیکھا تو بے اختیار اس کی طرف لپکی۔

"وہیں رک جاؤ بروج!" تحکمانہ انداز اور بیگانہ لہجہ۔ بروج اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ وہ حیران آنکھوں سے شانی کو دیکھے جا رہی تھی۔ شانی کے چہرے پر پژمردگی اور افسردگی تھی۔ جسمانی لحاظ سے وہ پہلے سے کمزور نظر آ رہا تھا۔ بروج تڑپ کر بولی۔

"شانی..... شانی یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ تم اتنے دن کہاں غائب تھے؟"

"بروج! یہ سب کیا ہو رہا ہے تم اچھی طرح سے جانتی ہو۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں بروج مگر اپنے ملک سے غداری میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔" شانی نے اپنے آپ کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"شانی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں غداری کیوں کروں گی؟ بارہا مواقع پر میں نے جان کی بازی لگائی ہے۔ اگر میں غدار ہوتی تو تمہارے ساتھ کئی کامیاب آپریشن نہ کرتی۔"

"وہ سب اپنی جگہ درست ہے بروج! مگر یہ بھی حقیقت ہے بروج کہ تم انتہائی پراسرار، مافوق الفہم اور بے وفا لڑکی ہو اور یہ بات بھی میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ لڑکی ہو بھی یا نہیں۔"

"شش..... شانی! یہ تم کیا کہے جا رہے ہو؟ میرا یقین کرو میں تمہارے لیے جان دے سکتی ہوں مگر تم سے غداری یا بیوفائی نہیں کر سکتی۔ میری زندگی صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہے ایک تم ہی تو ہو میرے جینے کا سبب۔" وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بولی۔

"ایم سوری بروج! میں تمہاری بے وفائی اور غداری کا ثبوت دیکھ چکا ہوں۔" شانی کی بات سن کر بروج تین چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے پر ناقابل یقین حیرت تھی۔

"شانی! اگر تم بھی مجھے غدار اور بے وفا سمجھتے ہو تو پھر" بروج نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے۔ "میں حاضر ہوں شانی مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دو۔ میں بھی تو دیکھوں مجھے دل و جان سے پیار کرنے والا شانی کتنا مضبوط دل ہے۔"

شانی نے ایک نظر بروج کو دیکھا۔ یہ وہی خوبصورت بروج تھی جسے اس نے دل میں نہیں روح میں بسایا تھا جو اس کی زندگی کا اہم حصہ تھی۔ کمرے میں ناقابل فہم اداسی، حبس اور پژمردگی چھائی تھی۔ شانی نے ریوالور نکال لیا تھا۔ وہ تھرتھراتے لبوں سے بولا۔

"بروج! میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ مجھے افسوس ہے بروج کہ تم نے میرے ساتھ نہیں میرے وطن کے ساتھ غداری کی ہے اور میں وطن کے غداروں کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ چاہے میری جان، میرا پیار بروج ہی کیوں نہ ہو۔" اس نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ گولی بروج کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر لڑکھڑاتی ہوئی نیچے گر گئی۔ خون کا فوارہ اس کے سینے سے پھوٹ پڑا تھا۔ بروج کے چہرے اور آنکھوں میں ہنوز حیرت کے آثار تھے۔ شانی کی انگلی رکی نہیں تھی اس نے یکے بعد دیگرے فائر کر کے پورا چیمبر خالی کر دیا تھا۔ خون میں لت پت بروج تڑپتے تڑپتے فرش پر ٹھنڈی ہو گئی شانی جو بت بنا ہوا اپنی جگہ جما کھڑا ہوا تھا اس نے ریوالور پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ ریوالور کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ شانی گھٹنے ٹیک کر فرش پر بیٹھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔

☆☆۞۞۞☆☆

وہاں ٹوٹل سات افراد موجود تھے۔ کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ بلکہ قالین اور گاؤ تکیے بچھائے گئے تھے۔ چھ افراد تکیوں سے ٹیک لگائے دیواروں کے ساتھ ہلال کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے باریش شخص مولانا عبدالرحمٰن محو گفتگو تھے۔ غلام رسول، حمزہ اور عبداللہ بھی ان سات افراد میں شامل تھے۔ ان کی خصوصی ٹریننگ جاری تھی اس ٹریننگ میں عربی کے ابتدائی رموز سیکھنے کی ایک کلاس بھی شامل تھی۔ سر جی نے انہیں بتایا تھا کہ انہیں بہت جلد فلسطین روانہ کر دیا جائے گا جہاں رہ کر

انہوں نے اسرائیل میں ایک خاص مشن مکمل کرنا ہے۔ اس لیے انہیں عربی زبان کی اتنی شدبد ہونا چاہیے کہ بوقت ضرورت وہ بات سمجھ اور سمجھا سکیں۔ آج کی کلاس ختم ہو چکی تھی۔ مگر بات عربی سے عربوں اور مسلمانوں پر چل نکلی۔ موضوع انتہائی دلچسپ تھا اس لیے وہ لوگ رک گئے۔ یہ بحث حمزہ نے چھیڑی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ آج کے عرب مسلمان اپنا قیمتی سرمایہ بے جا لٹا رہے ہیں۔ کئی ارب پتی شیوخ عیش و عشرت، بڑے بڑے محلات، سیر و تفریح اور دیگر فضول قسم کی مصروفیات میں پیسہ برباد کر رہے ہیں، وہ چاہیں تو کسی بھی غریب السلامی ملک کی کفالت کر سکتے ہیں مگر وہ ایسا کرنے سے گریزاں تھے۔
اس کی بات سن کر مولانا عبدالرحمٰن جنہیں وہ لوگ معلم کہہ کر پکارتے تھے اپنی لمبی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

"حمزہ! آپ ٹھیک کہتے ہیں، عرب شیوخ کی شاہ خرچیاں عروج بام پر ہیں۔ اگر انہوں نے کہیں کچھ سرمایہ کاری کی بھی تو ان کا انتخاب یورپ ٹھہرا ہے۔ یورپ کے کئی جوئے خانے اور شراب خانے عربوں کی ملکیت ہیں۔"

"معلم! کیا مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب مذہب سے دوری بھی ہے؟" یہ سوال کرنے والا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی کے بال ابھی نمودار ہو رہے تھے۔

"اس سے بڑھ کر دوسرا کوئی سبب ہو ہی نہیں سکتا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ عربوں نے اپنے اسلاف کو بھلا دیا ہے۔ اب وہ انہیں تکتے ہیں جنہوں نے عربوں سے ہی سیکھا ہے۔" معلم کا جواب سن کر اس بار عبداللہ بولا۔

"آج مغربی باطل قوتیں چاہیں وہ سیاستدان ہوں، سرمایہ دار ہوں، مفکر و دانشور ہوں یا مذہبی پادری ہوں ان کا سارا زور مسلمانوں پر مرکوز ہے۔"

"میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں بیٹا! مغربی باطل قوتیں یہ نہیں چاہتیں کہ مسلمان مرتد ہو کر کلمہ پڑھنا چھوڑ دیں بلکہ آج کے دور میں ان کی نئی حکمت عملی یہ ہے کہ مسلمان صرف نام کا مسلمان رہ جائے۔ عملاً وہ یہودی، عیسائی اور ہندو ہو۔"

معلم کی بات سن کر غلام رسول کے ذہن میں جان رائٹ کا مشن گھوم گیا۔ وہ بھی مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر اسی مشن پر گامزن تھا۔ غلام رسول بولا۔

"میں آپ کو بتاؤں اس مشن پر بہت بڑے نیٹ ورک سے کام ہو رہا ہے، ماضی اور حال کی تمام کامیابیاں جو مسلمانوں نے حاصل کی ہیں وہ ناکامیوں میں بدل جائیں اور مستقبل میں کوئی کامیابی حاصل کرنے کے قابل نہ چھوڑا جائے۔"

"میں آپ کی باتوں میں کچھ مزید اضافہ کرنا چاہوں گا۔" یہ بات کہنے والا نوجوان بھی کم عمر تھا۔ سوٹ میں ملبوس نوجوان نے معلم کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا پھر ان کا اشارہ پا کر بولا۔

"معلم! میں تاریخ اسلام کا طالب علم ہوں۔ تاریخ مسلمانوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ مگر یورپین مورخین کا تعصب دیکھیے انہوں نے بہت سے کارنامے یا تو یورپیوں کے حصے میں ڈال دیے اور جن کارناموں سے وہ چاہ کر بھی مسلمانوں کا نام نہ مٹا سکے۔ ان کے موجدین کا نام اس طرح خلط ملط کر کے پیش کیا کہ بادی النظر وہ بھی غیر مسلم ہی محسوس ہوتے ہیں۔"

"یہی بات میں کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ چاہتے ہی نہیں کہ یورپ کے طالب علم کو معلوم ہو کہ اصل اسلام اور مسلمان کیا ہیں۔" غلام رسول نے کہا۔

"محمد بلال! ہم آپ کے مطالعہ سے مستفید ہونا چاہیں گے۔" معلم عبدالرحمٰن نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا۔ انہیں اصل خوشی اس بات کی تھی کہ محمد بلال جیسے نوجوان تاریخ اسلام میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی متجسس نگاہوں سے محمد بلال کو دیکھ رہے تھے۔

"معلم! اہل یورپ نے تمام علوم مسلمانوں سے حاصل کیے ہیں۔ ورنہ وہ زیرو تھے۔ اس کے باوجود

انہوں نے خود کو ان علوم کا خصوصاً سائنسی ایجادات کا بانی ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جو سراسر غلط ہے۔ تجرباتی اصول کا موجد اہل یورپ کی نظر میں راجر بیکن ہے۔ حالانکہ سائنس کی ابتداء نظریاتی طور پر یونانیوں کا کارنامہ ہے۔ جبکہ تجرباتی طور پر اس کی ابتداء مسلمانوں کے سر جاتی ہے۔ میں یہاں کچھ مسلمان سائنسدانوں کے نام اور کارنامے بتانا چاہوں گا.....“ محمد بلال نے ایک نظر معلم کی طرف دیکھا۔ انہیں پوری یکسوئی سے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

”دوران خون کی تحقیق ابن نفیس نے شروع کی جبکہ یورپ نے ابن نفیس سے تین سو سال بعد آنے والے ہاروے کے سر اس کا سہرا سجا دیا۔ فضا میں پرواز کا کامیاب کارنامہ پہلی بار ابن فرناس نے سرانجام دیا تھا مگر صد افسوس اسے اطالوی مصور اور سائنسدان لیونارڈو کے نام منسوب کر دیا گیا ہے۔ قطب نما کی ایجاد مشہور جہاز ران ابن ماجہ کا شاندار کارنامہ ہے اور یورپ کی تنگ نظری دیکھیے اسے چینیوں کے نام تھوپنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے انڈیا پہنچانے والا ملاح بھی عربی تھا میں ایسے سیکڑوں کارنامے گنوا سکتا ہوں۔ جن کے موجد مسلمان ہیں مگر تاریخ انہیں غیر مسلموں کے ساتھ نتھی کرنے پر تلی ہوئی ہے۔“

”آپ کی عمر کیا ہے بیٹا؟“

”معلم! میری عمر اٹھارہ برس ہے۔“

”مجھے بے حد خوشی ہے کہ آج میری قوم کا اٹھارہ سالہ نوجوان تاریخ اسلام اور سائنس میں اس قدر دلچسپی رکھتا ہے۔ دین اسلام ازل سے ابد تک رہنے والا دین ہے۔ اس کے خلاف جب باطل قوتیں اور سازشی ٹولے اٹھے تو ان کے سامنے کوئی نہ کوئی محمد بن قاسم، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی بن کر سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑا ہوا ہے اور جب مطبوعہ مواد کے ذریعے تاریخ اسلام کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی تو انہیں محمد بلال جیسے نوجوان نے اس کا منہ توڑ جواب دیا ہے۔ بیٹا! آپ اپنی بات جاری رکھیں۔“

”جی معلم! اب میں آپ لوگوں کو مغرب کا ایک ظلم سناتا ہوں۔ کیسے انہوں نے مسلمان سائنسدان کے نام تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ دنیا کو پتہ چل نہ پائے کہ یہ ذہین و فہیم اور غیر معمولی انسانوں کا تعلق کس مذہب سے ہے۔ ابو علی سینا کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں انہوں نے دو سو اڑتیس تصنیف کی۔ تھرمامیٹر کے بانی ہیں۔ ماحول میں تبدیلی، پہاڑوں کے بننے اور زلزلے کے سائنسی اسباب بیان کیے۔ روح کے لافانی ہونے کے نظریے کی وضاحت بھی ابو علی سینا نے بیان کی۔ یورپ نے ان کا نام ایوی سینا مشہور کر رکھا ہے۔ زمین کا قطر معلوم کرنے اور پانی کی گہرائی ناپنے والے نیلو میٹر کے موجد ابو عباس احمد الفرغانی کو الفرگانوس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ افلاطون کے بعد مسلم دنیا کے عظیم مفکر ابو بکر محمد ابن یحییٰ کو ایون پیس کا نام دیا گیا ہے۔ اہل یورپ کے تعصب اور تنگ نظری کا ایک اور مظاہرہ کیجیے۔ حضرت امام صادق رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد علم کیمیا میں تجرباتی تحقیق کا طریقہ رائج کرنے والے جابر بن حیان کو گیبر کے نام سے لکھا اور پکارا جاتا ہے۔ تاکہ یورپ کا عام آدمی سمجھ ہی نہ پائے کہ عظیم انسان جنہوں نے علم کیمیا کے متعلق بائیس کتابیں لکھیں ان کے نظریات علم کیمیا کی تاریخ میں ایک ہزار سال تک رائج رہے۔ ان کی اصلاحات آج بھی جدید کیمسٹری کا جز ہیں۔ مختلف چیزوں سے عرق اور ست نکالنے کا آلہ تین معدنی تیزاب شورے کے تیزاب سے سونے کو حل کرنے والے ایسڈ کی ایسی دریافت ہے جو ہنوز جاری ہے ان کے کامیاب فارمولوں میں کپڑا رنگنے واٹر پروف کپڑے پر وارنس اور لوہے کو زنگ سے محفوظ رکھنے، فولاد بنانے، سونے کے حروف لکھنے، شیشہ سازی میں مکلس ڈی اوکسائیڈ کو استعمال کرنے کے کامیاب فارمولے شامل ہیں۔ مریض کو پہلی بار بے ہوش کرنے کے لیے الیون کا استعمال بھی جابر بن حیان نے بتایا۔ کہاں جابر بن حیان

اور کہاں گیبر ناموں کا یہ اتنا بڑا تضاد یورپین مورخین کے تعصب اور قوم پرست ہونے کی دلیل کرتا ہے...... "محمد بلال چند ثانیوں کے لیے رکا مگر تمام حاضرین کو مکمل یکسو پا کر پھر سے بولنا شروع کر دیا۔

"ابوالقاسم عظیم ترین سرجن جنہوں نے انسانی اعضا کی تحقیق کے لیے اپنے پوسٹ مارٹم پر زور دیا تھا۔ سرجری کے بہت سے آلات انہوں نے ایجاد کیے ان کی کتاب التعریف جو تمیں جلدوں پر مشتمل ہے آج بھی یورپ کے میڈیکل کالجز میں پڑھائی جاتی ہے مگر یورپین طالب علم انہیں ابوالقاسم جیسے مسلم نام سے نہیں بلکہ ابل کیسس کے نام سے جانتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کو بتاؤں۔ مسلمان سائنس کے خالق ہیں۔ علم کے میدانوں میں عظیم الشان کارناموں کے موجد ہیں۔ علم ریاضی، میڈیکل، سائنس، علم طبعیات، علم نباتات، علم کیمیا ہر میدان کے فاتح مسلمان ہیں۔ اگر آپ لوگ بور نہ ہوں تو میں چند کارناموں کا ذکر کروں۔"

"ہم ہمہ تن گوش ہیں بلال بھائی! پلیز آپ بولیے۔" غلام رسول نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سب محمد بلال کی سحر انگیز باتوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ معلم کی آنکھوں میں داد و تحسین تھا۔ بلال نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"پنڈولم کے خالق ابن الیوسف ہیں۔ دوربین ابوالحسن، بارود فتح اللہ، قطب نما ابن ماجہ، فوٹو گرافی ابن ہاشم اور گھڑی قطبی نے ایجاد کی۔ میں کتنے نام اور کارنامے گنواؤں۔" محمد بلال کے لہجے میں جذبات کا سمندر موجزن تھا۔ وہ اتنے خلوص اور محویت سے بول رہا تھا کہ سننے والوں پر سکتہ طاری تھا۔

"جدید ٹیکنالوجی میں آج جس مقام پر غیر مسلم اترا رہے ہیں کل یہ مسلمانوں کا وتیرہ تھا۔ علم سائنس ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ مگر آج کا مسلمان مغرب کے پیچھے بھاگ کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا ہے مغرب ڈوبنے کی جگہ ہے جبکہ مشرق ابھرنے کا مقام۔ مگر مشرق نے مغرب کی پیروی میں خود کو ڈبو دیا۔ ہم ان کی سازشوں میں ایسے پھنسے کہ ہم نہ مسلمان رہے نہ کافر۔ بلکہ کچھ اور ہی بن گئے ہیں۔" محمد بلال کہتے ہوئے چپ ہوا تو معلم عبدالرحمن نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"شاباش بیٹا! کاش میری قوم کا ہر نوجوان محمد بلال بن جائے۔"

"معلم! میرا دل کٹ جاتا ہے جب میں انگلش کی تاریخ میں محمد بن یوسف الخوارزمی کو الگورزم کے نام سے پڑھتا ہوں۔ یورپ اپنی یونیورسٹیوں میں ان کی شہرہ آفاق کتاب الجبر والمقابلہ کو نصاب میں شامل کرتے ہیں مگر ان کا اصل نام چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"بھائی محمد بلال! کیا آپ محمد بن موسیٰ کے بارے میں مزید کچھ بتا سکتے ہیں۔" حمزہ کے کہنے پر محمد بلال نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کہا۔

"جی بھائی! کیوں نہیں۔ محمد بن موسیٰ کا عظیم کارنامہ صفر یعنی زیرو کی ایجاد ہے۔ جس نے حساب کتاب کو بہت آسان اور سہل کر دیا ہے۔ صوت الارض نامی کتاب آپ نے جغرافیہ پر لکھی۔ صوت الارض کا لاطینی زبان میں ترجمہ کرنے والے مصنف سی اے نیلینو نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ایسا کارنامہ کوئی بھی یورپی قوم اپنی سائنسی ترقی کے آغاز میں پیش نہیں کر سکی ہے۔ زمین کی پیمائش اور اجرام فلکی کی گردش پر تحقیق کرنے والا آلہ اسطرلاب کی ایجاد بھی آپ کا کارنامہ ہے۔ علم مثلث کے متعلق شیڈول بھی آپ نے ایجاد کیا تھا۔"

"محمد بلال بیٹا! جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ مگر ہمارے پاس وقت کی کمی ہے۔ انشاء اللہ پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔" معلم عبدالرحمن نے کہا۔ پھر غلام رسول کے اندر بے چینی اور اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے بولے۔

"غلام رسول! کیا بات ہے۔ آپ بے چینی سے پہلو کیوں بدل رہے ہو؟"

"معلم! مجھے لگتا ہے عمارت میں کچھ مسلح شر پسند داخل ہو چکے ہیں۔" غلام رسول کی بات سن کر وہ سب چونک پڑے۔ حمزہ اور عبداللہ کے اعصاب تن گئے تھے۔ تاہم معلم عبدالرحمٰن سکون سے بولے۔

"غلام رسول! آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیے یہاں کوئی بھی غیر متعلقہ شخص داخل نہیں ہو سکتا۔"

معلم عبدالرحمٰن کی خود اعتمادی اپنی جگہ مگر غلام رسول کی بے چینی رفع نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ ایک بار تو وہ بری طرح چونک پڑا تھا۔ معلم اس کی کیفیت نوٹ کر رہے تھے۔ تاہم بولے کچھ نہیں۔ ایک گھنٹہ بعد جب معلم نے انہیں جانے کی اجازت دی تو غلام رسول کو انہوں نے دس منٹ کے لیے روک لیا۔ دوسرے لڑکوں کے جانے کے بعد معلم بولے۔

"غلام رسول! آپ نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ عمارت میں شر پسند گھس آئے ہیں کیا آپ کو اس بات کا بیٹھے بٹھائے الہام ہوا تھا؟"

"نن...... ہو گیا تھا۔" اس کی کیفیت دیکھ کر معلم فوراً بولے۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے پتہ ہے کہ آپ کو کیسے پتہ چلا تھا۔"

"جی......!" غلام رسول نے حیرت سے لمبی جی کا لفظ ادا کیا۔ معلم نے اسے بغور دیکھتے ہوئے بات میں اضافہ کیا۔

"آپ کو اس جن نے اطلاع دی تھی جو مسلسل آپ کے ساتھ رہتا ہے۔"

"جن......؟" غلام رسول نے حیرت سے دہرایا۔ اس کے چہرے پر حیرت جم کر رہ گئی تھی۔ معلم بھی اس کی حیرت پر حیران ہو رہے تھے۔

"کیا تمہیں نہیں پتہ کہ تمہارے ساتھ جن موجود ہے؟"

"نہیں معلم! ایسی کوئی بات نہیں۔" غلام رسول نے اس بار تحمل سے جواب دیا۔ اس کے لہجے کا اعتماد اور چہرے کے تاثرات دیکھ کر معلم بولے۔

"ہو سکتا ہے میں غلطی پر ہوں۔ مگر آپ غلطی پر نہیں تھے۔ عمارت میں واقعی چار بندے داخل ہوئے تھے۔"

اس بار غلام رسول حیران ہوا۔

"معلم! آپ کو کیسے پتہ چلا۔ جبکہ آپ بھی مسلسل ہمارے ساتھ موجود رہے ہیں۔"

"میرے ساتھ چند مسلمان جنات رہتے ہیں انہوں نے ہی مجھے آ کر اطلاع دی تھی۔ مگر میں اس لیے بے فکر تھا کہ عمارت سے نہ کچھ لے جا سکتے ہیں اور نہ ہی ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کمرے کا دروازہ باہر سے نظر نہیں آتا۔ جنات نے اس دروازے کو سپاٹ دیوار میں بدل دیا تھا۔"

"اوہ اب میں سمجھا تبھی آپ کو شک گزرا تھا کہ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔"

"بالکل اور مجھے اب بھی یہی یقین ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں معلم! میں آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"آپ جانتے ہو کہ یہ کون لوگ تھے؟"

"نہیں معلم!"

"یہ وہی لوگ تھے جن کے خلاف تم لوگ برسرِپیکار ہو۔ مگر یہ یہاں کیسے پہنچ گئے۔ کیا انہوں نے ہم میں سے کسی کا تعاقب کیا تھا؟ غلام رسول آپ کے پاس کریڈٹ کارڈ ہے؟"

"جی معلم! یہ لیجیے۔" غلام رسول نے والٹ سے بینک کریڈٹ کارڈ نکال کر انہیں پیش کر دیا۔

"غلام رسول! آپ کے دشمن جدید ترین آلات سے لیس ہیں۔ یہ برقی ٹیگ دیکھ رہے ہو؟" معلم نے کارڈ پر لگی مائیکرو چپ پر انگلی رکھتے ہوئے غلام رسول کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ غلام رسول نے حیرت سے صرف اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"غلام رسول یہ وہ جاسوس ہے جسے نہ ہم پکڑ سکتے ہیں نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ گمان کر سکتے ہیں مگر ڈھونڈے

والے ہمیں اس جاسوس کے توسط سے کھوج لیتے ہیں۔"
غلام رسول کے لیے یہ انوکھی بات بالکل نئی تھی۔
"مگر معلم! کریڈٹ کارڈ تو آج کل ہر دوسرے شخص کے پاس موجود ہے۔"
"عنقریب ہر شخص کے پاس ہوگا۔ دنیا پر راج کرنے والی یہودیوں کی نئی کرنسی یہی الیکٹرونک منی ہوگی۔"
"معلم! میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ برقی ٹیگ کو استعمال کرنے والے اپنا ٹھیک نشانہ کیسے لگاتے ہیں؟"
"غلام رسول! آپ کو کریڈٹ کارڈ آپ کا مکمل بائیو ڈیٹا لینے کے بعد جاری کیا گیا ہے۔ اس پر سیریل نمبر اور بینک کا اپنا کوڈ نمبر بھی موجود ہے۔ غلام رسول کو تلاشنے والے ان کی مدد سے باآسانی پہنچ جاتے ہیں۔"
"معذرت کے ساتھ معلم! ایسی سائنسی اور سیکرٹ معلومات آپ تک کیسے پہنچی ہیں؟"
"آپ بھول رہے ہو غلام رسول! آپ ایک حساس ادارے کی زیر نگرانی ٹریننگ لے رہے ہو....." معلم نے چند ثانیے خاموشی کے بعد کہا۔
"آپ جیسے لوگوں کو کریڈٹ کارڈ فرضی نام سے استعمال کرنا چاہیے۔"
"آپ بجا فرماتے ہیں معلم! پاکستان میں انٹرنیشنل تنظیمیں متحرک ہیں جو یقیناً اس قسم کے جدید آلات سے لیس ہوں گی۔"
"بیٹا! مائیکرو چپ کی ایجاد کے بعد اسے پیوند کاری کے ذریعے جاسوسی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ انسانی دماغ، پنڈلی یا بازو کے اندر چھپا دیا جاتا تھا۔ مگر اب برقی ٹیگ کی جدید اشکال دنیا میں عام ہو چکی ہیں۔"
"معلم! آپ نے جنات کا ذکر کیا تھا۔ آپ کے جنات نے عمارت میں داخل ہونے والے بندوں کا کھوج لگایا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟"
"جی ہاں بیٹا! وہ لوگ جیسے ہی عمارت میں داخل ہوئے تھے میرے تابع جنات نے مجھے اطلاع دے دی تھی اور میں نے انہیں نگرانی پر بھی مامور کر دیا تھا۔ اس وقت وہ لوگ اندرون شہر حلیم رضا کے گھر پر موجود ہیں۔ حلیم رضا ایسا شخص ہے جو کوئٹہ شہر میں ایک بہت بڑا رفاہی ادارہ چلا رہا ہے۔ اس کا نام اعلیٰ حلقوں میں عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔"
"بہت شکریہ معلم! اب میں جانا چاہوں گا۔" غلام رسول نے اجازت طلب نگاہوں سے معلم کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولے۔
"فی امان اللہ۔"
غلام رسول نے باہر آتے ہی سیر جی کو فون ملا دیا وہ انہیں حلیم رضا کے گھر پر حملہ کرنے کی تفصیل بتا رہا تھا۔



بیگم کلثوم نے کچن میں جھانک کر دیکھا۔ منزہ ہنوز کام میں جتی ہوئی تھی۔ شاید کچھ کام ابھی باقی تھا۔ وہ لحہ بھر کو رکیں مگر پھر ڈرائنگ روم کی طرف نکل گئیں۔ ملازم صبح سے پورے گھر کی صفائی میں مگن تھے۔ بیگم کلثوم نے چاہا تھا۔ کہ کھانا ہوٹل سے منگوا لیتے ہیں لیکن منزہ کھانا خود تیار کرنے پر بضد تھی۔ بیگم کلثوم نے وال کلاک کو دیکھا دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ یقیناً مہمان آنے والے ہوں گے۔ انہیں شانی کا خیال آیا جو سامان لانے کے بعد کمرے میں ایسے گھسا کہ اب تک نکلا نہیں تھا۔
شانی کمرے میں اداس بیٹھا ہوا تھا۔ بروج کی یادوں نے اسے غموں کے سمندر میں دھکیل رکھا تھا۔ وہ جن دنوں اپنے کام میں مگن ہوتا یادوں سے کسی حد تک چھٹکارہ پالیتا۔ مگر جیسے ہی فرصت کے چند لمحات میسر آتے بروج ایک دم سے اس کے سامنے آکھڑی ہوتی تھی۔ وہ بروج کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ ہی اس سے وابستہ باتیں اور واقعات کو دہرانے کا خواہاں تھا۔ مگر یادوں اور سوچوں پر پہرے کون بٹھا سکتا ہے۔ اس نے ہمیشہ بروج کی یادوں سے مات کھائی تھی۔ یہ سوچ کر اس کی روح بھی کانپ اٹھتی تھی کہ بروج نے نہ صرف اس سے بے وفائی کی بلکہ پاکستان سے بھی غداری کی

مرتکب ہوئی تھی۔ بات یہاں تک رکی نہیں۔ بروج اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ اس کی موت شانی کے ہاتھوں واقع ہوئی تھی یہ داستان عشق کتنی لرزہ خیز تھی کوئی شانی کے دل سے پوچھتا تو پتہ چلتا کہ دائمی ہجر کے دردوں کی ٹیسیں کیا ہوتی ہیں بیگم کلثوم میں کب داخل ہوئیں سوچوں میں محو شانی کو احساس نہیں ہوا۔ بیگم کلثوم شانی کی حالت دیکھ کر اندر سے لرز اٹھیں۔ انہوں نے شانی کے لیے کیا سوچا تھا اور مقدر نے اسے کیا دے دیا۔ بیگم کلثوم نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ شانی نے بدک کر آنکھیں کھول دیں۔ اداس آنکھوں میں تیرتا پانی باہر نکلنے کو بے چین ہو رہا تھا۔ بیگم کلثوم نے ہاتھوں سے اس کے ڈھلکتے آنسو صاف کیے اور بولیں۔

''شانی! تم میرے بہادر بیٹے ہو۔ تمہارے سر سے 19 سال کی عمر میں باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ تمہاری گود میں سگی بہن نے دم توڑا تھا۔ شانی تم نے تو وہ سب غم سہے ہیں۔ تم اتنے چھوٹے دل کے مالک تو نہ تھے۔''

''ممی! بروج کو طبعی موت آجاتی تو میں برداشت کر لیتا مگر ممی حالات کی ستم گری دیکھیے کہ مجھے خود اسے مارنا پڑا۔ مجھے یہ کلک دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ کاش بروج بیوفا ہوتی مگر غدار نہ ہوتی۔ میں اس کی بیوفائی بھی قبول کر لیتا۔ اب میں اس کی ساری یادوں سے دل سے کھرچنا چاہتا ہوں مگر ممی وہ میرے دل و دماغ سے جاتی نہیں۔'' شانی نے ماں کے سینے میں سر چھپاتے ہوئے کہا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ بیگم کلثوم نے اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ راز تب افشا ہوتا جب وہ تمہاری بیوی بن گئی ہوتی۔ سوچو تو تب تمہیں کتنی تکلیف اور اذیتیں جھیلنا پڑتیں۔ تم اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دو۔ کیونکہ بیٹا کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جن کا بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

''کوشش کرتا ہوں ممی! پر کامیاب نہیں ہو پاتا میں بروج کی منہ زور یادوں کو لگام نہیں دے سکتا۔''

''رفتہ رفتہ ان پر قابو پانا سیکھ لوگے بیٹا۔'' وہ لوگ باتوں میں مصروف تھے کہ ملازم نے آکر مہمانوں کے آجانے کی اطلاع دی۔

''ارے ہمیں باتوں میں احساس ہی نہیں ہوا۔ اٹھو بیٹا! جلدی سے فریش ہو کر مہمان خانے آجاؤ۔'' بیگم کلثوم دوپٹہ سنبھالتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

ڈرائنگ روم میں حمزہ کی پوری فیملی آئی ہوئی تھی۔ بس حمزہ نہیں تھا۔

''السلام علیکم!'' بیگم کلثوم نے داخل ہوتے ہی خوشدلی سے کہا۔ وہ سب عورتوں سے گلے ملی۔ حمزہ کے ابو سے حال احوال پوچھا۔

''کیسے ہیں بھائی صاحب؟'' حمزہ کا بڑا بھائی یاسر بھی موجود تھا۔ بیٹا! آپ ٹھیک ہو؟ بیگم کلثوم نے کہا۔

''بیٹھیے بیٹھیے پلیز۔''

''دیکھ لیجیے کلثوم! آج ہمارا پورے کا پورا گھر ہی چلا آیا ہے۔''

''زہے نصیب' میں آپ لوگوں کی شکر گزار ہوں کہ میرے غریب خانے کو رونق بخشی ہے مگر......'' بیگم کلثوم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''حمزہ بیٹا نظر نہیں آرہا؟''

''اسے ایک خاص کام کے لیے روک لیا ہے۔'' حمزہ کی ممی نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

منزہ اور شانی اس دوران کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے بھی خوش دلی سے مہمانوں کا استقبال کیا۔

''ہاں بھئی شانی! کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں انکل اللہ کا شکر ہے۔''

''بیٹا! حمزہ آپ کی بہت تعریفیں کرتا ہے۔''

''انکل! وہ خود بہت اچھا انسان ہے اس لیے دوسرے سب اسے اچھے نظر آتے ہیں۔ ویسے وہ آج آپ کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟'' شانی نے کہتے ہوئے موبائل نکال لیا تھا۔

''ایک منٹ میں ابھی اسے بلاتا ہوں۔''

''رکو بیٹا۔'' حمزہ کی ممی فوراً بولیں۔

''وہ آج نہیں آپائے گا۔''

''مگر کیوں آنٹی؟ مجھے پتہ ہے آج میری طرح وہ بھی فری ہے۔''

''وہ بعد میں بتاتی ہوں بیٹا۔'' آنٹی نے کہہ کر اسے خاموش کر دیا۔

منزہ حمزہ کی بہنوں کے ساتھ کان میں کھسر پھسر کر رہی تھی۔

کھانے کے بعد وہ انہیں اپنا گھر اور فارم ہاؤس دکھانے لے گئی۔ جبکہ آنٹی نے بعد والی بات کھول دی تھی۔

''ہم یہاں حمزہ کے لیے منزہ کا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔'' بیگم کلثوم اس خوشگوار سرپرائز کی بالکل بھی توقع نہیں کر رہی تھی۔ نہ ہی شانی کو کوئی ایسا گمان تھا۔ اس لیے دونوں ہی حیرت سے خاموش ہو گئے۔

''کیا سوچ رہی ہو کلثوم؟'' حمزہ کی ممی نے اسے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''ہم آپ کے دیکھے بھالے لوگ ہیں۔'' حمزہ کے ڈیڈی بولے۔

''شانی بیٹا! آپ تو حمزہ کو بہت اچھی طرح جانتے ہو۔'' شانی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حمزہ کی ممی اٹھ کر بیگم کلثوم کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ وہ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''کلثوم بہن! آپ تینوں بیٹوں سے صلاح مشورہ کر لو۔ ہم فیصلہ لینے کے لیے دوبارہ آجائیں گے۔''

''نہیں بہن! مشورہ تب کیا جاتا ہے جب رشتہ غیروں میں جا رہا ہو۔ اپنوں کے معاملے میں مشورہ کیسا۔ اگر شانی کو یہ رشتہ منظور ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

شانی ماں کی بات سن کر آبدیدہ ہو گیا۔

''ممی! خدا نہ کرے کہ آپ کے ہوتے ہوئے میں کوئی فیصلہ کروں۔ آپ کا فیصلہ میرے سر آنکھوں پر۔''

''تو ہم یہ رشتہ پکا سمجھیں؟''

''بالکل بھائی صاحب منزہ آپ کی ہی بیٹی ہے جب چاہیں آ کر لے جائیں۔'' بیگم کلثوم کے فیصلے پر کئی چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

''مبارک ہو۔'' وہ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ حمزہ کے ڈیڈی بولے۔

''یاسر ارے یار مٹھائی تو لاؤ ہمارا سامان کہاں ہے؟''

''جی ڈیڈی! ایک منٹ۔''

منہ میں مٹھائی رکھتے ہوئے بیگم کلثوم کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے تھے۔ اسے اپنے شوہر اسد محمود خان اور بیٹی کنزہ بڑی شدت سے یاد آنے لگے تھے۔



ویل ڈیورنٹ نے اپنے گروپ کے سامنے اپنا نیا نظریہ پیش کیا۔ چاروں سائنسدان اسے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ دبلا پتلا سائنسدان میک ملن جس کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا۔ مگر مونچھیں اور بھویں مکمل سفید تھی۔ اس نے ویل ڈیورنٹ کو دیکھا اور پھر حیرت سے بولا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈیورنٹ یہ کیسے ممکن ہے؟ ویل کے بولنے سے پیشتر شان پولاک بولا۔

''ویل ڈیورنٹ یہ سب تو قدرتی نظام ہے۔ پندرہ ارب سال پہلے جب دنیا وجود میں آئی تب سے یہ نظام چلا آرہا ہے۔'' شان پولاک کے لہجے میں بھی حیرت دوچند تھی۔

ویل ڈیورنٹ نے دوسرے ساتھیوں بروس ریڈ اور جیمس کوئل کی جانب دیکھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ بھی اپنی رائے کا اظہار کریں گے مگر وہ دونوں حسب عادت خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کم گو تھے۔ بولنے سے زیادہ سننا پسند کرتے تھے۔ ویل نے انہیں خاموش پا کر کہا۔

''آپ لوگوں کو پتہ ہی ہوگا۔ آج سے بہت سال پہلے جب موسموں کو کنٹرول کرنے کا نظریہ پیش ہوا تھا تو

اسے بھی ناممکن قرار دیا گیا تھا۔ بھلا موسم پر کسے اختیار ہو سکتا ہے یہ بھی ایک قدرتی عمل ہے۔ مگر وقت نے ثابت کیا ہے کہ ہم نے جو کہا وہ سچ کر دکھایا ہے۔ اس بات میں تھوڑی سی کمی بیشی ہے جو عنقریب پوری کر دی جائے گی۔'' ویل ڈیورنٹ کی بات پر وہ سب لاجواب ہو گئے تھے۔ وہ بہت اچھی طرح جانتے تھے 1960ء کے عشرے میں امریکہ کے ذہین دماغوں نے ریاست الاسکا کا میں کاکونا کے ویران مقام پر پچیس کروڑ ڈالرز کی لاگت کا منصوبہ شروع کیا تھا۔ یہ منصوبہ چیدہ چیدہ سائنسدانوں کی نگرانی میں پروان چڑھا تھا۔ یہ منصوبہ بیس سال کے طویل عرصے میں پورا ہوا تھا۔ اس منصوبے کے لیے چودہ ایکڑ زمین کا رقبہ مختص کیا گیا تھا۔ کاکونا کا یہ مقام اس لحاظ سے اہمیت کا حامل تھا کہ یہ دنیا کی آئیڈیل جگہ تھی۔ دنیا کا شمالی خطہ ہونے کی وجہ سے یہاں سے پوری دنیا میں جہاں سائنسدان چاہیں اپنے ٹارگٹ کو ہٹ کر سکتے تھے۔ اس پروجیکٹ کو پورا کرنے والے ادارے کا نام ہارپ رکھا گیا تھا۔ ہارپ میں جدید ترین ٹیکنالوجی کا استعمال ممکن بنایا گیا تھا۔ ہارپ میں کام کرنے والے ذہین سائنسدانوں کے سامنے ایک نظریہ موجود تھا.....'' ویل سانس لینے کے لیے رکا اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھا۔

''ایک سیکنڈ میں بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہونے والے پانی کی تعداد ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ٹن ہے۔ اپنے ساتھ نمک کے پھندے لے جانے والے یہ بخارات اوپر جا کر ٹھنڈک کا سبب بنتے ہیں۔ ٹھنڈ کے ساتھ ہوا اور اس کی مٹی کا امتزاج ہوتا ہے۔ تب بادل بنتے ہیں بادلوں میں قطرے اور پھر بارشیں بارہ سو کلو میٹر بلندی سے برستی ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں جب بخارات ہوا میں تحلیل ہوتے ہیں تو اوپر ایک سمندر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ماہرین کا کہنا ہے کہ فضا میں دس بخارات کی شکل میں دریا پائے جاتے ہیں۔ ان دریاؤں کو چھیڑ کر ہواؤں اور بارشوں کا نظام درہم برہم کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی راکٹوں اور مصنوعی سیاروں کے ذریعے بادلوں پر کیمیائی مادے کا چھڑکاؤ من چاہے علاقے پر مصنوعی بارش برسانا ممکن بن جاتا ہے۔ ہارپ مرکز پر بائیس میٹر بلند تین سو ساٹھ ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ایک سو اسی اینٹینا سے کئی ارب واٹس قوت کی برقی توانائی حفاظتی تہہ کی جانب پھینکی جاتی ہے۔ زمین کے چاروں طرف چالیس سے چھ سو میل اوپر Lonosphere حفاظتی تہہ موجود ہے۔ واٹس قوت کی برقی توانائی ہائی فریکوئنسی، ریڈیائی لہروں کے ذریعے حفاظتی تہہ کی جانب سفر کرتی ہیں۔ در اصل Lonosphere کو شعاعوں کے ذریعے ایسے نشانہ بنایا جاتا ہے کہ سائنسدان تابکار لہروں کو زمین سے ٹکراتے ہیں اور موسم میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ چاہیں تو روس کے جنگلات میں قیامت خیز آگ لگا دیں، چلی اور ہیٹی میں زلزلے پیدا کر دیں یا پھر پاکستان میں سیلاب کو جنم دے دیں۔''

''ویل ڈیورنٹ! بلاشبہ ہارپ نے ناقابل یقین حد تک کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ مگر ان تجربات میں خطرات بہت کم تھے۔ ناکامی کی صورت میں مالی خسارہ تو اربوں ڈالرز کا ہونا تھا مگر جانی نقصان کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ جبکہ آپ کے موجودہ نظریے میں بہت سی باتیں خطرناک ہیں۔'' میک ملن نے کہا۔ اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بروس ریڈ بولا۔

''ویل ڈیورنٹ! ہیروشیما پر جو ایٹم بم گرا تھا اس کا ٹمپریچر چھ ہزار سینٹی گریڈ تک گیا تھا۔ چھ ہزار سینٹی گریڈ کے ٹمپریچر میں دو لاکھ تیس ہزار آدمی چند منٹوں میں لقمہ اجل بن گئے تھے' آپ سورج کی آگ میں رد و بدل چاہتے ہیں۔'' بروس کی بات سن کر ویل ڈیورنٹ نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ان کی حیرت سے محظوظ ہو رہا ہے۔

''بروس! ذرا آپ سورج کی آگ برسانے والی بات کی وضاحت تو کیجیے۔''

''سورج ہر سیکنڈ میں ایک دھماکا کرتا ہے۔ دراصل

یہ دھماکا تب ہوتا ہے جب ہر سیکنڈ میں چودہ ارب ٹن ہیلیم گیس بارہ ارب ٹن میں تبدیل ہوتی ہے۔ تبدیلی کے اس مرحلے میں دھماکا ہوتا ہے۔ زمین پر پچاس کروڑ ایٹم بم اکٹھے پھٹ جائیں تو ان میں سے جو آگ نکلے گی یہ دھماکہ اتنا ہی طاقتور ہوتا ہے۔ اتنی ہی آگ سورج زمین کی طرف پچھلے پندرہ ارب سالوں سے پھینک رہا ہے۔ اگر ایک ایٹم بم دو لاکھ تیس ہزار افراد کو لمحوں میں موت کی وادی میں اتار سکتا ہے تو پچاس کروڑ ایٹم بم پوری کائنات کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتے ہیں۔ مگر سورج کے اس دھماکے کا اثر زمین پر نہیں پڑتا۔ کیونکہ سورج کی آگ کا صرف ایک حصہ زمین پر اترتا ہے۔ بیس کروڑ 99 لاکھ 99 ہزار 999 حصے فضا میں ہی گم ہو جاتے ہیں۔ اگر سورج ایک حصے کی بجائے دو حصے زمین کی طرف بھیجنا شروع کر دے تو انسانوں اور جانوروں کی ہڈیوں سے گوشت خود بخود گلنے سڑنے لگے۔"

"بالکل ٹھیک بروس ریڈ! مگر مجھے لگتا ہے آپ میری بات کو مکمل طور سے سمجھے نہیں ہیں۔"

"ویل ڈیورنٹ! ہم واقعی آپ کا نظریہ مکمل طور سے سمجھ نہیں پائے ہیں۔" جیمس کونل نے پہلی دفعہ لب کشائی کی تھی۔

"بہتر یہی ہے کہ آپ ہمیں تفصیلاً اس کے بارے میں بتائیں۔"

"او کے۔ میں اپنے نئے نظریئے کو پیش کرتا ہوں۔ بلکہ ٹھہریے پہلے چند مثالیں دینا چاہوں گا۔" ویل ڈیورنٹ نے آمادہ ہوتے ہوئے کہا۔ چاروں سائنسدانوں کے چہروں پر تجسس امڈ آیا تھا۔ ویل نے کہنا شروع کیا۔

"بگ بینگ ہونے سے قبل یہ کائنات ایک بڑی کمیت تھی۔ بگ بینگ کے بعد کہکشائیں وجود میں آئیں اس کے بعد ستارے، سیارے، سورج، چاند وغیرہ میں تقسیم ہوئے۔ کائنات کی ابتداء ایک اچھوتے انداز میں ہوئی تھی۔ ایک دھماکا ہوا۔ دھماکے کے سبب مادے میں رفتار اور کشش پیدا ہوئی۔ رفتار اور کشش میں اگر تھوڑا سا بھی فرق ہو جاتا تو کائنات پھر سے تباہ ہو جاتی تھی۔ مگر کائنات ایک منظم طریقے سے وجود میں آئی۔ پرانے لوگ جبکہ سائنس کا وجود نہ تھا۔ لوگ زمین کو چپٹا سمجھ کر دور کے سفر سے اجتناب کرتے تھے کہ کہیں زمین سے گر ہی نہ جائیں۔ 1597ء میں بحری سفر کرنے کے بعد سر فرانس ڈریک نے پہلی دفعہ یہ ثابت کیا کہ زمین چپٹی نہیں بلکہ بیضوی ہے۔ اس پر مزید ریسرچ ہوتی رہی اور 1929ء میں ایڈون ہبل کیلی فورنیا کے ماہر فلکیات نے ثابت کیا ہے کائنات بڑے منظم طریقے سے حرکت میں ہے۔ زمین ہر سیکنڈ کے بعد سورج سے 2.8 ملی میٹر دور ہو جاتی ہے۔ اگر یہ زمین 2.8 کی بجائے 3.1 ملی میٹر دور ہو جائے تو اس میں 3 میکرو میٹر کا فرق پڑ جائے گا۔ جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں مائیکرو میٹر اتنا چھوٹا ہے کہ نظروں سے نہیں مائیکروسکوپ سے دیکھا جاتا ہے۔ زمین 2.5 ملی میٹر یعنی 3 مائیکرو میٹر کم ہو جائے تو چوبیس ہزار کلو میٹر کا زمینی حجم کم ہو جانے سے آگ کا بگولہ بن جائے گا اور اگر بڑھ جائے تو برف خانہ بن کر کائنات موت کی وادی میں چلی جائے۔"

"یہی تو ہم کہنا چاہتے ہیں ویل ڈیورنٹ! یہ سب قدرتی نظام ہے۔"

"پہلے سن تو لو!" ویل ڈیورنٹ کے لہجے میں ناگواری تھی۔ "فضا میں 21 فیصد آکسیجن ہے 77 فیصد نائٹروجن، 1 فیصد کاربن ڈائی آکسائیڈ اور باقی کا ایک فیصد دوسری گیسیں موجود ہیں۔ آکسیجن کو اگر 21 کی بجائے 22 فیصد کر دیا جائے اور اس میں برمودا ٹرائی اینگل سے حاصل کی گئی شعاعوں کا امتزاج کیا جائے تو دنیا میں ہم جہاں چاہیں گے آتشزدگی کے واقعات میں ستر سے اسی گنا اضافہ کر سکتے ہیں اور اگر 21 سے 25 فیصد تک صرف آکسیجن کو لے جایا جائے تو ماسوائے قطب شمالی اور جنوبی کے برفوں میں کھڑے درختوں کے سارا جہاں آگ میں جل کر خاکستر ہو جائے گا.....'' ویل ڈیورنٹ

چند لمحات رکا پھر بولا۔

"اب میں آتا ہوں اپنے نظریے کی طرف۔ آپ لوگوں کو یہ تو پتہ ہے کہ ہم کئی ذہن دماغوں کو یکجا کر کے ایک سپر مین بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور برمودا تکون میں پراسرار محیر العقل شعاعوں پر بھی قابو پالیا ہے۔ اس لیے ہم دو مزید تجربات کریں گے۔ ایک میں بتا چکا ہوں۔ فضا میں موجود اکیس فیصد آکسیجن کو چھیڑنے کا تجربہ اور دوسرا سورج میں دھماکا کرنا ہے اور ہیلیم گیس کو چودہ ارب ٹن سے بارہ ارب ٹن میں تبدیل کرنا ہے۔ سورج ایک وقت میں مشرق میں روشنی پھینک رہا ہوتا ہے اور دوسرے وقت مغرب میں یوں ہم جس علاقے کو آگ میں جلا کر بھسم کرنا چاہیں گے تب سورج کی آگ کو چھیڑیں گے۔" ویل ڈیورنٹ نے انہیں دو گھنٹوں تک لیکچر دیا۔ جب وہ پانچوں اس نظریے سے متفق ہو گئے تب ویل ڈیورنٹ نے بات اعلیٰ حکام تک پہنچائی۔ بہت جلد اس پروجیکٹ کی دھوم حکام بالا میں بج اٹھی تھی۔ مگر وہ بہت دنگ رہ گئے تھے جب ڈیوڈ نے ایک میٹنگ میں اس پروجیکٹ کا تذکرہ چھیڑ دیا تھا۔ ڈیوڈ اس پروجیکٹ کے بارے میں نہ صرف مکمل جانتا تھا بلکہ اس کے پاس حسب سابق مزید حیران کن آئیڈیے موجود تھے۔ بحالت مجبوری اس عظیم پروجیکٹ میں اسرائیل کو بھی رازدار بنا لیا گیا تھا۔ دنیا کے اس کے مہنگے ترین اور عقل کو دنگ کر دینے والے تجربے پر ڈیوڈ بھی کام کر رہا تھا۔



پانچ افراد کا قافلہ شمال جنوب کی طرف بہنے والے دریا، دریائے اردن سے رات کی تاریکی میں فلسطین میں داخل ہوا تھا۔ ان پانچ افراد میں غلام رسول، حمزہ اور عبداللہ بھی شامل تھے۔ ان کے ساتھ دو نوجوان راہبر ابو محمد اور اونس طلال شریک سفر تھے۔ ارض فلسطین پر قدم رکھتے ہی تینوں سجدہ ریز ہو گئے تھے۔ فلسطینی راہبروں نے انہیں محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ ان کا سجدہ شکر ارض فلسطین سے والہانہ محبت کا ثبوت تھا۔ بلاشبہ فلسطین دنیا میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے لیے تیسرا معتبر ترین مقام ہے۔ ابو محمد اور اونس طلال دونوں نوجوان چست و چالاک، پھرتیلے اور تمام علاقے کے چپے چپے سے واقف تھے۔ وہ انہیں پو پھوٹنے سے پہلے پہلے بیت المقدس کے شمال میں واقع پہاڑی چوٹیوں کے ایک محفوظ مقام پر پہنچا چکے تھے۔ وہاں مجاہدین کا گروپ موجود تھا۔ انہوں نے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا تھا۔ یہ وہ مجاہدین تھے جو اسرائیل کے جدید ترین جوہری حیاتیاتی کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کے سامنے غلیل اور پتھروں کی جنگ کرتے کرتے اس مقام پر پہنچے تھے۔ ان کے جسم پر کمانڈوز کی وردیاں تھیں۔ سر پر فلسطین کا روایتی عمامہ اور گلے میں کلاشنکوف لٹک رہی تھی۔ ان مجاہدین کا عہد تھا کہ وہ یہودیوں کو فلسطین کی پاک سرزمین سے نکال کر دم لیں گے۔ جب حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا دور حکومت تھا تب فلسطین کا حدود اربعہ بہت وسیع تھا۔ بحر روم سے لے کر لبنان، سریا اور دریائے فرات تک کے علاقے اس کا حصہ تھے۔ عہد عثمانیہ میں بھی بحر روم سے شفیلا، جودا، اسمایا، صحرائے نجیب اور عقبہ کے علاقے بھی فلسطین میں شامل تھے۔ مسلمانوں کے زیر سایہ اتنا لمبا چوڑا فلسطین غیر مسلم باطل قوموں سے برداشت نہ ہوا۔ 1912ء سے مغربی طاقتوں نے یہودی ریاست قائم کرنے کا واویلا مچانا شروع کر دیا تھا۔ جسے 14 مئی 1948ء کو اسرائیل کے نام پر عملی جامہ پہنایا گیا۔ سات لاکھ فلسطینی باشندے دیگر عرب ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ غزہ کی پٹی نجیب، گیلیلی اور شمال مغربی یروشلم کا رقبہ اسرائیل کے غاصبانہ تسلط میں آ چکا تھا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ مجاہدین نے قسم کھا رکھی تھی کہ یہودی کتوں کو یہاں سے نکال کر فلسطین کو 1948 سے پہلے والی حدود میں لے جائیں گے۔

اگلا پورا دن انہوں نے آرام کیا تھا۔ سفر کی تھکاوٹ اور دو راتوں کی شب بیداری نے انہیں تھکا دیا تھا۔ ظہر کی

نماز کے وقت انہیں جگایا گیا تھا۔ مجاہدین کے ساتھ مل کر انہوں نے نماز ظہر ادا کی کھانا کھایا اور باتوں کا دور چل نکلا کیونکہ دوسرے روز انہیں اپنے مشن پر نکلنا تھا۔ مجاہدین کے اس گروپ کا امیر چالیس سالہ مضبوط اور توانا جسم کے مالک احمد سعید تھے۔ عبداللہ نے ان سے پوچھا۔

''کیا ہم مسجد اقصیٰ کا دیدار کر سکتے ہیں۔'' اس کے جواب میں احمد سعید بولے۔

''یہ پہاڑیاں بیت المقدس سے تقریباً پچاس میل دور ہیں۔ بیت المقدس کے راستوں پر انتہائی کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ میرے خیال میں آپ لوگوں کا وہاں جانا فی الحال ٹھیک نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ یہاں سے پچیس میل کے فاصلے پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے نام پر قصبہ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا روضہ شریف ہے۔ شام ڈھلتے ہی آپ لوگوں کو وہاں لے جاؤں گا۔''

''حضرت موسیٰؑ کا روضہ مبارک یہاں موجود ہے۔'' حمزہ کے لیے یہ بات نئی تھی۔ امیر مجاہدین مسکرا کر بولے۔

''یہاں چپے چپے پر مقدس مقامات موجود ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسیٰؑ، حضرت لوطؑ، حضرت عزیرؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ سمیت ہزاروں انبیاء کرام اور عالم دین د بزرگ ہستیاں یہاں مدفن ہیں۔ آپ لوگ خود اندازہ کیجیے۔ صرف رام اللہ میں تین سو سے زائد انبیائے کرام مدفن ہیں۔ شہید خلیل اللہ کے قریب گاؤں میں حضرت لوط علیہ السلام کے علاوہ ساٹھ انبیاء کرام، طبریہ میں حضرت ابو ہریرہؓ اور لقمان حکیم کے علاوہ ستر سے زائد انبیاء کرامؑ بمبیرون میں حرم خلیل اللہ کے تہہ خانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے مزارات ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بیت اللحم میں بے شمار پیغمبر مدفن ہیں۔ طبریہ سے پچیس میل دور شمال کی طرف ایک قصبہ ناصریہ میں حضرت مریم علیہ السلام کا قیام ہوا تھا.....''

امیر مجاہدین نے تینوں مہمانوں کو دیکھا۔ وہ پوری محویت سے انہیں سن رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر کو رکے تو حمزہ بولا۔

''امیر صاحب! آپ نے باتوں میں رام اللہ کا نام لیا ہے۔ ہمارے ہاں انڈیا میں ہندو اپنے بھگوان کو رام کہتے ہیں آپ نے رام اور اللہ دونوں کا یکجا نام لیا ہے۔'' عبداللہ کی بات سن کر امیر صاحب بے اختیار مسکرائے۔

''بیٹا! رام اللہ دراصل مشہور شہر رملہ کا اصل نام ہے۔ یہاں پر فلسطین کے صدر یاسر عرفات کا کمپاؤنڈ بھی ہے۔ کیا آپ لوگ مزید تاریخی مقامات کے بارے میں جاننا چاہو گے؟''

''بالکل امیر صاحب! یہاں سے نکلے تو پتہ نہیں دوبارہ اکٹھے مل بیٹھیں گے یا نہیں۔'' غلام رسول نے سوالاً جواباً کہا۔ امیر صاحب سر ہلاتے ہوئے گویا ہوئے۔

''عبرہ اس قصبے کا نام ہے۔ جہاں قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا۔ یہ قصبہ بیت المقدس سے کچھ ہی فاصلے پر ہے صحرائے سینا میں طور سینا قصبہ ہے۔ جس کی چوٹی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی تھی۔ یہیں پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تجلی دیکھی تھی۔ جس کی تاب نہ لاتے ہوئے غش کھا کر گر پڑے تھے۔ طبریہ اور بسردت کے درمیان وہ مشہور کنواں ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے دانستہ پھینکا تھا۔ کفریا کے قصبے میں حضرت یونس علیہ السلام بمعہ والد محترم کے مدفن ہیں۔ یہیں پر حضرت ہودؑ، حضرت عزیرؑ کے مقبرے بھی موجود ہیں۔ حضرت ایوبؑ کے چار بیٹوں اور حضرت موسیٰؑ کی والدہ ماجدہ کے مقبرے ازبل خطیرہ کے نواحی علاقے اربدیا میں موجود ہیں۔ حضرت آدمؑ نے نابلوس شہر میں نماز ادا کی تھی۔ یہاں پر حضرت یعقوبؑ کا کھودا ہوا کنواں بھی موجود ہے۔ عسکہ نام کا قصبہ ساحل سمندر پر واقع ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ نے یہاں کھیتی باڑی کی تھی ایک روایت یہ بھی ہے عین البقر نام کا جو چشمہ یہاں موجود ہے وہ حضرت آدمؑ نے نکالا تھا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے القدس اور مسجد

ابراہیم کے درمیانی علاقے میں حضرت آدم دفن ہیں۔"

"جی ہاں امیر صاحب! ہم جانتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ارض فلسطین کی تاریخ کتنی قدیم ہے۔"

"ہاں بیٹا! بالکل آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ میں نے اتنے انبیا کرام کا نام مبارک لیا ہے تو میری زبان مٹھاس سے بھر گئی ہے مگر اب میں جس ہستی کا نام لینے جارہا ہوں ان کے اسم مبارک کا تصور ہی میرے دل و دماغ کو معطر کر گیا ہے۔ میری زبان خوشبوؤں میں نہا گئی ہے۔ جی ہاں میں ذکر کرنے والا ہوں اس ہستی کا دنیا جن کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ جنت کی چابیاں جن کے ہاتھوں میں ہیں۔ جن کی بزم میں فرشتے بھی عاجزی سے حاضر ہوتے ہیں۔ محبوب خدا، نور کائنات سرور کائنات، فخر دو عالم، امام الانبیاء نبی آخر زماں حضرت محمد ﷺ۔" امیر صاحب نے جب یہ سبارک نام زبان سے ادا کیا تو مجاہدین نے بلند آواز میں "صلی اللہ علیہ وسلم" ادا کیا تھا۔ ان کی بلند آوازوں میں تین دھیمی آوازیں دب گئی تھیں۔

"بیٹا! جب بھی ہمارے پیارے نبی سرکار دو عالم رحمت العالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک آئے تو درود بھیجنے میں بغض سے کام نہ لیا کرو۔ بلند آواز میں درود بھیجا کرو بیٹا! ایمان تازہ ہوگا۔"

"جی امیر صاحب! یہ آواز غلام رسول کی تھی۔ جس نے واقعی دھیمی آواز میں درود پڑھا تھا۔ امیر صاحب اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

"کرہ ارض پر فلسطین وہ پاک خطہ ہے جس میں بیت المقدس کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ بیت المقدس کی قابل فخر مٹی کو نبی آخر زماں نبیوں کے نبی حضرت محمد ﷺ کی قدم بوسی کا اعزاز حاصل ہے۔"

"امیر صاحب! ہم لوگ ہر سال شب معراج مناتے ہیں مگر عموماً افراد کو اس کا صحیح پس منظر معلوم نہیں ہے۔" یہ بات غلام رسول نے کہی تھی کیونکہ اسے زندگی میں ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تو اس کا نام دادا جان نے غلام رسول رکھا تھا یہ خالصتاً مذہبی نام تھا۔ ممی اور ڈیڈی نے اسے قدیم نام سے تشبیہ دے کر دلی طور سے قبول نہیں کیا تھا مگر دادا جان کی ناراضی کے سبب انہیں بہرحال غلام رسول کے نام سے ہی رجسٹریشن کروانا پڑا تھا لیکن دادا جان کی غیر موجودگی میں وہ اسے ذیشان کہتے تھے۔ دادا جان کی وفات اس کی دو برس کی عمر میں ہی ہوگئی تھی۔ تب وہ سب کے لیے ذیشان بن گیا۔ جو لاڈ و پیار سے بگڑتے ہوئے شانی ہو گیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ شانی کا اصل نام غلام رسول ہے۔ سر جی کو بھی تب پتہ چلا تھا جب اردن کے ویزے کے لیے ان کے ہاتھ میں شانی کا پاسپورٹ آیا تھا۔ انہوں نے پاسپورٹ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"شانی! غلام رسول سے بھی کوئی اچھا اور خوبصورت نام ہوگا؟" شانی زندگی کے مختلف پہلو دیکھ چکا تھا۔ دنیا اور مذہب میں بہت حد تک تمیز کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ وہ بلا جھجک بولا تھا۔

"نہیں سر جی! اس نام سے کوئی بھی دوسرا نام خوبصورت نہیں ہو سکتا۔" اس کے بعد سر جی نے سب پر واضح کر دیا تھا آئندہ شانی کو اصل نام سے پکارا جائے گا۔ بارہا مواقع آئے تھے جب غلام رسول کو اپنی مذہبی کم علمی کا ادراک ہوا تھا۔ واقعہ شب معراج سے بھی وہ مکمل سیاق و سباق کے ساتھ ناآشنا تھا۔ امیر مجاہدین کہہ رہے تھے میں مختصراً آپ کو شب معراج کے بارے میں بتائے دیتا ہوں۔

"رسول اللہ ﷺ مکۃ المکرمہ میں تشریف فرما تھے وہاں سے آپ ﷺ براق پر تشریف فرما کر حضرت جبرائیل کے ہمراہ سیدھا طور سینا پہنچے۔ طور سینا سے بیت اللحم گئے بیت اللحم اس شہر کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰ اور حضرت داؤد پیدا ہوئے تھے۔ بیت اللحم میں حضرت داؤد کی زوجہ محترمہ بھی مدفون ہیں۔ یہاں کھجور کا ایک درخت اب تک موجود ہے جس کا پھل حضرت مریم نے کھایا تھا۔ بیت اللحم میں ہی چھوٹی سی مسجد سید مسیح کے

نام سے مشہور ہے۔ اس کے بارے میں روایت ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ نے شیر خوارگی میں لوگوں سے گفتگو فرمائی تھی۔ میری بات کسی اور طرف نکل گئی۔ میں واقعہ معراج بیان کر رہا تھا۔ بیت اللحم سے آنحضرت ﷺ بیت المقدس تشریف لائے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد پاک ہے۔

جس وقت ہم بیت المقدس میں، حرم شریف کے احاطے میں پہنچے تو حضرت جبرئیلؑ نے مجھے براق سے اتارا اور اسے ایک کنڈی سے باندھ دیا۔ پھر آپ ﷺ حرم شریف میں داخل ہوگئے اور اس چٹان پر چڑھے جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر آپ ﷺ کی ملاقات سابقہ انبیاء کرام سے کرائی گئی۔ ان انبیائے سابقین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ بھی شامل تھے۔ یہیں پر آپ ﷺ نے تمام انبیائے سابقین کی نماز کی امامت فرمائی اور امام الانبیاء کہلائے۔ اس کے بعد قبۃ الصخرہ کی متبرک چٹان سے آپ ﷺ حضرت جبرائیلؑ کے ہمراہ نور کے ایک زینے سے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ آسمانوں پر آپ ﷺ کو جنت الفردوس اور اللہ تعالیٰ کی مختلف نعمتوں کا دیدار نصیب ہوا۔ آپ ﷺ نے جزاوسزا کے مناظر دیکھے اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کے حضور حاضری دی۔ دیدار الٰہی نصیب ہوا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ پانچ نمازوں کے احکام بھی حاصل کیے۔ اس کے بعد آپ واپس زمین پر تشریف لائے۔ براق پر مراجعت فرمائی اور صبح ہونے سے قبل واپس مکۃ المکرمہ پہنچ گئے تھے۔“

امیر مجاہدین نے مختصر واقعہ معراج بتایا اور دستی گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔

”نماز عصر کا وقت قریب ہے تیاری کر لیجیے۔“

☆☆✿✿✿☆☆

اسرائیل ایک چھوٹا سا خطہ ہے مگر اس میں جوہری جراثیمی اور کیمیائی ہتھیاروں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ڈمونہ، حیفہ، ابلا بن کی پہاڑیاں سب ہتھیاروں سے لبا لب بھری جارہی ہیں۔ ڈمونہ کے پلانٹ کو اسرائیل نے ٹیکسٹائل فیکٹری کا لبادہ پہنانے کی کوشش کر رکھی ہے۔ دنیا میں یہودی قوم کمیونٹی کے لحاظ سے سب سے چھوٹی اقلیت میں شمار کی جاتی ہے مگر طاقت اور اثر و رسوخ میں اس قدر آگے کہ امریکہ جیسا سپر پاور بھی اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا ہے۔ دنیا کا طاقتور ترین صدر سمجھا جانے والا امریکی صدر عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے بعد برملا کہنے پر خوشی محسوس کرتا ہے کہ ہم نے اسرائیل کی بقا کی جنگ لڑی ہے۔ اس اعلانیے کے باوجود مسلمانوں بشمول عربوں کو کوئی عقل نہیں آئی یا پھر گریٹر امریکہ کی کامیاب پالیسی ہے کہ ڈیڑھ لاکھ امریکی افواج مسلمانوں کے مقدس ترین مقام سعودی عرب میں ڈال رکھی ہے۔ حتیٰ کہ مکہ شریف اور مدینہ پاک دونوں شہروں کی ناکہ بندی کردی گئی ہے۔ یعنی سمندری راستوں پر ہر طرف مکمل امریکہ کا کنٹرول ہے۔ بحرالہند اور بحرالعرب میں آمد و رفت کے جہازوں کی انتہائی سخت چیکنگ کی جاتی ہے۔ عام سمندری راستوں پر ان کا مکمل کنٹرول ہے۔ کراچی کے ساحل سے لے کر صومالیہ تک تمام بحری گزرگاہوں پر عالمی کفر کا قبضہ ہو چکا ہے۔ مسلم لیڈر غفلت کے صحراؤں میں ہنوز بھٹکے ہوئے ہیں۔

ان کا ٹارگٹ موساد کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ جہاں قیاس کیا جارہا تھا کہ پاکستان سے چرائی گئی فائلیں موجود ہیں۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ تینوں علیحدہ علیحدہ وہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے پھر وہاں رابطہ کر کے اکٹھا حملہ کیا جائے گا۔ امیر مجاہدین احمد سعید نے اپنا ایک ایک مجاہد ان کے ہمراہ روانہ کر دیا تھا۔ غلام رسول کے ساتھ نوجوان مجاہد ارشاد غوری تھا۔

وہ غالباً سلوان کی بستی تھی روڈ پر فلسطینی عوام مرد و عورتیں اور بچے ہاتھوں میں مختلف بینرز اٹھائے احتجاجی ریلی نکال رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شہداء اور گمشدہ افراد کی تصاویر تھیں۔ ارشاد غوری نے غلام رسول کو بتایا کہ پچھلے دنوں یہودیوں نے بستی کے سولہ گھروں

پر زبردستی قبضہ جمالیا تھا۔ یہ احتجاج اس کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ غلام رسول نے دیکھا ریلی کے شرکاء نے سروں پر کلمہ طیبہ سے کندہ کپڑا باندھا ہوا تھا۔ یہ پرامن مظاہرہ جاری تھا اچانک اسرائیلی پولیس کا ایک دستہ گھوڑوں پر سوار دندناتا ہوا نمودار ہوا انہیں دیکھ کر ریلی میں بے چینی دوڑ گئی تھی۔ کیونکہ وہ ان کی ظالمانہ حکومت سے اچھی طرح واقف تھے۔ پولیس نے آتے ہی گھوڑے لوگوں پر چڑھا دیئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور کندھوں پر رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ عورتیں بچوں کو ایک طرف کرنے لگی تھیں۔ نوجوان پولیس کے ڈنڈے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ پولیس نے تشدد شروع کر دیا تھا۔ غلام رسول نے دیکھا نوجوانوں نے گلے میں لٹکے فلسطین کے روایتی رومال چہرے پر بطور نقاب چڑھائے اور پولیس سے مقابلہ کرنے لگے تھے۔ ارشاد غوری نے غلام رسول کی طرف دیکھا اسرائیلی پولیس کا وحشیانہ تشدد ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ معاً انہوں نے ایک چیختی ہوئی آواز سنی۔

''یہودی کتوں فلسطین سے نکل جاؤ۔'' حلق کے بل چیختے ہوئے یہ الفاظ ادا کرنے والا ایک بوڑھا شخص تھا۔ اس کی آواز پر ایک پولیس والے نے اسے کچلنے کے لیے اس طرف گھوڑا بھگایا مگر بوڑھے شخص نے اس کے قریب پہنچتے ہی نہ صرف ایک طرف ہو کر خود کو بچایا بلکہ ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر پولیس مین کی ٹانگ پکڑ کر جھٹکا دیا جھٹکے سے پولیس مین نیچے کو جھکا اور توازن بگڑنے کی وجہ سے گھوڑے کی گردن سے پھسلتا ہوا نیچے زمین پر گر پڑا۔ سرپٹ بھاگنے والے گھوڑے کے پچھلے دونوں پیر اس کے سینے پر پڑے تو وہ بھیانک انداز میں چیخنے لگا۔ اس کا سینہ پچک گیا تھا۔ وہ چند لمحے ہی تڑپا پھر ساکت ہو گیا۔ اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر دوسرے پولیس والے بوڑھے شخص کی طرف لپکے لیکن ان کی خواہش بھی پوری نہ ہو سکی کیونکہ میدان میں ارشاد غوری اور غلام رسول اتر

چکے تھے۔ انہوں نے لمبی چھلانگیں لگائی تھیں اور اپنے اپنے ہدف کو لیتے ہوئے زمین پر آگرے۔ غلام رسول نے چھوٹا سا خنجر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ نیچے گرتے ہی اس نے خنجر پولیس والے کے دل میں اتار دیا تھا۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ لمحوں میں جہنم داخل ہو چکا تھا۔ غلام رسول نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی رائفل اٹھالی اور ایک پولیس والے کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ ارشاد غوری کے ہاتھ میں بھی رائفل آچکی تھی۔ وہ بھی ٹھیک ٹھیک نشانے لگا رہا تھا لوگوں میں جوش وخروش بڑھ گیا تھا اور فضا نعروں سے گونج اٹھی تھی۔

''خیبر خیبر یا یہود، جیش محمد سوف یہود۔''

اسرائیلی پولیس کو سمجھ نہیں آرہی تھی فائرنگ کہاں سے ہو رہی ہے۔ غلام رسول اور ارشاد غوری کی برسائی گولیاں انہیں مسلسل چاٹ رہی تھیں۔ ریلی کے نوجوانوں نے بھی انہیں لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا تھا۔ بہت جلد چند بچ جانے والے پولیس مین بھاگنے کی راہ تکنے لگے تھے۔ مگر غلام رسول نے انہیں موقع نہیں دیا تھا۔ ارشاد غوری اس لڑائی میں شہید ہو چکا تھا۔ اس کی میت دیکھ کر غلام رسول حیران رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک انوکھی مسکراہٹ ثبت ہو گئی تھی۔ اسرائیلی پولیس پر پہلا حملہ کرنے والے بوڑھے شخص کا نام سلیم خمیس تھا۔ جھٹکا کھانے سے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ غلام رسول نے اسے گھر تک لے جانے میں مدد کی۔ وہ غلام رسول کو گھر لے گیا۔ سلیم خمیس تاریخ کا پروفیسر رہا تھا۔ اس کے دو بیٹے آزادی فلسطین کے لیے شہید ہو گئے تھے ایک چھوٹا بیٹا حماد خمیس لاپتہ تھا۔ اس کی تلاش میں کئی بار اسرائیلی خفیہ ایجنسی کے اہلکار اس کے گھر پر چھاپہ مار چکے تھے۔ اسے زدوکوب بھی کیا تھا اور قید میں بھی رکھا تھا۔ مگر وہ خود نہیں جانتا تھا حماد کہاں ہے۔ اسے اپنے بڑے بیٹوں کے شہید ہونے اور حماد کو کھو دینے کا کوئی غم نہیں تھا۔ بقول پروفیسر کے اس کے بیٹوں جیسے لاکھ بیٹے

فلسطین کی پاک سرزمین پر قربان ہو چکے ہیں وہ تو جنت میں جا چکے ہیں مگر سلیم کیس کو ایک غم دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ ڈیڑھ برس پہلے جب اسرائیلی خفیہ پولیس نے اس کے گھر چھاپہ مارا تو اس کی اکلوتی بیٹی اور بیوی کو اٹھا کر لے گئے تھے بعد ازاں بیوی کو تو چھوڑ دیا گیا مگر عائشہ ہنوز ان کی قید میں تھی۔

"پروفیسر صاحب! میں تو یہاں کفر کے ظلم و ستم دیکھ کر ششدر رہ گیا ہوں۔"

"بیٹا! تم نے یقیناً مغربی کنارے، غزہ کی پٹی الخلیل، خان یونس اور غزہ شہر کی حالت نہیں دیکھی ہوگی۔"

"جی ہاں پروفیسر صاحب! ابھی وہاں نہیں گیا ہوں۔"

"بیٹا! غزہ اور مغربی کنارے پر یہودیوں کی بستیاں قائم کرنے کے لیے پانچ لاکھ فلسطینیوں کو زبردستی بے دخل کر دیا گیا تھا بات یہاں رکی نہیں۔ اسرائیل نے دیوار برلن کو حفاظتی دیوار کا نام دے کر فلسطینی علاقے میں تعمیر کر دیا تھا۔ جسے عالمی عدالت انصاف کے پندرہ ججوں میں سے چودہ ججوں نے ناجائز قرار دیا تھا۔ مگر ہوا کیا؟" پروفیسر صاحب کے لہجے میں افسردگی اور دکھ تھا۔

"پروفیسر صاحب! میں نے پڑھا تھا 1987ء میں ایریل شیرون کی سفاک قیادت میں صابرہ اور شتیلہ کے مہاجر کیمپوں پر دھاوا بول کر ہزاروں فلسطینیوں کو شہید کر دیا گیا تھا۔"

"ایسے کئی واقعات ہیں بیٹا! جنہوں نے پاک ارض فلسطین کو خون میں نہلایا ہے۔"

غلام رسول پروفیسر کی روداد سن کر ان کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے پروفیسر سے کہا۔

"آپ کی بیٹی اس وقت کون سی جیل میں ہے۔ کچھ پتہ ہے آپ کو؟"

"یہاں سے چالیس کلو میٹر دور ایک فوجی کیمپ ہے میری بیٹی کو کیمپ کے قید خانے میں رکھا گیا ہے۔"

غلام رسول کو ہم نواز نے بتایا وہ فوجی کیمپ کی لوکیشن جانتا ہے۔ غلام رسول نے پروفیسر کو تسلی دی اور فوجی کیمپ کی طرف نکل گیا۔ ہم نواز کی راہنمائی میں وہ با آسانی وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ یہ ایک پختہ کیمپ تھا۔ جس کے اردگرد پختہ چار دیواری بنائی گئی تھی۔ ہم نواز نے اسے بتایا کہ کیمپ میں ٹوٹل چھ بیرکیں بنی ہوئی ہیں۔ چار نمبر بیرک جو کہ کیمپ کی شمالی دیوار کے ساتھ الگ سے بنائی گئی۔ قید خانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ پروفیسر کی بیٹی بھی اسی عقوبت خانے میں قید تھی۔

غلام رسول نے دور سے کیمپ کا جائزہ لیا۔ اس کے دماغ میں امیر مجاہدین احمد سعید کی باتیں گونج اٹھی تھیں۔ 780 سال مسلمانوں نے بیت المقدس پر حکومت کی ہے۔ 7 جون 1967ء کو عالمی کفریہ طاقتوں نے اسرائیل کی پشت پناہی کی اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ جما لیا تب سے لے کر آج تک مسلمانوں کا قبلہ اول جس کی طرف رخ کر کے مسلمانوں نے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ایک سال چار ماہ تک نماز ادا کی ہے۔ یہودیوں کے زیر تسلط آنسو بہا رہا ہے۔ دنیا میں چھپیں آزاد اسلامی ممالک ہیں تقریباً ڈیڑھ ارب مسلمان ہیں مگر کسی عالمی لیڈر کی توجہ فلسطین کی طرف مبذول نہیں ہوئی۔ بلند و بالا چار دیواری پر حفاظتی کانٹے دار باڑھ بھی لگائی گئی تھی۔ دیوار پھلانگ کر اندر جانا تقریباً ناممکن تھا۔ البتہ مرکزی دیوار سے فوجیوں کی آمد و رفت کا طریقہ کار دیکھ کر اس کے ذہن میں پلان ترتیب پا چکا تھا۔

مرکزی دروازے پر دائیں جانب چھوٹی سی اسکرین لگی ہوئی تھی اندر داخل ہونے والے فوجی اسکرین پر اپنا کارڈ چند سیکنڈ کے لیے رکھتے جس سے ذیلی کھڑکی کھل جاتی تھی۔ کارڈ حاصل کرنے کے لیے غلام رسول نے چار فوجیوں کا خاموشی سے تعاقب کیا۔ فوجی کیمپ سے نکل کر پیدل ہی گلیوں میں گشت کر رہے تھے۔ ہم نواز نے اسے بتایا اس طرف ویران علاقہ ہے کیونکہ یہاں پر بہت سے فلسطینی گھر چھوڑ کر

ہجرت کر گئے تھے۔ غلام رسول ایک طرف گھوم کر گھات لگا کر بیٹھ گیا فوجی جیسے ہی ایک موڑ مڑ کر اس کے سامنے آئے وہ ان پر ٹوٹ پڑا۔ فوجی حضرات خوش گپیوں میں مگن تھے وہ اس اچانک حملے کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ غلام رسول ان پر بری طرح ٹوٹ پڑا تھا۔ پہلے حملے میں ہی اس نے ایک فوجی کی گردن توڑ دی تھی۔ ساتھ ہی دوسرے کی کنپٹی پر لات رسید کر کے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ باقی دو فوجی جب تک بچوئشن سمجھتے اور سنبھلتے ایک کے سینے میں خنجر پیوست ہوا اور دوسرا غلام رسول کے آہنی بازوؤں میں تڑپنے لگا۔ چند منٹوں میں اس کے منہ سے خون رسنے لگا۔ آناً فاناً غلام رسول نے تین فوجیوں کو ابدی نیند سلا دیا تھا اور چوتھا بے ہوش تھا۔ اس نے ایک نظر بے ہوش فوجی کو دیکھا اس کے ذہن میں فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم وستم گھوم گئے۔ غلام رسول نے اپنا بھاری بوٹ اس کی گردن پر رکھا اور سارا وزن چھوڑ دیا۔ فوجی کے منہ سے غوں غوں کی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے غلام رسول کی ٹانگ پکڑ لی مگر ان میں جان نہیں تھی۔ وہ چند منٹوں میں جہنم واصل ہو چکا تھا۔ غلام رسول نے ان کی تلاشی لی اپنے مطلب کا سامان جیبوں میں منتقل کیا اور ایک فوجی کی وردی اتار کر پھرتی سے کپڑوں کے اوپر ہی پہن لی۔ برہنہ فوجی کے اوپر دوسرے فوجی کی لاش پھینکی اور تیزی سے کیمپ کی طرف بڑھ گیا۔ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا جس کی بدولت وہ باآسانی اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس نے سر کی ٹوپی کو دانستہ نیچے کر رکھا تھا تاکہ پہلی نظر میں پہچانا نہ جا سکے۔ کیمپ میں داخل ہوتے ہی اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ کیمپ کے احاطے میں جا بجا بکتر بند گاڑیاں ٹینک اور ہیلی کاپٹر کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا ایک ہیلی کاپٹر کے پنکھے چلنا شروع ہو گئے ہیں۔ یقیناً وہ اڑنے کی تیاری میں تھا غلام رسول کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اس نے ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑ لگا دی وہ سرپٹ بھاگتا ہوا پائلٹ کو رک جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کا دروازہ اس کے بالکل سامنے تھا اور پائلٹ گردن موڑ کر اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ غلام رسول ہیلی کاپٹر کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ پائلٹ نے دروازہ کھول کر غالباً کچھ کہا تھا مگر غلام رسول شور کی وجہ سے کچھ سن نہ سکا وہ جمپ لے کر کیبن میں پہنچ گیا۔ فوجی وردی کی وجہ سے ابھی تک پائلٹ اسے پہچان نہیں پایا۔ غلام رسول نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اسے گردن سے دبوچ لیا وہ جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا مگر غلام رسول نے اسے موقع نہیں دیا۔ پائلٹ کے مرتے ہی غلام رسول نے اسے ایک طرف پھینکا اور خود پائلٹ سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ باندھ لیا۔ پاکستان میں ٹریننگ کے دوران آخری چند مہینوں میں انہیں خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ اس ٹریننگ میں ہیلی کاپٹر اڑانے، بکتر بند گاڑی، ٹینک اور دوسرا جدید اسلحہ چلانے کی تربیت شامل تھی۔ کنٹرول روم سے اسے بار بار ہدایت دی جا رہی تھی اس نے سرسری روشن اسکرینوں کو دیکھا اور بلند آواز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یا اللہ مدد کہہ کر فضا میں بلند ہو گیا۔

"ہم نواز! قیدی کون سی بیرک میں ہیں؟"

"چار نمبر بیرک شالی! وہ شمالی دیوار کے ساتھ دوسری بیرکوں سے الگ بنی ہوئی ہے۔" ہم نواز نے اسے بتایا۔ غلام رسول نے فضا میں تھوڑی بلندی پر جا کر کیمپ پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ کبھی اسی ہیلی کاپٹر سے اسرائیلی فوجی نہتے اور مظلوم فلسطینیوں پر گولہ باری کرتے تھے۔ کیمپ میں بھونچال آ گیا تھا۔ سائرن بج اٹھے تھے۔ فوجی ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کنٹرول روم سے اسے چیختے ہوئے کچھ کہا جا رہا تھا۔ مگر یہ چیخ و پکار چند منٹ سے زیادہ سنائی نہ دی۔ کیونکہ کیمپ میں زوردار دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ شاید اندر رکھا ہوا بارود بھی پھٹ پڑا تھا۔ کئی کان پھاڑ دھماکے فضا میں گونج اٹھے تھے۔ دس منٹ میں کیمپ کی

پانچ ہیر کیں ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ جبکہ پانچویں ہیرک بھی شدید متاثر ہوئی تھی۔ غلام رسول نے ہیلی کاپٹر کو نیچے کیا اور بجائے زمین پر اتارنے کے خود نیچے چھلانگ لگا دی۔ ہیلی کاپٹر زمین سے ٹکرایا اور ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گیا۔ قید خانے کے محافظ فوجی باہر بھاگ آئے تھے اور حیران و پریشان باہر کی بربادی دیکھ رہے تھے۔ غلام رسول جھکے جھکے انداز میں بھاگتا ہوا ایک طرف پوزیشن لے چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی جو اس نے بھاگتے ہوئے زمین سے اٹھائی تھی۔ بدحواس فوجی ہنوز سچوئشن کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ جبکہ غلام رسول نے ان پر فائرنگ کھول دی تھی۔ کئی فوجیوں نے ادھر ادھر چھلانگیں لگائیں مگر غلام رسول نے ان پر بارود کا ڈھیر کھول دیا۔ بہت جلد میدان صاف ہو گیا تھا۔ غلام رسول بھاگ کر قید خانے میں داخل ہوا۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا اتنی بڑی تباہی کی خبر اوپر تک پہنچ گئی ہوگی کیونکہ دھماکوں کے ساتھ اب آگ بھی بھڑک اٹھی تھی۔ قید خانے میں فلسطینی بچے، جوان، بوڑھے، مرد و عورتیں قید تھیں۔ اس نے اندر جاتے ہی دروازے کھول دیئے اور بلند آواز میں بولا۔

"میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا مجاہد ہوں۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکلو۔" ساتھ ہی غلام رسول نے مرد حضرات کو حکم دیا کہ وہ عورتوں اور بچوں کو باہر نکلنے میں مدد دیں۔ غلام رسول پروفیسر سلیم خمیس کی بیٹی عائشہ کو بھی پکار رہا تھا۔ وہاں پر جوش و خروش کا عجیب ماحول بن گیا تھا۔ وہ آسمان کی طرف منہ اٹھائے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالا رہے تھے نعرے بھی بلند ہو رہے تھے اور جلدی چلو جلدی چلو کی آوازیں بھی گونج رہی تھی۔ غلام رسول بار بار عائشہ کو پکارے جا رہا تھا۔ ایک بوڑھی عورت اس کے پاس آ کر رک گئی غلام رسول نے ایک نظر اسے دیکھا وہ پچاس سے اوپر کی لگتی تھی۔ آنکھوں میں انجانا سا دکھ رچا بسا تھا۔ مگر اس سمے بوڑھے چہرے پر بے انتہا خوشی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر غلام رسول کا ہاتھ تھام کر اسے بوسہ دیا اور بلند آواز میں بولی۔

"مرحبا! آج ایک مجاہد نے صلاح الدین ایوبی کی یاد تازہ کر دی ہے۔" وہ غلام رسول کا ہاتھ والہانہ چوم رہی تھی۔ غلام رسول نے پرنم آنکھوں سے اسے دیکھا اور قریب اکٹھے ہونے والے نوجوانوں سے کہا۔

"پلیز آپ لوگ باہر نکلیں انہیں بھی ساتھ لے جائیں جلدی کریں اسرائیلی فوج کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔" غلام رسول نے کہتے ہوئے دائیں جانب دیکھا تو نظر میں وہیں چپک گئیں۔ وہ سکتے میں آ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنی طرف آنے والی لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا۔ جو سینے پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔"

"انا فی عائشہ۔" غلام رسول اس کی بات سن نہیں رہا تھا۔ اسے پریشان، حیران، ناقابل یقین نظروں سے دیکھ رہا تھا اس کے سامنے بروج اپنے پورے خدوخال کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ ویسی معصوم خوبصورت چہرہ۔ گہری آنکھیں، گوری رنگت، وہی خدوخال وہی سلکی لمبے سیاہ بال وہ بروج جسے خود اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ جس کی خون میں لت پت لاش پر اس نے آنسو بہائے تھے۔ وہی بروج پورے حسن و جمال کے ساتھ ایک بار پھر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

"بر...... بروج...... تت...... تم...... یہ میں کیا دیکھ رہا......؟" اس نے آگے بڑھ کر بروج کے دونوں بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑا مگر اس کے سامنے جو لڑکی کھڑی تھی وہ اسے ناآشنا اور خوف زدہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ بوڑھی عورت نے لڑکی سے عربی میں کچھ کہا تو اس کے چہرے سے خوف کے بادل چھٹ گئے تھے۔ مگر غلام رسول کی حیرت دور نہیں ہو رہی تھی کیونکہ یہ بروج اردو نہیں بول سکتی تھی۔ غلام رسول کے پاس وقت کی کمی تھی اس نے بروج کا ہاتھ پکڑا اور پروفیسر سلیم خمیس کے بارے میں پوچھا۔ لڑکی کا نام عائشہ تھا اور وہی پروفیسر کی بیٹی تھی وہ قدرت کے عجیب و غریب اتفاق پر حیران تھا۔ وہ لڑکی سر سے پاؤں تک بروج تھی۔ فرق یہ تھا وہ بروج پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے گاؤں گوریا بستی میں

پیدا ہوئی تھی اور یہ بروج فلسطین کے گاؤں المنارہ میں پیدا ہوئی تھی۔



غلام رسول ماں باپ اور بیٹی کا والہانہ ملاپ دیکھ رہا تھا۔ ڈیڑھ برس کی جدائی اس ایک لمحے میں سمٹ آئی تھی وہ تینوں ایک دوسرے کو چوم رہے تھے اور رو رہے تھے نجانے کتنی دیر ملاپ کا سلسلہ جاری رہا۔ جب پروفیسر سلیم خمیس کو غلام رسول کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ اس کی طرف پلٹا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ پوری روداد سننے کے بعد پروفیسر سلیم خمیس کے چہرے کی خوشی پریشانی میں بدل گئی تھی۔ وہ پریشان لہجے میں بولا۔

''اسرائیلیوں کے پاس تمام قیدیوں کے مکمل کوائف موجود ہوتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ وہ پھر سے ہم پر چڑھائی کر دیں۔''

''اوہ! پھر پروفیسر صاحب؟''

''ہمیں آج رات ہی یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔''

''مگر آپ لوگ جائیں گے کہاں؟''

''رام اللہ میں عائشہ کے ماموں کا گھر ہے۔ ہمیں وہاں جانا ہوگا۔ میرے بھائی کا اپنا ٹرک ہے میں اسے بلاتا ہوں۔'' پروفیسر سلیم خمیس نے رات تک سارا انتظام کر لیا تھا۔ رات کے دو بجے وہ لوگ ٹرک میں ضروری سامان لاد کر نکل پڑے۔ سامان کے ساتھ پچھلے حصے میں عائشہ اور ماں کو بٹھایا گیا تھا۔ غلام رسول پروفیسر سلیم خمیس آگے حافظ اسامہ کے ساتھ براجمان تھے۔ رات کی تاریکی میں ٹرک پہاڑی علاقے کا سفر کر رہا تھا۔ راستے میں پروفیسر سلیم خمیس نے غلام رسول کے بارے میں پوچھا۔ وہ کیسے فلسطین آیا۔ غلام رسول نے مختصراً اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو پروفیسر سلیم خمیس انتہائی تاسف سے بولا۔

''عالمی کفر یہ طاقتوں کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا سرا بہت دراز ہے۔ مگر جنگ رمضان جسے یہودی جنگ کپور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس جنگ کے بعد ایک منظم طریقہ اپنایا گیا۔ یہ جنگ اسرائیل اور عربوں کے درمیان 1973ء میں لڑی گئی تھی۔ دنیا کا ساٹھ فیصد تیل عربوں کے پاس ہے۔ جنگ رمضان میں امریکہ کی بے وفائی پر جب مسلمانوں نے یورپ کو اسرائیل کے ساتھ دیکھا تو ان کو تیل کی فراہمی روک دی جس سے یورپ میں سماجی اور صنعتی زندگی تقریباً جام ہو گئی تھی۔ یہ ٹھوکر اہل یورپ کے لیے تجربہ ثابت ہوئی انہوں نے عربوں سے تیل حاصل کرنے کا منظم پلان بنایا۔ دانستہ تیل کی قیمتیں کم کر دی گئیں۔ تیل نکالنے کی مشینری اور فاضل پرزہ جات کو روک دیا گیا کچھ عرصے کے لیے تیل کی خرید سے دانستہ اجتناب کیا۔ عربوں کو باور کروایا اگر وہ تیل نہ خریدیں تو ان کی آمدنی زیرو ہو جائے گی کیونکہ ان کے پاس تیل کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ عربوں کو دھڑکا لگا وہ خوف زدہ ہو گئے۔ وہ صحرا نشینی کی زندگی کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے وہ بخوشی ان کمپنیوں سے معاہدہ کرنے لگے جنہیں یورپ کا آشیرباد حاصل تھا۔ یورپ کی طرف سے میدان میں اتاری گئی کمپنیوں نے تیل نکالنے کے ٹھیکے لے لیے کیا تم سن رہے ہو غلام رسول؟'' کہتے ہوئے اچانک پروفیسر نے غلام رسول سے پوچھا۔ وہ پوری دلچسپی سے سن رہا تھا۔

''جی ہاں پروفیسر صاحب! آپ بات جاری رکھیے۔''

''برخوردار! ہمارے بھائی تو حالات حاضرہ اور چلتی پھرتی کتاب ہیں۔'' حافظ اسامہ نے روڈ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان سے آملا ہوں۔'' غلام رسول کے لہجے میں عقیدت تھی۔ پروفیسر سلیم خمیس نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔

''میں تمہیں دنیا کا سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والے ملک سعودی عرب کی چھوٹی سی کہانی سناتا ہوں۔ یہ بات 1933ء کی ہے۔ سعودی فرماں روا شاہ

عبدالعزیز نے امریکی آئل کمپنی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی جس کا ڈائریکٹر یہودی تھا' سے تیل نکالنے کا معاہدہ کر لیا۔ سعودی عرب کی پاک سرزمین پر اس وقت بدو کسی غیر مسلم کا وجود برداشت نہیں کرتے تھے۔ آج ان کی موجودگی پر فخر کرتے ہیں خیر بدوؤں کے ممکنہ حملے سے بچاؤ کے لیے کمپنی کے انگریز درکر عربوں کا روایتی لباس زیب تن کرتے تھے۔ انہوں نے داڑھیاں بھی لمبی کر رکھی تھیں۔ 1933ء سے شروع ہونے والا کام 1937ء تک تیس لاکھ ڈالرز کے بڑے خسارے کے باوجود کامیابی سے ہم کنار نہ ہوا۔ مگر انگریزوں نے کچھ سونگھ ضرور لیا تھا۔ 1938 میں مارچ کا مہینہ ان کے لیے خوشخبری لے کر آیا۔ یہیں سے عربوں کی قسمت بدلی ۔یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرح نکلنے والے تیل نے ان کی قسمت کی بربادی کا آغاز کیا تھا یا کامیابی کا۔"

"بربادی کا کیسے؟ پروفیسر صاحب۔"

"بیٹا! جب تک زر پرستی نہیں تھی دلوں میں خالص روحانی اسلام تھا۔ جو دلوں میں بستا تھا۔ جس کے جھنڈے تلے مسلمانوں نے 36 ہزار شہروں اور بے شمار قلعوں کو صرف بارہ برسوں میں فتح کیا تھا۔ آج مسلمان ہر لحاظ سے ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ کیوں......؟" غلام رسول کے پاس پروفیسر کے کیوں کا جواب نہیں بن رہا تھا۔ وہ خاموش رہا تو وہ بولے۔

"1939ء میں کمپنی نے 39 لاکھ 34 ہزار بیرل تیل نکالا جو 1943ء تک 2 کروڑ 13 لاکھ 11 ہزار بیرل تک جا پہنچا۔ کمپنی اور سعودی حکام بے حد خوش تھے۔ آئے دن تیل کی پیداوار میں حیران کن حد تک اضافہ ہو رہا تھا۔ 1946ء میں سالانہ 60 ملین بیرل تک پہنچا تو اگلے ہی برس 1947ء میں نوے ملین بیرل کو چھونے لگا۔ تیل کے ساتھ گیس کی پیداوار بھی شروع تھی۔ اتنی بڑی کامیابی کے بعد کمپنی نے پردے کی چادر اتار دی اور اپنے اصل نام عربین امریکن آئل کمپنی سے منظر عام پر آ گئی۔ جس کا مختصر نام آج بھی زبان زد عام ہے۔ آرامکو کمپنی میں غیر ملکی باشندے بھی آج کام کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔"

"جی ہاں پروفیسر صاحب! آرامکو کمپنی کے بارے میں میں نے بھی سن رکھا ہے۔"

"بیٹا! یہ تو میں نے تمہیں سعودی عرب میں خوشحالی کی ابتدائی کہانی سنا دی ہے۔ میری اصل بات تو 1973ء کے بعد کی تھی۔ تمہیں نیند تو نہیں آ رہی۔"

"آپ بولتے رہیے بھائی صاحب، برخوردار سو بھی گیا تو میں ہوں نا سننے والا۔" حافظ اسامہ کی بات پر دونوں مسکرا دیئے۔

"تیل کے ذخائر پر دسترس کے باوجود اہل یورپ نے شرح تبادلہ سونے کی بجائے ڈالر میں کر دی۔ ساتھ ہی عرب سرمایہ کاروں کو اسٹاک ایکسچینج کا خوبصورت گفٹ بھی سونپا۔ مسلمان بہت اچھی طرح جانتا ہے سود حرام ہے مگر پھر بھی وہ عیار قوم کے جھانسے میں آ گئے۔ ایک ڈالر کے عوض سو ڈالر کے لالچ نے انھیں یورپ میں سرمایہ کاری پر مجبور کر دیا۔ عربوں نے بنا سوچے سمجھے کئی جاہلانہ اور ناسمجھی کے قدم اٹھائے ہیں۔ پیرس میں شانزے لیزے دنیا کی مہنگی ترین سڑک سمجھی جاتی ہے۔ اس پر نوے فیصد عمارتیں عربوں کی ملکیت ہیں ۔شرمناک بات یہ ہے کہ یورپ میں قائم جوئے خانے، شراب خانے، ریسٹورانٹ، ہوٹل اور ڈسکو کلب سب میں عربوں کے حصص شامل ہیں۔ برطانیہ میں تقریباً چار ہزار شراب خانے اور ڈسکو کلب کی ملکیت پر مسلمانوں کے نام درج ہیں۔ امریکہ نے تو کمال ہی کر دیا ہے اس نے عربوں پر کمال ہوشیاری سے ہاتھ پھیرا ہے۔ سیکڑوں عرب خاندان امریکی تجارتی مارکیٹ میں حصص رکھتے ہیں۔ عربوں نے امریکہ میں تین کھرب ڈالر کی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ سعودی شاہی خاندان پہلے نمبر پر ہے۔ انہوں نے ایک ہزار ارب ڈالر امریکہ میں جھونک رکھے ہیں۔"

"پروفیسر صاحب! آپ تو مجھے حیران و پریشان کیے جا رہے ہیں۔ کیا مسلمان لیڈرا تنے سادہ لوح ہیں۔"

"بیٹا! ایک اور دلچسپ بات سنو۔ گیارہ ستمبر کا واقعہ جس کا سارا نزلہ مسلمانوں پر گرا۔ اس کی پاداش میں مسلم ملک افغانستان پر چڑھائی کر دی گئی۔ اس واقعہ کا سب سے زیادہ نقصان عربوں کو ہوا تھا۔"

"عربوں کو نہیں پروفیسر صاحب! مسلمانوں کو کہیے۔"

"تم میری بات نہیں سمجھے۔ مالی خسارے کی بات کر رہا ہوں۔"

"مالی خسارہ......؟"

"ہاں مالی خسارہ 9/11 نے پوری دنیا میں بھونچال مچا دیا تھا۔ امریکہ میں مہنگائی کا جیسے سیلاب اتر آیا تھا۔ ڈالر کی قیمت یک دم نچلی ترین سطح پر آ گئی تھی۔ جس سے امریکی معیشت کو زبردست دھچکا لگا، پیداوار رک گئی تھی۔ اگر عرب چاہتے تو اس موقع پر تیل کی فراہمی روک کر امریکہ کو مکمل دیوالیہ بنا سکتے تھے۔ مگر دلچسپ امر یہ ہے کہ امریکہ کے دیوالیہ ہونے سے عرب بھی دیوالیہ ہو جاتے۔ کیونکہ امریکی صنعتوں میں اس کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی چالیس بڑی کمپنیوں کے حصص میں سعودی شاہی خاندان شامل تھا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی انشورنس کرنے والی کمپنی کے حصص بھی عربوں کے پاس تھے۔ جب سے سینٹر کے گرنے کا خسارہ بھی براہ راست انہی کو پہنچا۔ ہوائی سفر کا رجحان کم ہوا تو بھی عرب متاثر ہوئے کئی ہوائی کمپنیوں میں ان کے حصص تھے۔ بحالت مجبوری انہیں امریکہ کو تیل کی پیداوار میں پانچ لاکھ بیرل یومیہ اضافہ کرنا پڑا۔ جس سے امریکہ کی گرتی ہوئی معیشت کو زبردست سہارا ملا تھا۔ اس کے باوجود امریکہ نے یہ صلہ دیا کہ اس کا الزام مسلمانوں پر تھوپ دیا۔ حالانکہ بعد از اں تحقیق کا دائرہ وسیع ہوا تو یہ کھرا اسرائیل کی جانب نکلنے لگا۔ اس لیے امریکہ بہادر نے چپ سادھ لی۔"

"آپ کی آخری بات پو تو پاکستان کے کئی دیانت دار صحافی بار بار اپنے کالموں میں کہہ چکے ہیں مگر ان کی یہ صدا صحرا میں برستی بارش ثابت ہوئی۔"

"بیٹا! امریکی فضائی کمپنیاں ہوں، ہالینڈ کے کلب یا جوئے خانے، پیرس کی مہنگی سڑک، شانزے لیزے کی دکانیں اور عمارتیں لندن کی پیکا ڈلی سرکس، مونٹی کارلو کے جوئے خانے سب میں عربوں کے حصص ہیں پتہ نہیں کیوں یہ موت کو بھول گئے ہیں۔" پروفیسر سلیم خمیس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔

"صرف عربوں کا نہیں سر! آج سارے مسلمان لیڈروں کی ذہنی پستی کا کم و بیش یہی حشر ہے۔"

"اب تو بیٹا! ہمیں صلاح الدین ایوبی کا انتظار ہے نجانے کب مسلمانوں میں کوئی صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم، نور الدین زنگی پھر سے جنم لے گا۔"

"انشاء اللہ پروفیسر صاحب آج بھی بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی وہی مضبوطی اور پختگی ہے جو ہمارے اسلاف کے دلوں میں تھی۔" غلام رسول نے پر اعتماد انداز میں کہا۔ پروفیسر صاحب خاموش تھے۔ غلام رسول نے اس کی بیٹی عائشہ کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ وہ عائشہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ کیونکہ عائشہ اور بروج میں نام کے علاوہ رتی برابر فرق نہیں تھا۔



قدیم ترین بندرگاہ ہیمین ٹوٹا جس میں سے سالانہ 60 ہزار بحری جہاز گزرتے ہیں۔ بندرگاہ کے عین اوپر خلا میں بہت بلندی پر ڈیوڈ جوہانسن نے جو پروجیکٹ شروع کیا تھا وہ اپنے ہدف کے مطابق سترہ کروڑ ڈالر کی لاگت سے بخیر و خوبی پورا ہو چکا تھا۔ پروجیکٹ میں جدید ترین توانائی کو برمودا تکون سے حاصل کی گئی شعاعوں میں ضم کیا گیا۔ انہیں ایک نئی شکل دی گئی۔ یہ نئی شکل سابقہ اشکال سے زیادہ پاورفل اور عجیب و غریب ثابت ہوئی تھی۔ پروجیکٹ کے کنٹرول روم سے ہدف کا

تعین کیا جاتا تھا۔ پھر ہدف پر جس طرح پرندوں پر جال پھینکا جاتا ہے اسی طرح ان دیکھی شعاعوں کا جال پھینکا جاتا ہے۔ یہ شعاعیں ہدف میں جا کر ہٹ کرتی ہیں۔ اس کے دائرے میں آنے والی ہر چیز لمحوں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ دراصل اشیاء کو شعاعیں اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ شعاعوں کو جب واپس پروجیکٹ میں کھینچا جاتا ہے تو وہ اپنے ساتھ سامان کو بھی کھینچ لیتی ہیں۔ پروجیکٹ میں شعاعوں پر اشیاء کو علیحدہ علیحدہ کر کے محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ یہ پروجیکٹ عقل کو دنگ کر دینے والی صلاحیتیں رکھتا تھا۔ اس کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ اس کا ایک کنٹرول روم اسرائیل میں بنایا گیا تھا بوقت ضرورت اسے وہاں بیٹھ کر بھی کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ بحری راستوں سے گزرنے والے جہازوں سے مطلوبہ سامان غائب کر دینا اب کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ڈیوڈ نے یہ کام کر لیے توانائی کو عمل میں لایا کہ جہازوں میں سوار کسی بھی ذی روح کو بنا نقصان پہنچائے اور بنا انہیں محسوس ہوئے سامان غائب کیا جا سکتا تھا۔ ابتدائی طور پر ماہرین ایک بحری آئل ٹینکر سے تیل اڑا چکے تھے۔ جہاز کا عملہ سمجھ ہی نہ سکا وہ حیران و پریشان خالی ٹینکرز کو دیکھتے رہ گئے۔ تیل کہاں گیا۔ سمندر میں بہہ گیا یا ہوا میں بھاپ بن کر تحلیل ہو گیا۔ کئی سوال منہ پھاڑے ان کے سامنے کھڑے تھے۔ نگران کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ماہرین نے خدشہ ظاہر کر دیا کہ برمودا ٹکون کی طرح کی کوئی نادیدہ قوت یہاں بھی اپنا کام دکھا گئی ہے۔ کامیاب تجربے پر ڈیوڈ کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ اعلیٰ حکام کو اس نے مکمل تسلی دے رکھی تھی پروجیکٹ کے بارے میں کوئی بھی بین الاقوامی سطح پر تفتیش ہوئی تو بھی یہ ایک عام پروجیکٹ ثابت ہوگا۔ خلاء میں کئی ملکوں نے سیارے چھوڑ رکھے ہیں یہ بھی انہی کا ایک حصہ ثابت ہوگا۔ اسرائیل مستقبل قریب میں آئل کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بننے والا تھا۔ اسرائیل ابھی پچھلی کامیابی کا مزہ چکھ رہا تھا کہ ڈیوڈ اور ویل ڈیورنٹ نے انہیں عالمگیر خوشخبری سنائی۔ اسرائیل اور امریکہ نے مل کر جو تجربات فضا میں آکسیجن سے چھیڑ چھاڑ اور سورج پر شروع کر رہے تھے ان میں بھی کامیابی نے ان کے قدم چومے تھے۔ فضا سے 77 فیصد نائٹروجن، 1 فیصد کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ایک فیصد باقی متفرق گیسیں موجود ہیں اس کا پہلا منصوبہ تھا۔ آکسیجن کو کم کرنا یا بڑھا دینا۔

وہ آکسیجن کو 21.5 تک بڑھانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ وہ دنیا میں کسی خاص حصے کا انتخاب کریں گے۔ منتخب کردہ حصے میں موجود فضائی آکسیجن کو چھیڑ کر بڑھا دیا جائے گا جس سے وہاں خوفناک آگ بھڑک اٹھے گی۔ یعنی دنیا کے جس ملک کے جس حصے میں وہ چاہیں گے آگ لگا سکیں گے۔ انہوں نے محدود پیمانے پر اس کا کامیاب تجربہ کر لیا تھا۔ اب ان کا اگلا اسٹیپ زمین اور سورج کی آنکھ مچولی کے بارے میں تھا۔ سورج جب ہیلیم گیس کو چودہ ارب ٹن سے بارہ ارب ٹن میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ کامیابی پچھلی کامیابی سے بڑی تھی۔ کیونکہ نئی کامیابی پوری دنیا کو اس کا تابع و مطیع بنانے کے لیے انتہائی اہم کردار ادا کرنے والی تھی۔ ڈیوڈ اصلی روپ میں گرو بن کر چیلوں کے سامنے پہنچا تو بہت خوش تھا۔ چیلوں نے دیکھا آج ان کا گرو بہت خوش ہے۔ چیلوں نے سبب پوچھا تو گرو بولا۔

''ہاں میں آج بہت خوش ہوں کیونکہ وقت آچکا ہے کہ میں کرہ ارض کو اپنی مرضی سے چلا سکوں۔''

''حق گرو! بے شک گرو۔'' چیلے یہ بات سن کر نعرے بلند کرنے لگے۔ گرو کی گردن فخر سے اکڑ گئی تھی۔

''سنو میرے قابل فخر چیلو! 24 ہزار 8 سو سال پہلے کرہ ارض پر ایک ہولناک تباہی وارد ہوئی تھی۔ جس میں ساری مخلوقات زیر و زبر ہو گئی تھی۔ میں نے دنیا پر شب و روز محنت کی۔ بے شک میری اس محنت میں میرے سارے چیلے میرے معاون تھے۔ ہماری اس محنت کے طفیل آج دنیا میں یہ رائے پائی جاتی ہے کہ 21 دسمبر 2012ء کو یہ زمین ایک انتہائی خطرناک اور بھیانک

تجربے سے گزرنے والی ہے۔ ایک ایسا تجربہ جو شاید 28 ہزار 8 سو سال پہلے والی تباہی سے زیادہ تباہی لے کر آئے۔ میکسیکو کی مایا تہذیب نے اپنا کیلنڈر 21 دسمبر 2012 سے آگے بند کر دیا ہے۔

دنیا کے ماہرین کا نظریہ ہے زمین کا ایک بیرونی خول ہے جسے عام زبان میں قشر کہا جاتا ہے قشر مختلف جگہوں پر مختلف سائز یعنی دس سے تیس میل تک ہے۔ زمین کے اس خول یا قشر کو بدلنے کے عمل کو پول شفٹ کہتے ہیں نئی تحقیق کے تناظر میں 21 دسمبر 2012ء کو قطب شمالی جنوبی میں پھنس جائے گا۔ جب سورج نکلے گا تو قشر کا عمل بے قابو ہو جائے گا کیونکہ اس وقت زمین دو انتہائی طاقتور مقناطیسی قوتوں کی وجہ سے اپنی کشش کھو دے گی۔ یا بہت حد تک کمزور ہو جائے گی۔ اس صورت حال میں دنیا ایسے ارتکائی تجربے سے گزرے گی کہ ہر طرف تباہی ہی تباہی ہو گی۔ دوسرے لفظوں میں قیامت آجائے گی۔"

"گرو جی! کیا ایسا ہونے والا ہے؟" گرو نے طویل بے ڈھنگے انداز میں قہقہہ لگایا۔

"یہ سارے مفروضے اور نظریات ہمارے پیدا کردہ ہیں میں چاہتا ہوں ہمارا ازلی دشمن مسلمان ان مفروضات پر اندھا اعتماد کرلے کیونکہ دنیا میں واحد مذہب اسلام ہے جس کے پاس آسمانی کتاب قرآن مجید آج تک اپنی اصل حالت میں جوں کا توں موجود ہے۔ قیامت کے بارے میں انہیں اس کتاب میں کئی نشانیاں ملتی ہیں۔"

"مگر گرو آپ تو کہہ رہے تھے کہ وقت آچکا ہے جب ہم کرہ ارض کو اپنی مرضی سے چلا سکیں گے۔"

"ہاں وقت آچکا ہے کہ ہم اپنا آخری ہتھیار سامنے لائیں اور پوری دنیا اسے اپنا خدا مان کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے۔"

"گرو جی! آپ کئی بار کہہ چکے ہیں ہمارا آخری ہتھیار مگر کبھی اس کی تفصیل نہیں بتائی۔"

"سنو! یہودی اسے مسیح کے نام سے پکارتے ہیں جس کا مطلب وہ مسیحا لیتے ہیں۔ مسلمان اسے دجال کے نام سے پکارتے ہیں وہ کہتے ہیں جب سے دنیا وجود میں آئی ہے اس سے بڑا فتنہ کرہ ارض نے نہیں دیکھا۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے دجال ایک نوجوان، تنومند اور بھاری بھرکم ہوگا۔ سرخ رنگت، گھنگھریالے بال، الجھے ہوئے چھوٹے اور کھڑے بال، دونوں آنکھوں سے عیب زدہ مگر ایک آنکھ سے کانا ہے یا اندھا ہوگا دوسری آنکھ انگور کے دانے کی طرح لٹکی ہوئی ہوگی۔ دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر کافر لکھا ہوگا۔ مسلمان تمام غیر مسلم کو کافر کہتے ہیں۔ دجال کی پیشانی پر لکھا ہوا کافر مسلمان چاہے وہ پڑھا لکھا ہے یا ان پڑھ پڑھ لے گا۔ مگر غیر مسلم نہیں پڑھ سکے گا۔ وہ شام اور عراق کے درمیان ایک راستہ پر نمودار ہوگا۔ یا پھر اصفہان کے علاقے یہودیہ سے نکلے گا۔ مسلمان شام کے جبل دخان کی طرف بھاگ جائیں گے دجال وہاں جا کر ان کا محاصرہ کرلے گا۔"

"گرو! دجال تو ہماری یعنی شیاطین کی منشا کے مطابق کام کرے گا۔" یہ سوال سیلبا کا تھا۔

"سیلبا! بے شک ایسا ہی ہوگا۔ میں تمہیں اس دھرتی کا سچا مذہب اسلام میں دجال کے بارے میں عقیدہ بتا رہا ہوں۔ دجال جب نمودار ہوگا اس کے ساتھ ستر ہزار اصفہان کے یہودی ہوں گے جو ایرانی چادریں اوڑھے ہوئے ہوں گے۔ دجال کے پاس روٹیوں کا پہاڑ اور پانی کا دریا ہوگا۔ وہ ایک گدھے پر سوار ہوگا۔ گدھے کے کانوں کے درمیان چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہوگا۔ وہ ایک بدو سے کہے گا۔ میں تمہارے ماں باپ کو پھر سے زندہ کر دوں تو تم میرے خدا ہونے کی شہادت دو گے۔ بدو کہے گا۔ ہاں دوں گا۔ تب میرا کام ہوگا۔ یعنی دو شیاطین بدو کے ماں باپ کے روپ میں اس کے سامنے جا کر کہیں گے۔ بیٹا یہ تمہارا خدا ہے اس کا ہر حکم مانو۔ دجال کے قبضے میں زندگی کے تمام نفع بخش وسائل، پانی، آگ، غذا

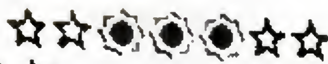
اور دیگر توانائی ہوگی۔ وہ بارشوں، موسم، فصلوں سب پر قدرت رکھتا ہوگا۔ دجال خشک سالی اور قحط پر عبور رکھتا ہوگا' وہ زمین پر ایسے چلے گا جیسے ہوا بادلوں کو اڑا لے جاتی ہے۔ اس کے ساتھ نقلی جنت بھی ہوگی اور جہنم بھی۔ وہ ظاہر طور پر زندگی اور موت پر قدرت رکھے گا۔ یہ ہے مسلمانوں کا عقیدہ۔''

''گرو جی! ان باتوں میں کہاں تک سچائی ہے۔ کیونکہ دجال کے بارے میں کوئی جانتا ہو یا نہیں گرو تو جانتا ہے کہ دجال کہاں ہے کون ہے اور کیسا ہے؟''

''ان باتوں میں ایسی ہی سچائی ہے جیسے سمندر کا یہ پانی جس پر ہم نے تخت بچھا رکھے ہیں۔ جو ہمارے سامنے ہے اور جسے ہم چھو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی ساری باتیں حرف بہ حرف سچی ہیں۔ تبھی تو میں نے ہمیشہ دنیا سے وہ کام لیا ہے جو دجال کا معاون ثابت ہو۔ آج کوئی بھی عقل والا انسان حالات و واقعات کا جائزہ لے تو اسے دجال کا ہم آہنگ پائے گا۔ دنیا کے اسی فیصد لوگ اور لیڈر جن کے اذہان و قلوب میں ہم نے مکمل ڈیرے جما لیے ہیں وہ ہماری پیروی میں دجال کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ دنیا کے سارے وسائل چند غیر مرئی ہاتھوں نے قابو کر لیے ہیں۔ انسان کو مار کر اسے پھر سے زندہ کرنے کا تجربہ ہو چکا ہے۔ موسموں پر کنٹرول حاصل کیا جا چکا ہے۔ بارشوں، زلزلوں، آگ سب پر قابو پا لیا گیا ہے۔ بنا باپ کے بچہ جنم لینے لگا ہے اور ایسے طیارے جنم لے چکے ہیں جو چند منٹوں میں دنیا کا سفر طے کر لیتے ہیں اور اب دنیا والوں کو ایک ایسے تجربے میں پھنسا دیا ہے، جس سے وہ پوری دنیا کو گلوبل ویلیج بنا کر سارا نظام اپنی مٹھی میں تو کر لیں گے مگر اس سے وہ کئی صدیاں پیچھے چلے جائیں گے۔''

''کئی صدیاں پیچھے......؟'' چیلے حیران تھے کہتے کہتے گرو یہ کیا کہہ گیا ہے؟

''ہاں کئی صدیاں پیچھے۔ تھوڑا انتظار کرو اس وقت کا جو عنقریب آنے والا ہے۔''



حمزہ اور عبداللہ اپنے اپنے مقام پر پہنچ گئے تھے۔ غلام رسول کو اضافی کام کرنا پڑا تھا۔ اس لیے منزل مقصود سے ابھی دور تھا۔ فلسطین کی سرزمین پر اس کی زندگی میں ڈرامائی موڑ آئے تھے۔ پروفیسر سلیم قیس کی مدد کرنا اس کا فرض تھا۔ جسے اس نے بحسن و خوبی پورا کر دیا تھا۔ وہ لوگ محفوظ ٹھکانے تک پہنچ گئے تھے۔

غلام رسول کا خیال تھا شاید یہ قدرت کی منظوری تھی۔ اسے بروج سے ایک بار پھر ملنا تھا۔ بروج اس کا پیار تھی کل بھی اور آج بھی وہ اسے بھی بھلا نہیں سکا تھا۔ اس کی جدائی اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ غالب امکان تھا کہ بہت جلد زندگی کے کسی موڑ پر وہ کھوکھلی لکڑی کی طرح ٹوٹ جاتا۔ پروفیسر صاحب کی بیٹی عائشہ نے اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو یک دم بریک لگا دی تھی۔ اس نے عائشہ کے بارے میں کھرچ کھرچ کے سوال کیے تھے۔ عائشہ کا بروج کے ساتھ دور دور کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ غلام رسول نے پروفیسر سلیم قیس اور اس کی بیوی کو پوری روداد سنادی تھی۔ جسے سننے کے بعد انہوں نے اس کی تشفی کے لیے عائشہ کی بچپن سے لے کر اب تک جو بھی تصاویر ان کے پاس محفوظ تھیں اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ خود بھی عائشہ سے تنہائی میں بات چیت کر چکا تھا۔ عائشہ کو بروج کی فوٹو کاپی کہنا بھی غلط تھا۔ وہ بروج کا اصل تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک اور بروج نے جنم لیا ہے۔

عائشہ غلام رسول کی ممنون تھی۔ جس نے اس کی ذات اور خاندان پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ یہودی فوجیوں کی قید میں اسے ہر لمحہ اپنی عزت تار تار ہونے کا ڈر رہتا تھا۔ وہ موت سے نہیں ڈرتی تھی۔ وہ شہداء کی بہن تھی اسلام کا یہ طرہ امتیاز ہے اس کے مرد و عورت دین پر شہید ہونے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ عائشہ کو ایک مجاہد نے آزادی دلوائی تھی۔ وہ اسے فلسطینی مجاہد سمجھی تھی۔ بعد میں پتہ چلا اس کا محسن پاکستانی مجاہد ہے۔ اس

نے ماں سے کہا تھا۔

''ہمارا اللہ ہمیں کبھی تنہا نہیں چھوڑتا میری آزادی کے لیے اس نے کہاں سے مجاہد کو اٹھایا اور کہاں لے آیا۔'' ماں جواباً بولی۔

''ہاں بیٹی! اس ذات نے کبھی مسلمانوں کو اکیلے نہیں چھوڑا بس ہم ہی بدعقیدہ لوگ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر دیگر اسباب ڈھونڈنے لگتے ہیں۔''



رام اللہ میں ان کا دوسرا دن تھا۔ یہ دن اس کے لیے نیا موڑ لایا۔ اس دن عائشہ اس سے محوِ گفتگو ہوئی۔

''مجھے آپ کی بے لوث اور بے پناہ محبت کا احساس ہے میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں اور سلام پیش کرتی ہوں اس جذبے کو جس کے تحت آپ تن تنہا قابض فوج کے اتنے بڑے فوجی اڈے پر حملہ آور ہوئے اور انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ عائشہ بول رہی تھی اور غلام رسول اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بولنے کا انداز بھی بروج جیسا تھا۔ بس زبان وہ نہیں تھی۔ آپ بروج کے حوالے سے ہی سہی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ محبت میرے لیے فخر کی بات ہے۔ اسلام کا مجاہد مجھ سے محبت کرتا ہے میں آپ کا انتظار کروں گی۔

غلام رسول چونک پڑا۔ عائشہ کے آخری الفاظ سے اسے نئی حرارت دے گئے تھے۔ ایک خیال کے تحت وہ بولا۔

''ہوسکتا ہے میں واپس نہ لوٹ سکوں میں یہاں جذبہ شہادت لیے آیا ہوں۔ میرا مشن بہت ہی کٹھن اور مشکل ترین ہے میرے لیے سب سے پہلے میرا مشن ہے۔ میری خواہش ہے یہ مشن میرے ہاتھوں تکمیل تک پہنچے چاہے اس میں میری جان چلی جائے۔''

یہی موقع تھا جب عائشہ نے اسے ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

''میں نہیں جانتی آپ کے نزدیک محبت کا پیمانہ کیا ہے مگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔''

''کک..... کیا؟'' وہ حیرت سے گنگ ہو گیا تھا۔

''ہاں میں نے کبھی سپنے نہیں دیکھے نہ ہی کبھی آئیڈیل تراشا ہے مگر جس نوجوان کے دل میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کے بھری ہو سر پہ کفن باندھے وطن کی خاطر ہزاروں میل دور چلا آیا ہو۔ جس کے دل میں احساس کا سمندر موجزن ہو وہ ایک بوڑھے مسلمان کی بیٹی کو چھڑانے کے لیے اکیلا آگ کے دریا میں کود پڑتا ہے۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی آئیڈیل نہیں ہو سکتا۔ میں واقعی آپ سے محبت کرتی ہوں اور آپ چاہیں تو ہم نکاح کر سکتے ہیں۔''

''یہ جانتے ہوئے بھی عائشہ! کہ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو تم مجھ سے شادی پر رضامند ہو۔''

''میں نے ایک سگے بھائی کو راہ حق میں شہید ہوتے دیکھا ہے اگر میرا شوہر بھی اس راہ میں کام آگیا تو میں جنت اللہ تعالیٰ سے لڑ کے بھی لے لوں گی۔ پھر ہم جنت میں ہمیشہ کے لیے ملیں گے۔'' غلام رسول کو سن کر دھچکا لگا اس کے سامنے منزہ کی تصویر لہرانے لگی تھی۔

سر جی نے حمزہ کو فلسطین جانے سے قبل شادی کا مشورہ دیا تھا۔ بات جب ان کے گھر تک پہنچی تو غلام رسول نے ممی سے کہا تھا۔

''بہتر ہے ممی! ہم منزہ سے پوچھ لیں ان دونوں نے منزہ سے بات کی تو وہ بولی۔

''اگر آپ لوگوں کی رضا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں بھائی کو وطن پر قربان کرنے کی سکت رکھتی ہوں تو شوہر کو بھی اس عظیم مشن سے نہیں روکوں گی۔ میرے لیے فخر کی بات ہوگی مجھے شہید بھائی کی بہن اور شہید شوہر کی بیوی کا اعزاز حاصل ہوگا۔'' حمزہ شادی کے پندرہ دنوں بعد مشن کے لیے روانہ ہوا تھا۔

غلام رسول نے عائشہ کے لیے باہیں وا کر دی تھیں۔ وہ اس کی بانہوں میں سما گئی۔

''مجھے فخر ہے ہم مسلمان ہیں جس کا ہر فرد جذبہ شہادت سے لبا لب بھرا ہوا ہے۔'' غلام رسول کہتے

ہوئے رو پڑا تھا۔

یہ ڈرامائی موڑ اس کے تصور سے بالاتر تھا مگر حقیقت یہی تھی رات کو چار گواہوں کی موجودگی میں اس کا نکاح پڑھوا دیا گیا تھا۔ نکاح کے بعد غلام رسول پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ پروفیسر سلیم خمیس کے گلے سے لگا دہ ہچکیوں میں رویا تھا۔ اسے گھر والے بڑی شدت سے یاد آئے تھے۔ خصوصاً ڈیڈی اور کنزہ، ڈیڈی کو بہت حسرت تھی اس کے سر پر سہرا سجا دیکھنے کی وہ ممی سے اکثر کہا کرتے تھے جب وہ کامران اور اذان کے رویوں کا گلہ کرتی تو وہ کہتے بیگم اپنی ساری خواہشیں اور حسرتیں شانی کی شادی کے لیے بچائے رکھو۔ شانی اور اس کی بیوی تمہاری ساری شکایتیں دور کردے گے۔ آج ڈیڈی اور کنزہ دنیا میں نہیں تھے جو تھے حالات کی ستم ظریفی کہ وہ انہیں خبر تک نہیں کر سکتا تھا۔



وہ کمرے میں داخل ہوا تو عائشہ ایشیائی لڑکیوں کی طرح گھونگھٹ گرائے بیڈ کے وسط میں بیٹھی ہوئی تھی۔ غلام رسول نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور بولا۔

”ہمارے ہاں دولہا جب دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتا ہے تو اسے کوئی تحفہ دیتا ہے اسے منہ دکھائی کی رسم کہتے ہیں مجھے افسوس ہے عائشہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔“

”آپ کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ آپ بھی منہ دکھائی کی رسم ادا کرسکتے ہیں۔“

”مگر میرے پاس اس وقت تمہیں دینے کے لیے محبتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

”اس کمرے میں ایک چیز ہے وہ ہماری مشترکہ ملکیت ہے اس سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا۔“

غلام رسول نے کمرے کے مختصر سامان کا جائزہ لیا بیڈ کے علاوہ ایک صوفہ، دو کرسیاں ان کے سامنے میز ایک کتابوں کی الماری تھی بیڈ کے اوپر کلمہ طیبہ کا خوبصورت فریم لٹکا ہوا تھا۔ وال کلاک اور ایک گلدان بھی تھا۔ غلام رسول کی نظریں الماری پر ٹک گئیں۔ جہاں دس بارہ کتابیں جڑی ہوئی تھیں۔ [illegible]

رکھا تھا۔ غلام رسول بیڈ سے اترا اور قرآن پاک اٹھا لیا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو عائشہ! منہ دکھائی میں اس سے قیمتی تحفہ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔“ عائشہ نے مجازی خدا سے پہلا تحفہ لیا۔ اسے چوما اور سینے سے لگا لیا۔ پانچویں دن غلام رسول ان سے الوداع ہو چکا تھا۔



وہ دریائے اردن کے مغربی کنارے پر واقع شہر رام اللہ کی کشادہ سڑک پر جا رہا تھا۔ جب تک وہ پاکستان میں تھا اسے رملہ کے نام سے ہی جانتا تھا۔ مگر امیر مجاہدین اور پروفیسر سلیم خمیس نے اسے شہر کا اصل نام رام اللہ بتایا تھا۔ بقول پروفیسر سلیم خمیس۔

رام کا لفظ فارسی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی تابع یا مطیع ہے۔ سنسکرت میں اس کے معنی خوبصورت اور پروردگار کے لیے جاتے ہیں جو غلط ہیں۔ پروردگار پالنے والے کو کہتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اصل لفظ رام عبرانی زبان سے لیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے شان اور عظمت اس طرح رام اللہ کا معنی نکلے گا اللہ کی شان یا اللہ کی عظمت کسی خاص دیوتا کے لیے رام استعمال کرنا غلط ہے۔ پروفیسر صاحب نے اسے بتایا تھا۔

رام اللہ کو اسرائیل نے 1968 کی جنگ میں اردن سے چھین لیا تھا۔ اس وقت شہر کی آبادی بارہ ہزار سے کچھ اوپر تھی۔ آج کا رام اللہ جدید شہر میں ڈھل چکا تھا۔ جس میں بڑے بڑے روڈ تھے۔ جن پر گاڑیاں فراٹے بھرتی تھیں۔ سجی سجائی دکانیں اور مارکیٹیں تھیں۔ موبائل فون سیٹ کی دکانیں بھی کہیں کہیں نظر آنے لگی تھیں۔ برگرز، چاکلیٹس کی دکانیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ رنگین اشتہاروں کی خوبصورتی الگ سے تھی۔ بہت سی جگہوں پر جام شہادت نوش کرنے والے شہداء کی تصویروں کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔

غلام رسول چلتے ہوئے ان کا جائزہ لے رہا تھا۔

بہت سی ایسی تصویریں بھی نظروں سے گزری تھی جن میں اسرائیل پر ہونے والے خودکش حملوں کی عکاسی کی گئی تھی۔ یہیں پر رملہ کمپاؤنڈ بھی تھا۔ جس میں یاسر عرفات کی رہائش تھی۔ دوسرے لفظوں میں قید خانہ، کیونکہ ایک عرصے سے انہیں اسرائیل نے اس کمپاؤنڈ میں نظر بند رکھا ہوا تھا۔ غلام رسول کی شادی پر ہم نواز، روشن نواز اور عاصم نواز بے حد خوش تھے۔ انہوں نے خوب جشن منایا تھا۔ خصوصاً روشن نواز جس کی خدا نے ہر خواہش پوری کردی تھی۔ رام اللہ کے کشادہ روڈ پر چلتے ہوئے غلام رسول کو بوڑھے جن کا خیال آیا۔ اس نے پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا۔ اب تک وہ اسے بھول چکا تھا حالانکہ وہ بوڑھے جن سے گولان کی پہاڑیوں میں جا کر مل سکتا تھا۔ اس نے ہم نواز سے درخواست کی۔

''ہم نواز! مجھے گولان کی پہاڑیوں پر بوڑھے جن کے پاس لے جاؤ۔'' خلاف توقع ہم نواز فوراً مان گیا۔ وہ بولا۔

''ٹھیک ہے شانی! آپ آنکھیں بند کریں۔ وہ تینوں اسے ہنوز شانی کے نام سے پکارتے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں چند سیکنڈ بعد اسے ہم نواز کی آواز سنائی دی۔

''آنکھیں کھولو شانی!'' وہ ابھی کچھ ہوجانے کی توقع کررہا تھا مگر وہ ہوچکا تھا جس کی وہ ذہنی طور پر تیاری کررہا تھا۔ اس کے سامنے بوڑھا جن کھڑا ہوا تھا۔ وہ لمحوں میں گولان کی پہاڑیوں پر پہنچ چکا تھا۔

''خوش آمدید شانی! مقدر ایک بار پھر تمہیں میرے سامنے لے آیا ہے۔''

''میں نے وعدہ کیا تھا جب بھی فلسطین آیا تو آپ سے ملاقات ضرور کروں گا۔'' کہتے ہوئے شانی کے ذہن میں ماضی کی فلم چلنے لگی تھی۔ ان پہاڑیوں میں جنات کے بچوں نے اس پر بہت انوکھے ظلم ڈھائے تھے۔ اسے طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں اور تشدد کا نشانہ بنایا تھا مگر یہیں سے اسے بہت کچھ ملا بھی تھا۔ ایک منظر جس کی لگن میں وہ یہاں تک آن پہنچا تھا۔ پراسرار آوازیں اور روشنی کا زمین سے اٹھتا ہوا ہالہ، جس کی منزل سمجھ سے بالاتر تھی۔ ایک عرصے بعد اس پر یہ راز عیاں ہوا تھا۔ وہ آوازیں کیسی تھی، وہ زمین سے آسمان کی طرف اٹھتا ہوا روشنی کا ہالہ کیا تھا۔ اس گھر میں ایک بزرگ ہستی کا کمرہ تھا۔ وہ روزانہ نماز تہجد ادا کرتا تھا۔ جب وہ تہجد پڑھتا تھا تب آسمان سے روشنی کا ہالہ اس گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ وہ پراسرار آوازیں اصل میں روشنی کے ہالے سے اٹھتی تھیں۔ ان آوازوں کو خوف کے سبب شانی سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ غالباً فرشتوں کی آوازیں تھیں جو نچلے آسمان پر اتر کر کہتے ہیں۔

''ہے کوئی بخشش کروانے والا؟'' شانی کو یہ سب باتیں تب پتہ چلیں جب وہ گھر خالی ہوچکا تھا۔

ہم نواز، روشن نواز اور عاصم نواز سے آگہی بھی اسے انہی پہاڑیوں میں ہوئی تھی۔ وہ منظر اسے کل کے دن کی طرح یاد تھا۔ وقت رخصت بوڑھے جن نے اسے کہا تھا۔

''شانی! ایک تحفہ دے رہا ہوں اسے دیکھ بھال کر استعمال کرنا۔'' ساتھ ہی بوڑھے جن نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ لوگ اسے دل کہتے ہیں گوشت پوست کا چھوٹا سا لوتھڑا مگر ہزاروں لاکھوں خواہشات کا منبع۔ یہ انسان سے چار ماہ پہلے وجود میں آتا ہے جب یہ پیدا ہوتا ہے تب بالکل صاف وشفاف ہوتا ہے ہمارے اعمال اسے وقت کے ساتھ ساتھ سیاہ یا پھر مزید روشن کردیتے ہیں۔ میں اسے روشن نواز کہتا ہوں۔'' بوڑھے جن نے اس کے دماغ کو چھوا۔

''یہ جسم کا سربراہ ہے دماغ سے کام لینے والے ہی کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ میں اسے ہم نواز کہتا ہوں۔'' اس کے بعد جن نے اس کے سینے پر ہلکے سے چپت لگائی اور بولا۔

انسان کے اندر ایک ضمیر ہے جو اسے اچھے کاموں کی ترغیب دیتا ہے اور برے کاموں سے روکتا ہے۔ اسے مار دینے والے ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ میں نے اسے عاصم

نواز کا نام دے رکھا ہے۔ کبھی اسے مرنے نہ دینا، انسان ان تینوں سے باتیں کرتا ہے یہ تمہارے ساتھ بھی باتیں کریں گے ہاں البتہ ہم نواز میں ایک اضافی صفت ہے جو ہر انسان کے دماغ کو نہیں ملتی میں تمہیں دے رہا ہوں۔

شانی آج پھر اسی بوڑھے جن کے روبرو کھڑا تھا۔ آج اسے بہت سے ادھورے سوالات کا پورا جواب چاہئے تھا۔ بوڑھے جن نے اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''مجھے خوشی ہے شانی تم نے روشن راہوں کا انتخاب کیا ہے اندھیری راہوں کے مسافر نہیں بنے من کے انسان بنے ہو اور اس کی منزل کی تلاش میں ہو۔''

''میں تو بس چلتا رہا ہوں۔ راہیں خود بخود متعین ہوتی گئی ہیں۔ میں تو ان کے صحیح یا غلط ہونے کا ابھی مکمل ادراک بھی نہیں رکھتا۔ بس جو ہوا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوا۔''

''شانی! تم نے بہت سے مقامات پر سرخروئی حاصل کی ہے۔''

شانی الجھ گیا یہ بات بوڑھا جن اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتا ہے۔

''کیا آپ جانتے ہیں یہاں سے جانے کے بعد مجھ پر کیا بیتی؟ یا میں نے کیا کیا؟''

''ایک ایک پل کی رپورٹ ہے میرے پاس۔'' جن نے اسے حیران کر دیا تھا۔

''مگر وہ کیسے......؟ آپ تو توحید کے قائل ہیں غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ پھر آپ کیسے جانتے ہیں؟'' جن اس کی بات پر مسکرا پڑا تھا۔

''شانی! ہر انسان دل و دماغ سے باتیں کرتا ہے۔ تم بھی کرتے تھے۔ مگر ہر انسان دماغ سے جاسوسی کا کام نہیں لے سکتا۔ مگر تم ہم نواز سے یہ کام لیتے تھے۔ کیسے یہ کبھی سوچا تم نے؟''

''نہیں۔ یہ معمہ میں حل نہیں کر سکا۔''

''سوچ اور دماغ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دماغ اپنی جگہ ساکت رہتا ہے جبکہ سوچ سفر کرتی ہے اگر دماغ سفر کرنے لگے تو انسان پاگل ہو جائے۔ میں نے تمہارے ساتھ اپنے قبیلے کا ایک مسلمان جن مستقل لگا دیا تھا۔ تم جیسے ہی ہم نواز یعنی اپنے دماغ کو حکم دیتے تھے اس پر وہی مسلمان جن عمل کرتا تھا۔ جنات کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیات عطا کی ہیں وہ پلک جھپکتے میں ادھر ادھر آ جا سکتے ہیں۔ اس لیے جن لمحوں میں تمہیں خبریں پہنچا دیتا تھا۔''

''اوہ......!'' غلام رسول کے ذہن میں کوندے کی طرح خیال لپکا۔ اسے معلم عبدالرحمن کی بات یاد آ گئی تھی۔ انہوں نے یہی اصرار کیا تھا۔

''غلام رسول تمہارے ساتھ جن ہے۔ جو تمہارے حکم کی بجا آوری کرتا ہے۔''

''ہم نواز میں تمہیں دیکھنا چاہوں گا۔ میرے سامنے آؤ۔''

''شانی! جنات کی کوئی واضح شکل نہیں ہے مگر یہ بات طے ہے ہم نواز نے تمہارا ہر پل خیال رکھا۔ تب بھی جب تم نے چاہا اور وہ بھی جو تمہارے علم میں نہیں۔'' بوڑھے جن نے اسے بتایا۔

''ہم نواز! نے میرا واقعی ہر لمحہ ہر پل خیال رکھا ہے۔''

''شانی! جب تھانے میں تم رسیوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے تب اسی نے تمہیں کھولا تھا۔ نثار پور کی پہاڑیوں سے جب تم نیچے گرے تھے اس نے تمہیں اٹھا لیا تھا اور وہاں پھینک دیا جہاں مچھیرے پہلے سے ایک لڑکی کی تلاش میں غوطہ زن تھے۔ جب حیدر عباس تم پر تشدد کر رہا تھا۔ تب بھی تمہارے ہاتھ کھولنے والا یہی تھا۔ مجھے یہ ہر لمحہ حالات سے باخبر رکھتا تھا۔''

''تو پھر خدا کے لیے میری زندگی کی سب سے بڑی الجھن بھی دور کر دیجئے۔ بروج میرے لیے معمہ ہے آپ مسلمان ہیں میں اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں اگر آپ کو اس معاملے میں کچھ پتہ ہے تو مجھے بتائیے۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"شانی! جس بروج کو تم پیار کرتے تھے وہ بروج انسان تھی ہی نہیں۔"

"کیا......؟" شانی اچھل پڑا انسان نہیں تھی۔ میں سمجھا نہیں

"گوریا بستی کی بروج دریا میں گر کر موت کا شکار ہو چکی تھی۔ جو بروج مچھیروں کو ملی تھی وہ اس کا روپ تھا۔ جو شیطان نے تمہیں پھنسانے کے لیے دھارا تھا۔"

"شش......شیطان؟"

"ہاں شیطان۔ جو مسلمان کے ساتھ ہمہ وقت رہتا ہے۔ اسے گمراہ کرتا ہے۔ اس کے دل میں وسوسے پیدا کرتا ہے وہ بھی شیطان تھا جس نے بروج کا روپ لیا تھا۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی شکل کی دو لڑکیاں پیدا کر رکھی تھیں۔ ایک گوریا بستی کی بروج اور دوسری المنارہ کی عائشہ جسے تم نے گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ وہ شیطان مردود تھا۔ جو اب کسی نئے روپ میں تمہارے ساتھ ہوگا اور تاحیات رہے گا۔ اس سے بچنے کی تدبیریں ہمیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے بتا دی ہیں۔ سو جب تک تم زندہ ہو انہی پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنا۔"

غلام رسول نے طویل سانس خارج کی۔ وہ سارا ماجرہ سمجھ گیا تھا۔ طارق اور سرجی کی تمام باتیں درست تھیں۔

"شانی! یہ تمہاری بے لوث محبت کا نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ نے عائشہ کی صورت میں تمہارا پیار تمہیں لوٹا دیا ہے۔"

"جی ہاں۔ میں اس کے لیے اپنے رب کا جتنا بھی شکر بجا لاؤں کم ہوگا۔" شانی نے جواب دیا۔ پھر تھوڑا توقف کے بعد بولا۔

"میری زندگی پر آپ کے بہت احسانات ہیں عین ممکن ہے کوئی ایسا موقع آئے میں ان کا بدلہ چکا دوں مگر میں آپ سے ایک اور احسان کا خواہش مند ہوں۔"

"کون سا احسان......؟"

"مجھے موساد کے ہیڈ کوارٹر پہنچنا ہے۔ جو کہ یہاں سے بہت دور ہے راستے کے خطرات سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ مجھے میری منزل پر پہنچا دیں۔" اس کی بات سن کر بوڑھا جن بولا۔

"ہم نواز نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ شانی جب تک پاکستان میں رہے گا ساتھ رہوں گا۔ اگر فلسطین پلٹ آیا تو پھر ساتھ جانے کا پابند نہیں رہوں گا۔ وعدہ کے مطابق یہاں آنے کے بعد ہم نواز یعنی میرا منتخب کردہ جن تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ اسے فلسطین کی سرزمین سے بے حد پیار ہے۔ یہ کہتا ہے روز قیامت میرے لیے فلسطین کی سرزمین بخشش کا سبب بنے گی۔"

"میں ہم نواز کو ساتھ لے جانے کی ضد نہیں کرتا مجھے آپ خود موساد کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیں۔ اس کے بعد ہماری راہیں جدا جدا ہیں۔" بوڑھا جن خاموش ہو گیا۔ ہم نواز کی آواز سنائی دی۔

"شانی! بہت سے سال تمہارے ساتھ گزارے ہیں مجھے تمہاری قربت میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ تمہاری محبت میں، میں تمہیں تمہاری منزل تک پہنچا دیتا ہوں۔ اس کے بعد ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہیں۔"

شانی گولان کی پہاڑیوں میں سجدہ ریز ہو گیا۔ اس نے اپنی کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے رو رو کر دعا مانگی۔ بوڑھے جن کو الوداع کیا اور ہم نواز کے حکم پر آنکھیں بند کر لیں۔



تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ نے جو سب سے عجیب و غریب چیز پیدا کی ہے۔ اس کا نام موت ہے۔ انسان ہر لحہ ہر پل اس کی طرف بڑھتا ہے مگر پھر بھی اسے پس پشت ڈالے رکھتا ہے۔ زندگی موت کے بنا مضطرب اور پریشان رہتی ہے۔ زندگی کے سارے غم اور دکھ چھیننے والی بھی موت ہے جب تک موت کا ظہور نہیں ہوتا زندگی میں ایک خلا رہتا ہے۔ موت اس خلا کو پر کرتی ہے۔ کچھ انسان زندہ رہ کر بھی جزوی زندگی گزارتے

ہیں کچھ کا نام ونشان موت مٹا دیتی ہے مگر کچھ انسان موت کے بعد زندگی کو ہمیشہ کے لیے امر کر لیتے ہیں وہ کبھی نہ مرنے کے لیے ایک بار مرتے ہیں پھر ہمیشہ کے لیے زندہ رہتے ہیں ایسے ہی لوگوں میں سابق ڈی ایس پی امجد بخاری بھی شامل تھا۔ جنہوں نے ضمیر کے خلاف ایک قدم اٹھایا۔ مگر ضمیر نے اس کی جان بخشی نہ کی اس جرم کی پاداش میں اس نے نوکری چھوڑ دی۔ اللہ کا دیا پہلے سے بہت کچھ تھا۔ جذبہ حب الوطنی سے مجبور ہو کر ایک پرائیویٹ گروپ تشکیل دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے منظم ہوتا چلا گیا۔

میں تو اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ آتے گئے کارواں بنتا ہی گیا

اس شعر کی اصل تفسیر امجد بخاری کی ذات میں نظر آتی ہے۔ اس کے گروپ نے دیکھتے ہی دیکھتے کئی منزلیں طے کی تھیں۔ بہت سے حب الوطن لوگ جو جانی طور سے اپنی خدمات پیش نہیں کر سکتے تھے انہوں نے امجد بخاری کے سامنے اپنی تجوریاں کھول رکھی تھیں۔ ایسے لوگوں کا عقیدہ تھا ہم پاکستان سے ہیں پاکستان ہم سے نہیں ہے۔ جو لوگ پاکستان کو اپنی ذات سے مشروط کرتے ہیں وہی دراصل اسے لوٹتے کھسوٹتے ہیں۔ وہ اپنی تجوریاں اور بینک بیلنس بھر کر بھی یہ زعم رکھتے ہیں کہ ہم نہ ہوں گے تو پاکستان کا نظام نہیں چل سکے گا۔ ایسے لوگ بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ انہیں انتظار کرنا ہوگا اپنے منطقی انجام کا۔

امجد بخاری کے ساتھ نڈر اور مخلص لوگ شامل ہوئے تھے۔ جن کے بل بوتے پر اس نے بے شمار کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ حیدر عباس، شکیل عباسی اور کرم خان جیسے لوگوں کے کئی منظم گروہوں کا خاتمہ کیا تھا۔ جان رائٹ اور ونو ملہوترا جیسے انٹرنیشنل گروپ کا صفایا بھی کیا تھا۔ مگر ابھی اس کا مشن جاری تھا۔ مگر خود امجد بخاری ابدی نیند سو چکے تھے۔ وہ اپنے ساتھ محافظوں کی فوج کے کبھی قائل نہیں رہے تھے۔ اس کا آنا جانا ڈرائیور کے ساتھ ہوتا تھا۔ ڈرائیور ٹریننگ یافتہ ضرور تھا مگر وہ چار مسلح افراد کا مقابلہ نہ کر سکا تھا۔ ان کی گاڑی پر اندھا دھند فائرنگ ہوئی تھی۔ اس حملے میں امجد بخاری اور اس کا ڈرائیور جاں بحق ہو گئے تھے۔ شمس الرحمٰن نے عارضی طور پر گروپ کے انتظامی امور سنبھال لیے تھے۔ تاہم گروپ میٹنگ میں طے ہوا تھا غلام رسول، عبداللہ اور حمزہ کی وطن واپسی پر امجد بخاری کے بعد سرچی کا خطاب لینے والے بندے کا انتخاب کیا جائے گا۔ فی الحال انہیں اس خبر سے لاعلم رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔



اسلام اور کفر کرہ ارض میں دو اہم طاقتوں کے نام ہیں یہ طاقتیں ازل سے ایک دوسرے سے ٹکرائی ہیں۔ اس حوالے سے آج تک دنیا میں جتنے بھی سائنسی یا تخلیقی تجربات غیر مسلموں کی طرف سے کیے گئے ہیں ان کا تعلق بلواسطہ یا بلاواسطہ مسلمانوں سے رہا ہے۔ بلکہ 70 فیصد تجربات مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی تیاریوں کے سلسلے میں کیے گئے ہیں اور 30 فیصد انسانی بھلائی اور بہتری کے لیے۔

یہودی اور عیسائی دونوں مذاہب کے پیروکاروں نے ہمیشہ مسلمانوں کی مخالفت کی ہے۔ انہیں طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ہر محاذ پر مسلمانوں کو شکست سے دوچار کیا جائے۔ برصغیر میں ہندوؤں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں سے اتنی ہی نفرت کی جتنی کہ عیسائیوں اور یہودیوں نے کی ہے۔ اپنی اپنی جگہ تینوں مذاہب کے ماننے والوں کو اللہ تعالیٰ نے عبرت ناک سزاؤں سے دوچار کیا ہے۔ یہودیوں نے ہمیشہ انبیاء کرام کی دل آزاری کی ہے ان کی گستاخی میں پیش پیش رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سے انبیاء کرام کو یہودیوں نے شہید بھی کیا ہے۔ اس کے بدلے میں انہیں کئی کڑی سزائیں ملی ہیں۔ مگر نہ تو انہوں نے اس سے کوئی سبق سیکھا ہے نہ ہی اس سے باز آئے۔ یہودیوں کی بدقسمتی تھی حضرت عیسیٰ

کے کئی معجزات دیکھنے کے باوجود ان کی پیروی نہ کر سکے۔ بلکہ یہودیوں کے احبار اور راہبان نے ان کی شدید مخالفت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو زندہ سلامت آسمان پر اٹھالیا ہے۔ اب دنیا کے تین بڑے مذہب اسلام، عیسائی اور یہودی حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ نزول کا اپنے اپنے عقیدے کے مطابق انتظار کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف آخری معرکہ میں فتح حاصل کرنے کے لیے تین مذاہب کی تکون بن چکی ہے۔ عیسائی، یہودی اور ہندو۔ اس تکون کا مشن مسلمانوں کو ہر میدان میں شکست سے دوچار کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے طرح طرح کے سائنسی تجربات ہو رہے ہیں اور دنیا میں اہم اسلامی ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے۔ پاکستان میں بیرون ملک طاقتیں ازل سے متحرک رہی ہیں اور نجانے کب تک متحرک رہیں گی۔ مگر انہیں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ملی ہے یا ملے گی یہ آنے والا وقت بتائے گا۔



موساد کسی عام تنظیم یا گروہ کا نام نہیں۔ یہ ایسا نام ہے جس کا بین الاقوامی سطح پر اثر ورسوخ چلتا ہے۔ اس نے کئی ملکوں کی تاریخ بدل دی ہے اور ابھی نجانے کتنے ممالک پر اثر انداز ہوگی۔ اس کے ہیڈ کوارٹر میں گھس کر چند فائلیں حاصل کرنا آسمان سے تارے توڑنے کے برابر تھا۔ امیر مجاہدین احمد سعید نے موساد کے ہیڈ کوارٹر میں قید کاٹی تھی۔ موساد کے ایجنٹوں نے ان پر غیر انسانی وغیر اخلاقی تشدد کیا تھا۔ کئی دنوں تک اسے چار فٹ اونچی کال کوٹھری میں قید رکھا تھا۔ جس میں وہ نہ کھڑے ہو سکتے تھے نہ بیٹھ سکتے تھے کیونکہ فرش پر بدبودار پانی چھوڑا گیا تھا۔ دوران تشدد ان کے سر کے اوپر ایک ہاتھ کے فاصلہ پر انسانی فضلے کی بھری ہوئی تھیلی لٹکائی گئی تھی۔ جس کی بدبو اور حبس سے دم گھٹتا تھا۔ انہیں برہنہ کر کے جسم کے نازک حصوں پر کرنٹ لگائے گئے تھے مگر موساد کے اہلکار ان سے اپنا مقصد نہ پا سکے تھے۔ موقع ملتے ہی وہ ان کی قید سے بھاگ آئے تھے۔ انہوں نے جہاں تک ہیڈ کوارٹر کو دیکھا تھا اس کا نقشہ بنا دیا تھا۔ یہ نقشہ بچوں کے اسکول میں استعمال ہونے والی کاپی کے ایک ورق پر بنایا گیا تھا۔ جسے حمزہ نے تعویز کی شکل دیکر بازو میں باندھ دیا تھا۔ چیکنگ کے دوران وہ اسے منہ میں ڈال کر زبان کے نیچے رکھ لیتا تھا۔ حمزہ اور عبداللہ دونوں یہودی طالب علموں کے روپ میں تھے۔ امیر مجاہدین نے ایک یہودی درسگاہ کے کارڈ بھی بنوا دیئے تھے۔ وہ دونوں بہت اچھی عربی بول لیتے تھے اور ان کی رنگت بھی گوری تھی۔ اس لیے وہ باآسانی اس روپ میں ڈھل گئے تھے۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر سے تیس کلومیٹر ہٹ کر انہوں نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا تھا۔ کاغذات کے اعتبار سے دونوں بھائی تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک ہی ڈبل بیڈ کا کمرہ لیا تھا۔ اب انہیں غلام رسول کا انتظار تھا۔ غلام رسول سے ان کا آخری رابطہ اسرائیلی پولیس کے ساتھ جھڑپ والے دن ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ کہاں گیا انہیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ ان کے ساتھی مجاہدین بھی تل ابیب تک ان کے ساتھ رہے تھے۔ جبکہ غلام رسول کے ساتھ جانے والا مجاہد بھی شہید ہو چکا تھا۔ رات کے تقریباً نو بجے کا ٹائم تھا حمزہ کو یوں لگا جیسے زوردار دھماکے ہو رہے ہیں۔ دھماکوں کا یہ احساس چند سنٹ میں نامانوس آوازوں میں بدل گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اندازہ کیا تو پتہ چلا دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ وہ فوراً اٹھ گیا۔ عبداللہ پہلے ہی جاگ گیا تھا۔ وہ دونوں رات دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ بارہ بجے کے قریب شب بخیر کہہ کر سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ عبداللہ تو جلدی سو گیا تھا۔ مگر حمزہ کا دھیان منزہ کی طرف نکل گیا تھا۔ اس لیے دو گھنٹوں تک وہ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ دستک کی آواز سے کچھ ہی دیر پہلے اس کی آنکھ لگی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ حمزہ نے آہستگی سے سر ہلایا تو عبداللہ اٹھ کر دروازے کے پاس پہنچا۔ حمزہ مستعد کھڑا تھا۔ اس کی نیند ہوا ہو چکی تھی۔

"کون ہے؟" عبداللہ نے دھیرے سے پوچھا۔

باہر سے آنے والی آواز سن کر وہ دونوں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ عبداللہ نے دروازہ کھولا تو سامنے غلام رسول کھڑا ہوا تھا۔



یہودی قوم ازل سے سازشی ذہن کی مالک رہی ہے۔ ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ان کی ریشہ دوانیاں چالبازیاں اور سازشی منصوبے ہر دور میں بڑے واضح نظر آتے ہیں۔ انہوں نے نہ کبھی عیسائیوں کو قبول کیا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کو۔ عیسائیوں نے بھی ان پر خوب دل کھول کر اپنی نفرت و کدورت مٹائی ہے۔ صلیبی جنگوں کے دور میں عیسائیت پر لڑنے کا ایسا جنون سوار تھا کہ انہیں مسلمان نہ ملے تو وہ یہودیوں سے جنگ چھیڑ دیتے تھے۔ کولون کے مقام پر عیسائیوں نے ہزاروں یہودیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ شمالی فرانس، رائن لینڈ، دورمز ٹریولیس، منیز ایسے مقامات ہیں جہاں مالدار یہودی آباد تھے۔ ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا اور انہیں بے دردی سے قتل کیا گیا۔ فرانس، جرمنی میں یہودیوں کا قتل عام ہوا۔ کاربٹین، سلی، رمیرو، بوہیمیا۔ ہر مقام پر انہیں تباہ و برباد کیا گیا 1235ء میں باون کے مقام پر۔ 1247ء میں برلن کے نزدیکی مقام بلنز۔ 1283ء میں منیز۔ 1286ء میں ایریزل۔ 1298ء میں رائنکن میں یہودیوں کا قتل عام کیا گیا۔ جرمن لارڈ نے تو یہودیوں کو صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لیے نابود کرنے کا ایک پلان ترتیب دیا تھا۔ اس پلان میں یہودیوں کے 140 مذہبی گروہوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا تھا۔ اس ظلم و زیادتی سے بچنے کے لیے یہودی جرمن چھوڑ کر فلسطین بھاگ گئے۔ ایریل بھی ان ہی عیسائیوں میں سے ایک تھا جو یہودیوں کے ظلم کا شکار ہوئے تھے۔ جب وہ چھ سال کا تھا تو اس کا پورا خاندان یہودیوں کے ظلم و بربریت کا نشانہ بنا تھا۔ جس رات یہودیوں نے اس کے گھر میں موت کی ہولی کھیلی تھی، اس رات وہ اپنے نانا کے گھر میں تھا۔ اگلے روز جب اس کے گھر سے اکٹھے چار تابوت اٹھے تو وہ غم سے نڈھال تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر ہر تابوت سے لپٹ کر دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ انیس سال کی عمر تک اس کی اپنی ہی چیخیں اس کی سماعتوں میں گونجتی رہیں۔

انیس سال کی عمر میں اسے پہلی مرتبہ اس وقت قدرے قرار میسر آیا جب اس نے استرے سے ایک یہودی پروفیسر کا گلا کاٹ دیا۔

سات سال کی عمر میں اس کے نانا اسے اپنے گھر لے گئے تھے۔ انہوں نے بچپن سے اس کے دل میں بٹھا دیا تھا کہ اس کے خاندان کو تباہ و برباد کرنے والے یہودی ہیں اور اسے اگر اپنے خاندان کی تباہی کا انتقام لینا ہے تو اسے بھی یہودیوں جیسی مکاری اور چال بازی سے کام لینا ہوگا اور اس کے لیے یہودیت کا لبادہ اوڑھنا ہوگا۔ اس نے نانا کی اس بات کو گرہ میں باندھ لیا اور تئیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک کٹر یہودی کے روپ میں خاصا مقبول ہو چکا تھا۔

اپنے مشن کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے وہ پچیس سال کی عمر میں موساد میں بھرتی ہو گیا۔ موساد کی وہ شاخ اندرونی سلامتی اور داخلی معاملات کی ذمے دار تھی۔

پینتیس سال کی عمر تک اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے ایریل نے کئی اہم کارنامے سرانجام دیے۔ دس سال کی انتھک محنت کے بعد وہ نہ صرف یہودیوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہا بلکہ موساد کا ایک اہم اور قابل اعتماد ایجنٹ بن چکا تھا۔

وہ موساد کے لیے اتنی اہمیت اختیار کر چکا تھا کہ متعدد مرتبہ اس کی ملاقات موساد کے ڈائریکٹر سے بھی ہو چکی تھی۔ جب ہر طرف سے اسے وفاداری اور پیشہ ورانہ مہارت کی سند مل گئی تو اس نے اپنا ایک خفیہ نیٹ ورک قائم کر لیا۔ اس نیٹ ورک میں ایسے تمام عیسائی شامل تھے جن کے سینوں میں یہودیوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اسی نیٹ ورک کا ایک

اہم حصہ فلسطینی مجاہدین بھی تھے کیوں کہ دونوں کا دشمن مشترک تھا۔

غلام رسول اور اس کے ساتھیوں کی مدد کرنے والا ایریل ہی تھا جس نے نہ صرف انہیں ضروری ساز و سامان اسلحہ اور بارود پہنچایا بلکہ ہیڈ کوارٹر میں گھسنے اور اپنا مشن پورا کرنے کا منصوبہ بھی بتایا۔ ایریل کی بس ایک ہی شرط تھی کہ اس حملے میں زیادہ سے زیادہ یہودی ایجنٹ موت کا شکار ہوں۔ ان تینوں نے ایریل کے ساتھ میٹنگ کی تھی جس میں ایریل نے انہیں بہت اہم معلومات فراہم کی تھیں۔

ہفتے کے دن فائیو اسٹار ہوٹل کی پارکنگ نمبر دو میں 97972 نمبر پلیٹ کی سفید مرسڈیز کار کھڑی ہو گی۔ مذکورہ کار کی ہیڈ کوارٹر کے پارکنگ ایریا تک کوئی چیکنگ نہیں ہوئی مگر گاڑی سے اترتے ہی بندہ کیمروں کی آنکھ میں آجاتا ہے اس کار کی پارکنگ کے لیے ہیڈ کوارٹر میں 6 نمبر پارکنگ مختص ہے۔ پارکنگ نمبر 6 کے سامنے کی دیوار کے اس پار کوریڈور ہے جس کے دائیں جانب راہداری ہے راہداری میں دائیں جانب کے پہلے دو دروازے چھوڑ کر تیسرا دروازہ ایک ہال میں کھلتا ہے۔ ہال کی چوڑائی 30 فٹ ہے۔ ہال میں مزید تین کمروں کے دروازے کھلتے ہیں ہال کے دروازے کے عین بالکل سامنے کا دروازہ ایک اور راہداری میں کھلتا ہے اس راہداری میں آمنے سامنے چار کمرے ہیں چاروں کے اوپر انگریزی کے الفابیٹ لکھے ہوئے ہیں ایک دروازے کے اوپر لکھا ہوا ہے یہ کمرہ ایک طرح کی جدید ترین لیبارٹری ہے۔ اس میں کچھ خودکار مشین ہیں اور کچھ کو دو آپریٹر آپریٹ کرتے ہیں ان کی حفاظت کے لیے دو مسلح افراد ہمہ وقت وہیں رہتے ہیں اس کمرے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے خانے ہیں ہر خانے کا اپنا پاس ورڈ ہے خانوں کے اوپر کوڈ نمبر لکھے ہیں یہ کوڈ نمبر ملکوں کی پہچان کے لیے لگائے گئے ہیں۔ پاکستان سے لی جانے والی فائلیں ایک مائیکرو فلم میں محفوظ ہے اور یہ مائیکرو فلم انہی خانوں میں سے ایک میں موجود ہے۔ جس خانے پر PK009 لکھا ہے اسی میں مائیکرو فلم موجود ہے۔ ایریل انہیں باریک بینی سے سمجھا رہا تھا۔ وہ پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ اب بات کرتے ہیں سیکیورٹی سسٹم کی۔ عمارت میں انتہائی سخت اور جدید ترین سیکیورٹی سسٹم نصب ہے۔ آپ لوگ کار میں پارکنگ ایریا تو جا سکتے ہیں مگر اس کے بعد آپ کیمروں کی زد میں ہوں گے۔ بالالفاظ دیگر آپ لوگوں کو سیکیورٹی اہلکار دیکھ رہے ہوں گے۔ بلڈنگ سے متعلقہ ہر شخص کی فل باڈی اسکیننگ کی جاتی ہے۔ باڈی کا پورا عکس ماسٹر کمپیوٹر میں محفوظ ہے۔ کوئی بھی عمارت کے کسی بھی کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ خودکار سسٹم حرکت میں آتا ہے۔ اس پر ان دیکھی شعاعیں پھینکی جاتی ہیں یہ شعاعیں فل باڈی کا عکس ماسٹر کمپیوٹر کو ٹرانسفر کرتی ہیں۔ جس میں آل ریڈی اس شخص کا باڈی عکس موجود ہوتا ہے جب دونوں عکس ایک حصے میں ملتے ہیں تو کمپیوٹر اسے گرین سگنل دیتا ہے اس طرح متعلقہ اشخاص با آسانی اپنا کام جاری رکھتے ہیں ان کی آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی اور اگر کوئی غیر متعلقہ شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے جس کی باڈی کا عکس پہلے سے کمپیوٹر میں موجود نہیں ہوتا وہ اور شعاعیں اس کا باڈی عکس کمپیوٹر کو سینڈ کرتی ہیں تو اسے گرین سگنل نہیں ملتا اس صورت میں کمرے کی چھت میں چاروں طرف پوشیدہ خودکار گنیں باہر نکل کر پورے کمرے میں گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتی ہیں۔ یہ گنیں اس انداز میں فائرنگ کرتی ہیں کہ گولیوں کی زد سے کمرے کا ایک انچ حصہ بھی محفوظ نہیں رہتا۔ یعنی غیر متعلقہ شخص یا اشخاص کی تکہ بوٹی ہو جاتی ہے۔ اس سسٹم پر کنٹرول حاصل کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ ہاں البتہ باڈی اسکیننگ کمپیوٹر کی چیکنگ اور سگنل دینے کا دورانیہ 45 سیکنڈ ہوتا ہے جو کچھ کرنا ہے انہی 45 سیکنڈوں میں کرنا ہوگا۔ یعنی جب ہال میں داخل ہوں تو پینتالیس سیکنڈ میں اگلے روم میں چلے جائیں جب تک پچھلے کمرے

میں گولیوں کی بوچھاڑ ہو آپ لوگ اگلے کمرے میں موجود ہوں گے یہ سسٹم عمارت کے چھوٹے بڑے سارے کمروں میں موجود ہے۔ راہداریوں' کوریڈور اور بالکونی میں یہ سسٹم نہیں ہے۔ بلکہ وہاں سکیورٹی اہلکار متعین ہوتے ہیں۔

''مسٹر ایریل! ہیڈ کوارٹر میں آخر غیر متعلقہ اشخاص بھی تو جاتے ہوں گے۔ اعلیٰ حکام وغیرہ اندرونی یا بیرونی جو بھی ہوانہیں اندر لے جانے کا کیا نظام ہے؟''

''مسٹر غلام! کوئی بھی شخص چاہے وہ کتنا بھی وی آئی پی ہو۔ اس کی پہلے باڈی سکیننگ کی جاتی ہے۔ اس کی باڈی کا عکس کمپیوٹر میں بہرحال فیڈ کیا جاتا ہے چاہے یہ عارضی ہی کیوں نہ ہو۔''

''اوکے مسٹر ایریل! اس کے علاوہ؟''

''لیبارٹری میں جن خانوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے پاس ورڈ صرف وہاں موجود دو آپریٹرز کو ہی معلوم ہے۔ اگر خانوں کو توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے یا غلط پاسورڈ ڈائل کیا گیا تو چھت سے شعاعوں کا خروج ہوتا ہے۔ یہ شعاعیں مشینوں کو تو کچھ نقصان نہیں پہنچاتیں مگر انسان کا گوشت جسم سے برف کی طرح پگھلنے لگتا ہے۔ صحیح پاسورڈ سے خانہ کھل جائے تو اس میں ایک ہی شکل کی تین مائیکروفلم پڑی ہوتی ہیں وہ پہلی دوسری اور تیسری ایک ہی لائن میں تین مائیکروفلموں میں ایک اصل ہے اور باقی دو اس کی ڈمی۔ اصل فلم اٹھانے پر تو کچھ نہیں ہوتا مگر ڈمی مائیکروفلم کو اٹھاتے ہی چھت سے آنے والی لیزر شعاعیں جسم سے گوشت تک اڑا دیتی ہیں۔''

''ایک بات بتایئے پاکستان سے مسودہ فائلوں کی شکل میں چرایا گیا ہے۔ جبکہ یہاں یہ مائیکروفلم میں محفوظ ہے تو اصل فائلیں کہاں ہیں؟''

''اصل فائلیں پاکستان میں ہیں جان رائٹ کے پاس اس نے وہاں سے مائیکروفلم ہی سینڈ کی تھی۔''

''یہ بات درست ہے ایریل؟ کیونکہ ایسا نہ ہو کہ ہم صرف مائیکروفلم حاصل کر کے جائیں اور اصل فائلیں انہی کے پاس پڑی رہ جائیں۔''

''سو فیصد درست ہے مسٹر غلام! آپ اس کی قطعی کوئی فکر نہ کریں۔''

''اوکے مسٹر ایریل! بہت بہت شکریہ۔''



ایریل سے میٹنگ کے بعد تینوں نے سر جوڑ لیے۔ ہفتہ میں ابھی دو دن باقی تھے۔ دو دنوں میں انہوں نے پروگرام کو حتمی شکل دینا تھی۔ یہ بات طے ہے کہ وہ نظروں میں آئے بنا مائیکروفلم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ سکیورٹی سسٹم کو جام کرنا' ناممکن تھا۔ ایریل جہاں تک مدد کر سکتا تھا وہ کر چکا۔ اب اس سے آگے انہی لوگوں کا کام تھا۔ وہ جمعرات کی رات 2 بجے پلان کو حتمی شکل دے کر سو گئے تھے۔ جمعہ کے دن انہوں نے مزید ضروری سامان خریدا۔ شام کو حمزہ سفید مرسڈیز کار' رینٹ اے کار سے کرائے پر لے آیا تھا۔ یہ کار ہو بہو اسی کار جیسی تھی۔ جسکی تصویر ایریل نے انہیں دی تھی۔ ہفتہ کی صبح وہ مرسڈیز کار پر سوار ہو کر نکل گئے۔ دس بجکر تیس منٹ پر وہ فائیو اسٹار ہوٹل سے صرف بیس میٹر ہٹ کر ایک طرف کھڑے تھے۔ عبداللہ اندر ہوٹل میں چلا گیا تھا۔ گیارہ بجے ان کی مطلوبہ مرسڈیز کار ہوٹل کے پارک ایریا میں داخل ہوئی۔ اس کے لیے پہلے سے جگہ مختص تھی۔ گیارہ بجکر 20 منٹ پر عبداللہ ہوٹل سے نکلا اور بااعتماد، پروقار قدموں سے سیدھا سفید مرسڈیز کے پاس پہنچا۔ اس نے ماسٹر کی سے کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ گیارہ بجکر پچیس منٹ پر وہ گاڑی باہر روڈ پر لے آیا تھا۔ جہاں ایک طرف غلام رسول کھڑا ہوا تھا۔ گاڑی نے چند لمحوں کے لیے اس کے سامنے بریک پکڑے اور وہ بھاگ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گیارہ بج کر تیس منٹ پر حمزہ سفید مرسڈیز ہوٹل کے پارکنگ میں لے جا کر کھڑی کر چکا تھا۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ پر وہ تینوں اپنے ہوٹل کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ ایریل نے بتایا تھا یہ گاڑی موساد کے ایک اہم عہدیدار کی ہے۔ اس نے

ہوٹل میں دو گھنٹے رکنا تھا۔ گاڑی ہوٹل کے سامنے روک کر حمزہ اور عبداللہ اتر کر سامان لے آئے۔ اب ان کا رخ موساد کے ہیڈ کوارٹر کی طرف تھا۔ ان کی موت اور زندگی کا مشن شروع ہو چکا تھا۔



اسٹیئرنگ عبداللہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر غلام رسول بیٹھا ہوا تھا۔ عقبی سیٹ پر حمزہ موجود تھا۔ انہوں نے راستہ میں لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ہوٹل سے نکلتے وقت وہ عام لباس میں تھے مگر اب ان کے جسموں پر کمانڈوز کا لباس تھا۔ جب گاڑی عمارت میں داخل ہوئی تو انہوں نے فوراً چہروں پر نقاب چڑھا لیے۔ عبداللہ کار کو سیدھا پارکنگ نمبر 6 کی طرف لے گیا۔ انہوں نے سارا نقشہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ پارکنگ میں گاڑی رکتے ہی عبداللہ نے دستی بم کی پن کھینچی اور ہاتھ باہر نکال کر اسے سامنے دیوار پر دے مارا۔ حمزہ اور غلام رسول نے بھی بموں کی پنیں کھینچی تھیں مگر یہ دھویں کے بم تھے یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے۔ ایک سامنے کی دیوار پر جس نے دیوار پر کئی دراڑیں ڈال دی تھیں۔ انہی کے بیچ ایک چھوٹا سا خلا بھی بن گیا تھا۔ جبکہ دائیں بائیں پھٹنے والے بموں نے دھواں دھواں کر دیا تھا۔ تینوں پھرتی سے باہر نکلے اور دیوار میں پیدا ہونے والے خلا سے اندر کوریڈور میں چھلانگیں لگا دیں۔ اب تینوں کے ہاتھوں میں مشین گنیں نظر آ رہی تھیں۔ جبکہ کندھے سے بیگ جھول رہے تھے۔ کوریڈور سے وہ جیسے ہی راہداری میں داخل ہوئے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی مگر کوئی گولی نشانے پر نہیں لگی وہ کرالنگ کرتے ہوئے سائیڈ میں ہو گئے تھے۔ حمزہ نے اس طرف گن کا رخ کر کے فائرنگ کا ابھی ارادہ ہی کیا تھا کہ غلام رسول نے پھرتی سے دستی بم وہاں پھینک دیا یہ دستی بم انہیں اسرائیل نے فراہم کیے تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ طاقتور بم اسرائیل نے بنائے تھے اور ان سے کئی مسلم بستیاں تباہ برباد ہوئی تھیں۔ مگر آج ان کے اپنے بنائے گئے بم انہی پر برس رہے تھے' راہداری میں پھٹنے والے بم نے تباہی مچا دی تھی۔ وہاں پر موجود چار بندوں کے اعضاء اڑ کر دور دور جا گرے تھے۔ پوری عمارت سائرن سے گونج رہی تھی اور زمین یوں ہل رہی تھی جیسے اس پر کئی ہزار گھوڑوں کی فوج بھاگ رہی ہے۔ وہ لوگ راہداری میں ہال کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے تھے جو کہ بند تھا۔ حمزہ اور عبداللہ غلام رسول کے آگے پیچھے مخالف سمتوں میں رخ کیے کھڑے تھے۔ غلام رسول نے ایک دستی بم دروازوں پر کھینچ مارا تھا۔ جس سے دروازے کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ جیسے ہی دروازہ ٹوٹا عبداللہ نے ایک دھویں کا بم سامنے پھینک دیا جہاں سے دائیں بائیں دو موڑ نظر آ رہے تھے راہداری دھویں سے بھر گئی تھی۔ عبداللہ ایک طرف سیڑھیوں کے نیچے مورچہ زن ہو گیا تھا۔ غلام رسول اور حمزہ ہال کی طرف لپکے غلام رسول کو شک تھا کہ اندر آدمی موجود ہیں اس لیے اس نے اندر چھلانگ لگاتے ہی ایڑی پر گھوم کر فائر کھول دیے تھے۔ اندر دو آدمی موجود تھے جو اس کی فائرنگ کی زد میں آ کر تڑپنے لگے تھے۔ ہال میں موجود سامنے کا دروازہ خوش قسمتی سے کھلا ہوا تھا۔

''ہری اپ مسٹر اے۔'' غلام رسول نے چیخ کر انگلش میں حمزہ کا کوڈ نام لے کر کہا۔ کہتے ہوئے وہ ہال کراس کر چکا تھا۔ وہ ابھی اس طرف کی راہداری میں پہنچا ہی تھا کہ حمزہ اڑتا ہوا اس کے قدموں میں آ گرا۔ گرتے ہی حمزہ نے قلابازی کھائی اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ غلام رسول نے وہ دروازہ تاڑ لیا تھا جس پر L لکھا ہوا تھا۔ وہ جلدی میں دروازے کی طرف بڑھا مگر حمزہ کی چیختی آواز پر فوراً نیچے بیٹھ گیا۔ وہ بال بال ان گولیوں سے بچا تھا۔ جو سامنے کے دروازے سے نکلنے والے دو آدمیوں نے اس پر چلائی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید فائرنگ کرتے حمزہ انہیں نشانے پر لے چکا تھا۔ ان کی کھوپڑیاں ذروں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ جس طرف سے وہ لوگ آئے تھے وہاں سے بھی فائرنگ کی مسلسل

آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً عبداللہ انہیں نیچے سے بہت اچھی طرح سے کور کیے ہوئے تھا۔ راہداری میں ہونے والی فائرنگ نے شاید اندر والوں کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ غلام رسول کو اندر کی ہلچل کا شک گزرا تو اس نے حمزہ کو ایک طرف ہو جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی دروازوں کی ایک طرف دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا شک درست نکلا اندر سے دو لمبے تڑنگے محافظ باہر نکلے۔ وہ جیسے ہی باہر آئے غلام رسول اور حمزہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ حمزہ نے اپنے شکار کی گردن توڑ دی تھی۔ جبکہ غلام رسول نے گن کی نال اس کے جسم کے ساتھ لگا کر کئی فائر کھول لے تھے۔ ان سے نمٹ کر وہ بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے اندر داخل ہو گئے۔

''ہینڈز اپ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔'' اندر داخل ہوتے ہی غلام رسول نے غراتے ہوئے کہا۔

وہاں پچاس سال کے لگ بھگ عمروں کے دو آدمی حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ نسبتاً بھاری بھرکم تھے جبکہ ایک کی تو اچھی خاصی توند بھی نکلی ہوئی تھی۔ غلام رسول نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لڑائی والے آدمی نہیں ہیں۔ بلکہ بقول ایریل وہ مشین آپریٹر ہیں۔ حمزہ ان کی حالت دیکھ کر دروازہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا تھا تاکہ بیرونی خطرے سے نمٹا جائے۔ غلام رسول نے جیب سے خنجر نکالا اور اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا اس نے موٹی توند والے کی شہ رگ کاٹ دی۔ خون فوارے کی طرح ابلا اور فرش پر پانی کی طرح بہنے لگا۔ غلام رسول نے ایسا دوسرے آدمی کو خوف زدہ کرنے کے لیے کیا تھا تاکہ وہ بلا چوں چرا اس کے حکم پر عمل کرے۔ وہ اپنے ساتھی کی حالت دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ خوف و ہراس اس کے گورے چہرے پر جم گیا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔

کمرے میں بے شمار چھوٹی بڑی مشینیں اور اسکرین لگی ہوئی تھی اور ان گنت کمپیوٹر پڑے ہوئے تھے۔

''کو... کون ہو... تم...؟'' غلام رسول اس کا جواب دینے کی بجائے اس کے پاس پہنچا وہ لرزہ براندام تھا۔

''اے۔ اسے کھول۔'' غلام رسول نے انگلی سے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں PK009 لکھا ہوا تھا۔ اس کی بات سن کر گٹھے ہوئے جسم والا پہلے چونکا پھر خوف سے بولا۔

''نن... نہیں مجھے نہیں معلوم یہ...'' اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ غلام رسول نے اس کے بازو میں خنجر گھونپ کر نیچے کی طرف کھینچا۔ اس طرح بازو پر نیچے کی طرف گہرا زخم لگا۔ جیسے جانور کی کھال اتارتے وقت چیرا لگاتے ہیں اس شخص کے منہ سے کربناک چیخیں نکلنے لگی تھیں۔

''جلدی کرو ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے۔ انکار کرو گے تو اسی طرح تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی الگ کر دوں گا۔'' غلام رسول کے سفاکانہ لہجے میں ایسی بے دردی اور کرختگی تھی کہ وہ شخص فوراً آگے بڑھا اور PK009 کے ساتھ منسلک دس بٹنوں کو تیزی سے دبانے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور جیسے ڈی وی ڈی پلیئر کا ڈیسک بروم باہر نکلتا ہے ایسے ہی ایک پلیٹ باہر نکل آئی۔ اس میں بلیو کلر کی ایک ہی ساخت کی تین مائکرو فلمز پڑی ہوئی تھیں۔

''ان میں سے جو اصل ہے وہ اٹھاؤ ورنہ تم بھی جانتے ہو ڈی مائکرو فلم اٹھانے پر تمہارا کیا حشر ہوگا۔'' غلام رسول کی بات سن کر اس نے بے بسی سے اسے دیکھا اور درمیان والی مائکرو فلم اٹھالی۔

''مسٹر اسے اس سے مائکرو فلم لے لو۔'' غلام رسول اس پر کڑی نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ تاکہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ حمزہ نے آکر مائکرو فلم اس کے ہاتھ سے لے کر جیب میں ڈالی۔ جیسے ہی فلم حمزہ کے ہاتھ میں پہنچی غلام رسول نے دو فائر کر کے اسے ابدی نیند سلا دیا۔



جس وقت موساد کے ناقابل شکست ہیڈ کوارٹر پر تین پاکستانی جیالے تباہی مچا رہے تھے عین اسی وقت ہیڈ کوارٹر کے ایک ساؤنڈ، بم پروف کمرے میں ڈیوڈ کی سربراہی میں میٹنگ جاری تھی۔ یہ وہی تین دروازوں اور چار کھڑکیوں والا کمرہ تھا جس میں ڈیوڈ نے پہلی بار میٹنگ بلائی تھی۔ اسی میٹنگ میں اس نے نیو ورلڈ آرڈر کا آئیڈیا پیش کیا تھا۔ برسہا برس کی محنت کے طفیل انہیں کرہ ارض پر حکمرانی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ڈیوڈ حسب سابق صدارتی کرسی پر براجمان تھا۔ دیگر کرسیوں پر تھامس، رابرٹ، بون، کیم، پیٹرسن، کیمرون، لی چنگ، ینڈی اور جیم براجمان تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں ابتدائی میٹنگ میں نیو ورلڈ آرڈر کا آئیڈیا ناممکن نظر آتا تھا مگر اب انہیں منزل دو چار ہاتھ دور نظر آ رہی تھی۔ وہ دنیا کو غیر محسوس طریقے سے اپنی مٹھی میں لے چکے تھے۔ زندگی کے تمام وسائل پانی، آگ، بجلی، غذا، تیل، گیس، سب پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ جدید ترین تجربات نے انہیں قدرتی وسائل پر بھی عبور دلا دیا تھا۔ بارشیں، دھوپ، چھاؤں، قحط، خشک سالی تک ان کی رسائی 80 فیصد پوری ہو چکی تھی۔ انسان حیوان، چرند پرند، بحری و بری تمام مخلوقات پر انہوں نے نت نئے تجربات کیے اور کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے دنیا کی فرضی جنت اور جہنم ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھی۔ قوموں سے معیشت، وسائل، ٹیکنالوجی، ذہانت، تخلیقی صلاحیتیں چھین کر انہیں اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ دنیا کی تمام ٹاپ یونیورسٹیوں، کالجز، انسٹیٹیوٹ، بینک، سب پر ان کا مکمل کنٹرول تھا۔ جس طرح اسرائیل فلسطین کے کسی بھی علاقے کو حساس قرار دے کر اس پر بلا جواز چڑھائی کر دیتا ہے بالکل اسی طرح نیو ورلڈ آرڈر کے کرتا دھرتا ہاتھ دنیا کے کسی بھی ملک پر بلا جواز چڑھائی کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ چند اسلامی ممالک میں انہوں نے ایسا کر کے ثابت بھی کر دیا تھا۔ آج کی میٹنگ میں دراصل انہوں نے نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے لیے قوانین وضع کرنے تھے۔ ان قوانین کو مرتب انہوں نے کرنا تھا اور گرین سگنل ان کے بڑوں نے دینا تھا۔ مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے اور مقدر ان پر ہنس رہا تھا۔



غلام رسول اور حمزہ مائیکرو فلم حاصل کرنے کے بعد واپس آنے والے راستے کی طرف بھاگے تھے مگر ہال میں کھلنے والے دروازے کو لوہے کا ایک اور دروازہ ڈھک چکا تھا۔

''اس طرف۔'' غلام رسول نے لوہے کا دروازہ دیکھتے ہی واپس راہداری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس راہداری میں دائیں بائیں دو موڑ نظر آ رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں گن تھی اور دوسرے ہاتھوں میں بم پکڑے ہوئے تھے۔ حمزہ نے ایک دھوئیں کا بم سامنے پھینک دیا کیونکہ اس طرف اسے شک گزرا تھا کہ آدمی بھاگتے ہوئے آ رہے ہیں جیسے ہی راہداری میں دھواں پھیلا ساتھ ہی انہوں نے فائرنگ کھول دی۔ تین چار اکٹھی چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ دونوں بھی دھوئیں میں داخل ہو گئے تھے کیونکہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ غلام رسول بائیں طرف گھوما تھا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ حمزہ دائیں طرف مڑ گیا ہے۔ غلام رسول سختی سے سانس روکے دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اچانک اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی وہ بری طرح لڑکھڑایا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ گرتے ہوئے اس کا جسم کئی بار ٹھوس چیزوں سے ٹکرایا جس سے اسے کافی چوٹیں لگی تھیں۔ وہ دراصل سیڑھیوں سے نیچے گرا تھا۔ یہاں دھواں بہت کم تھا اس نے دیکھا کہ وہ ایک ہال میں تھا۔ گرتے ہی اس کے ذہن میں اریل کی بات گھوم گئی تھی اوپر سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں اوپر جانا خطروں سے خالی نہ تھا۔ ہال میں اسے ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آیا اس نے اس

طرف دوڑ لگا دی شاید تین چار سیکنڈ کی بات تھی۔ ہال گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا تھا۔ 45 سیکنڈ پورے ہو چکے تھے اور اب وہ ایک اور کمرے میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کمرے میں دو دروازے تھے ایک عام لکڑی کا دروازہ تھا جبکہ دوسرا دروازہ لوہے کا تھا۔ غلام رسول کے ہاتھ میں جو آخری دستی بم تھا وہ گرنے کی وجہ سے کہیں ادھر ادھر گر گیا تھا۔ اس نے لکڑی کے دروازے کی طرف گن کا رخ کر کے ٹریگر دبا دیا مگر اس بار اسے مایوسی ہوئی تھی کیونکہ دروازے پر گولیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ انتہائی بری طرح پھنس گیا تھا۔ ہال میں گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں اور ہال میں پڑا ہوا سامان پرزوں کی طرح اڑ رہا تھا۔ غلام رسول کے لیے آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی جہاں وہ کھڑا تھا اس کمرے میں بھی گولیاں چلنے والی تھیں۔

وہ یااللہ مدد پکار کر ہال اور کمرے کے دروازے کے بیچ دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ اب کمرہ بھی گولیوں سے گونج اٹھا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے بچا لیا تھا۔ ہال اور کمرے کی گولیاں دروازے کی دہلیز تک نہیں آرہی تھیں۔ البتہ اڑنے والے سامان کے کئی ٹکڑے اسے خاصا زخمی کر چکے تھے۔ نیچے گرنے سے بھی اسے کافی چوٹیں آئی تھیں اور جسم کے کچھ حصوں سے خون بہہ رہا تھا لیکن یہ وقت زخموں کی پروا کرنے کا نہیں تھا ہال میں گولیوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ واپس پلٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ لوہے کا دروازہ کھلا اور فوراً بند ہو گیا مگر جس شخص کی جھلک غلام رسول نے دیکھی تھی اس نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ تھامس تھا۔ جس کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا تھا جس کی معلومات انہیں جان رائٹ نے بھی فراہم کی تھی۔ اس نے واپس پلٹنے کا ارادہ ترک کر دیا بلکہ کمرے میں فائرنگ رک جانے کا انتظار کرنے لگا جو کچھ ہی دیر میں رک گئی۔ تب وہ بھاگ کر لوہے کے دروازے کے پاس پہنچا اور اسے زور زور سے پیٹنے لگا۔

"دروازہ کھولیے سر! پلیز جلدی دروازہ کھولیے۔" دروازے کو پیٹتے ہوئے وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تھامس کمرے میں برستی گولیاں دیکھ چکا تھا۔ اسے غیر معمولی حالات کا اندازہ بھی ہونے لگا۔ اس لیے زور زور سے پیٹے جانے والے دروازے پر اس نے کیم سے کہا۔

"دروازہ کھولو۔ مجھے کچھ بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا ہے۔"

وہاں موجود تمام افراد تشویش میں گھر گئے تھے یہ میٹنگ روم بم پروف ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل ساؤنڈ پروف بھی تھا۔ اندر کی آواز نہ باہر جاتی تھی نہ باہر کی اندر آتی تھی۔ جب ساتھ والے کمرے میں فائرنگ ہوئی تو چھت لرز گئی تھی۔ تبھی تھامس نے باہر جھانک کر دیکھا تھا اور برستی گولیوں پر بہت حیران ہوا تھا۔ اب یہ دروازہ مسلسل پیٹا جا رہا تھا۔

کیم نے جیسے ہی دروازہ کھولا غلام رسول اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا اور غراتے ہوئے بولا۔

"خبردار کوئی غلط حرکت نہ کرے۔" ساتھ ہی اس نے لات مار کر دروازہ بند کر دیا۔

وہ لوگ حیران و پریشان نقاب پوش کو دیکھ رہے تھے جس کی اسٹین گن ان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ غلام رسول نے پہلی نظر دیکھ لیا تھا کہ وہاں موجود کسی بھی شخص کے پاس اسلحہ نہیں ہے، نہ ہی وہ موساد کے ایجنٹ ہیں۔ بلکہ وہ مختلف قومیت کے بندے تھے۔

"اے مسٹر کون ہو تم.....؟" پیٹرسن نے تحکمانہ لہجے میں سوال کیا مگر اسے جواب گولیوں کی شکل میں ملا۔ غلام رسول نے تھامس اور صدارتی کرسی پر براجمان ڈیوڈ کے علاوہ سب کو لمحوں میں گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ اس کے پاس باہر نکلنے کا واحد راستہ تھامس کی صورت میں بچا تھا۔ اس لیے وہ لمبے چکروں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا اس نے ڈیوڈ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ تھامس

موت کے خوف سے خاموش ہو چکا تھا کیونکہ اس کے سامنے خون میں لت پت آٹھ لاشیں پڑی ہوئی تھیں کوئی کرسی پر ہی ڈھیر ہوا پڑا تھا اور کچھ کرسیوں سے نیچے لڑھک گئے تھے جس کمرے میں بیٹھ کر انہوں نے کرہ ارض پر حکمرانی کے منصوبے بنائے تھے وہی کمرہ ان کے لیے مقتل بن گیا تھا۔ دروازہ ایک بار پھر پیٹا جا رہا تھا۔ غلام رسول نے تھامس کو تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''تھامس! انہیں کہو یہاں سب ٹھیک ہے اور ہمیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ ہری اپ' جیسا میں نے کہا ویسا کرو ورنہ اپنے ساتھیوں کا حشر تم دیکھ ہی چکے ہو۔''

تھامس اس کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران رہ گیا۔ تاہم اس نے بلا تامل حکم کی تعمیل کی تھی۔ باہر والے تھامس کے تسلی دینے پر واپس پلٹ گئے تھے۔ تب ڈیوڈ بولا۔

''شانی! تمہیں بہت دیر ہو چکی ہے۔ ہم دنیا کو فتح کر چکے ہیں اور عنقریب اس پر اپنی حکمرانی مسلط کر دیں گے۔'' اب کی بار غلام رسول چونک پڑا۔ ڈیوڈ کے منہ سے اپنا نام سن کر اسے حیرانی ہو رہی تھی۔ یہ موصوف کون ہیں۔ جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

''تم لوگ لاکھ کوشش کر لو۔ تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس دھرتی پر ابھی مسلمان زندہ ہیں اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے ہمیشہ زندہ و جاوید رہنا ہے۔'' اس کی بات سن کر ڈیوڈ نے بلند قہقہہ لگایا اور مکروہ انداز میں بولا۔

''مسلمان...... میں انہیں مٹھی میں مسل دوں گا۔''

اس کا لہجہ اور انداز شانی پر بجلی بن کر گرا۔

''تم زندہ رہو گے تب ایسا کرو گے ناں' مسٹر۔'' کہتے ہوئے شانی نے اس پر فائر کر دیے مگر غلام رسول ہی نہیں تھامس بھی حیران و پریشان ڈیوڈ کو قہقہے لگاتا دیکھ رہا تھا۔ اس پر گولیاں اثر نہیں کر رہی تھیں۔ غلام رسول کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ یہ ماجرا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ڈیوڈ قہقہے لگاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''تم جس طرح میرے ادنیٰ شاگرد سیلیا کو نہ مار پائے جو بروج کی شکل میں تمہارے ساتھ ساتھ رہا۔ اسی طرح مجھے بھی کبھی مار نہیں پاؤ گے۔ ہاہاہا۔'' بلند قہقہوں میں غلام رسول بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔

''اعوذ با اللہ من الشیطان الرجیم''

یہ الفاظ جیسے ہی اس کے منہ سے خارج ہوئے ڈیوڈ پگھلنے لگا تھا۔ تھامس کبھی ڈیوڈ کو پگھلتے دیکھ رہا تھا اور کبھی غلام رسول کو۔ غلام رسول کیا کہہ رہا ہے یہ تھامس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ تھامس کے لیے دونوں چیزیں ہی ناقابل فہم اور باعث حیرت تھیں۔ اسے نہ نقاب پوش کے الفاظ سمجھ آ رہے تھے اور نہ ہی ڈیوڈ کا موم بتی کی طرح پگھلنا۔ تھامس اندر سے بے حد خوف زدہ ہو چکا تھا۔ یہ مافوق الفہم واقعہ جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اس کی روح کی طنابیں کھینچ رہا تھا۔ وہ حواس باختہ نظروں سے غلام رسول کو دیکھنے لگا۔ غلام رسول ڈیوڈ کے مکمل طور سے پگھل جانے کے بعد تھامس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''مسٹر تھامس! تم نے مسلمانوں پر بے حد ظلم ڈھائے ہیں انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے خواب دیکھے اور نت نئے منصوبے بنائے ہیں مگر یاد رکھو مسلمان امن پسند قوم ہے یہ محبتیں بکھیرنے والی قوم ہے۔ مگر جب اسے نفرت کی بھٹی میں جھونکا جائے تو پھر یہ ایسے پگھلا دیتی ہے۔ جس کا عملی مظاہرہ تم نے ابھی ابھی دیکھ لیا ہے۔''

''تت...... تمہیں غلط معلومات دی گئی ہیں' مم......'' تھامس کو اپنی موت بالکل واضح نظر آ رہی تھی۔ اس لیے وہ منمنانے لگا تھا۔ غلام رسول نے ہاتھ اٹھا کر اسے سختی سے روکتے ہوئے کہا۔

''مسٹر تھامس! مجھے اس ہیڈ کوارٹر سے نکلنا ہے تمہاری جان بخشی کی واحد صورت میرا یہاں سے بچ نکلنا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم یہ کیسے ممکن بناتے ہو؟ ''جہاں ڈیوڈ براجمان رہتا تھا اس کے عقب میں

دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تھامس بولا۔

''ہم تمام ممبر اس خفیہ راستے اندر داخل ہوتے ہیں۔'' تھامس کی بات پر غلام رسول کو خیال آیا کہ اس کمرے میں اسے کافی دیر ہو چکی ہے لیکن یہاں کوئی فائرنگ نہیں ہوئی تھی۔ جس کا مطلب تھا یہ کمرہ ایریل کے علم میں نہیں تھا۔ یہاں کا سیکورٹی سسٹم کیا تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے تھامس کو نظروں میں رکھتے ہوئے اس کا بتایا گیا دروازہ بڑی احتیاط سے کھولا باہر لمبی سرنگ نظر آ رہی تھی جس کی دیواریں اور چھت انتہائی چمکدار تھی۔ سرنگ میں روشنی اور ٹھنڈک تھی۔ اس نے تھامس سے پوچھا۔

''یہ کہاں جا کر ختم ہوتی ہے؟''

''وی آئی پی پارکنگ ایریا میں۔''

''یہ پارکنگ کس طرف ہے میرا مطلب ہے عمارت کی کون سی سائیڈ پر ہے؟''

یہ ایریا اصل عمارت سے کافی ہٹ کر ہے۔ غلام رسول کو قدرت نے بچ نکلنے کا اچھا موقع فراہم کیا تھا۔ اس نے تھامس کو گن سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آگے چلو۔'' وہ لوگ سرنگ میں داخل ہو گئے تھے سرنگ لوہے کی کسی اسپیشل دھات سے بنائی گئی تھی۔ جس میں آکسیجن اور روشنی کا بہترین انتظام کیا گیا تھا۔ سرنگ آگے چل کر تین موڑ لیتی تھی۔ اس کے بعد سیڑھیاں اوپر کو جا رہی تھی تھامس غلام رسول کے آگے چل رہا تھا سیڑھیوں کے اختتام پر لوہے کا دروازہ تھا۔ دروازہ بند تھا۔ تھامس نے غلام رسول کی طرف دیکھا غلام رسول نے انتہائی تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''کوئی چالاکی مت دکھانا تھامس! ورنہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔'' غلام رسول کے لہجے کی سفاکی محسوس کر کے تھامس لرز گیا تھا۔ اس نے بے بس نظروں سے اسے دیکھا۔

''دروازہ کھولو۔'' دوسرے حکم پر تھامس نے دروازے کے بائیں بٹ کے وسط میں اپنی پوری ہتھیلی رکھی ایک منٹ بعد دروازہ خودکار سسٹم سے دائیں بائیں سرک گیا۔ غلام رسول نے باہر کا جائزہ لیا یہاں دس گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پارکنگ سے آگے خاصا طویل گارڈن تھا گارڈن کے آخری کونے پر دیوار نظر آ رہی تھی۔ یہ ایریا اصل عمارت سے واقعی کافی دور تھا۔ غلام رسول کو تھامس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے گن کی نال لحظہ بھر اس کی کھوپڑی پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔ تھامس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی تھی۔

غلام رسول ارد گرد کا جائزہ لیتا ہوا گارڈ کی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد دیوار کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ وہ ابھی گارڈن کے وسط میں پہنچا تھا پیچھے سے اس پر فائرنگ کی گئی تھی گولیاں اس کی کمر میں پیوست ہو گئی تھیں۔ وہ انتہائی بری طرح لڑکھڑایا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ وہ اپنی پوری طاقت یکجا کیے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر پر تھے جس سے خون کا رساؤ بڑی تیزی سے جاری تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ ٹانگوں کی توانائی بھی جواب دے رہی تھی۔ چند قدم آگے اسے ایسا لگا جیسے قدموں تلے زمین نہیں رہی۔ وہ کسی گہری کھائی میں گر رہا ہے۔ گرنے کا یہ آخری احساس تھا جو اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔



غلام رسول کو ہوش آیا تو کچھ دیر وہ خالی الذہن لیٹا رہا۔ وہ کون ہے کیوں ہے اور کہاں ہے اسے کچھ سمجھ نہیں آئی چند لمحوں بعد اسے اپنے ہونے کا احساس ہوا۔ اس کے بعد اسے لگا جیسے وہ تاریک قبر میں لیٹا ہوا ہے۔ متفرق خیالات اس کے ذہن میں لمحہ لمحہ وارد ہوتے رہے کچھ دیر بعد اسے گزرے لمحات یاد آنے لگے۔ پاکستان، اردن اور پھر فلسطین آہستہ آہستہ اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ مائکرو فلم کا حصول اور پھر اس پر ہونے والی فائرنگ، فائرنگ کے بعد وہ

غالباً کسی گہری کھائی میں گرا تھا۔ تمام حالات و واقعات یاد آنے کے بعد اس نے حرکت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ شاید اعصاب ابھی پوری طرح متحرک نہیں ہوئے تھے۔ دس منٹ میں وہ پوری طرح شعور میں آچکا تھا۔ اس دوران اس کی خدمت پر مامور ایک سجیلا نوجوان بھاگ کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے صرف پانچ منٹ بعد امیر مجاہدین احمد سعید تین مجاہدین کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ غلام رسول کی کھلی آنکھیں دیکھ کر ان کے چہروں پر خوشیاں دوڑ گئی تھیں۔ احمد سعید نے بیڈ پر دونوں ہاتھ ٹکائے اور غلام رسول پر جھکتے ہوئے بولا۔

''بہت بہت مبارک ہو غلام رسول! اللہ تعالیٰ نے تمہیں نئی زندگی عطا کی ہے۔'' مکمل شعور میں آنے کے بعد یہ پہلی آواز تھی جو غلام رسول کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ امیر مجاہدین اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر اسے اتنی تسلی بہرحال ہوگئی تھی کہ موساد کے ہیڈ کوارٹر سے زندہ بچ نکل آیا ہے۔ اس نے ایک بار پھر حرکت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس بار اس کا بالائی جسم تھوڑا بہت حرکت میں آیا تھا مگر نیچے کا جسم بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ یوں جیسے وہ اس کے جسم کا حصہ ہے ہی نہیں اس نے کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر خشک لب تھرتھرا کر رہ گئے اس کا گلا بہت خشک ہو رہا تھا۔

''پانی لاؤ۔'' احمد سعید کی آواز پر وہ ہی سجیلا نوجوان جس نے انہیں اطلاع دی تھی۔ فوراً ایک طرف پڑے ہوئے جگ کی طرف بڑھا اور پانی کا گلاس احمد سعید کی طرف بڑھایا۔ غلام رسول کے حلق میں پانی کے قطرے اترے تو اسے جسم میں نئی توانائی محسوس ہوئی۔ اس نے بمشکل ہاتھ اٹھا کر امیر مجاہدین کے ہاتھ پر رکھا۔ جواباً امیر مجاہدین نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر اسے آنکھوں سے تسلی بخش اشارہ کیا۔

''سب ٹھیک ہے۔''

پھر بھی غلام رسول نے اسے کچھ بتانے پر مجبور کیا۔

''تمہیں کمر میں چار گولیاں لگی تھیں۔ جہاں تم گرے تھے وہاں مین ہول تھا۔ جس کا ڈھکن اتفاق سے کھلا رہ گیا تھا۔ تم سیدھا نیچے پائپ میں گر گئے تھے۔ یہ 96 انچ کی بڑی شہر کی مرکزی پائپ لائن ہے۔ جو کبھی فٹ پاتھ کے نیچے ہوا کرتی تھی۔ بعد ازاں اس حصے کو موساد نے باؤنڈری وال کے اندر کر لیا تھا۔ اس لائن میں پورے شہر کا پانی گزرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا دباؤ بھی زیادہ رہتا ہے۔ تمہیں پانی کا دباؤ اپنے ساتھ بہا لے گیا تھا۔ ایریل کے کسی خاص بندے نے تمہیں مین ہول میں گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً ایریل کو خبر دی تھی جو بروقت ایکشن میں آیا تھا۔ اس کے بندوں نے تمہیں اگلے مین ہول سے جو بلڈنگ سے سو میٹر دور بنا ہوا ہے سے نکال لیا۔ موساد کے ایجنٹ بھی وہاں پہنچے تھے مگر انہیں دیر ہوگئی تھی۔ ایریل نے تمہیں اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا تھا۔ وہاں تم آٹھ دن رہے اس کے بعد یہاں ہمارے پاس منتقل کر دیا گیا۔ اب تمہیں بارہ دنوں بعد ہوش آیا ہے۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ تمہاری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ تمہارا نیچے کا جسم کام نہیں کر رہا۔ دوسرے لفظوں میں تم ہمیشہ کے لیے معذور ہو چکے ہو۔''

غلام رسول کو اپنی معذوری کا کوئی غم نہیں تھا اسے عبداللہ اور حمزہ کی فکر تھی کیونکہ مائکرو فلم بھی حمزہ کے پاس تھی۔ وہ اپنے اندر کمزوری اور نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ دھیرے سے بولا۔

''حمزہ اور عبداللہ؟''

''عبداللہ شہید ہو چکا ہے۔'' امیر مجاہدین کی بات سن کر غلام رسول نے آنکھیں سختی سے موند لی۔

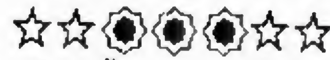
''انا للہ و انا الیہ راجعون'' اس نے دل میں پڑھا اور اپنی ساری قوت یکجا کر کے بولا۔

''اور حمزہ؟''

''الحمدللہ حمزہ اس وقت اردن پہنچ چکا ہے اور عنقریب پاکستان چلا جائے گا۔ ہاں البتہ دایاں ہاتھ کلائی سے کٹ گیا ہے مگر ایک ہاتھ کی قربانی دے کر وہ بمعہ مائکرو

فلم ہیڈ کوارٹر سے نکل آیا تھا چونکہ اس کا جانا بے حد ضروری تھا اس لیے ہم نے انہی ساتھیوں کے ساتھ جن کے ساتھ آپ لوگ آئے تھے اسے اردن پہنچا دیا ہے۔"

غلام رسول نے ساری تفصیل سننے کے بعد سکون سے آنکھیں بند کرلی تھی۔ اس کے اندر ایک انوکھا سکون اتر آیا تھا۔ ایک ایسا سکون جس کی لذت اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی نہ سنی اور نہ محسوس کی۔



نثار پور کے ساؤتھ ریجن میں واقع اسد محمود خان کے فارم ہاؤس میں بنا ہوا مکان برقی قمقموں رنگین جھنڈیوں اور مختلف اشکال کے غباروں سے سجا ہوا تھا۔ گھر میں عزیز واقارب کے علاوہ چیدہ چیدہ دوست احباب کی آمد و رفت جاری تھی۔ فارم ہاؤس کی وہ شام بڑی رنگین اور خوشیوں سے بھرپور تھی منزہ، کامران، اذان ان کی بیوی بچے آنے والے مہمانوں کو خوش دلی سے رسیو کر رہے تھے۔ بیگم کلثوم بار بار فون پر حمزہ سے بات کر رہی تھیں۔ وہ اسے لمحہ بہ لمحہ رپورٹ کر رہا تھا۔ جب فون منقطع ہو جاتا تب بیگم کلثوم پارٹی کے انتظامات پر نظر ثانی کر لیتیں۔ کبھی کیٹرنگ کمپنی والوں سے بات کرتیں جنہیں کوئٹہ سے خصوصی طور سے اس پارٹی کے لیے بلوایا گیا ہے۔ کبھی گھر میں آنے والے مہمانوں کے پاس جا کر ان کا حال احوال پوچھتیں۔ جب مہمان انہیں مبارک باد دیتے تو ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھتا۔ یہ سلسلہ چند منٹ چلتا اور پھر ان کی انگلیاں حمزہ کا نمبر ڈائل کرنے لگتیں۔ دس بجے کے قریب انہیں حمزہ نے ایک اطلاع دی جسے سن کر بیگم کلثوم اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئیں۔ کمرے میں ایک طرف جائے نماز بچھی ہوئی تھی۔ انہوں نے دو رکعت نماز نفل کی نیت کی اور اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیے۔ شکرانے کے نفل ادا کرنے کے بعد دس منٹ تک وہ لرزتے وجود اور چمکتے آنسوؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتی رہیں۔

اس کے بعد وہ مستقل مہمانوں میں گھل مل گئیں۔

گیارہ بج کر 7 منٹ پر بیرونی گیٹ کی طرف سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ بیگم کلثوم نے خوشی سے لبریز لہجے میں بلند آواز میں کہا۔

"معزز مہمانوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ہمارے آج کے چیف گیسٹ تشریف لا چکے ہیں۔"

ان کی آواز سن کر سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ وہ سب منزہ، کامران اور اذان کو مبارک باد دینے لگے۔ اب طے شدہ پروگرام کے مطابق سب ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور گلاب کی پتیوں کے ٹوکرے اٹھائے باہر نکل آئے۔ منزہ بھاگ کر فارم ہاؤس کے دروازے پر پہنچ گئی تھی۔ جبکہ باقی حصوں نے مکان کے مرکزی دروازے سے لے کر فارم ہاؤس کے دروازے تک ایک قطار بنالی تھی۔ تاہم کامران، اذان، منزہ دوسری طرف الگ سے کھڑے ہوگئے تھے۔ مہمانوں میں حمزہ کی پوری فیملی شامل تھی۔ شمس، شہریار اور امجد بخاری کے گروپ کے بہت سے اہم بندے بھی موجود تھے۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ گرے کلر کی نسان کار اندر داخل ہوئی۔ گاڑی اندر داخل ہوتے ہی رک گئی تھی۔ فرنٹ سیٹ سے حمزہ نیچے اترا' اس کے دائیں بازو کی آستین لٹک رہی تھی۔ اس نے باہر آتے ہی ہاتھ لہرا کر سب کو سلام کیا۔ کامران اور اذان نے بھاگ کر ڈگی سے وہیل چیئر نکالی بیگم کلثوم باوقار قدموں سے چلتی ہوئیں ان کے نزدیک پہنچ چکی تھیں۔ بیگم کلثوم ان سے وہیل چیئر لے لی۔ وہ وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی کار کے عقبی دروازے کے پاس لے آئیں۔ تاہم انہوں نے دروازہ نہیں کھولا بلکہ گھوم کر دوسرے دروازے کے پاس گئیں اور دروازہ کھول دیا۔ وہاں موجود تمام لوگوں کے چہرں پر عجیب وغریب تاثرات تھے۔ کہیں خوشی تھی۔ کہیں محبتیں اور کہیں پرکیف و پرلطف جذبات۔

"بیگم کلثوم جلدی کیجیے ناں۔" ایک بے قرار آواز ابھری۔

"تھوڑا رکو بھئی۔" دوسری آواز ابھری۔

لوگوں میں ہلکی سی ہنسی اٹھی اور پھر مدھم پڑ گئی۔ بیگم کلثوم نے جھک کر عائشہ کو باہر نکالا۔

"مرحبا مرحبا۔" بلند آوازوں سے عائشہ کو خوش آمدید کہا گیا۔ اس پر پھولوں کی بارش کر دی گئی تھی۔ بیگم کلثوم نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا اس کا ماتھا چوما اور گال تھپتھپائے۔ منزہ کے اندر بے چینیاں دوڑ رہی تھیں۔ تاہم ابھی اس کی باری نہیں آئی تھی۔ بیگم کلثوم نے عائشہ کا ہاتھ تھاما اور ان کے پاس لے آئیں اب ان کی باری تھی۔

"ویلکم مائی سویٹ سسٹر۔" وہ عائشہ سے لپٹ گئی۔ اس کے بعد بیگم کامران اور بیگم اذان نے اسے گلے سے لگایا۔ حمزہ کی ممی اور بہنوں نے اسے خوش آمدید کہا اور ہار پہنائے۔ بیگم کلثوم اب دوسرا دروازہ کھول رہی تھیں۔ کامران اور اذان نے ماں کی مدد کی۔ انہوں نے جھک کر غلام رسول کو دیکھا۔

"خوش آمدید میرے قابل فخر بھائی۔" کامران نے سر کار کے اندر کرتے ہوئے کہا۔

غلام رسول نے اس کے گالوں کا بوسہ لے لیا۔

"شکریہ بھائی۔"

کامران اور اذان نے اسے مل کر وہیل چیئر پر بٹھایا۔ بیگم کلثوم نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا اب الفاظ دم توڑ گئے تھے۔ نہ ماں کچھ کہہ پا رہی تھی نہ بیٹا۔ ان کے لرزتے وجود اور آنسوؤں کی برسات ان کے الفاظ بن گئے تھے۔ جب کافی دیر یہی صورت حال رہی تو منزہ نے آگے بڑھ کر ممی کو شانوں سے پکڑا اور انہیں کھڑا کر دیا۔ بیگم کلثوم نے چہرہ صاف کیا اور وہیل چیئر کے پیچھے آ گئیں۔

مہمانوں نے غلام رسول کو ہار پہنانا شروع کر دیئے تھے۔ ہاروں کے بنڈل سے غلام رسول کا گلا جھکنے لگا تھا۔ ہار پہنانے سلسلہ تھما تو بیگم کلثوم وہیل چیئر آہستہ آہستہ دھکیلتی ہوئی مکان کی طرف لے جانے لگیں۔ اب ان پر گلاب کی پتیاں نچھاور ہو رہی تھی۔ غلام رسول کے ایک طرف عائشہ تھی دوسری طرف منزہ اس کے پیچھے حمزہ، کامران اور اذان چل رہے تھے۔ یہ قافلہ اندر جا چکا تھا۔ غلام رسول نے اندر کا جائزہ لیا تو حیرانی میں ممی سے بولا۔

"ممی! یہ سب......؟"

"بھول گئے ہو کیا' آج تمہاری اٹھائیسویں سالگرہ بھی ہے۔" ممی نے جھک کر اسے یاد دلایا۔



امجد بخاری کی شہادت کے بعد غلام رسول "سرجی" کا خطاب لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ جبکہ گروپ کی میٹنگ میں یہ منصب اس کے حصے میں آیا تھا مگر وہ مان نہیں رہا تھا۔ اپنے انکار کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے میٹنگ میں کہا۔

"ایک معذور شخص جس نے اب ساری عمر وہیل چیئر پر گزارنی ہے اور جو عملی طور پر میدان سے خارج ہو چکا ہے وہ اس اہم عہدے کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ یہ عہدہ ایسے شخص کا ہے جو اس کا سو فیصد حقدار ہو۔"

غلام رسول نے ہزار ہا دلیلیں پیش کی تھیں۔ سیکڑوں تاویلیں گھڑی تھیں مگر گروپ کے افراد تھے کہ مانتے نہ تھے۔ اسے سرجی کا خطاب دینے کے لیے سب زور لگا رہے تھے سب نے اس پر واضح طور سے عیاں کر دیا کہ اب اس گروپ کو آپ ہی نے لیڈ کرنا ہے۔ غلام رسول نے دیکھا کہ یہ لوگ کسی طور سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تو اس نے چند دن سوچنے کے لیے طلب کیے جو اسے بخوشی دے دیئے گئے۔ چار دنوں بعد دوسری میٹنگ بلائی گئی تھی۔



غلام رسول نے ماں اور عائشہ سے مشورہ کیا۔ ممی نے بھی اسے یہ کمان سنبھالنے کا مشورہ دیا تھا۔ جبکہ عائشہ نے تو باقاعدہ اس کے سامنے فلسطین کے عظیم رہنما شہید احمد یاسین کی مثال رکھ دی تھی۔ جنہیں اول عمری میں ہی ایک ایسی چوٹ لگی تھی جس کے سبب وہ عمر

بھر کے لیے معذور ہو کر وہیل چیئر پر بیٹھ گئے تھے۔ اس کے باوجود ان کے اندر جذبات کا سمندر موجزن رہتا تھا۔ دسمبر 1982ء میں غزہ میں حماس کی بنیاد رکھی تھی جو ایسی مقبول عام ہوئی کہ اسرائیل نے انہیں اپنے خلاف بغاوت اور دہشت گردی کے الزام میں 1989ء میں گرفتار کرلیا اور انہیں عمر قید کی سزا دی مگر آفرین ہے ان مجاہدین پر اور فلسطین کے لوگوں پر جنہوں نے اس کی گرفتاری کے بعد ایسی تحریک انتفاضہ شروع کی کہ 9 سال بعد ہی اسرائیل کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اگر محصور شیخ احمد یاسین کو رہائی نہ دی گئی تو شاید اسرائیل ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔ بحالت مجبوری نو سال اسرائیل کے عقوبت خانے میں رکھنے کے بعد انہیں رہا کرنا پڑا۔ پھر انہیں شہید کرنے کے لیے اکتوبر 2003ء میں ناکام کوشش کی گئی۔ 22 مارچ 2004 کی صبح جب وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ صبح کی نماز ادا کر کے باہر آرہے تھے تو ان پر ہیلی کاپٹر سے میزائل فائر کیے گئے۔ جس میں وہ شہید ہوگئے۔ شیخ احمد یاسین ایک معذور شخص جب شہید ہوتے ہیں تو چھ لاکھ فلسطینی ان کی نماز جنازہ ادا کرتے ہیں۔

”غلام رسول! معذوری کو اپنی کمزوری مت بناؤ۔ ابھی تمہیں اپنے ملک پاکستان اور اسلام کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔“ عائشہ کی مدلل باتوں کے بعد غلام رسول کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ چار دن بعد گروپ میٹنگ میں انہیں باقاعدہ صدر منتخب کرلیا گیا اور سب افراد کو بتا دیا گیا کہ آئندہ انہیں ”سر جی“ کے نام سے لکھا اور پکارا جائے گا۔

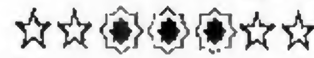


ستائیس سال بعد ایک یادگار دن کا احوال

ویل ڈیورنٹ کا لگایا ہوا پودا اب ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ مگر پچھلے اٹھائیس سالوں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھی۔ نہ اب ویل ڈیورنٹ رہا تھا نہ ہی اس کی معاونت کرنے والے سیاستدان۔ اس کی پوری ٹیم وقتاً فوقتاً اپنی طبعی موت مر گئے تھے۔ مگر ویل ڈیورنٹ کے معرکتہ الارا منصوبے کو جاری و ساری رکھا گیا۔ اگر ایک سائنسدان ابدی نیند سو گیا تو اس کی جگہ دوسرے سائنسدان نے لے لی۔ یوں دستور دنیا کے مطابق جانے والے جاتے رہے اور آنے والے آتے رہے لیکن ویل ڈیورنٹ کا عظیم منصوبہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ ہاں البتہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تھوڑا بہت ردو بدل ہوتا رہا۔ جس کے باعث یہ اپنی مقرر کردہ مدت میں پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا تاہم اب یہ مکمل ہو چکا تھا۔ اس پروجیکٹ کو امریکا اور اسرائیل نے مل کر پروان چڑھایا تھا۔ یہ بیک وقت دونوں ممالک میں جاری رہا تھا۔ مگر اب دونوں نے مل کر اس کا آزمائشی تجربہ کرنا تھا۔ اسرائیل میں بھی سائنسدانوں کی ٹیم بدل گئی تھی مگر اس پروجیکٹ پر انہوں نے بھی کوئی آنچ نہ آنے دی۔

21 دسمبر 2031 کی صبح کو دونوں ممالک میں انتہائی گہما گہمی تھی۔ جس پروجیکٹ پر انہوں نے دن رات محنت کی تھی اب اس کا پھل کھانے کا وقت آگیا تھا۔ گویا آج کے کامیاب تجربے کے ساتھ ہی وہ نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کا اعلان کرنے والے تھے۔ دن ایک بجے تک سیکڑوں لوگ امریکا میں اور ہزاروں لوگ اسرائیل میں اس تجربے کی تیاری میں مصروف رہے تھے۔ ان کا باہم ایک دوسرے سے رابطہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کیساتھ براہ راست رابطے میں تھے۔ ان سب کا نگران امریکا اور اسرائیل میں ایک شخص این ایف کلائن تھا۔ این ایف کلائن ڈیوڈ کے بعد میدان عمل میں آیا تھا۔ جس طرح لوگ ڈیوڈ جوہانسن کی اصلیت سے نہ آشنا تھے بالکل اسی طرح این ایف کلائن کی اصلیت سے بھی ناواقف تھے اور دنیا کبھی ان کی اصلیت کو پہچان نہیں پائے گی کیونکہ شیطان کا کام ہی انسانوں کو تباہ برباد کرنا، انہیں ورغلانا اور جہنم کا راستہ دکھلانا ہے۔ یہ

قیامت تک روپ بدل بدل کر اپنا کردار نبھاتا رہے گا۔
دن ایک بجے تک ساری تیاری مکمل کر لی گئی تھی۔
اب این ایف کلائن کی طرف سے او کے کا گرین سگنل ملنا تھا۔ اس کے بعد ایک لیور امریکا میں اور دوسرا اسرائیل میں کھینچ دیا جانا تھا۔



زمین کے قطر سے سورج کا قطر 1.9 گنا بڑا ہے۔ سورج کا قطر 14 لاکھ کلومیٹر ہے۔ جبکہ زمین کا صرف 12754 کلومیٹر۔ اسی طرح سورج کا وزن بھی زمین کے وزن سے سوا تین لاکھ گنا زیادہ ہے اگر سورج کا وزن سوچا جائے کہ کتنا ہوگا تو انسانی دماغ چکرا کر رہ جاتا ہے۔ سورج کا وزن دس کھرب 19889X کھرب ٹن ہے۔ سورج میں حرارت کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ابھی یہ پانچ ارب سالوں کے لیے بہت ہے۔ سورج کا درجہ حرارت تقریباً ڈیڑھ کروڑ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ جبکہ صرف اس کی سطح کا درجہ حرارت چھ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ جہاں یہ ہر سیکنڈ میں دھماکا کر کے چودہ ارب ٹن ہیلیم گیس بارہ ارب ٹن میں تبدیل کرتا ہے وہاں پر ہر سیکنڈ میں چالیس لاکھ ٹن ہائیڈروجن گیس بھی استعمال ہو رہی ہے۔ سورج سے پلوٹو سیارہ پندرہ ارب 91 کروڑ کلومیٹر ہے۔ جبکہ سورج سے زمین 15 کروڑ کلومیٹر دور ہے۔

امریکا اور اسرائیل نے سورج کے نظام کو چھیڑ کر اپنے مطلوبہ ہدف کو ٹارگٹ کرنے کا تجربہ کرنا تھا۔ جس وقت انہوں نے عظیم پروجیکٹ کے عظیم تجربے کے لیے دو لیور کھینچے تو اس وقت دنیا اپنے نارمل انداز میں رواں دواں تھی۔

پچپن سالہ غلام رسول گھر کے لان میں اپنے پوتے محمد ذیشان کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہ گھر اس نے اپنے سابقہ منہدم شدہ گھر والی زمین پر نیا تعمیر کیا تھا۔ اس گھر میں اس کے ساتھ عائشہ دو بیٹوں محمد بشارت اور محمد یاسر ان کی بیویاں مسرت یاسر نوشین بشارت اور بشارت کا دو سالہ خوبصورت سا بچہ محمد ذیشان رہائش پذیر تھے۔

مسرت، منزہ اور حمزہ کی بیٹی تھی جبکہ نوشین کامران کی پوتی تھی جو غلام رسول کی بہو بنی تھی۔ بیگم کلثوم کی وفات کو پندرہ برس گزر چکے تھے کامران بھی ایک ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ اذان اپنی فیملی کے ساتھ کوئٹہ میں ہی زندگی بسر کر رہا تھا۔ غلام رسول کا گروپ اسی طرح اپنے پورے جوش و خروش کے ساتھ ملک دشمن عناصر کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ تاہم پانچ سال قبل غلام رسول نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔

21 دسمبر 2031ء کے دن دو بجے سردیوں کی چلچلاتی دھوپ میں غلام رسول لان میں وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے محمد ذیشان کھیل میں مگن تھا۔

پوری دنیا میں زندگی جوبن پر تھی پاکستان کے بازار اسی طرح بارونق اور شور و غل سے بھرپور تھے امریکا، برطانیہ، جرمنی، ہالینڈ، چین، دبئی، سعودی عرب کرہ ارض کے تمام ممالک معمول زندگی جی رہے تھے ہوٹلوں، کلبوں، شاپنگ مال، کھیل کے میدان، ساحل سمندر سارے کے سارے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ عرب ممالک کی اونچی اونچی بلڈنگیں مزید اونچی ہو گئی تھیں۔ لوگوں کے ہنستے مسکراتے چہرے زندگی میں مگن تھے۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ قدرت کے نظام میں انسانوں نے دخل اندازی کر کے اسے فتح کرنے کی جسارت کی تھی مگر قدرت ان کی سوچ، اپروچ، تجربات، توانائی، ٹیکنالوجی اور سائنس سے بہت بہت اوپر ہے۔ اس قدر بلند و بالا جس کا ابھی انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا اور نہ ہی کر سکتے تھے مگر انہوں نے قدرت کے نظام کو چھیڑا ضرور تھا۔

غلام رسول کی جانب ننھے ذیشان نے بال پھینکا۔ بال ابھی غلام رسول سے دو میٹر دور تھا۔ جب غلام رسول نے تیز گڑگڑاہٹ کی آواز سنی مگر آواز کا منبع سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر گھبرا کر دیکھا۔ آسمان کی طرف سر اٹھا کر اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ عجیب و غریب آواز

کیسی ہے۔ لحظہ بھر میں اسے محسوس ہوا جیسے اس کی کرسی کو کوئی دھکے دے رہا ہے۔ اسے محسوس ہوا زمین لرز رہی ہے۔

''زلزلہ.....'' اس کے ذہن میں پہلا خیال لپکا، کرسی کے دھکے زور پکڑ رہے تھے اس نے ذیشان کو زور سے آواز دے کر اپنے پاس بلانا چاہا مگر وہ زمین پر گر کر رونے لگا تھا۔

عائشہ مسرت اور نوشین بھاگ کر باہر نکل آئی تھی۔ بشارت اور یاسر اپنے آفس میں تھے۔ زمین کا تھرکنا مسلسل بڑھ رہا تھا۔ غلام رسول بلند آواز میں استغفار پڑھنے لگا تھا۔ اس کی کرسی گر جاتی اگر اسے عقب سے عائشہ نے تھام نہ لیا ہوتا۔ گھر والے خوف و ہراس میں اس کے پاس کھڑے ہوئے تھے مگر خوف و دہشت کے سبب وہ کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ دفعتاً مسرت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ غلام رسول نے گھبرا کر مسرت کو دیکھا۔ مسرت کے چہرے اور آنکھوں میں خوف و ہراس تھا۔

''کک..... کیا ہوا بیٹی؟'' غلام رسول بمشکل کہہ پایا تھا۔ کیونکہ فضا میں نامانوس آوازیں بہت بڑھ گئی تھی۔ مسرت نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ میرے اللہ!'' غلام رسول نے آسمان کی طرف دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''نیچے بیٹھ جاؤ۔ سب زمین پر بیٹھ جاؤ اور توبہ استغفار پڑھو۔'' غلام رسول نے چیختے ہوئے سب کو ہدایت کی۔

مسرت اور نوشین فوراً نیچے بیٹھ گئیں۔ زمین ابھی تک ہلکورے لے رہی تھی۔ نوشین ذیشان کو سختی سے سینے کے ساتھ بھینچ کر بیٹھی ہوئی تھی تاہم عائشہ غلام رسول کی کرسی کو مضبوطی سے تھام کر کھڑی ہوئی تھی۔ آسمان سے آگ کے شعلے فضاؤں میں اٹھنے لگے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان سے برستی آگ زمین کو ہڑپ کرنے کے لیے بے چینی سے پر تول رہی ہے۔ زمین کا ہلنا ابھی تک جاری تھا۔ جس سے درخت، کھیت، مکان دھڑا دھڑ گرنے شروع ہو گئے تھے، زمین میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ افراتفری شور و غل، خوف، دہشت ہر سو ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ مناظر صرف پاکستان میں نہیں تھے پوری دنیا میں بپا تھے۔

امریکا اور اسرائیل جو قدرت کے نظام کو تسخیر کرنے کے دعویدار تھے ان کی تجربہ گاہیں بھک سے اڑ گئی تھیں۔ ہزاروں لوگ لمحوں میں لقمہ اجل بن گئے تھے۔ جہاں ان کی عظیم تجربہ گاہیں فخر سے سر اٹھائے کھڑی تھی وہاں اب آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان، ایران، انڈیا، امریکا، اسرائیل، فرانس، جرمنی، برطانیہ، آسٹریلیا اور پوری دنیا کے وہ ممالک جو جوہری ہتھیار رکھتے تھے ان کے گوداموں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ تمام ایٹمی ہتھیار جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔ وہ بھی اس انداز میں کہ وہ نہ پھٹے تھے نہ ان سے بارود باہر نکلا تھا۔ بلکہ تمام اسلحہ جہاں جس حالت میں تھا اسی حالت میں خاکستر ہو گیا تھا۔ دیگر تمام ممالک بھی تمام اسلحہ بارود جل چکا تھا۔ بلند و بالا عمارتیں ماسوائے مکہ مکرمہ اور مدینہ المنورہ کی عمارتوں کے۔ پوری دنیا میں زمین بوس ہو گئی تھیں۔ درخت گر چکے تھے۔ سمندر بے قابو ہو گئے تھے۔ کرہ ارض بے انتہا، تباہ و بربادی کا شکار تھی۔ مسلمانوں کے لبوں پر توبہ استغفار بلند تھا اور وہ چیخ پکار کر رہے تھے۔

''قیامت آ گئی قیامت آ گئی۔''

سب کچھ ملیا میٹ ہو رہا تھا۔ کلب، شراب خانے، بڑے بڑے ہوٹل، شاپنگ مال، میدان، کھیت سب کچھ تباہ ہو رہا تھا۔ گیس اور تیل کے کنوؤں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ تباہی تمام اقوام عالم میں برپا تھی۔ ایک ایسی ہولناک تباہی مچ اٹھی تھی۔ جس کا جدید دنیا کے جدید انسانوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

دنیا کے ذہین و فہیم سائنسدان حیرت سے ہی مر گئے تھے۔ تمام تجربہ گاہیں غیست و نابود ہو چکی تھیں۔ نہ کسی

ملک کے پاس توانائی بچی تھی نہ جدید ٹیکنالوجی، نہ اسلحہ اور نہ ہی دوسرے کوئی جن کے آلات جدید دنیا کے ساری جدید اشیاء ملیامیٹ ہوگئی تھی۔ انسان اپنے ہی تجربات کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ اب وہ لامحدود بے شمار اور بے انتہا نقصانات کا خسارہ بھگت رہا تھا۔ صرف سمندر کے سینے پر ڈیرے جمانے والا شیطان اپنے چیلوں کے سامنے فخریہ انداز میں قہقہہ لگا رہا تھا اور خوب زور زور سے کہہ رہا تھا۔

”کسی کے پاس کچھ نہیں رہا کچھ نہیں بچا۔ اب سب بھکاری بن گئے ہیں اب دجال آئے گا۔ جس کے پاس سب کچھ ہوگا۔ دنیا اسے خدا ماننے پر مجبور ہو جائے گی یہی میرا آخری ہتھیار ہے۔“

جب زلزلہ تھما اور آگ رکی تو اپنے پیچھے صرف تباہی و بربادی چھوڑ گئی تھی۔



2034ء تک دنیا اپنی تباہی و بربادی کا تاکام تخمینہ لگا تی رہی۔ نہ اسے مالی خسارے کا اندازہ ہوا نہ جانی نقصان کا نہ ہی تین سالوں میں تباہی کو سنبھال پائی تھی کیونکہ جدید دنیا کی تمام اشیاء مٹ چکی تھیں نہ جدید مشینری رہی تھی نہ جدید آلات۔ جس سے تباہی کا ملبہ ہٹایا جا سکتا۔ زندہ بچ جانے والے لوگ بہت پیچھے چلے گئے تھے۔ قوموں کے پاس کوئی اسلحہ نہیں رہا تھا۔ تیل و گیس اور توانائی کے دوسرے تمام ذرائع ختم ہو چکے تھے نہ ہوائی جہاز رہے تھے نہ بحری جہاز، جو شخص جہاں تھا وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ تمام سفری سہولیات ناپید ہو چکی تھیں۔ لوگ پیدل سفر کرنے لگے تھے۔ کرہ ارض میں 25 کروڑ انسانوں کو ایک دن میں موت آئی تھی۔ جو بچ گئے تھے وہ صدیوں پیچھے چلے گئے تھے۔ پوری دنیا بشمول امریکا، اسرائیل، برطانیہ بری طرح پسماندگی کا شکار ہو چکے تھی۔ اب کسی عسکری طاقت کے پاس لڑنے کے لیے ایٹم بم، ہوائی جہاز، ٹینک، میزائل کچھ نہ بچا تھا مگر دنیا شاید جنگ و جدل سے کبھی باز نہیں آنے والی تھی۔ اس لیے اب وہ تیر کمان، نیزے اور تلواریں بنانے لگی تھی۔

فوجیں گھوڑوں پر سوار رہتی تھی۔ انسانی تمدن کے ڈھانچے جس طرح تیر کمان سے نکل کر اسٹین گن، رائفل، مشین گن تک پہنچے تھے اب وہ پھر سے بدل کر ماضی میں لوٹ گئے تھے۔ سائنسی ترقی جس جنون کا شکار تھی وہ اپنی موت آپ مر گئی تھی اور ایسا ایک دن ہونا تھا کیونکہ آخری معرکے کا وقت بہت قریب پہنچ چکا ہے۔ جس میں ہوائی جہازوں کی جگہ گھوڑے استعمال ہوں گے۔

حضرت مہدی قسطنطنیہ سے نو گھڑ سواروں کو دجال کا پتہ معلوم کرنے کے لیے شام روانہ کریں گے۔ میزائل، بم اور ٹینک ناپید ہوں گے حضرت عیسیٰ دجال کو نیزے سے ہلاک کریں گے۔ رائفل اور اسٹین گن نہیں ملے گی۔ یاجوج ماجوج کی قوم فساد برپا کرنے نکلے گی۔ تو ان کے پاس تیر کمان ہوں گے اور اب دنیا اسی تمدن میں لوٹ آئی تھی جو سچے کھرے من کے مسلمان تھے ان کے لبوں پر ایک ہی دعا ہر لمحہ رہتی تھی۔

اللّٰھُمّ اِنّیِ اَعُوذُبِکَ مِنْ عَذَابِ جَھَنَّمَ وَاَعُوذُبِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَاَعُوذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَسِیحِ الدَّجَالِ۔ اللّٰھُمّ اِنّیِ اَعُوذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ۔ اَللّٰھُمّ انی اعوذ بِکَ مِنَ الْمَاثَمِ وَالْمَغْرَمِ۔

ختم شد



بھیڑیا

خلیل جبار

شہرت اور دولت انسان کو اندھا کر دیتی ہیں اور پھر وہ اس کے زعم میں ہر گناہ کرتا چلا جاتا ہے۔
ایک ایسے شخص کی کہانی جسے شہرت و دولت نے انسان سے بھیڑیا بنا دیا تھا۔

وقاص احمد کا شمار ملک کے اچھے لکھنے والوں میں ہوتا تھا' اس کا انداز تحریر کچھ اس طرح کا تھا کہ قاری کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ قاری اگر اس کی کہانی شروع کرتا تو پھر پورا کیے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ وقاص احمد کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا وہ مختلف جرائد میں تواتر سے کہانیاں لکھ رہا تھا' بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس کے لکھنے کی رفتار میں کمی واقع ضرور ہوگئی تھی مگر قارئین سے رشتہ ابھی تک برقرار تھا۔ آج بھی اس کے پاس مختلف قارئین کے خطوط آتے رہتے تھے جن میں اس کی تحریروں سے پسندیدگی کا اظہار ہوتا تھا جس طرح ہر فنکار داد کا بھوکا ہوتا ہے اسی طرح وقاص احمد بھی اپنی تحریروں کی تعریف پڑھ کر خوش ہو جاتا تھا۔ آج بھی کسی کے تعریفی بھرا خط ملنے پر وہ اس خط کو دن میں کئی بار پڑھتا اور خوش ہوتا تھا۔

دو سال سے ایک لڑکی جس کا نام رعنا تھا کے خطوط آرہے تھے' ان خطوط میں اس کی کہانیوں کی خوب تعریف ہوتی تھی۔ اپنی کہانیوں کی تعریف پڑھ پڑھ کر اسے دلی مسرت ہوتی تھی۔ اکثر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ رعنا کو اپنے پاس آنے کی دعوت دے اور پوچھے کہ آخر اس کی کہانیاں اسے اتنی کیوں پسند آتی ہیں کیونکہ اس کے خط پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسے جنون کی حد تک وقاص کی کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے لیکن وہ ڈرتا بھی تھا کہ اس بنگلے میں اکیلا رہتا تھا کوئی بھی اجنبی مرد یا عورت گھر میں داخل ہو کر اسے قتل کر کے اس کی عمر بھر کی جمع پونجی لے جاتا۔ وہ تنہائی پسند نہیں تھا اور جوانی میں بھی بہت سوشل قسم کا نوجوان تھا۔ اس کی خوب صورتی پر یونیورسٹی میں صاعقہ نامی لڑکی مرمٹی تھی۔ شکل وصورت میں وہ کوئی خاص نہیں تھی' خاص بات یہ تھی کہ وہ امیر ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں باپ کے انتقال ہو جانے پر تمام دولت اور جائیداد اس کی ہونی تھی۔ اس بات نے وقاص احمد کو بھی صاعقہ کی طرف مائل ہونے پر مجبور کر دیا تھا وہ غریب ماں باپ کی اولاد تھا۔ زندگی بھر کمانے پر بھی اتنی دولت جمع نہیں کر سکتا تھا' تعلیم مکمل ہونے پر وہ اس قدر قریب آچکے تھے کہ اس کا انجام شادی پر ختم ہوا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ ان کی شادی کے دو سال بعد وقاص احمد کے ساس اور سسر کا ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا۔ صاعقہ کو بلڈ کینسر تھا وہ بھی مزید دو سال گزرنے پر انتقال کرگئی لہٰذا اب ساری دولت کا وقاص احمد مالک بن گیا تھا۔ کاروبار کرنا اس کے بس کا کام نہیں تھا اس لیے وقاص نے شہر میں پھیلے ہوئے وسیع کاروبار کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا' اس کے سسر جمال الدین کے ساتھیوں

نے وقاص کو بہت سمجھایا کہ چلتے کاروبار کو اس طرح ختم کردینا اچھا نہیں ہے مستقبل میں ہماری باتیں تمہیں بہت یاد آئیں گی اور تم سوائے پچھتانے کے کچھ نہ کرسکو گے۔ وہ چوں کہ کاروبار کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اسی لیے لوگوں کے سمجھانے پر بھی باز نہیں آیا اور چلتے کاروبار کو ختم کرکے اس سے جو سرمایہ حاصل ہوا اس سے پراپرٹی خرید کر پلازہ تعمیر کروایا اور اس کے فلیٹ کرائے پر دے دیئے۔ پلازہ سے اتنی آمدنی ہونے لگی تھی کہ اس کی گزر بسر اچھی ہوجاتی تھی وہ فکر معاش سے بالکل آزاد ہوچکا تھا۔

اسکول کے زمانے سے ہی وقاص احمد کو کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا بہت شوق تھا اس کے دوست احباب اس کی لکھی ہوئی کہانیوں کا خوب مذاق اڑاتے تھے جس پر اسے بہت غصہ آتا تھا لیکن وہ برداشت کرجاتا۔ وہ سوچتا کہ ہر بڑے ادیب کے ساتھ ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے میرے ساتھ یہ سب کچھ نیا نہیں ہورہا ہے وہ کہانیاں لکھتا اور ضائع کردیتا۔ تعلیمی مصروفیات نے اس کے شوق کو وقتی طور پر دبادیا تھا اب اس کے پاس فرصت ہی فرصت تھی اس نے باریک بینی سے بڑے بڑے ادیبوں کی کہانیاں پڑھنی شروع کردی تھیں جب اس کا مطالعہ وسیع ہوا تو اس نے کہانیاں لکھنی شروع کردیں ابتداء میں رسائل کے مدیران نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی مگر اس کا عزم جواں تھا اور وہ اپنی آپ کو ایک بڑا رائٹر منوا کر دم لینا چاہتا تھا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کی کہانیاں رسائل کی زینت بننے لگیں اور قارئین کا ایک ایسا حلقہ پیدا ہوگیا تھا جو اس کی کہانیاں پڑھنا چاہتا تھا اس لیے اب ہر ڈائجسٹ اس کی کہانیاں اپنے رسالے میں شائع کرنا چاہتا تھا۔ ڈائجسٹوں میں اپنی کہانیاں دیکھ کر اس کا دل بہت خوش ہوتا تھا۔

وقاص احمد اپنی رنگین مزاج طبیعت کے سبب ان ہی ادبی تقریبات میں جاتا تھا جہاں اسے توقع ہوتی تھی کہ تقریب میں خواتین کی تعداد زیادہ ہوگی جو خاتون اسے پسند آجاتی تھی اسے اپنے گھر کھانے کی دعوت پر مدعو کرلیتا تھا۔ دستر خوان پر کھانے کا خوب اہتمام ہوتا تھا آنے والی خاتون خود بخود اس سے مرعوب ہوجاتی تھی۔ اکثر خواتین کے ساتھ وہ بستر پر لیٹنے کا لطف بھی اٹھاتا وہ خوب جانتا تھا ان خواتین میں آنیوالی ایک لڑکی نازش بھی تھی جو اسے بہت چاہتی تھی اور وہ اس سے شادی کی خواہش مند تھی۔ وقاص احمد شادی کے بندھن میں بندھنا نہیں چاہتا تھا اس کی تو یہی خواہش تھی کہ نازش سے اچھی دوستی رہے' ایک روز نازش کے انکشاف پر وہ ہل گیا کہ بنا نکاح کے ایک بچے کا باپ بننے والا تھا وہ غصے سے بھڑک اٹھا۔

''یہ...... یہ...... تم کیا کہہ رہی ہو' میں فی الحال باپ بننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے' تم واقعی ایک بچے کے باپ بننے والے ہو اور مجھے یہ سوچ کر ہول آرہا ہے کہ اس بچے کے باپ کی بارے میں لوگوں کو کیا بتاؤں گی۔'' نازش نے کہا۔

''تم اس کی نوبت ہی نہیں آنے دو' اس کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی ضائع کردو۔'' وہ بولا۔

''اب ایسا ممکن نہیں ہے اس کے دنیا میں آنے میں چند ماہ باقی رہ گئے۔'' نازش نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

''اس کا ایک حل ہے تم اس بچے کے پیدا ہوجانے پر کسی کچرا کنڈی پر ڈال آنا' کوئی بے

اولاد جوڑا اسے لاوارث سمجھ کر پال لے گا۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی یہ بچہ دنیا میں ضرور آئے گا اور میں اسے پالوں گی کیونکہ وہ ہم دونوں کی محبت کی نشانی ہے۔"

"یہ...... یہ...... تم کیسی...... بات کررہی ہو یہ معاشرہ تمہیں جینے نہیں دے گا۔ تم پر انگلیاں اٹھائے گا کہ شادی کے بغیر یہ بچہ کہاں سے آیا ہے۔" وقاص احمد نے کہا۔

"میں اسے تمہارا نام دوں گی کیونکہ یہ بچہ تمہارا ہے۔" وہ بولی۔

"نہیں تم ایسا نہیں کروگی اگر تم نے ایسا کیا تو میں بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوجاؤں گا۔"

"کیا کروگے تم......" نازش چیخی۔

"میں تم دونوں کو قتل کرادوں گا۔" وہ غصے سے دہاڑا۔

"تم مجھے اور اپنے بچے کو قتل کراؤ گے؟"

"ہاں پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے قتل کرنے کے لیے کرائے کے قاتل بہت مل جاتے ہیں۔" وقاص احمد نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

قتل کا سن کر نازش بُری طرح سہم گئی تھی پھر وہ کبھی وقاص احمد کی پاس نہیں آئی کیونکہ وہ بہت زیادہ ہی ڈر گئی تھی۔ وقاص احمد بھی خوش تھا کہ صرف اس کی دھمکی نے وہ کام کردکھایا تھا کہ قتل جیسے جرم سے باز رہا۔

آج کی ڈاک سے جو خطوط آئے تھے ان میں سے ایک خط رعنا کا بھی تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ کل اس کے شہر آرہی ہے اور کل شام پانچ بجے ملاقات کرے گی۔ اس کی آمد کا سن کر اس کے دل میں جو اس سے ملنے کی تڑپ تھی اس کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا اور وہ تصور ہی تصور میں اس کا خیالی اسکیچ بنا چکا تھا۔

شام پانچ بجے بیل بجنے پر اس نے دروازہ کھول دیا' دروازے پر کھڑی لڑکی نے اپنا تعارف رعنا کے نام سے کرایا' اس کے ایک ہاتھ میں بیگ تھا وہ اس کے تصور سے بھی زیادہ حسین تھی' وہ گم صم سا ہوکر اسے یک ٹک دیکھے جارہا تھا۔

"اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوہ...... ہاں آیئے میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔" اس نے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

"سر کیا اتنے بڑے گھر میں اکیلے ہی رہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں رعنا صاحبہ میں اکیلا ہی رہتا ہوں اور نوکروں کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

"وہ کیوں؟"

"بازار سے ہر چیز مل جاتی ہے پھر نوکروں کے چکر میں کیوں پڑوں۔"

"پھر بھی سر! نوکروں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

"رعنا! یہ شہر کراچی ہے یہاں قابل بھروسہ نوکر نہیں ملتے' اکثر تم نے اخبار میں پڑھا ہوگا گھر کے ملازم موقع سے فائدہ اٹھا کر مالکان کے گلے کاٹ کر ان کی دولت لوٹ کر فرار ہوجاتے ہیں۔ ڈاکوؤں سے مل کر انہیں گھر میں گھسا لیتے ہیں اور ان پر چوری کا الزام بھی نہیں آتا اور اس واردات میں سے حصہ بھی وصول کرلیتے ہیں اور نہ جانے کیسے کیسے کام بڑے گھروں میں نوکر کر جاتے ہیں جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔" وقاص احمد نے کہا۔

"سر! میں اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکوں

گی۔'' رعنا مسکرائی۔

''کیوں؟''

''سر! ادیب لوگ چھوٹی سی بات کو سنسنی خیز بنا کر پیش کر دینے کا فن جانتے ہیں جو بات آپ کہہ رہے ہیں واقعی ایسے واقعات کراچی میں ہوتے ہیں پھر بھی ملازم رکھنے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔''

''ملازم ہیں میرے پاس ان کا کام میرے شہر میں کئی پلازہ کی دیکھ بھال کرنا' پلازہ کے فلیٹ میں رہنے والوں سے بروقت کرایہ وصول کرنا' مجھے وقت پر دینا ان کا کام ہے اور ان سے ملاقات کا وقت میرے آفس میں مقرر ہے گھر پر آنے کی کسی کو اجازت نہیں۔'' وقاص احمد نے بتایا۔

''وہ گھر پر کیوں نہیں آ سکتے؟''

''میں ڈرپوک قسم کا آدمی نہیں ہوں بس احتیاط کرتا ہوں' ہاں خاص مہمانوں کو گھر بلانے میں تاخیر نہیں کرتا۔'' وقاص احمد نے نقطہ خاص پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ کا گھر بہت شاندار ہے۔''

''ابھی تم نے پورا گھر دیکھا ہی کہاں ہے۔'' وقاص احمد مسکرایا۔

''سر! میں ابھی بہت تھکی ہوئی ہوں' ذرا تھکن دور ہو جائے پھر گھر کا معائنہ کروں گی۔''

''ویسے میرا یہ گھر بیچنے کا فی الفور کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''سر! میرا ابھی گھر خریدنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' وہ ایک خاص ادا سے مسکرائی۔

''میں نے تمہارے لیے یہ کمرا سیٹ کر دیا ہے جا کر آرام کرو' رات کے کھانے پر ملاقات ہوگی اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو بتا دینا۔'' وقاص احمد نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑھے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی' وقاص احمد کی زندگی میں اب تک جتنی لڑکیاں آئی تھیں ان میں رعنا سے زیادہ حسین کوئی بھی نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا شکار خود چل کر اس کے پاس آ گیا تھا' شکار کو بستر تک لے جانے کا فن اسے بہت خوب آتا تھا۔ رعنا کو دیکھ کر وہ مچل اٹھا تھا' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے فوراً ہی بستر پر لے جاتا مگر وہ صبر سے کام لے رہا تھا ورنہ کام بگڑ بھی سکتا تھا۔

رات میں کھانے کی میز پر بیٹھی رعنا قیامت ڈھا رہی تھی' آرام کر کے وہ نہا دھو کر آئی تھی۔ اس لیے رنگت اور کھل گئی تھی' چہرے پر شادابی نظر آ رہی تھی وقاص احمد ایک کامیاب شکاری تھا اس لیے وہ دل میں شدید ہلچل ہونے کے باوجود پرسکون سا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''سر! اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی؟'' اتنے زیادہ کھانوں کا اہتمام دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

''یہ تکلف نہیں ہے جتنا پیٹ گنجائش دے کھالو جو بچ جائے گا وہ فریج میں رکھ دیں گے۔'' وقاص احمد مسکرایا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے اس طرح کھانا ضائع نہیں ہوگا۔'' وہ بولی۔

کھانے سے فراغت ملنے پر وقاص احمد نے اسے اپنے بنگلے کی سیر کرائی' اتنا وسیع و عریض بنگلہ دیکھ کر رعنا بہت متاثر ہوگئی تھی۔

''سر! یقین نہیں آتا کہ گھر میں کوئی عورت بھی نہیں ہے' ملازم آپ رکھتے نہیں پھر بھی بنگلے کی سجاوٹ اور صفائی ستھرائی پر بھرپور توجہ نظر آتی ہے۔ یہ سب کیسے کر لیتے ہیں؟''

''یہ تم نے بہت اچھا سوال کیا اور اس کا جواب بھی بہت اچھا ہی دوں گا۔''

''ظاہر ہے آپ ایک ادیب ہیں اور لفظوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا ادیب ایک اچھا مقرر بھی ہو۔'' وقاص احمد نے مسکراتے ہوئے رعنا کی طرف دیکھا۔

اس سے پہلے رعنا کچھ کہتی وہ خود ہی بول پڑا ''میرا لکھنے کا کام ایسا ہے کہ زیادہ چل پھر نہیں سکتا اچھی صحت کے لیے انسان کو جسمانی مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس یہی سوچ کر بنگلے کی صفائی ستھرائی اور دیگر کام اپنے ہاتھوں سے کرتا ہوں جس کا فائدہ یہ ہے کہ بیمار بھی نہیں پڑتا اور گھر بھی صاف ستھرا رہتا ہے۔''

''اور ملازم کی تنخواہ بھی بچ جاتی ہے۔'' رعنا زوردار قہقہہ لگا کر بولی۔

''ہاں ملازم کی تنخواہ بھی بچ جاتی ہے۔'' وقاص احمد نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی بات چیت اور بنگلہ دکھا کے رعنا کو خاصہ مرعوب کرلیا تھا۔ کل رات تک وہ رعنا کو اپنے بیڈ پر لے جائے گا' اس کام میں وہ بہت ماہر تھا اس لیے اسے پورا یقین تھا کہ اپنے شکار کو شکار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

رات خاصی بیت چکی تھی رعنا سونے کو کمرے میں جاچکی تھی وقاص احمد نے بہت کوشش کی اسے نیند آجائے لیکن ایسا لگتا تھا کہ کسی نے اس کی نیند چرالی ہے اور وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کی نیند کس نے چرائی ہے وہ تصور ہی تصور میں رعنا کو اپنے بیڈ پر محسوس کر رہا تھا۔ رعنا کو دو بھائی رنگت'

علم

۱۔ امام ابو حنیفہ نے اپنے شاگردوں کو فرمایا اگر تم اس علم سے خیر طلب نہ کرتے تمہیں ہرگز اس کی توفیق نہ دی جاتی۔

۲۔ جس نے علم دنیا کمانے کی خاطر حاصل کیا وہ اس کی برکت سے محروم رہ گیا وہ علم نہ اس کے دل میں ٹھکانہ پکڑے گا اور نہ اس کے علم سے کوئی استفادہ حاصل کرے گا جس نے علم دین کے واسطے حاصل کیا وہ علم اس کے دل میں ٹھکانہ پکڑے گا اور اس سے ہزاروں انسان فیضیاب ہوں گے۔

۳۔ حضرت ابراہیم بن ادھم کو وصیت فرمائی کہ تجھے عبادت سے بہت کچھ دیا گیا ہے اب علم کو اپنا مشغل راہ بنا کیونکہ علم عبادت کا تاج ہے اور علم ہی استعانت دین کا ذریعہ ہے۔

۴۔ جس نے حدیث پڑھی فقہ نہ سیکھی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے دوائیاں جمع کر لی ہوں اور اس کا فائدہ نہ جانتا ہو۔

مرسلہ: محمد فراز۔۔۔۔کراچی

متناسب' جسم دلکش نقوش اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ دو گھنٹے مسلسل بیڈ پر ادھر اُدھر کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ رعنا کے کمرے کی طرف تھا اس نے خود کو کمرے سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہا تھا۔ دل ہی دل میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں اس کی جلد بازی کے سبب شکار ہاتھ سے نہ نکل جائے اس نے کمرے کے دروازے پر دباؤ ڈالا مگر دروازہ اندر سے لاک ہونے کے سبب کھل نہ سکا۔

''شکار چالاک ہے' آسانی سے قابو آنے والا

نہیں ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

وہ کمرے سے ہٹ کر لان میں آ گیا' چاند کی روشنی تیز ہونے کے سبب لان کی ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی وہ گزرے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کتنی جلدی گزر گیا' محسوس ہی نہیں ہوا۔ شادی کی عمر نکل گئی تھی والدین زندہ ہوتے تو وہ زبردستی ضد کر کے اس کی شادی کرا ہی دیتے۔ والدین نہ ہونے کا یہ نقصان ہوا کہ وہ دوسری شادی نہ کر سکا تھا' اب کوئی خاتون شادی کے لیے تیار بھی ہوتی ہے تو وہ اس کی جائیداد کے حصول کے لیے شادی کرے گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ مل کر اس کا گلا گھونٹ دے پھر اس کے اور آشنا کو اتنی دولت حاصل ہو جائے گی کہ وہ باقی عمر خوب عیش کرتے گزار دیں۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ اسے اپنی دولت کے ساتھ بہت پیار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اس کی دولت آسانی سے ہڑپ کر جائے۔ یہ دولت حاصل کرنے لیے اس نے واجبی صورت کی مالک صاعقہ سے شادی کی تھی' وہ بہت وہمی ہو گیا تھا ہر ملنے والے سے خوف زدہ رہنا اس کا معمول بن گیا۔ مردوں کے مقابلے میں وہ عورتوں سے محبت کا جذبہ رکھتا تھا چند ملاقاتوں میں عورت سے دل بھر جانے پر وہ کسی دوسری کی زلف کا اسیر ہو جاتا تھا۔ وہ کسی ایک عورت کے ساتھ ساری عمر بتانا پسند نہیں کرتا تھا۔

رعنا کو دیکھ کر نا جانے کیوں آج اسے نازش یاد آ گئی تھی وہ بھی رعنا کی طرح بہت حسین تھی۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہو گی جس دن اس نے نازش کو دھمکی دی تھی پھر کبھی وہ اسے دکھائی نہیں دی تھی۔ پتا نہیں وہ زندہ بھی ہو گی یا نہیں' اس نے حمل ضرور گرا دیا ہو گا حمل نہ گرانے کی صورت میں وہ بچے کو باپ کا نام دیتی۔ بچے کے لیے باپ کی شناخت ضروری ہوتی ہے۔ جس بچے کا کوئی باپ نہ ہو اس کی ماں کو معاشرہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

اچانک آہٹ ہونے پر اس نے پلٹ کر دیکھا رعنا شب لباس میں لان میں آ رہی تھی' چاند کی روشنی میں اس کے دودھیائی رنگت اور شب لباس میں رعنا کا حسن اور کھل اٹھا تھا۔ بے اختیار وقاص احمد کا دل چاہا کہ وہ لپک کر اسے اپنی بانہوں میں سمو لے مگر دل کے چاہنے کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہ اٹھ سکا۔

''سر! کیا بات ہے اتنی رات میں لان میں بیٹھے ہیں؟'' رعنا نے کہا۔

''بس نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے لان میں چلا آیا۔'' وقاص احمد نے کہا۔

''نیند مجھے بھی نہیں آ رہی تھی اس لیے وقت گزارنے لان میں چلی آئی۔''

''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے انسان کے چاہنے کے باوجود نیند نہیں آتی۔''

''جگہ کی تبدیلی سے بھی نیند نہیں آتی۔'' رعنا مسکرائی۔

''ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔''

سر! اتنے بڑے بنگلے میں اکیلے رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟'' رعنا نے پوچھا۔

''ڈر کیسا...... یعنی مجھے تنہا رہنے کی عادت ہو گئی ہے جب سے بیوی کا انتقال ہوا ہے تنہا ہی بنگلے میں رہ رہا ہوں۔''

''سر! دوسری شادی کیوں نہیں کی اس طرح تنہائی سے نجات مل جاتی۔''

''بس وقت کا احساس ہی نہیں رہا یہ سوچتے

ہوئے کہ ابھی وقت بہت ہے دوسری شادی کرلوں گا لیکن وقت اس تیزی سے گزرا کہ بوڑھا ہوگیا ہوں اب دوسری شادی کرنے سے ڈرلگتا ہے۔''

''وہ کیوں سر؟''

''ہوسکتا ہے کہ دوسری بیوی دولت کے لالچ میں کہیں میرا گلہ نہ دبادے۔''

''سر! زندگی کو ایک پہلو سے کیوں دیکھتے ہیں' ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو دوسری بیوی بہت اچھی ثابت ہو۔''

''اخبارات اس طرح کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں کہ فلاں کو دولت کے لیے قتل کردیا گیا۔ شوہر نے بیوی کو اور بیوی نے شوہر کو دولت کے لالچ میں قتل کردیا۔'' وقاص احمد نے کہا۔

''میں مانتی ہوں کہ اس طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں لیکن سب کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہے میں تمہارے کہنے پر دوسری شادی پر غور کروں گا۔'' وقاص احمد نے مسکراتے ہوئے رعنا کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں کچھ دیر یونہی باتیں کرتے رہے اور پھر دوبارہ سونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ رعنا کو وقاص احمد کے پاس آئے ہوئے چوتھا روز تھا' اسے بڑی حیرت تھی کہ وہ ابھی تک اس کی بانہوں میں نہیں آئی تھی۔ پہلی بار وقاص احمد کو احساس ہورہا تھا کہ رعنا میں ایسی کوئی خاص بات ضرور ہے جو ابھی تک اس کے قابو میں نہیں آسکی تھی' وہ جب اس سے بات کرتی تھی اسے احترام کا درجہ دیتی تھی' اس بنا پر وہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جانب بڑھ نہیں سکا تھا لیکن آج اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ہر حالت میں وہ اسے قابو کرکے ہی چھوڑے گا چاہے کچھ بھی ہو' اس کی تجوری میں اتنی دولت بھری ہوئی تھی کہ جو حسینہ آسانی سے قابو نہیں آئی تھی وہ وقاص کی دولت دیکھ کر اس کی جھولی میں گرجاتی تھی۔ جب اس نے اپنی تجوری کی دولت رعنا کو دکھائی اس کا خیال تھا وہ حیرت سے گنگ ہوجائے گی لیکن اس کے برعکس ہوئی' اس نے وقاص احمد کی دولت کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔

''سر! مجھے دولت سے نفرت ہے۔'' رعنا بولی۔

''وہ کیوں؟''

''سر! دولت کی چمک دمک انسان کو حیوان بنادیتی ہے' میری ماں نے بھی ایک دولت مند شخص سے شادی کی تھی لیکن وہ بھیڑیا محبت کے جذبے سے ناآشنا تھا اس نے میری ماں کے جذبات اور عزت سے کھیلا اور پھر شادی کرنے کی بجائے اسے دھتکار دیا۔ اس لیے میں پیسے سے نفرت کرتی ہوں۔''

''واقعی وہ شخص بھیڑیا ہی ہوگا جس نے تمہاری ماں کے جذبات سے کھیلا۔'' وقاص احمد نے رعنا سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

رات کا کھانا رعنا نے ہی تیار کیا تھا' کھانے کی کئی ڈشیں تھیں ہر ڈش سے کھانا نکال کر کھاتے ہوئے وہ رعنا کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ آخر میں دونوں نے کھیر کی ڈش کھائی۔

''بھئی واہ یہ ڈش بھی بہت شاندار ہے۔'' وقاص احمد نے پلیٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ نے اپنی زندگی میں اس سے شاندار کھانے نہیں کھائے ہوں گے اور نہ کھاسکیں گے۔'' رعنا نے مسکراتے ہوئے وقاص سے کہا۔

''بھئی یہ ضروری نہیں ہے' ہوسکتا ہے تمہاری طرح کوئی حسینہ اس سے اچھا کھانا کھلادے۔''

''ایسا اب ممکن نہیں ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ میں نے بھیڑیئے کو کھیر کے ساتھ زہر بھی کھلا دیا ہے۔''

''کک...... کک...... یہ کیا کہہ...... رہی ہو؟''

''ہاں تم نے خود ہی اقرار کیا تھا کہ جس نے میری ماں کو دھوکہ دیا تھا وہ بھیڑیا ہی تھا اس لیے بھیڑیئے کا زندہ رہنے کا مطلب ہے اور زندگیاں تباہ کرنا۔''

''تم مذاق اچھا کر لیتی ہو کھیر میں زہر کیسے ہو سکتا ہے یہ تم نے بھی میرے سامنے کھائی ہے۔''

''ہاں میں نے بھی کھائی ہے لیکن زہر کھیر میں نہیں تمہاری پلیٹ میں تھا۔''

''میں...... میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' وقاص نے غصے سے کہا۔

''زیادہ اچھل کود مت کرو میری بات غور سے سن لو کیوں کہ تم بس چند منٹ کے مہمان ہو۔'' رعنا نے وقاص احمد کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

زہر کا سن کر وقاص احمد کی حالت غیر ہو گئی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت کیا کرے۔

''مجھے تمہارے بارے میں میری ماں نازش نے بالکل نہیں بتایا تھا لیکن ایک دن صفائی کے دوران ڈائری مل گئی جس میں سب باتیں لکھی ہوئی تھیں وہ ڈائری اگر نہ ملتی تو میں کبھی اس حقیقت کو نہ جان سکتی کہ میرا باپ ایکسیڈنٹ میں مرا نہیں بلکہ زندہ ہے اور وہ بے تحاشہ دولت کے ذریعہ اپنی راتوں کو رنگین بناتا ہے اور میری ماں ذلت بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ خاندان کے لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ اس نے پسند کی شادی کی تھی شوہر کے انتقال پر بیوہ کی زندگی محنت مشقت کرتے گزار رہی ہے۔ پسند کی شادی کرنے والی کا شوہر مر جائے یا ساتھ چھوڑ جائے تو پھر خاندان کا کوئی اور اس سے شادی نہیں کرتا۔ یہی میری ماں کے ساتھ ہوا وہ ڈائری پڑھ کر یہ پلان بنایا تھا کہ میری ماں کو جس نے یہ ذلت بھری زندگی گزارنے پر مجبور کیا اس سے بھرپور انتقام لوں گی۔ میں نے تمہارے بارے میں مکمل معلومات اکٹھی کر کے یہ ہی پلان بنایا اور میں اپنے پلان میں کامیاب رہی جس دولت پر تمہیں غرور و تکبر ہے وہ بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گی کیونکہ تمہاری بیٹی ہونے کے ناطے اس دولت پر میرا اور امی کا پورا پورا حق ہے۔ ہم اب بقیہ زندگی خوب عیش و آرام سے گزار سکیں گے۔'' رعنا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ تیزی سے اٹھا اور چاہتا تھا کہ سزا کے طور پر اس گلا گھونٹ دے مگر وہ ایسا نہ کر سکا اور دھڑام سے گرا پھر ذرا دیر تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ رعنا نے بڑے آرام سے تجوری کی چابی وقاص احمد کی جیب سے نکالی اور تجوری کی طرف بڑھ گئی اسے رقم لے کر اس شہر سے فوری طور پر نکلنا تھا۔



ایک نام دو فنکار

قیصر عباس

ایک طرف ننھی ننھی خواہشات سینے میں دبائے ہوئے غریب مزدور کی داستان تو دوسری طرف شان وشوکت اور بے پناہ دولت کے حامل عوام کی قسمت کے سوداگر کی کہانی' دونوں کی آخری منزل ایک مگر خیالات مختلف۔

تارکول کی بنی سڑک پر معاً کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے' اردگرد کھڑے افراد نے چونک کر دیکھا' ان سب کی نظریں رکنے والی نیو ماڈل کی سیاہ رنگ پراڈو پر جم گئیں۔ ان کی نظروں میں ایک عجیب سی حیرانگی تھی کہ جس میں ستائش بھی تھی اور حسرت بھی۔ گاڑی کا ڈرائیور سائیڈ والا دروازہ کھلا اور ڈرائیور نے ایک شان سے اردگرد کھڑے افراد کو دیکھا اور وقار سے چلتا ہوا گاڑی کے بائیں طرف آیا اور پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ اب کی بار وہ شاندار شخصیت برآمد ہوئی۔ اردگرد کھڑے افراد نے اس کی شخصیت سے مرعوب ہوکر نظریں جھکالیں۔ وہ شان سے چلتا ہوا سامنے واقع شاندار بلڈنگ میں داخل ہوگیا۔

یہ شخصیت معروف سیاستدان اللہ دتہ خان المعروف اے ڈی خان کی تھی۔ وہ ایک طاقتور پارٹی کے سربراہ تھے' ان کی پارٹی ایک بار بھاری اکثریت سے جیت چکی تھی' وہ سیاستدان ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ ملک میں جگہ جگہ ان کے سماجی ادارے پھیلے ہوئے تھے جنہوں نے اب تک بے شمار سماجی اور ویلفیئر کام کیے تھے' ان سماجی اداروں کے زیر اہتمام معذور افراد کے لیے خصوصی ٹرسٹ بھی تھے۔ وہ مجموعی طور پر عالم گیر شہرت کے حامل تھے' عوام کی بہبود کے لیے کیے گئے نت نئے اقدامات سے انہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں ایک الگ مقام پیدا کرلیا تھا' لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے محبت بھی تھی اور عزت بھی' لوگ انہیں دیوتا سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

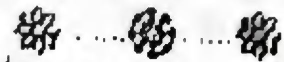


اس کا حلیہ مزدور جیسا تھا کمر جھکی ہوئی اور چہرے سے نقاہت برس رہی تھی' اس کے کپڑے میلے کچیلے اور چیتھڑوں پر مشتمل تھے۔ کام کرتے کرتے وہ ہانپنے لگا اور تھک کر بیٹھ گیا' سوچوں میں گم جانے کتنے پل بیت گئے کہ کسی خیال نے اس کے کمزور بازوؤں میں توانائی بھردی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور لکڑی کی شکستہ ریڑھی سے جلدی جلدی اینٹیں خالی کرنے لگ گیا۔ اینٹیں خالی کرکے وہ دوسرا پھیرا لانے کے لیے واپس ریڑھی کو دھکیلنے لگا' خاموش فضا میں اینٹوں کی ریڑھی کی گھرڑ گھرڑیوں سنائی دے رہی تھی گویا دور کہیں رہٹ چل رہا ہو' اسے اینٹوں کے اس بھٹے میں کام کرتے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا تھا۔

''ارے او دتو! بیٹھ کیوں گیا ہے رے' چل اٹھ ابھی دو ہی تو پھیرے لگائے ہیں تو نے۔ ابھی سے تھک گیا ہے چل اٹھ شاباش کام کر۔'' دور سے منشی کرم دین کی آواز سنائی دی اور تھک ہار کر بیٹھا اللہ

دتہ طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اللہ دتہ عرف دتو ایک کچی بستی میں کچے سے گھر میں اپنی بیوی اور بارہ سال کی بیٹی کے ساتھ رہتا تھا اس کی مزدوری سے بمشکل گھر کا چولہا جلتا تھا۔



''پاپا مجھے نہیں پتا' مجھے نئی گاڑی لینی ہے۔ وہ میری سہیلی ہے ناں غزل' اس کے پاپا نے کل ہی اسے نئی گاڑی لے کر دی ہے اور وہ کل ڈرائیور کے ساتھ اپنی نئی گاڑی میں کالج آئی تھی۔ پاپا اس کے سامنے مجھے اپنی گاڑی بہت پرانے ماڈل کی لگ رہی تھی۔'' ایمن نے دوسری بار ایک ہی رٹ لگائی۔

''ارے بیٹا ابھی دو مہینے ہی تو ہوئے ہیں تمہیں گاڑی لے کر دی تھی اور وہ بھی نیا ماڈل' اب ماڈل چینج ہوگیا ہے تو تمہیں اپنی گاڑی پرانے ماڈل کی لگ رہی ہے۔''

''مجھے نہیں پتا پاپا! مما آپ بھی تو پاپا سے کچھ کہیں ناں' آپ کو پتا نہیں میری اپنی سہیلیوں میں کتنی سبکی ہوگی۔ پتا ہے میں نے اپنی تمام سہیلیوں سے کہہ دیا ہے کہ پرسوں میں بھی نئے ماڈل کی گاڑی میں کالج آؤں گی۔'' ایمن نے اپنے ساتھ کھڑی مما سے کہا' وہ بھی کافی دیر سے مسکراتے ہوئے باپ بیٹی کی بحث سن رہی تھیں۔

''لے دیں ناں اسے نئی گاڑی ایک ہی تو بیٹی ہے ہماری اور اس کی ضد بھی آپ پوری نہیں کرسکتے۔'' تہمینہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اللہ دتہ خان سے کہا۔

''اچھا تو آپ بھی سفارش لے کر بیٹھ گئیں' ایک تو تم ماں بیٹی کے خیالات اس طرح کی باتوں میں آ کر ایک ہوجاتے ہیں۔ ٹھیک ہے بھئی' ہم ہی ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ بیٹیا جانی' تم کل ڈرائیور کے ساتھ شوروم چلی جانا اور اپنی پسند کا ماڈل لے لینا۔ میں پے منٹ کردوں گا۔'' اے ڈی خان نے مسکرا کر کہا۔

''پاپا ڈی گریٹ......'' ایمن نے نعرہ لگایا۔

''بس بس زیادہ مکھن مت لگاؤ۔'' اے ڈی خان نے ہنستے ہوئے کہا اور اس کی بات پر تہمینہ بیگم اور ایمن دونوں ہنس پڑیں۔



''ابا مجھے نئی گڑیا لا دیں ناں۔'' اللہ دتہ عرف دتو ابھی ابھی کام سے واپس آ کر صحن میں پڑی پرانی سی چارپائی پر بیٹھا تھا کہ بارہ سالہ زرینہ نے آ کر ضد کی۔

''پتر ابھی اس دن تو تجھے نئی گڑیا لا کر دی تھی' اب میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں کہ روز تجھے نئی گڑیا لا کر دوں۔'' دتو نے پیار سے زرینہ کو سمجھایا۔

''مجھے نہیں پتا ابا مجھے نئی گڑیا چاہیے' وہ اس دن والی گڑیا تو کھیلتے ہوئے مجھ سے گم ہوگئی تھی اب میں گڑیا کہاں سے لاؤں۔'' زرینہ کی آنکھوں میں حسرت سے آنسو گئے۔

''گم ہوگئی تو میں کیا کروں' اب میں تمہاری دال روٹی پوری کروں یا تمہاری نت نئی فرمائشیں۔'' دتو نے بری طرح زرینہ کو جھڑک دیا۔ زرینہ سہم کر پیچھے ہٹی۔

''ارے کیا کرتے ہو؟ کیوں جھڑک رہے ہو اسے؟ ایک ہی تو بیٹی ہے ہماری اور وہ بھی کون سا تم سے اتنی بڑی فرمائش کررہی ہے' ایک گڑیا ہی تو مانگ رہی ہے۔'' جنت بی بی نے کھانے کے برتن اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ایک گڑیا ہی تو مانگ رہی ہے' تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے' بہت خود سر ہوتی جارہی ہے۔ میں سارا دن بھٹے پر خوار ہوکر روٹی پانی کا بندوبست کرتا ہوں' اب یہ نئی نئی فرمائشیں مجھ سے پوری نہیں ہوتیں' کاش تم نے اس کی جگہ کوئی بیٹا جنا ہوتا تو آج وہ میرے ساتھ بھٹے پر کام تو کررہا ہوتا......!''

''نہیں ہیں ابھی میرے پاس پیسے جب ہوں گے تو لادوں گا نئی گڑیا۔'' دِتّو نے اچانک کسی خیال کے تحت کہا اور کھانے میں مشغول ہوگیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

''سر ہمیں یقین ہے کہ اس بار ہماری پارٹی واضح برتری حاصل کرے گی اور ہمارے مخالفین ہاتھ ملتے رہ جائیں گے کیونکہ عوام کی اکثریت دلی طور پر آپ کے ساتھ ہے اور پتا ہے سر! ابھی الیکشن میں دو ماہ باقی ہیں اور عوام میں آپ کے نام کے جلسے جلوس ابھی سے شروع ہوگئے ہیں۔'' احمر نے اے ڈی خان سے مخاطب ہوکر کہا۔

احمر اے ڈی خان کا اسسٹنٹ تھا اور الیکشن کا سارا انتظام بھی اے ڈی خان نے احمر کے ذمے لگایا ہوا تھا۔ بڑی سی میز کے پار سوچوں میں گم بیٹھے اے ڈی خان نے چونک کر احمر کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

''بھئی عوام کیوں ہمارے ساتھ نہیں آخر ہمارا بھی تو پیسہ اور دل عوام کے ساتھ ہے۔ تم اس طرح کرو کہ شوروم جاکر میرے نام سے تیس چالیس نئی گاڑیاں نکلوالو' نمائندوں میں تقسیم کردو اور ہاں اعلیٰ سطح پر جلسے جلوس خود اپنی نگرانی میں کراؤ' چاولوں کی دیگیں پکواؤ' بھئی پیسہ ہمارا ہوگا اور ووٹ عوام کے ہوں گے۔ ٹھیک ٹھاک پیسہ لگاؤ اور پھر دیکھنا کمال۔''

''سر وہ جمال حسن ہے ناں' وہ تو عوام کی بھاری اکثریت کو آپ کے ساتھ دیکھ کر آپ کے حق میں بیٹھنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔'' احمر نے ایک

ھنسنا منع ھے

ڈاکٹر: ''بچے کو پانی دینے سے پہلے ابال لیا کریں۔''
سردار: لیکن ابالنے سے بچہ مر تو نہیں جائے گا۔''

☆☆☆

ایک خاتون نے بھکاری کو باسی روٹیاں دینے کے بعد پوچھا۔ ''روٹیاں تو دے دی ہیں' اب کیوں کھڑے ہو؟''
''ہاضمے کی گولیاں بھی دے دیں۔'' بھکاری نے معصومیت کہا۔

☆☆☆

ماں' ماہر نفسیات کو بتا رہی تھی۔ ''میرا چھوٹا بیٹا اپنے بہن بھائیوں اور محلے کے بچوں کو خوف زدہ کرتا رہتا ہے' اسکول کے بچوں کی کاپیوں اور کتابوں پر اپنا نام لکھ دیتا ہے' کھانا سب سے الگ کھاتا ہے اور ہوا تیز چلے تو پلنگ کے نیچے چھپ جاتا ہے۔''
''فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے بیٹے میں ایک اچھا لیڈر بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔'' ماہر نفسیات نے کہا۔

☆☆☆

خالد: ''تمہیں معلوم ہے کہ ٹارزن کے آخری الفاظ کیا تھے؟''
اکرام: ''مجھے نہیں معلوم' تم ہی بتادو۔''
خالد: ''اس درخت کی شاخ پر کس کمبخت نے گریس لگائی ہے؟''

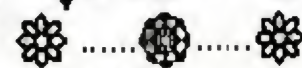
عاطف علی......ساھیوال

اور انکشاف کیا۔

''ارے اگر ہر النگا تلنگا الیکشن میں جیتنے لگ جائے تو ہم کہاں جائیں' ابھی آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ پیسہ کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے' ہمارے عوام تو گرگٹ کی طرح ہے' پھر پیسہ تو بڑے بڑوں کا ایمان کوڈانواں ڈول کردیتا ہے یوں سمجھو کہ ہمیں عوام کے ووٹ اپنے پیسوں سے خریدنے ہیں' اب جاؤ اور ہر کام مضبوط طریقے سے کرنا۔'' اے ڈی خان نے ہدایت کی۔

''او کے سر! ان شاء اللہ سب کچھ آپ کی توقع کے مطابق ہوگا۔'' احمر نے اٹھ کر اے ڈی خان سے ہاتھ ملایا' اس کے جانے کے بعد اے ڈی خان پھر سوچوں میں گم ہوگیا۔

الیکشن کے شب وروز اس کے دل ودماغ میں گردش کرنے لگے' اسے مکمل یقین تھا کہ اس بار وہ الیکشن میں ضرور کامیاب ہوگا اور ممکن ہے وزارت بھی مل جائے۔ کتنی ہی دیر تک وہ سوچوں میں گم بیٹھا رہا' ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے وہ تھکا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا' یک لخت اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم ساکت ہوگیا ہے۔ اس نے کرسی پر بیٹھنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے زمین پر گر گیا' اس نے اپنے وجود کی ساری توانائیاں صرف کر کے بولنا چاہا لیکن اس کی کوششیں ناکام ہوگئیں' تھوڑی ہی دیر میں اسے ایمبولینس میں شہر کے سب سے مہنگے ہسپتال لے جایا جارہا تھا' اسے دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ ہسپتال میں اسے فوری ٹریٹمنٹ دی گئی کہ آخر وہ ملک کی نامور اور وی آئی پی شخصیت تھا۔



لکڑی کی شکستہ ریڑھی کو دھکیلتا ہوا دِتو سوچ رہا تھا کہ کل کی مزدوری سے کچھ پیسے اس نے بچالیے تھے' کچھ پیسے اس نے پرسوں کی مزدوری سے بچا کر رکھے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ آج وہ بازار جاکر اپنی بیٹی زرینہ کے لیے ایک خوب صورت اور قیمتی گڑیا لے کر آئے گا' اپنے لیے نئی گڑیا دیکھ کر وہ کتنی خوش ہوگی۔ یہ سوچتے ہی بے خیالی میں دِتو مسکرانے لگا۔

''ارے دِتو کیا بات ہے؟ آج تُو بڑا خوش ہے، میں تو ہر وقت تجھے سوچوں میں گم دیکھتا ہوں' مجھے بھی تو بتا کیا بات ہے؟'' جیون نے اس سے مخاطب ہوکر کہا' جیون اس کی طرح کا ہی ایک مزدور تھا اور بھٹے پر کام کرتا تھا۔

''کچھ نہیں......وہ جیون آج مجھے کچھ کام ہے اس لیے میں تھوڑی دیر بعد چلا جاؤں گا' منشی صاحب پوچھیں تو کہہ دینا ضروری کام تھا۔''

''دیکھ دِتو! تجھے پتا تو ہے کہ منشی کام کے معاملے میں کتنا سخت ہے' تو اتنی جلدی جارہا ہے وہ بہت ناراض ہوگا اور ہوسکتا ہے دوبارہ تجھے کام پر بھی نہ رکھے۔'' جیون نے تشویش سے کہا۔

''ہوتا ہے ناراض تو ہونے دے اور کام کا کیا ہے خدا نے چاہا تو اور مل جائے گا۔ روزی اس کریم ذات نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے جیسے تیسے مل جائے گی' مجھے تو آج جلد از جلد بازار جانا ہے اور اپنی بیٹی کے لیے گڑیا لانی ہے۔'' دِتو نے جیون سے کہا۔

''اس سے پہلے کہ جیون کچھ کہتا دِتو لکڑی کی ریڑھی کو دھکیلتا ہوا چل دیا' تھوڑی ہی دیر بعد وہ بازار چلا گیا' دکانوں میں موجود شیشے کے شوکیسوں میں سجی رنگارنگ گڑیاؤں کو وہ دیر تک دیکھتا رہا، پھر اس نے ایک خوب صورت اور قیمتی سی گڑیا خریدی اور واپسی کے لیے چل دیا' سوچوں میں گم ابھی وہ بس اسٹاپ سے چند قدم دور تھا کہ ایک تیز رفتار کار

یکدم اس کے سامنے آ گئی اور اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا' اردگرد کھڑے افراد تیزی سے جائے حادثہ پر آئے۔ کار رکے بغیر جاچکی تھی' لوگ اسے اٹھا کر ہسپتال لے جانا چاہتے تھے کہ وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا' اس کی شناخت کے لیے لوگوں نے اس کے شکستہ لباس کو ٹٹولا کہ شاید شناختی کارڈ یا کوئی اور ایسی نشانی مل جائے کہ جس سے اس کی شناخت ہوسکے اور اس کے لواحقین کو اطلاع دی جائے' اس کی تلاشی لینے والے افراد نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت اور نئی گڑیا تھی۔



اے ڈی خان اسپتال کے آئی سی یو وارڈ میں تھا۔ وارڈ کے باہر اس کی بیوی' بیٹی اور اس کا اسسٹنٹ احمر بے چینی سے ٹہل رہے تھے' تھوڑی دیر میں وارڈ کا دروازہ کھلا اور ایک سینئر ڈاکٹر باہر نکلا' احمر تیزی سے اس کی جانب لپکا۔

''ڈاکٹر صاحب، کیسے ہیں اے ڈی خان صاحب؟'' احمر نے بے چینی سے پوچھا۔ ایمن اور تہمینہ بیگم بھی ڈاکٹر کے پاس آ گئیں' وہ بھی ڈاکٹر کی بات سننے کے لیے بے چین تھیں۔

''سوری مسٹر! دل کا شدید دورہ تھا' ہم نے انہیں بچانے کی بے حد کوشش کی لیکن مشیتِ الٰہی یہی میں تھی۔'' ڈاکٹر نے ہاتھ سے احمر کے کندھے کو تھپکا اور چل دیا۔ احمر حیرانگی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں ساکت و جامد کھڑا تھا جبکہ ایمن اور تہمینہ بیگم رونے لگیں۔ علاقے بھر میں ایک ہنگامہ مچ گیا' اخبارات میں طرح طرح کی خبریں بڑی بڑی سرخیوں میں چھپنے لگیں، جن میں ایک بڑی لائن اس طرح کی تھی۔

''ملک کے نامور سیاستدان اے ڈی خان دل کا دورہ پڑنے سے انتقال فرما گئے۔'' ان کے جنازے میں لاکھوں افراد نے شرکت کی جن میں اخباری نمائندوں اور میڈیا والوں کا ہجوم تھا' لوگوں کے اژدھام سے ٹریفک معطل ہوگیا' جنازے میں ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد نے شرکت کی۔

ایم پی اے' ایم این اے' وزیر' مشیر' حتیٰ کہ وزیر اعلیٰ پنجاب نے بھی ان کے جنازے میں شرکت کی' ان کے گھر میں مہمانوں کے لیے ایک زبردست انتظام تھا' دور دور تک شامیانے لگے ہوئے تھے اور طرح طرح کے کھانوں کا انتظام تھا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نے اخباری نمائندوں کو دیے گئے بیان میں کہا۔

''اے ڈی خان ایک عظیم سیاستدان تھے' انہوں نے ہمیشہ ذاتی مفادات سے ہٹ کر عوامی سیاست کی۔ سیاست کے میدان میں ان کی خدمات کو ہمیشہ سراہا جائے گا۔ اے ڈی خان واقعی ایک بہت بڑی سیاسی اور سماجی شخصیت تھے' ان کے انتقال سے سیاست کا ایک باب بند ہوگیا ہے۔'' اے ڈی خان کے انتقال پر عوام غم زدہ تھے۔ لوگوں نے ان کے بڑے بڑے پوسٹر علاقے کے چوراہوں میں نصب کردیے۔

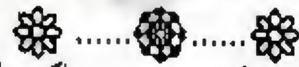
❁ ...... ❁ ...... ❁

اللہ دتہ عرف دِتّو مر گیا' لوگوں نے اس کی جیب سے ملنے والے شناختی کارڈ کی مدد سے اسے اس کے گھر پہنچادیا' صحن میں دِتّو کا مردہ جسم چارپائی پر رکھا ہوا تھا' اس کے سرہانے اس کی بیوی بیٹھی رو رہی تھی جبکہ دور کھڑی زرینہ حیرانگی سے چارپائی پر پڑی اپنے باپ کی لاش کو دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں کو ان گنت اندیشے ستا رہے تھے' ان کا واحد سہارا

ان سے چھن چکا تھا اور اتنی بڑی دنیا میں جنت بی بی کو حوصلہ دینے والا اور زرینہ کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں تھا' قریبی رشتے داروں میں تو کوئی تھا نہیں' دور پرے کے چند رشتے دار تھے جو مختلف شہروں میں آباد تھے۔

دِتّو نے اپنی زندگی میں کسی سے جان پہچان نہیں رکھی تھی' یہی وجہ تھی کہ چند ہمسایوں کے سوا اسے اپنے محلے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ انہی دو چار ہمسایوں نے دِتّو کے کفن دفن کا انتظام کیا' شام کے ہلکے سے اندھیرے میں وہی دو چار افراد دِتّو کی قبر پر آخری مٹی ڈال کر واپس آ رہے تھے اور اس شکستہ سی قبر کی منوں مٹی کے نیچے دِتّو گمنامی کی چادر لپیٹے دنیا و مافیہا سے بے نیاز پڑا تھا۔ فضا خاموش خاموش سی تھی' کوئی نہیں رویا' کہیں سے ماتم کی آواز نہیں آئی' سوائے دو افراد کے' ایک بوڑھا سا وجود کہ جس کے دل و دماغ میں مستقبل کے فکر و اندیشے بس گئے تھے اور ایک وہ معصوم سا پیکر کہ جس کے بچپنے نے حالات کی کٹھنائیوں میں پستے ہوئے سمجھ داری کا لبادہ اوڑھنا تھا۔

دِتّو کے کچے اور شکستہ سے گھر میں دو بے آسرا افراد کو زندگی کی سختیاں اب اکیلے ہی جھیلنی تھیں۔



یہ کہانی یہاں ختم ہو رہی ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو ہمارے معاشرے میں بے شمار اے ڈی خان ہیں جو اپنی بے تحاشا دولت کے بل بوتے پر لوگوں کی سوچوں کو ہپناٹائز کر کے بے پناہ عزت اور شہرت حاصل کرتے ہیں۔ اس معاشرے میں بے شمار ایسے دِتّو ہیں جو ساری زندگی محنت کی چکی میں پستے رہتے ہیں اور اپنے دل میں ابھرنے والی بے شمار خواہشات کو دال روٹی کی طلب میں پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ تمام زندگی محنت، مشقت ان لوگوں کے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے اور محنت کرتے کرتے ایک دن گمنامی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ یہ کیسا تضاد ہے۔ ایک وہ ہے کہ جس پر رونے والی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں آنکھیں ہیں' کروڑوں لوگ ماتم کناں ہیں اور ایک وہ ہے کہ جس کی قبر کی گیلی مٹی کے پاس کھڑے ہو کر دو لفظ پڑھنے والا بھی کوئی نہیں اور کوئی بھی تو نہیں جو اس کے گھر کے بے یار و مددگار مکینوں کو دلاسوں کی چھت ہی مہیا کر سکے اور ان محروم ہستیوں کے اجڑے سروں پر حوصلوں کی چادر رکھ سکے۔ ایسے بے شمار افراد ہیں جنہیں اپنی شاندار گاڑی کے بیک مرر میں دھندلے چہروں والے یہ لوگ نظر نہیں آتے' نام نہاد سماجی اداروں کا ڈھونگ رچانے والے ان لوگوں کی آنکھیں ان اجڑے لوگوں کو دیکھنے سے کیوں قاصر ہیں؟

میرے خیالات اپنی جگہ لیکن جب تک ہم میں موجود یہ دولت مند افراد اپنی خود احتسابی نہیں کریں گے تب تک ایسے بے شمار دِتّو پیدا ہوتے رہیں گے۔



قسط نمبر 20

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

وہ مسلسل میری طرف دیکھے چلے جارہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر جو دھیمی سی مسکان کھیل رہی تھی، میں اسے کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ وہ ایک دم سے مجھے جتنی پراسرار لگی تھی، اس کی آنکھوں میں اس قدر اپنائیت بھی چھلک رہی تھی۔ جبکہ میرے اندر بے چینی اٹھنا فطری عمل تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اٹھوں اور اس کے پاس جا کر پوچھ لوں کہ وہ کون ہے؟ شاید میں ایسا کر بھی لیتا مگر اس وقت باہر جانے کے لیے اعلان ہونے لگا۔ میں لاؤنج سے نکل گیا۔ لاؤنج سے جہاز تک وہ میری نگاہوں سے اوجھل رہی لیکن وہ میرے دماغ سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر آن بیٹھا اور اسی کے متعلق سوچنے لگا۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ میں چونک گیا۔ وہ میرے ساتھ آ کر اطمینان سے بیٹھ گئی تھی۔ میرے اندر ایک دم سے الارم بج اٹھا۔ میں پوری طرح محتاط ہوگیا۔ تبھی اس نے میری طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔

''لوگ اتنی جلدی بھول جاتے ہیں، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

اس کی آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی تھی۔ میں نے تب اسے غور سے دیکھا تو ایک دم سے میرے ذہن میں آ گئی۔ لیکن شک اب بھی تھا۔

''سوری، کیا آپ نے مجھے کچھ کہا؟'' میں نے انتہائی مہذب انداز سے پوچھا۔

''جی، میں نے آپ ہی سے کہا ہے؟'' اس نے پھر دھیمی آواز میں ہی کہا۔

''لیکن میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟'' میں نے یہی چاہا کہ وہ خود بتائے، کہیں میرا شک غلط نہ ہو جائے اور میں کوئی غلط نام لے بیٹھوں۔ میں پر اعتماد اس لیے بھی ہوگیا تھا کہ کرنل مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے لیے اس سفر میں ایک سرپرائز بھی ہوگا۔ میں سمجھ گیا تھا یہ سرپرائز کیا ہوسکتا ہے؟ اس کا یہاں ہونا اور میرے ساتھ سفر کرنا کسی بڑے معاملے کا اشارہ تھا۔

''ذرا تصور کرو، میری آنکھوں پر موٹی سی عینک لگی ہو۔ میں اپنی عمر سے ذرا بڑی دکھائی دے رہی ہوں۔ پھر تم میرے ساتھ کسی باغ میں بھی گھومے ہو'' وہ میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی۔

''میں پہچان تو گیا ہوں۔ لیکن ذرا سا شک اب بھی ہے۔ اگر چاہو تو خود بتادو'' میں نے سکون سے کہا تو وہ

ذرا سا منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"میں نوتن کور ہوں، اب پہچانا؟"

"ہاں اب پہچان گیا، لیکن تم یہاں کیسے؟ اور یہ تم بہت حد تک بدل گئی ہو، جوان، خوبصورت اور پرکشش۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک نئی لڑکی میرے سامنے آ گئی ہو۔ یہ سب کیا ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"لاہور پہنچ جائیں، پھر سکون سے باتیں کریں گے۔" اس نے ایک ادا سے کہا تو مجھے ایک بار شک ہوا جیسے یہ نوتن کور نہیں کوئی دوسری لڑکی میرے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ میں نے سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا دی۔

لاہور ائر پورٹ سے ہم یوں باہر آئے جیسے ہم دونوں میں کوئی اجنبیت نہیں ہے بلکہ ہم سفر ہیں۔ باہر ٹیکسی موجود تھی، جس کا نمبر مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے تو ٹیکسی چل پڑی۔ کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ ڈلیش بورڈ پر پڑا سیل فون بج اٹھا۔ نوجوان ڈرائیور نے ڈلیش بورڈ پر پڑا سیل فون اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کی کال ہے۔"

میں نے فون پکڑا تو دوسری طرف کرنل سرفراز تھے۔ میرے سلام کرنے پر انہوں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"ہاں کیسا رہا سرپرائز؟"

"پہلے سے کافی خوبصورت ہے۔ لگتا ہی نہیں یہ وہی ہے، جس نے مجھے باغ کی سیر کرائی تھی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بولے

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ خیر! کہنا تمہیں یہ تھا کہ یہ مہمان ہے۔ جیسے کہے ویسے کرتے جانا۔ اس کے ساتھ طے ہے۔ اور ہاں یہ فون اپنے پاس ہی رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا تو انہوں نے فون بند کر دیا۔ جو تھوڑا بہت شک تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

ٹیکسی نے ہمیں مال روڈ پر موجود فائیو اسٹار ہوٹل میں چھوڑ دیا۔ استقبالیہ پر بھارتی نژاد برطانوی خاتون کے نام پر سوئٹ بک تھا۔ ہمیں وہاں پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد جب میں فریش ہو کر آیا تو اس نے شارٹس پہن رکھے تھے۔ سامنے مہنگی شراب کی بوتل کے ساتھ لوازمات تھے۔ ایک گلاس میں وہ شراب ڈالے ہلکے ہلکے چسکیاں لے رہی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا

"بہت بدل گئی ہو نوتن۔"

"ہاں میں نے فیصلہ کر کے باقاعدہ پلاننگ کر کے خود کو بدلا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے لمبا سا سپ لیا اور یوں گویا ہوئی جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہہ رہی ہو۔" جمال جب تم چلے گئے تو میں نے بہت سوچا، ہم اتنے دن ساتھ رہے، لیکن تم نے مجھے عورت ہی نہیں سمجھا۔ بلکہ میری بہت ساری خامیوں کو بھی نظر انداز کیا۔ ورنہ میں نے جس کے ساتھ بھی کام کیا تنہائی میں اس کی پہلی ترجیح میرا جسم ہوا کرتی تھی۔ جرم کی اس دنیا میں ایک عورت ہونے کی وجہ سے طوائف بن جانے پر مجبور تھی۔ اس کی صرف اور صرف ایک وجہ تھی کہ میں طاقتور نہیں تھی کسی کے سہارے چل رہی تھی۔ رقم تھوڑی ہوتی یا زیادہ، اس کے عوض زندگی کو گھسیٹنے پر مجبور تھی۔ تم سے میں بہت کچھ سیکھا۔ مجھے اپنے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے یہ کام ہی چھوڑ دیا۔ کوئی تین ماہ بعد بانیتا کور میرے پاس آئی، میری اس سے لمبی بات ہوئی۔ تب اس نے مجھے امرتسر چھوڑ دینے کو کہہ دیا اور میں نے چھوڑ دیا۔" یہ کہہ کر وہ نیا گلاس بنانے لگی۔

"امرتسر چھوڑ کر کہاں گئی؟"

"ممبئی۔" یہ کہہ کر اس نے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

"تب سے میں وہاں ہوں۔ میں نے خود کو پوری طرح بدل لیا۔ اس دن سے میں نے رقم کا نہیں طاقت کا

حصول ہی اپنا مقصد بنا لیا۔ اب طاقت بھی ہے اور دولت بھی۔ اب اگر میں چاہوں تو اپنے لیے، وقت گزاری کے لیے کسی لڑکے کو بلا لیتی ہوں۔ کوئی میری طرف دیکھنے کی جرات نہیں کرتا۔ اس کے لیے میں نے کئی لڑکے پالے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ سپ لینے کیے رکی تو میرے ذہن میں کئی سوال آئے مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس معاملے میں یہ وہیں کی وہیں ہے۔ مجھے اس پر کوئی سوال نہیں کرنا چاہئے، یہ اس کی ذاتی زندگی ہے۔ وہ سپ لے کر بولی۔

"جب پچھلے دنوں تم وہاں تھے تو میرا بہت دل کیا تھا تمہیں ملنے کو، مگر اس وقت میں پونا میں پھنسی ہوئی تھی اور تم زوردار سنگھ کے پاس ٹھہرے بھی تو ذرا دیر ہی کے لیے تھے۔ جب تک میں ممبئی آئی، تم وہیں کہیں غائب ہو چکے تھے۔ مجھے دلی دُکھ ہوا تھا لیکن واہگورو کی مہر سے مجھے تمہارے پاس یہاں بھیج دیا گیا۔"

"کس نے اور کیوں؟" میں پوچھا۔

"ظاہر ہے زوردار سنگھ نے مجھے بھیجا۔ مگر ہمارا ایک بڑا نیٹ ورک ہے۔ وہ سکھ دھرم ہی کے لیے کام کر رہا ہے لیکن اس کے بہت سارے دوسرے کام بھی ہیں۔ صرف مشن سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اب بات یہ ہے کہ مجھے تمہارے پاس کیوں بھیجا گیا۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو یہ تمہیں بتانا ہوگا کہ تم ممبئی میں کیا چاہتے ہو اور میں یا میرا نیٹ ورک تمہارے لیے کیا کر سکتا ہے۔ اس حوالے سے میں تمہیں بتاؤں گی کہ ہم کہاں تک کیا کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں دولت کے علاوہ دوسرے مفادات بھی ہوں گے۔" اس نے واضح طور پر کہا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا

"بہت خوب، تم تو بڑے کام کی چیز بن گئی ہو۔"

"مجھے ذاتی طور پر تمہارے کام آ کر بہت خوشی ہو گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

"ابھی کھانا کھاتے ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر باہر ٹیرس کی جانب بڑھ گیا۔

میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ دنیا میں اپنے مفادات اور مقاصد کے حصول کے لیے بہت کچھ ہو رہا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنا ہدف حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اپناتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پیچھے کوئی ایسی سوچ ہوتی ہے اور آخرکار بات وہیں اس لکیر پر آ کر رکتی ہے کہ کون انسانیت کے ساتھ ہے اور کون ابلیسیت کا پیروکار۔ اس کے لیے جرائم کی دنیا کو بھرپور استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے انڈر ورلڈ میں بھی چھوٹی بڑی کمپنیاں بن چکی ہیں اور وہ ساری دنیا میں پھیل چکی ہیں۔ بے شک اس میں بھی بڑی اور چھوٹی مچھلیاں ضرور ہوں گی۔ جو اپنے مفاد کے لیے کام کرتی ہیں اور اسے بزنس کا نام دے دیا گیا ہے۔

کہتے ہیں جتنا بڑا شہر ہوتا ہے اتنی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ہر شہر کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ وہاں کی تہذیب اور ماحول میں بھی انفرادیت ہوتی ہے۔ وہ اس کی پہچان بن جاتی ہے۔ ممبئی بھی ایک ایسا ہی شہر ہے، جس کی بنیاد میں جرم ہے۔

سات جزیروں پر مشتمل شہر ممبئی، جب کوئی نام نہیں ہوا کرتا تھا، اور وہ محض سات مختلف جزیرے تھے، کولابہ، مزاگیون، بوڑھی عورت کا جزیرہ، ودالہ، ماہم، پاری اور مارٹونگا۔ امن پسندان جزیروں پر "اشوکا" کی نگاہ پڑی اور اس نے یہاں پر انہیں اپنے قبضے میں لیکر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ جس طرح اصل بھارتیوں پر آریان نے آ کر حکومت کی اور انہیں شودر بنا دیا۔ اسی طرح یہاں کے اصل باشندوں کو اس نے انتہائی ذلیل کیا تا کہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ اشوکا کی موت سے لیکر 1343ء تک یہ جزیرے مختلف ہندوں

حکمرانوں کے ہاتھوں منتقل ہوتے رہے۔ اس کے بعد گجرات کے مسلمانوں نے اس پر تقریباً دو سو سال تک حکومت کی۔ ماہم کا علاقہ ان کا مرکز تھا جہاں آج بھی اسی دور کی ایک مسجد موجود ہے۔ 1534ء کے لگ بھگ پرتگیزیوں نے یہاں قدم جمانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے سازش اور طاقت کے ذریعے مسلمانوں سے بہت سارے علاقے چھین لیے۔ خاص طور پر مغربی ساحلی علاقے جو تجارت کے لیے بہت اہم تھے۔ وہ وہاں آباد ہوئے، رومن کیتھولک چرچ بنائے۔ باندرہ میں آج بھی سینٹ اینڈریو چرچ موجود ہے۔ انہوں نے انہی علاقوں میں قلعہ نما عمارتیں بنائیں اور آہستہ آہستہ سبھی جزیروں پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے ساتوں جزیروں کے مقبوضہ علاقے کا نام رکھا "بوم بیا" (Bom Baia)، جس کا پرتگیزی زبان میں مطلب ہے "بہت اچھا ساحل"۔ تقریباً بیس برس بعد انگریز بادشاہ چارلس نے پرتگیزی شہزادی کیتھرین آف برگنزا سے شادی کی تو یہ بوم بیا ان کی عملداری میں آ گیا۔ یہ شہر انہیں تحفے میں دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کی قیمت یہ پائی کہ ان جزیروں کو دس سونے کے پونڈ کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا۔ اس سے پہلے ایسٹ انڈیا کا مرکزی دفتر گجرات کے شہر "سورت" میں تھا۔ 1687ء میں انہوں نے اپنا مرکزی دفتر یہاں تبدیل کر لیا۔ یہی جگہ تجارتی مرکز قرار پائی اور انہوں نے اس کا نام بوم بیا سے بدل کر "بمبئی" رکھ دیا۔ لیکن ساحلی قلیوں نے اس نام کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے اسے "ممبا" پکارا۔ یہ نام ان کی ممبا دیوی کی نسبت سے تھا۔ جس کا مندر آج بھی بابو ناتھ کے علاقے میں ہے۔ یہ علاقہ چوپڑتی ساحل پر ہے۔ یہ غریب طبقہ کی پہلی بغاوت تھی، جو دبا دی گئی۔ پہلی بار یہ شہر ایک یونٹ میں آ گیا۔ یعنی جزیرے ایک شہر بننے کی ابتدائی سطح پر آ گیا تھا۔

تقریباً پچاس برس کے بعد لگ بھگ 1835ء کے قریب ایک نئی قوت داخل ہوئی۔ رستم جی دوراب بھائی پاٹیل نے اپنا آبائی وطن ایران چھوڑا اور ہندوستان کے اسی ساحلی شہر میں آن آباد ہوا۔ اس کے ساتھ کافی سارے لوگ تھے۔ دراصل یہ زرتشت تھے اور اسلام کے اثرات سے اپنے مذہب کو بچا کر ہندوستان میں محفوظ ہونا چاہتے تھے۔ وہ پارسی جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے، انہیں دوراب بھائی نے آ کر اکٹھا کیا اور انہوں نے بھی سازش اور طاقت کے ذریعے برطانوی اور ساحلی قلیوں کی مدد سے ان جزیروں پر قبضہ کیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ پارسیوں نے کم تعداد میں ہونے کے باوجود ایسا کر دکھایا۔ یہ سب انہوں نے اپنی طاقت سے نہیں کیا بلکہ یہ طاقت انہوں نے غریب اور پسے ہوئے طبقے کو استعمال کر کے کی۔ یہیں سے "بھائی گیری" کا آغاز ہوا۔

پارسی ہی اس "بھائی گیری" مافیا کے بانی ہیں۔ رستم جی دوراب بھائی پاٹیل نے ایک نئی طرز کی مزاحمت سے اپنی طاقت کا احساس دلایا تھا۔ وہ غریب اور مزدور طبقے سے جنگ پر آمادہ، اور باغی قسم کے نوجوانوں کو چن کر انہیں زبردست طریقے سے استعمال کرتا۔ جو سب سے بڑا غنڈہ ہوتا وہ "بھائی" کہلاتا۔ یوں اب تک یہی اصطلاح ان غنڈوں کے لیے مخصوص ہے، جو باقاعدہ ایک مثال ہی نہیں روایت بن گئی ہے۔

ممبئی میں جرم کی طاقت سے حکومت کا آغاز ہو چکا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایک گروپ سے نئے گروپ بنتے چلے گئے۔ ان میں علاقے تقسیم ہونے لگے۔ ہر علاقے کا نیا "بھائی" وجود میں آنے لگا۔ ممبئی کے دولت مندوں نے اپنے مفاد کی خاطر نہ صرف اس طاقت کو استعمال کیا بلکہ اسے پروان چڑھایا۔ رقم اور تحفظ فراہم کر کے تجارتی حلقوں میں اپنا اثر رسوخ اور رعب داب بڑھانے میں کامیاب ہوتے گئے۔ اسی دھارے میں

سیاست دان بھی آتے گئے۔ ان سے بھی کام لیا جانے لگا۔ یوں ''بھائی گیری'' نے اتنی وسعت اور گہرائی اختیار کر لی کہ یہ مافیا کی صورت اختیار کر گیا۔

''بھائی گیری'' کا خام مال تب بھی اور اب بھی غریب، لاوارث، یتیم اور بگڑے آوارہ بچے ہیں جو اپنے ذہن میں انتقام لے کر پرورش پاتے ہیں۔ یہی انڈر ورلڈ مافیا ہے۔ عورتوں سے لیکر منشیات کے کاروبار تک، انسانی قتل سے لے کر ڈکیتیوں تک، چوری سے اسمگلنگ تک، ایک چھابڑی والے لیکر فلمی پنڈتوں تک سے بھتہ وصولی، تمام تر جرائم اب اسی انڈر ورلڈ مافیا ذمے وار ہے۔ یہ مافیا اس حد تک مضبوط ہو گیا ہے کہ اب ہر شعبے میں بادشاہ گر یہی لوگ ہیں۔ مطلب معمولی جیب کترے سے لیکر حکومتی ایوانوں تک، ان کی گرفت پوری طرح موجود ہے۔ ان سب کا صرف ایک مقصد ہے، ''فائدہ''

بھارت کے وجود میں آنے کے بعد 1960ء میں مختلف علاقوں کو ملا کر اسے مہاراشٹر کا نام دے دیا گیا۔ پارسی سیاست سے آؤٹ ہو گئے، ہندو چھا گئے۔ پارسیوں نے ملٹی نیشنل کمپنیاں بنا کر تجارتی حلقوں میں اپنی حکومت بنالی۔ لیکن انڈر ورلڈ مافیا بھی جڑیں اس حد تک مضبوط کر چکا ہے کہ ان کے بغیر ممبئی چل ہی نہیں سکتا۔

انہوں نے اپنے خام مال کی پیداوار کا بہت خیال رکھا ہوا ہے۔ ممبئی، جہاں فلک بوس عمارتوں کا تسلسل ہے، وہاں دنیا کی سب سے بڑی جھونپڑ پٹی بھی موجود ہے۔ سود کی نحوست سے غریب، غریب تر اور دولت مند امیر ترین ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ساحلی شہر کے اس تناظر میں دیکھا جائے تو کراچی بھی اس ''بھائی گیری'' سے محفوظ نہیں۔ ممبئی اور کراچی میں بہت سی مماثلت ہے۔ دونوں ساحلوں پر مافیا کا قبضہ پوری طرح موجود ہے۔ اسی کے ساتھ ہی تیسرا ساحل دوبئی بھی ہے۔ ممبئی سے دوبئی تک جرائم کی دنیا پھیلی ہوئی ہے اور اس پر اب کون حکومت کر رہا ہے؟ یہی سمجھنے کی چیز ہے۔

''یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟'' نوین نے کہا تو اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی گردن پر گرم ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے پلٹتے ہوئے نوین کور کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چھوڑ دیئے۔ تبھی اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھ پر اعتماد نہیں کر پا رہے ہو یا تمہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ تم دراصل چاہتے کیا ہو۔''

''نوین، یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟'' اس نے میرے قریب ہوتے ہوئے ہولے سے پوچھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ جو میں چاہتا ہوں، وہ تم کر بھی پاؤ گی یا نہیں، لیکن ایک طرح سے تم پر اعتماد کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ تمہیں کرنل صاحب نے بھیجا ہے۔'' میں نے اس کے بال بگاڑتے ہوئے کہا۔

''بھیجا نہیں بلوایا ہے مجھے، یہ ذہن میں رکھو'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہنس دیا

''چل کھانا کھاتے ہیں، پھر باغ ہی میں جا کر باتیں کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے میز تک لے آیا۔

سہ پہر ہو رہی تھی، جب ہم دونوں باغ جناح میں داخل ہوئے۔ نوین کور باوجود شراب پینے کے اس قدر نشے میں نہیں تھی، بلکہ سرور والی کیفیت میں تھی۔ ہم ہوٹل سے پیدل ہی باغ تک آئے تھے۔ مجھے کھلی فضا میں سانس لینا اچھا لگ رہا تھا۔ ایک لان میں سنگی بنچ پر بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔

''میں نہیں جانتا کہ تمہارے نیٹ ورک کی رسائی

کہاں تک ہے، صرف ممبئی کا ایک علاقہ، پورا ممبئی یا پھر دلی تک بھی رسائی ہے۔ کیونکہ میرا دشمن وہ ہے، جس نے اپنے خونیں پنجے بھارت میں گاڑ لیے ہیں اور اس کی نظر پاکستان پر ہے۔"

"تم ڈیوڈ ربنز کی بات کر رہے ہو، وہی جو ویرا ڈیسائی روڈ کے ساتھ بلڈنگ میں....." اس نے کہا اور جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بالکل وہی، وہ تو نہیں رہا، مگر اس کا نیٹ ورک اب بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھو، میں تمہیں ایک بات سمجھاتی ہوں۔ جس طرح کچھ لوگ یہودیوں کو بھارت لانے میں خوش ہیں، اسی طرح کچھ لوگ مخالف بھی ہیں۔ وہ اسے وہاں نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ یہ زہریلا ناگ ہے، دودھ پلانے والے کو بھی کاٹ لیتا ہے۔ میں مانتی ہوں، انہوں نے بھارت میں بہت گہرائی تک رسائی لے لی ہے، مگر یہ ناممکن نہیں ہے۔ اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

"یہ بات نشے میں تو نہیں کہہ رہی ہو، یا فقط مجھے حوصلہ دے رہی ہو یا پھر تمہیں اس کی سنگینی کا احساس نہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کا مقصد صرف اسلحہ فروخت کرنا ہے۔" اس نے سکون سے کہا۔

"نہیں، صرف اسلحہ فروخت کرنا نہیں ہے اور بہت کچھ ہے۔" میں نے تشویش سے کہا۔

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ رات تک میں تمہیں اس بارے میں بتا دوں گی، فی الحال اپنی بات کرو۔ تھوڑی پیار بھری باتیں، ایسا سکون، جسے میں یاد رکھوں۔" اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

"ایسا کیا ہو سکتا ہے، تم میرے بارے میں جانتی تو ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دی۔ اس دوران اس نے اپنا سیل فون نکال کر پیغام بھی ٹائپ کرتی رہی۔ مجھے لگا کہ وہ ڈیوڈ ربنز کے بارے میں لکھ رہی ہے۔ یہ پیغام تو منٹوں میں پکڑا جا سکتا تھا اور ایسی صورت حال میں جبکہ اس کے قاتلوں کو بڑے پیمانے پر تلاش کیا جا رہا ہو۔ کچھ دیر بعد وہ پیغام لکھ چکی تو میں نے اپنی تشویش کے بارے میں کہا تب وہ ہنس دی۔ پھر اپنا سیل فون مجھے دیتے ہوئے بولی۔

"پڑھ لو۔"

میں نے سیل فون پکڑا اور پڑھا، مگر پڑھ نہ سکا، وہ اوٹ پٹانگ زبان تھی۔ اس نے کوڈ ورڈز میں لکھا تھا۔ میں نے اسے سیل فون واپس کر دیا۔ اس نے وہ پیغام بھیج دیا۔ ہم وہاں کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے بہت ساری معلومات دیں۔ سورج ڈھل گیا تو ہم اسی طرح پیدل واپس آ گئے۔

ڈنر کے بعد نوتن کور نے ایزی لباس پہنا اور میرے سامنے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی اور میں سنتا رہا۔ میں اس کی باتیں اس لیے سنتا رہا کہ اس کی رسائی کے بارے میں معلوم ہو سکے۔ وہ ممبئی میں ہونے والی اپنی وارداتوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ بارہ سے زیادہ کا وقت ہو گیا ہوا تھا کہ اس کے سیل فون پر پیغام آ گیا۔ اس نے دیکھا اور پھر اپنے فون پر ای میل بکس کھول لیا۔ وہ چند لمحے پڑھتی رہی، پھر بولی۔

"یہ ڈیوڈ ربنز والا نیٹ ورک بظاہر حکومتی سائے میں ہے، مطلب بھارتی ایجنسیاں انہیں تحفظ دیتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ان کے لوگ یہاں ہیں جو بہت کم تعداد میں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فعال ہیں۔ وہ کئی دوسرے امور کے لیے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ گنتی کے یہ لوگ، بھارتی ایجنسیوں کی پشت پر ہیں۔"

"اگر انہیں ختم کرنا ہوگا تو بھارتی ایجنسیوں ہی سے لڑنا ہوگا۔ وہی ان کا سامنا کریں گی۔" میں نے کہا۔

''ایسا تو ہے،اب بولو کیا کرنا ہوگا۔''اس نے پوچھا تو میں نے چند لمحے سوچ کر کہا۔

''میں بتادوں گا۔''

''او کے اور یہ نام لکھ لو، جو یہاں اسی شہر اور کراچی میں موجود ہیں، جو ان کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور نام بھی لکھ لو جو یہودیوں کی بھارت آمد کے مخالف ہیں۔''

''یہاں کسی پیڈ پر لکھ دو اور سو جاؤ۔ صبح تمہیں جانا بھی ہے۔''میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں اپنے بیڈ پر آکر لیٹ گیا تھا۔ میری سوچیں بہت پھیل گئی تھیں۔ لیکن سونے سے پہلے میں سوہنی سے رابطہ کرنا نہیں بھولا۔ اسے میں نے بتادیا کہ میں لاہور میں ہوں۔

☆......☆......☆

مارکیٹ میں ہونے والے ناخوشگوار واقعے کی اطلاع ہم سے پہلے ہی اوگی پنڈ پہنچ چکی تھی۔ سردار ویر سنگھ کے ساتھ بلبیر سنگھ پنچ اُن کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''دکھ یہ نہیں کہ اس نے کمینہ پن دکھایا، دکھ یہ ہے کہ ہماری ملاقات کی تفصیل کس نے اس تک پہنچائی۔'' ویر سنگھ نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''سردار جی، یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے کسی منصوبے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اندر ہی کہیں کالی بھیڑیں ہیں۔ ان کا پتہ کریں۔''بلبیر سنگھ نے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ سب سامنے آجائے گا۔ آپ بس کل سے گردوارہ سیوا شروع کریں۔ پہلے شاید کہیں کسی دوسرے پنڈ سے ہوتی۔ اب اسی باجوے کے پنڈ سے شروع کریں گے۔ کیا یاد کرے گا وہ۔'' جسپال نے کہا تو سب نے اس کی طرف دیکھا۔ بلبیر سنگھ نے بات سمجھ لی تھی، اس لیے ایک دم سے ہنس دیا۔ کچھ غور کرنے پر ویر سنگھ کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی۔ اصل میں یہ پورے علاقے میں اپنی طاقت کا اظہار تھا۔

''پھر تو پتر ہمیں نکلنا چاہیے، دن کتنا رہ گیا ہے، کل کی تیاری میں کچھ وقت تو چاہیے نا۔''ویر سنگھ بے چین ہوتے ہوئے بولا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ بلبیر سنگھ پنچ بھی اٹھ گیا۔ ان کے جانے کے بعد کلجیت کور نے رونیت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''معاف کرنا پتر، تو پہلی بار ہمارے گھر آئی اور پہلی بار تمہیں اس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔''

''اوہ بے بے جی، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔''یہ کہہ کر وہ دھیمے سے بولی۔

''روز کا یہی کام ہے۔''

اس پر سبھی ہنس دیئے۔

''چل رونیت، تمہیں ڈریس دوں اور تو فریش ہوکر پہن لے۔''ہرپریت اُسے اپنے کمرے کی جانب لے جاتے ہوئے بولی تو جسپال اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ کافی حد تک خوشگوار تھا۔

جسپال، ہرپریت، انوجیت اور رونیت، چاروں شام ہونے تک چھت پر کھلی فضا میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کسی بات کا سرا شروع ہوتا تو وہ پھیلتا جاتا۔ جوتی ان کے لیے کھانے پینے کا سامان لاتی رہی۔ اس وقت سورج ڈوبنے کو تھا، جب جسپال کے سیل فون پر کال آگئی۔

''کون ہے جسپال؟''ہرپریت نے پوچھا۔

''تم شاید اسے نہیں جانتی، یہ بانیتا کور ہے۔ اس سے پوچھ لو۔''اس نے رونیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کال پک کرلی۔

''اوہ شکر ہے تم نے کال پک کرلی۔''بانیتا کور نے تیزی سے کہا۔ اس کا لہجہ نارمل نہیں تھا

''خیر تو ہے بانیتا؟''اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''اوئے خیر ہی تو نہیں ہے۔ کہاں ہے تُو؟''اس نے اسی لہجے میں پوچھا۔

''میں اوگی میں ہوں۔ اپنے گھر۔'' اس نے جواباً کہا۔

''دیکھ، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تو اپنے گاؤں سے دور ہو جا، اس طرح وہاں سے جانا ہے کہ گھر والوں کو کوئی پوچھ تاچھ میں تنگ نہ کرے۔ سکون سے سننا، تمہارے بارے میں ''را'' والوں نے فائل کھول لی ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے۔ وہ چاہے حقیقت ہے یا فرضی۔ تمہیں پھنسانے کے لیے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تمہارے گھر پر چھاپہ مارنے والے ہیں۔ ہو سکتا ہے مجھے ہی بتانے میں دیر ہوگئی ہو۔'' اس نے تیزی سے تفصیل بتائی۔

''میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟

''میں تمہیں سب سمجھا دوں گی، تمہیں نکلنے میں بھی وقت لگ سکتا ہے، وہ تیرے گھر کی دہلیز تک پہنچ گئے ہوں گے یا پہنچنے والے ہوں گے۔'' اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟ اور میرے بارے میں .....''

جسپال نے پوچھنا چاہا تو وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔

بکواس بند کرو اور نکلو۔ میں جالندھر آرہی ہوں۔ سب کچھ سمجھا دوں گی۔''

''اوکے۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا

''کیا کہہ رہی تھی۔'' رونیت نے پوچھا تو اس نے سیڑھیوں کی جانب بڑھتے ہوئے ایک منٹ میں ساری بات کہہ دی۔

''یہ کیا ہوا؟'' ہرپریت نے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے پوچھا تو رونیت بھی ان کے پیچھے جاتے ہوئے بے چین ہو کر بولی۔

''ہم نکلتے ہیں جسپال۔''

''اوکے نکلو۔'' جسپال نے کہا اور پھرتی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ جسپال باہر کی جانب بڑھنے لگا۔ تبھی ہرپریت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سب اچانک، ایسا کیا ہوگیا؟''

''میں تمہیں سب تفصیل سے فون پر بتاؤں گا۔ بانیتا کور غلط نہیں کہہ سکتی، ضرور کچھ ہوگا۔'' اس نے ہرپریت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اعتماد سے کہا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''یہاں کا کون خیال کرے گا؟ بولو، بتاؤ مجھے۔'' یہ کہہ کر اس نے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''سنو! چاہے کچھ بھی ہو جائے، سردار ویر سنگھ کے ساتھ گرودوارہ سیوا کی ریلی میں ضرور شامل ہونا ہے۔ وہ بہت ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ہرپریت ایک دم سے مانتے ہوئے بولی اور پھر ایک طرف ہٹ گئی۔ جسپال نے اُسے یوں دیکھا جیسے ہرپریت کو اپنے دل میں اُتار رہا ہو۔ چند لمحے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد وہ پلٹ کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے انوجیت بڑھا اور پھر پورچ میں رک کر فون کرنے لگا۔ جسپال اور رونیت پورچ میں کھڑی کار میں بیٹھے اور اگلے چند لمحوں میں وہ کوٹھی سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔

ابھی وہ اوگی پنڈ اور جالندھر شہر کے درمیان تھے، اسی وقت جسپال کا فون بج اٹھا۔ انوجیت کی کال تھی۔

''بانیتا کور کی بات ٹھیک ثابت ہوئی ہے، تمہارے جانے کے یہی کوئی چار پانچ منٹ بعد دو لوگ آئے تھے۔ وہ خود کو سی بی آئی کے بتا رہے تھے۔ انہوں نے تمہارا ہی پوچھا تھا۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟'' جسپال نے پوچھا۔

''یہی کہ اس سے ملوائیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ کچھ دیر پہلے جالندھر چلا گیا ہے۔ اس نے فون نمبر مانگا ہے تو میں نے دے دیا۔ کیا اس نے بات کی؟''

"ابھی تک تو نہیں کی، لگتا ہے،، وہ جالندھر میں داخل ہوتے وقت ہی مجھ سے ملنا چاہتے ہوں گے۔ خیر کوئی اور بات؟" جسپال نے پوچھا۔

"اور بات تو کوئی نہیں ہے، تمہارے بارے میں اوٹ پٹانگ سوال کرتے رہے۔ میں نے بلبیر سنگھ پنچ کو کال کر دی تھی، وہ آگئے۔ پھر انہوں نے اتنی بات نہیں کی اور چلے گئے۔"

"ٹھیک ہے اپنا اور سب کا خیال رکھنا، سردار ویر سنگھ سے رابطہ ضرور رہے تمہارا، بلکہ اسے بتا دو۔ میں بعد میں بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر جسپال نے فون بند کر دیا اور ساری بات رونیت کو بتادی۔ وہ تشویش سے بولی۔

"یار معاملہ کیا ہو گیا ہے؟ اس کی سمجھ نہیں آرہی ہے۔ میں سندو سے رابطہ کرتی ہوں۔ اسے بتادوں۔"

جس وقت وہ جالندھر کے قریب پہنچے، اس وقت تک نہ صرف سندو سے رابطہ ہو چکا تھا، بلکہ وہ بانیتا کور کے ساتھ رابطے میں بھی تھے۔ اسے بھی اوگی میں سی بی آئی کے بندوں کے آنے کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔ بانیتا کور نے اسے شہر سے باہر ایک فارم ہاؤس کا پتہ بتایا اور اسے وہیں پہنچنے کو کہہ دیا۔

وہ فارم ہاؤس جالندھر شہر سے مشرق کی جانب جی ٹی روڈ پر ذرا ہٹ کر کوٹ کلاں میں تھا۔ جس وقت تک وہ پہنچے، سندو وہاں آچکا تھا۔ فارم ہاؤس کا منیجر ایک لمبا چوڑا بھاری جسم کا سکھ نوجوان تھا۔ وہی سب دیکھ رہا تھا۔ سندو ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا، جب جسپال اور رونیت وہاں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی سندو نے پوچھا۔

"یار جسپال، یہ سب اچانک کیا ہو گیا ہے؟"

"مجھے خود نہیں معلوم، بانیتا نے یہ سب بھگدڑ مچا دی ہے، وہ آئے گی تو پتہ چلے گا۔" یہ کہتے ہوئے جسپال صوفے پر بیٹھ گیا اور اسے بھی سی بی آئی کے بندوں کے بارے میں بتادیا۔

"باقی سب ٹھیک ہے نا۔" رونیت نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں، سب ٹھیک ہے، وہ پروفیسر کی بیوی کو اس کے آبائی گاؤں بھیج دیا ہے، وہاں اس کا کوئی بھتیجا اب بھی ہے، ہرپال گیا ہے اسے چھوڑنے۔" سندو نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں، ہم اسے سنبھال سکتے تھے۔" رونیت بولی۔

"اچھا کیا، ورنہ اس کی بھی زندگی کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ خیر جب تک بانیتا آتی ہے، کوئی چائے وائے ہی پی لی جائے۔" میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت ہم چائے پی چکے تھے، جب بانیتا کور آندھی اور طوفان کی طرح وہاں آگئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"جسپال، سندو، اس وقت ہم بہت زیادہ خطرے میں ہیں۔ جس کا تم لوگوں کو اندازہ نہیں۔"

"کچھ بتاؤ گی بھی یا......" سندو نے چڑتے ہوئے کہا تو بانیتا نے اندر کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ، میں تمہیں دکھاتی ہوں۔"

ہم تینوں ایک بیڈ روم میں چلے گئے۔ اس نے ایک یو ایس بی نکالی اور سامنے پڑے ہوئے ڈی وی ڈی میں لگادی۔ ٹی وی اسکرین روشن ہو گئی۔

وہ کسی کانفرنس ہال میں ہونے والی بات چیت کی ویڈیو تھی۔ وہاں چند آدمی ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ایک اسکرین تھی۔ جس پر بانیتا کور کی تصویر تھی۔ کوئی اس کے بارے میں بریف کر رہا تھا

"سر! یہ ہے بانیتا کور، جس کا تعلق تو امرتسر سے ہے، لیکن یہ یہاں ممبئی میں پائی جا رہی ہے۔ یہ حیرت کی بات نہیں کہ یہ ممبئی میں کیوں ہے۔ اس کا ماضی ایسا ہی ہے کہ یہ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتی ہے مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کبھی پکڑی نہیں گئی۔ حیرت یہ ہے کہ

زمین ہاؤس میں اس کا ہونا اور اس پاکستانی کے ساتھ ۔ یہ دیکھیں۔" یہ کہہ کر اس کی مختلف تصویریں دکھائی جانے لگیں۔ یہ سب زمین ہاؤس میں لگے خفیہ کیمروں سے لی گئی تھیں۔ لفٹ میں، ڈیوڈ ریبنز کے کمرے کے باہر، ان کے کنٹرول روم میں۔ کوئی کہہ رہا تھا

"یہ سوال اپنی جگہ، یہ تو اسے پکڑ کر ہی پوچھا جاسکتا ہے نا کہ وہ وہاں پر کیا کر رہی تھی۔ کیونکہ اسی پاکستانی کے ساتھ یہ مختلف جگہوں پر دیکھی گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے، اسے پکڑو۔ مزید کیا ہے؟" کسی نے رعب دار آواز میں حکم دیتے ہوئے پوچھا۔

"مزید یہ ہے سر کہ جس وقت زمین ہاؤس پر حملہ ہوا، اس سے کچھ ہی دیر پہلے رامیش پانڈے پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے۔ اس کا ایک گارڈ مارا جاتا ہے۔ رامیش پانڈے سے کچھ سوال پوچھے جاتے ہیں۔ ان میں ایک فون نمبر بھی پوچھا جاتا ہے، جو کہ زمین ہاؤس ہی کا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد ہی وہاں حملہ ہو جاتا ہے۔ مطلب رامیش پانڈے پر قاتلانہ حملہ اور زمین ہاؤس پر حملہ ایک ہی سلسلے کی کڑی ہے۔ کیونکہ وہاں سے ہمیں کچھ مزید شواہد ملے ہیں۔"

"وہ کیا ہیں؟" اس رعب دار آواز والے نے پوچھا۔

"سر یہ دیکھیں، یہ تصویر، اس میں ایک لڑکا ہے اور یہ ایک لڑکی، یہ گوا کے ہوٹل سے لی گئی تصویر ہے۔ چھان بین سے یہ پتہ چلا ہے کہ فائرنگ ان دونوں نے کی ہے۔ جس کمرے سے کی گئی، وہاں موجود جوڑے نے ان کی تصدیق کی ہے، انہوں نے اس جوڑے کو باندھا اور بے ہوش کر کے بیڈ کے نیچے ڈالا۔"

"ان کے بارے میں پتہ چلا۔" رعب دار آواز میں پوچھا گیا تو بریف کرنے والے نے کہا۔

"یہ لڑکی تو چندی گڑھ کی ہے۔ اس کے بارے میں شک ہے کہ یہ جرائم پیشہ لوگوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کے ساتھ اس کا تعلق تھا، چند دن پہلے وہ پروفیسر قتل ہو گیا ہے۔ ریکارڈ پر کسی کا کوئی جرم نہیں اور یہ لڑکا، اس کا نام جسپال سنگھ ہے۔ اگرچہ یہ کینیڈا سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہاں اوگی پنڈ تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں رہتا ہے۔ پولیس اور سی بی آئی کے مطابق جب سے یہاں آیا ہے اس کی سرگرمیاں مشکوک ہیں، ایک معاہدہ بھی آن ریکارڈ ہے۔ جن کے ساتھ معاہدہ ہوا، وہ لوگ قتل ہو گئے۔ اس کے علاوہ اور بہت کچھ ہوا ہے سب فائل میں ہے، جو آپ کے سامنے پڑی ہے۔"

"سر ایک دوسری بری خبر یہ ہے کہ جس آفیسر کو اس پروفیسر کو راستے سے ہٹانے کا ٹاسک دیا گیا تھا، وہ ابھی کچھ دیر پہلے گھر سے نکلتے ہوئے دہشت گردوں کے ہاتھوں اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس کی پوری تفصیل آ گئی ہے ہمارے پاس۔"

"اوہ!" یہ کہہ کر چند لمحوں کی خاموشی رہی پھر اس رعب دار آواز والے نے کہا۔

"اسے بھی پکڑو اور پوری طرح دیکھو، یہ سب مختلف جگہوں کے لوگ ایک جگہ کیسے؟ اور ان کا ہدف زمین ہاؤس ہی کیوں؟ پاکستان سے ان کا تعلق کیا ہے۔ یہ سب مجھے آج رات سے پہلے چاہئے۔ ہری اپ"۔ اس کے ساتھ ہی وہ فلم ختم ہو گئی۔

"تمہیں یہ کیسے ملی، مطلب فلم؟" سندو نے تیزی سے پوچھا تو بانیتا نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"اچھا چور وہ ہوتا ہے جو نکلنے کا راستہ پہلے بنا کر رکھے۔ اگر ہم اپنے چور راستے ان فورسز میں بنا کر نہ رکھیں تو کب کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے گل سڑ گئے ہوتے۔ یہ ہائی پروفائل میٹنگ تھی دلی میں۔ جو اب سے پانچ گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔ اطلاع مجھے پہلے ملی اور یہ فلم بعد میں۔ اب بتاؤ، میں، رونیت اور تم کیا کریں؟"

"کچھ بھی نہیں، بس چند دن زیر زمین رہو، دھول بیٹھ جائے تو باہر نکل آئیں۔" سندو نے سکون سے کہا۔

"کوئی دوسرا ہوتو مجھے تمہاری اس احمقانہ بات پر اتنا افسوس نہ ہوتا، بے وقوف بھارت سرکار اس بے غیرت یہودی کے بارے میں کس قدر پریشان ہے تم نے اس کا اندازہ نہیں کیا۔ کس طرح انہوں نے چھان بین کی ہے اور وہ جان گئے ہیں کہ یہ سب کن لوگوں نے کیا ہے؟"

"اس وقت میں تمہاری ذہنی حالت کے بارے میں جانتا ہوں بانیتا، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" سندو نے کافی حد تک خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس اس کا ایک حل ہے۔" جسپال نے سکون سے کہا۔

"وہ کیا؟" بانیتا کور نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ میں خود کو پولیس یا جو فورس بھی مجھے پکڑنا چاہے، اس کے حوالے کردوں، تشدد ہوگا جو بھی ہو، میں یہ ثابت کردوں گا کہ میں وہاں گوا میں نہیں تھا۔" جسپال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم کسی یورپ کی فلم والی فورسز کے پاس نہیں جا رہے ہو، جو تمہیں مہمان بنا کر رکھے گی۔ تیرا ریشہ ریشہ الگ کرکے تجھے مار دیں گے اور تمہاری لاش کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔" رونیت نے غصے میں کہا۔

"تو پھر کیا کریں؟" جسپال نے پوچھا۔

"وہی جو میں نے کہا ہے۔ آج رات یہاں سکون سے رہو، کھاتے پیتے ہیں، انجوائے کرتے ہیں۔ اس دوران سوچ لیں گے۔" سندو نے کہا تو بانیتا کور ایک دم سے مسکرا دی۔ پھر بولی۔

"ہاں یار، ٹینشن سے مسئلہ حل تو نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے مینیجر کو بلایا اسے کافی کچھ ہدایات دے دیں۔ وہ سب اٹھے اور مختلف کمروں میں جا کر سو گئے۔ اندھیرا پھیل چکا تھا، جب انہیں جگایا گیا۔

ڈنر بہت خوشگوار ماحول میں لیا گیا۔ اس کے بعد بانیتا کور نے تینوں کو بتایا۔

"دلی کی اپ ڈیٹ یہ ہے کہ انہیں نہ تو بانیتا کور ملی ہے امرتسر میں، وہ ممبئی ہی سے واپس نہیں آئی۔ نہ ہی رونیت چندی گڑھ میں ملی، آخری بار اسے پروفیسر کے اتم سنسکار پر دیکھا گیا تھا۔ اب ان کا کوئی بندہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ جسپال آخری مرتبہ اوگی اور جالندھر کے درمیان دیکھا گیا ہے کسی لڑکی کے ساتھ۔ وہ چشم دید اوگی گاؤں ہی کا آدمی ہے۔ لہذا اب سارا زور جالندھر میں جسپال کو تلاش کرنے میں لگایا جائے گا اور وہ سب اس مقصد کے لیے نکل پڑے ہیں۔"

"ایک منٹ ایک منٹ....." رونیت نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یار جسپال، تیرا سیل فون نمبر انہوں نے لیا، اب تک اس کی مدد سے وہ یہاں تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے تمہیں کال کی ہے۔ یہ کیا بات ہے؟"

"انوجیت نے جو سیل نمبر دیا ہے، وہ نکودر کے ایک ڈیرے پر پڑا ہے۔ اسے کوئی نہیں سنتا۔ یہ اگر وہاں پہنچے تو سوائے سیل فون کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ انوجیت پاگل نہیں ہے۔"

"واؤ، کچھ سوچا؟" بانیتا کور نے پوچھا۔

"یہی کہ آج رات اس بندے کو ختم کرنا ہے، جس نے میری دبی ہوئی نیم مردہ فائل میں دوبارہ جان ڈالی ہے اور وہ ہے مان سنگھ۔ ابھی کچھ دیر پہلے انوجیت نے مجھے بتایا کہ میری خبر دینے والا وہی ہے۔"

"چل یار کئی دن ہوگئے، کچھ کیا نہیں۔" سندو نے انگڑائی لے کر کہا تو بانیتا کور ہنس دی۔

"مزہ آگیا یار، مجھے ایسے ہی حوصلے والے بندے چاہئیے تھے۔ چل یہ جسپال کا اک چھوٹا سا کام کریں، پھر تم لوگوں کو ایک بڑے کام پر لگاتی ہوں۔"

"وہ کیا؟" رونیت نے پوچھا۔

"وہ آ کر بتاتی ہوں، پہلے یہ بیگار بھگت لیں۔" یہ

کہتے ہوئے وہ زوردار انداز میں ہنس دی۔

تقریباً رات کے دس بجے کا وقت ہوگا جب وہ فارم ہاؤس سے نکلے۔ جسپال نے انوجیت سے کہہ کر بندے لگا دیئے تھے۔ بہت محتاط ہو کر وہ وہاں پہنچے تو ایک گھنٹہ گذر چکا تھا۔ مان سنگھ نے اپنی حویلی اوگی پنڈ کے باہر اپنی زمینوں میں بنائی ہوئی تھی۔ حویلی سے کافی دور انہوں نے اپنی فورڈ ہیل جیپ روک دی۔ وہ چاروں ہی تھے۔ جسپال کا رابطہ وہاں کے ایک لڑکے سے تھا، جو ساری خبر دے رہا تھا۔ اس وقت وہاں پر صبح ہونے والی گردوارہ سیوا ریلی روکنے کی بات ہو رہی تھی۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے روکا جائے۔ سیکورٹی والے تھوڑے بندے تھے جن کی پوزیشن کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہو پایا تھا۔ اس نے اچھی طرح پوچھا تھا کہ چھت پر سیکورٹی گارڈ ہوتے ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب اسے یہی ملا تھا کہ ہوتے ہیں مگر اس وقت نہیں ہیں، وہ رات دیر سے چھت پر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ پکا معلوم ہو گیا تھا کہ وہاں چوکی کا تھانیدار، وہی سی بی آئی کے دو بندے اور اُوگی کے وہ لوگ تھے، جو اب بھی رویندر سنگھ کے وفادار تھے اور اب مان سنگھ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رَبّ نے اسے بہت بڑا موقعہ دے دیا ہے۔

وہ چاروں جیسے ہی حویلی کے گیٹ پر گئے، وہاں سیکورٹی پر لگے ہوئے دو بندوں نے انہیں آگے جانے سے روکا۔ سندو نے بنا کوئی لفظ کہے فائر کر دیا۔ پسٹل پر سائیلنسر لگا ہوا تھا، ٹھک کی آواز آئی اور سیکورٹی گارڈ گرتا چلا گیا، سندو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کہ اس کی چیخ نہ نکلے۔ اس سے پہلے کہ دوسرے کو سمجھ آتی، جسپال نے ایسا ہی کیا۔ اس کے سینے میں بھی فائر دے مارا، اس کے گلے سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ ان دونوں کو ایک طرف لگا کر وہ آگے بڑھے، تب تک رونیت اور بانیتا آگے جا چکی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ مان سنگھ بہت سارے لوگوں کے درمیان سائیڈ والے لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں آگے بڑھیں اور ذرا فاصلے سے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو تاکنے لگیں۔ انہیں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان میں سے مان سنگھ کون ہے، لیکن انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ سی بی آئی والے کون ہو سکتے ہیں یا ان میں پولیس والا کون ہے۔ اس لان میں سی بی آئی والے دور ہی سے پہچانے جا رہے تھے۔ ان تینوں نے سفید سفاری سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ رونیت نے اپنی طرف سے پولیس والے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اسی لمحے جسپال وہیں آ پہنچا، اب اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے مان سنگھ کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ دو چار لمحوں کی دیری سے ان دونوں کی چیخ بلند ہوئی۔ تبھی ان چاروں نے پھیل کر فائرنگ شروع کر دی۔ سامنے بھگدڑ مچ چکی تھی لیکن جو بھی ان کی رینج میں آتا، گولی اس کے لگ جاتی۔ دو منٹ کے دورانیے میں سامنے لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ دور کہیں سیکورٹی والے بے آواز فائرنگ سے نہیں بلکہ چیخ و پکار پر متوجہ ہوئے تھے۔ تبھی بانیتا کور نے کہا۔

''نکلو'' یہ کہہ کر وہ پیچھے پلٹنے لگی۔ رونیت اس کے کور پر تھی۔ اسی لمحے جسپال لان کی جانب بڑھ گیا۔ وہ تیزی سے ان سفاری سوٹ والوں کے پاس گیا، ان کی جیبیں ٹٹولیں، ان میں سیل فون ملے، وہ لے کر فوراً ہی پلٹ پڑا۔ سندو اس کے کور پر تھا۔ اسی طرح سندو اور جسپال پیچھے ہٹے۔ ان کی راہ میں کوئی نہیں آیا۔ شاید اتنی لاشیں دیکھ کر ان کا حوصلہ نہیں پڑا تھا۔ وہ پوری قوت سے بھاگتے ہوئے وہاں تک آئے جہاں ان کی فورڈ ہیل کھڑی تھی۔ جسپال نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اگلے چند منٹوں میں وہ جالندھر جانے والی سڑک پر تھے۔

وہ شہر کے قریب پہنچنے والے تھے۔ تبھی سی بی آئی

والوں کا ایک سیل بج اٹھا۔ سندو نے کال رسیو کی تو دوسری طرف سے کسی نے انگریزی میں تیزی سے پوچھا۔

"ہیلو، نریش، کیسے ہو تم اور یہ خبر کیا ہے کہ......"

"کون بات کر رہا ہے۔" سندو نے کسی فلم کے ولن کے انداز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

"تیرا باپ بات کرت ہوں، بھڑ دی کے۔ جسے تو نے پھون لگایا ہے، اس کا بڑے افسر سے بات کرا۔"

"کیا مطلب۔!" دوسری طرف سے حیرانگی میں پوچھا گیا

"اے بھڑ دی کے، تجھے سمجھ ناہی آدت ہے، بولا کسی افسر سے بات کرا۔" اس نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ اور آواز بدل کے بات کی تھی

"میں ہی اس کا آفیسر بات کر رہا ہوں۔"

"تو پھر سن، تیرا وہ ملازم ترنت دنیا چھوڑ گیا ہے، میں نے اس کے سینے ما گولی اتاری۔ کدھر بھلا بولو۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو، کون ہو تم؟"

"اماں بتایا تو ہے تیرا باپ۔ بولو کہاں گولی لگی؟"

"تو نے اسے مار دیا ہے لیکن اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" دوسری طرف سے کہا گیا تو فون جسپال نے لیتے ہوئے کہا۔

"دیکھ، تو کوئی بھی ہے، تجھے ہماری لوکیشن کا پتہ تو چل ہی جائے گا۔ لیکن جس کے لیے یہ لوگ اس گاؤں میں آئے تھے، اسے پکڑنے کے لیے پرائم منسٹر یا کم از کم چیف منسٹر سے پوچھا ہوتا۔ وہ تو اب پتہ نہیں کہاں ہے، لیکن اس کا پیغام اپنے سارے لوگوں کو دے دو۔ جس نے بھی اس بندے کو یا اس سے متعلق کسی بندے کو بھی پکڑنے یا ہاتھ بھی لگانے بلکہ برا سوچنے کی بھی کوشش کی ، وہ سمجھو اپنی موت پر مہر لگا رہا ہے۔" یہ کہہ کر دوسری طرف سے کچھ بھی سنے بغیر اس نے فون بند کیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

"پیغام تو دے دیا، اب یہ دوسرا بھی پھینک دوں۔" سندو نے پوچھا۔

"نہیں اس پر ابھی بھی کال آئے گی۔ یہی کہنا، بلکہ رونیت تم کہنا۔" وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس فون پر بھی کال آ گئی۔ رونیت نے ایسا ہی پیغام دیا اور فون باہر پھینک دیا۔ انہوں نے طویل سانس لی اور پوری توجہ سڑک پر لگا دی۔

واپس فارم ہاؤس تک آتے ہوئے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ فور وہیل گیراج میں لگوانے کے بعد ہی بانیتا کور سکون سے اندر چلی گئی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان سب کے سامنے یہی سوال ہوگا کہ اب کیا کرنا ہے؟

☆......☆......☆

وہ ایک روشن صبح تھی۔ لاہور پر سورج چمک رہا تھا جب میں اور نوتن کور ہوٹل کے باہر پورچ میں کھڑی کار تک آ گئے۔ وہیں سے واہگہ کے لیے نکلنا تھا۔ کار میں بیٹھتے ہی نوتن نے کہا۔

"جس طرح کوئی سکھ امرتسر آئے اور وہ دربار صاحب نہ ہو کر جائے، اسی طرح جو لاہور آئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مڑھی نہ جائے تو عجیب سا لگتا ہے۔"

"تم وہاں جانا چاہتی ہو، تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ پھر پتہ نہیں لاہور دوبارہ آ بھی سکوں یا نہیں۔" اس نے کہا تو ڈرائیور نے کار دائیں طرف کی بجائے بائیں جانب موڑ لی۔ وہ صبح کا وقت تھا، جب ہم مال روڈ سے جا رہے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم مینار پاکستان کے سامنے جا رکے۔ میں بھی پہلی بار وہاں گیا تھا۔ ہم روڈ پر ہی تھے۔ رنجیت سنگھ کی مڑھی کی جانب مڑتے ہی آگے کوئی رکاوٹ تھی۔ ڈرائیور کو کار روکنا پڑی۔ میں وہیں اُتر گیا تو نوتن کور نے کار میں سے باہر جھانک کر حیرت سے پوچھا۔

''کیا ہوا، یوں کار کیوں.....''

میں نے پوری شان سے کھڑے مینار پاکستان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم چلو، میں آتا ہوں۔''

وہ آگے بڑھ گئے اور میں مینار پاکستان کو دیکھنے لگا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ اس وقت میرے دل میں کیسے جذبات تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں پاکستان کا نام لیے بغیر اس کی قرارداد منظور ہوئی تھی۔ میں نے چشم تصور سے اس مجمع کا ادراک کرنا چاہا تو ایک دم سے سارے منظر ہٹ گئے۔ حال میرے سامنے نہیں رہا، بلکہ وہ پارک لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہی ۱۹۴۰ء کا منظر میرے سامنے تھا۔ ملی جذبے سے لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ دور اسٹیج پر قائداعظم محمد علی جناحؒ تقریر کر رہے تھے۔ ان کی آواز پنڈال میں گونج رہی تھی۔ ایک روشنی اور نور کا ہالہ ان کے ارد گرد تھا۔ میرے دل میں آیا کہ یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے۔ وہ روشنی کا ہالہ پورے مجمعے کے لوگوں پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس روشنی کے منبع کو دیکھنا چاہا تو وہ میری پشت پر سے آ رہا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ روشنی کا ہالہ بادشاہی مسجد کے سامنے ایک مزار میں کہیں گم ہو رہا تھا۔ درمیان کی ساری رکاوٹیں ختم تھیں۔ وہ روشنی اسی مزار سے پھوٹ رہی تھی۔ قائداعظم کی تقریر جاری تھی کہ ماضی کا وہ منظر تحلیل ہو گیا اور حال کے سارے منظر جاگ اٹھے۔ میرا تجسس بیدار ہو گیا۔ میں پلٹا اور بادشاہی مسجد کی جانب چل پڑا۔ وہاں سڑک پر سے وہ منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راستے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مڑھی کے سامنے نوتن کور اور ڈرائیور میرے انتظار میں تھے۔

''تم لوگ اندر جاؤ، میں تمہیں یہیں ملوں گا۔''

پتہ نہیں میرے لہجے میں کچھ تھا یا کیا تھا کہ نوتن اور نوجوان ڈرائیور نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں ان کی کوئی بات سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مجھے وہ مزار دکھائی دینے لگا۔ میں اس جانب بڑھتا چلا گیا۔ وہ مزار شاعر مشرق حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا تھا۔ جنہیں میں قلندر لاہوری کہتا ہوں۔ میں اس مزار کے اندر چلا گیا۔ میں نے پیروں کی جانب کھڑے ہو کر پورے جذب سے فاتحہ پڑھی اور واپسی کے لیے دروازے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ ایک آواز گونجی

''ٹھہرو۔''

میرے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، میرے سامنے حضرت اقبالؒ خود کھڑے میری طرف بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ ایک لمحہ کے لیے میرے بدن میں سنسنی پھیلی تاہم مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ میں ایسے منظر دیکھ چکا تھا۔ میں باادب کھڑا ہو گیا۔ تبھی ان کی آواز گونجی

''تم آئے نہیں لائے گئے ہو۔ تاکہ تمہیں تمہاری امانت سونپ دی جائے۔''

''حضرت کیسی امانت؟'' میں نے حتی الامکان اپنے لہجے کو بھی باادب رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے اندر کا راز ہی تمہاری امانت ہے۔ یہی حقیقت ہے۔ میں تمہیں تم پر ہی آشکار کر رہا ہوں۔ تمہارا ہونا ہی سب سے بڑا راز ہے۔ تم اپنا راز خود آپ ہی ہو۔''

''میرا ہونا، میں خود راز ہوں، میں سمجھا نہیں؟'' میں نے ادب سے کہا تو وہ بولے۔

''دیکھو، یہ جو تم میرے سامنے ہو، یہ تم ہی ہو یا کوئی دوسرا کھڑا ہوا ہے؟ تم ہو یا تم نہیں ہو؟ دیکھ کون رہا ہے؟''

''جی میں ہی ہوں۔ میں ہی کھڑا ہوں۔ آپ کی بات سن رہا ہوں، آپ کو دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تیرا خود میرے سامنے ہونا، ایک دوسری زندگی کی دلالت کرتا ہے۔ لیکن اس زمین پر انسان کا ہونا خود اس کی دلیل ہے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔'' میں بے چارگی سے کہا۔

''کوئی بھی فیصلہ کہاں ہوتا ہے؟ آرزو کہاں پیدا ہوتی ہے، انسان ہی کے اندر نا۔ اس کے خود کے اندر۔ تو سب سے پہلے ''خود'' ہے۔ اپنے خود کے ہونے کا ادراک ہی تو میں چاہتا ہوں۔ سنو، منکر خدا نزد مُلّا کافر است..... منکر خود نزدِ من کافر تر است۔ اپنے خود ہونے کا احساس ہی انسان کو خودی کی طرف لے کر جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی تکمیل کو دیکھ پاتا ہے۔'' انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''خودی، یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے خود کا اقرار کر، اپنے آپ کو دیکھ، خود سے خودی تک کا سفر دراصل حقیقت کی طرف بڑھنے کا عمل ہے۔'' خود'' ہوگا تو خودی آئے گی۔ خودی کو سمجھنے کے لیے پہلے خود کو سمجھنا ہوگا۔ تیرا اپنا ہونا، تجھے خدا نے اپنا ہونا دیا ہے، تُو اپنے ہونے کا اعتراف کر، اس شہکار کا منکر نہ بن۔ خود سے خودی کے درمیان جو بڑے بڑے بُت پڑے ہوئے ہیں جو تم نے خود ہی گھڑے ہوئے ہیں۔ انسان کا اصل مقصد ہے کہ وہ خود کو پہچانے۔ اپنے خود کی پہچان ہی دراصل باطل قوتوں کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہ باطل ہی ہے جس نے انسان کے گرد ایسے حجاب پیدا کر دیئے ہوئے ہیں کہ انسان اندھا ہو چکا ہے اور جو ان پردوں کو اٹھا دیتا ہے، حقیقت اس پر کھل جاتی ہے۔ آج دنیا کا ہر انسان نظریاتی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔'' انہوں نے انتہائی جذب سے کہا۔

''یہ سفر کیسے طے ہو سکتا ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا تو وہ بولے

''خود، اسے خود کھڑا ہونا ہوگا۔ پھر کہیں جا کر اسے خودی کے ثمرات مل سکتے ہیں۔ خود سے خودی تک کے درمیان راستہ، منازل، اسرار و رموز طے کرانے والی ایک ہی قوت ہے اور وہ ہے عشق۔ کیونکہ جوہر زندگی ہے عشق...... جوہر عشق ہے خودی۔''

''میں کیسے خودی تک پہنچ سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم پر راز آشکار ہو جائیں گے۔ تمہارا جو مسئلہ بھی ہوگا سوچتے جانا، حل تجھے ملتے چلے جائیں گے۔ خودی کہیں اور سے نہیں تمہارے اندر ہی پڑی ہے۔ یہ امانت میں نے تم تک پہنچانی ہی تھی کہ عطا ہوا ہے خس و خاشاک ایشیاء مجھ کو..... کہ میرے شعلے میں ہے سرکشی و بے باکی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ میں آگے بڑھا اور ان کی بانہوں میں سما گیا۔ مجھ پر وہی کیفیت طاری ہونے لگی، جو روہی والے بابا جی سے ملنے سے ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد انہوں نے مجھے خود سے جدا کر دیا۔ پھر وہ میرے سامنے نہیں تھے، مگر میں اپنے وجود میں بہت زیادہ لطافت محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں بہت ہلکا ہو گیا ہوں۔ میں مزار سے باہر نکل آیا۔ روشن دن میں میرے اندر کیا کیا تبدیلی آگئی تھی، یہ میں ہی جانتا تھا۔

میں پیدل ہی تیز قدموں سے شاہی قلعے کی جانب چل پڑا۔ وہ دونوں باہر سڑک پر کھڑے پریشانی میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی انہیں سکون ہو گیا۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم کار میں بیٹھے تو کار چل دی۔ اس کا رُخ واہگہ کی طرف تھا۔

کافی دیر خاموش رہنے کے بعد نوتن کور نے مجھے بتایا کہ وہ امرتسر اس لیے جا رہی تھی کہ بانیتا کور ادھر ہے لیکن اب وہاں کے حالات بدل گئے ہیں۔ وہ اب وہاں پر نہیں ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے یہی بتایا کہ ''را'' اس کے پیچھے لگ گئی ہے اور وہ کل سے غائب ہے۔ اب جا کر پتہ کرتی ہوں کہ تفصیل کیا ہے۔

ہم واہگہ پہنچ گئے۔ پاکستانی پرچم کے ساتھ ترنگا بھی لہرا رہا تھا۔ یہ محض دو پرچم نہیں دو نظریات لہرا رہے تھے۔

یہ انسانی سوچ ہی ہے جس نے درمیان میں گیٹ ،تاریں اور راہداریاں بنائیں ہوئی تھیں۔ انسانی سوچ کا عمل میں اظہار ہی حقیقت ہے۔ وہ اس طرف کے تمام مراحل سے گزر کر گیٹ تک آن پہنچی۔ اس نے اپنے گلاسسز اتارے۔ مجھے دیکھا اور ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ واپس آ گیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے سوہنی کے گھر چھوڑ دے۔ وہاں موجود ملازمین میں نے رکھے ہوئے تھے۔ان میں سردار احمد عرف دارا میرا باعتماد ساتھی تھا، جو بچپن ہی سے میرا وفادار تھا۔قسمت نے اسے لڑکپن ہی میں نور نگر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ لاہور کے مختلف ہوٹلوں میں ویٹر رہا، پھر کئی کام کرتے کرتے وہ اب ہیرا بن گیا تھا۔ میں نے وہ گھر اس کے سپرد کر دیا تھا۔ لاہور میں میرے لیے بہترین پناہ گاہ تھی۔

☆......☆......☆

سندو، بانیتا، جسپال اور رونیت چاروں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ موجودہ حالات کے بارے میں ایک ایک بات کر چکے تھے۔تبھی سندو نے پوچھا۔

''یہ تو طے ہے کہ اب بھی ہماری جان کے درپے ہیں، اب یہ ہم پر ہے کہ سسک سسک کر مریں یا ایک دم مر جائیں۔''

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے سندو، ایک دم سے حوصلہ چھوڑ گئے ہو۔یار اگر ہم مریں گے بھی تو کم از کم بہت سوں کو لے کر مریں گے۔'' جسپال نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سنو،میری بات سنو۔'' بانیتا کور نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں متوجہ کرتے ہوئے کہا، پھر لمحہ بھر رُک کر بولی۔

''مجھے یہ پوری طرح احساس ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ رات ہی سے میرے دماغ میں یہی سوال تھا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہ جان لو کہ ہم نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہیں ڈالا بلکہ ہم سانپوں کی بستی میں ہیں۔ کوئی بھی اور کہیں سے بھی سانپ ڈنگ مار سکتا ہے۔کون کتنا زہر رکھتا ہے، ہمیں نہیں معلوم کیونکہ......''

''شاعری مت کر۔ سیدھی لائیں پر آ۔'' رونیت نے چڑتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔ تو سنو، یہ پنجاب ہے، یہاں خالصہ کا جتنا زور ہے، وہاں اتنی ہی منافقت ہے۔ ابھی ہمیں طاقت کی ضرورت ہے۔ایک مرکز پر اکٹھا ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ساتھ بہت سارے لوگ ہیں۔ ہمیں طاقت حاصل کرنا ہے اس وقت ہمیں وہ جگہ چاہئے کہاں ہمیں کچھ وقت کے لیے سکون اور طاقت مل سکے۔ میرے خیال میں وہ جگہ ممبئی سے بہتر کوئی نہیں ہے۔'' بانیتا کور نے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

''یار وہ جگہ تو......'' رونیت نے کہنا چاہا تو جسپال بولا۔

''بانیتا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بندہ بھیڑ ہی میں گم ہوتا ہے۔''

''ممبئی ہی کیوں؟'' رونیت کور اپنی جگہ اٹک گئی۔

''وہ اس لیے کہ سندو ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ یہ جزیرے سے جمال کے ساتھ بھاگا، اس کے ساتھ گم ہوا، تو تب سے گم ہے۔ان کے خیال میں یہ انہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ممبئی پہنچنے کے بعد یہ ان سے بچھڑ گیا تھا۔ یہ اپنا بزنس وہاں سیٹ کرے۔ جیسا کہ چنڈی گڑھ میں کرتا تھا۔ اور جو، اب یہ چنڈی گڑھ میں نہیں کر سکتا۔ یہ تم لوگ جانتے ہو۔ وہ لوگ جو سامنے نہیں ہیں، سندو کے ساتھ وہاں جڑ جائیں گے۔ یہ دنوں اور ہفتوں میں اپنے آپ کو مضبوط کرے گا۔ ہم باقی تینوں بچتے ہیں، ہم چھپ سکتے ہیں اور آزاد حالت میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔''

''ڈن ہو گیا۔'' رونیت کور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اب سب سے بڑا مسئلہ یہاں سے نکلنا ہوگا۔

اپنے سارے لوگوں سے کہو وہ ایک ایک کر کے یہاں سے نکل پڑیں اور ممبئی پہنچیں۔ سندو تم نکلو اور ان سے پہلے ممبئی پہنچو۔ تمہیں وہاں ایک ڈاکٹر سے ملنا ہے۔ تم وہاں اس وقت سے ایڈمٹ ہو، جب تم جزیرے سے ممبئی آئے۔ تمہیں وہاں ایک ہمدرد انسان چھوڑ گیا تھا تم ایک سڑک پر زندگی اور موت کی کشمکش میں اسے ملے تھے اور وہی تمہارا علاج کروا رہا ہے۔ وہاں ساری کاغذی کارروائی ہو چکی ہے۔ وہاں تمہیں اسپتال ہی میں رہنا ہے۔ وہ ہمدرد انسان تمہیں بزنس کروائے گا۔"

"بانیتا! تمہارے ہاتھ دکھانا۔" جسپال نے شوخی سے کہا تو اس نے حیرت سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کیوں؟"

"دیکھوں تو سہی تمہارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔"

اس پر سبھی زیر لب مسکرا دیئے۔ ماحول میں جو تناؤ تھا وہ ایک دم سے ختم ہو گیا۔ بانیتا کور کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہوا، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو پھر سر جھٹک کر بولی۔

"سندو، تم نکلو، ہماری ملاقات اب ممبئی ہی میں ہو گی۔" یہ کہہ کر اس نے ڈاکٹر اور اس کے اسپتال کا نام بتایا۔ سندو اٹھا اور اندر کی طرف چل دیا تو وہ بولی۔

"رونیت! اب ہمیں بھی نکلنا ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ تینوں ایک سیاہ کار میں سب فارم ہاؤس سے نکلتے چلے گئے۔ ان کے حلیے کافی حد تک بدلے ہوئے تھے۔ تینوں نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پہلی نگاہ میں انہیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔

انہوں نے جالندھر سے لدھیانہ تک کا سفر بہت احتیاط سے کیا۔ بڑی شاہراہ سے ہٹ کر چھوٹی سڑکوں سے نکل کر ہی لدھیانہ اسٹیشن پہنچے تھے۔ ایک طویل سفر ان کے سامنے تھا، انہوں نے اپنی کار وہیں چھوڑی اور ممبئی جانے کے لیے اسٹیشن پر آ گئے۔ وہیں سے انہوں نے ٹرین پکڑی، جسپال کے سامنے وہ دونوں بیٹھیں ہوئی تھیں۔ وہ تینوں ہی اونگھ رہے تھے۔ وہ بڑی حد تک خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

ڈرائیور نے مجھے سوہنی کے گھر کے سامنے اتارا تو مجھے اتار کر اس نے ڈگی کھولی۔ اس میں سے ایک چھوٹا سوٹ کیس نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کے لیے ہے، اس میں کچھ سامان ہے۔"

میں نے وہ سوٹ کیس لیا اور اسے جانے کے لیے کہہ دیا۔

وہ چلا گیا تو میں نے بیل دی۔ گیٹ کے ساتھ والا چھوٹا دروازہ کھلا تو میرے سامنے چھاکا تھا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر ایک دم سے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ رُو رہا ہے۔ میں نے جلدی سے اُسے الگ کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"چھاکے خیر تو ہے نا؟"

"خیر ہی یار، بس تیرے آنے کی خوشی میں یہ آنسو ہیں۔ تو ملتا ہے تب آنسو، بچھڑتا ہے تب بھی آنسو، یار وہ ہمارے خوشی بھرے عام سے دن لوٹ کر واپس کیوں نہیں آ جاتے۔" اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو میں نے سکون کا ایک لمبا سانس لیا اور کہا۔

"جن لوگوں کے لیے کوئی اعلیٰ مقصد چن لیا جاتا ہے نا، سکون ان کے لیے موت بن جاتی ہے۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تو نہیں سمجھے گا، چل اندر چلیں، اماں آئی ہیں؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، انہیں میں ہی لے کر آیا ہوں لیکن سوہنی نہیں آئی۔ اس نے کہا تھا کہ میں خود بات کر لوں گی۔" چھاکے نے کہا اور میرے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔

ڈرائنگ روم میں اماں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

انہوں نے سفید براق لباس پہنا ہوا تھا اور ہاتھ میں سیاہ تسبیح تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھیں اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ نجانے کتنی دیر تک میں ممتا کو محسوس کرتا رہا۔ اماں نے مجھے خود سے الگ کیا اور میرا ماتھا چومنے کے بعد بولیں۔

"میرے ربّ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تیری صورت دکھائی۔ آ بیٹھ میرے پاس۔" وہ صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔ چھاکا اندر کی طرف چلا گیا اور میں نے اپنا سر اماں کی گود میں رکھتے ہوئے قالین پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

"کیسا ہے تو؟"

"اماں! وہ بچے کیسے ہوتے ہیں جو اپنی ماں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ ماں سے بچھڑنا فطرت کی منشاء تو ہے لیکن بچھڑنے کے بعد وہ کہاں جاتا ہے؟ مجھے لگتا ہے میں ٹھیک مقام تک جا پہنچا ہوں۔" میں نے سکون سے کہا۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ چند دن پہلے میں نے ایک خواب دیکھا تھا میرے بچے۔ میں نے دیکھا تو ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے، تیرے اردگرد سبزہ ہی سبزہ ہے۔ لیکن تیرے سامنے جو وادی ہے، اس پر چیلیں، کوئے اور نجانے کون کون سی فضائی مخلوق موجود ہے، اور زمینی جانور کتے، بھیڑیئے، چیتے، شیر نجانے کون کون سے درندے اس وادی پر حملہ آور ہیں۔ سب کی رالیں ٹپک رہی ہیں اور تجھے حکم ملتا ہے کہ تو ان سب کو بھگائے۔ تو کبھی آگے دیکھتا ہے اور کبھی پیچھے اور ابھی تذبذب میں کھڑا ہے۔ پھر مجھے ملتا ہے کہ میں تمہیں اجازت دوں۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئیں، پھر بولیں۔

"میں تب سے دعا مانگ رہی تھی کہ تو میرے پاس آ جائے اور تو آ گیا۔"

"اماں تیرا خواب سچا ہے۔" میں نے اماں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سن، میری طرف سے تمہیں ہر طرح کی اجازت ہے۔ اب میری گود سے نکل اور اپنے سچے مقصد کی جانب بڑھ۔ اپنے وطن کی سرحدوں پر ڈٹ جانے والے بھی تو ماؤں کے بیٹے ہوتے ہیں۔ مائیں اپنے بیٹے وطن پر قربان نہ کریں تو یہ وطن بھی نہ رہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اللہ پاک ان ماؤں کو چنتا ہے، جن کے بیٹے اس عظیم مقصد کے لیے چنے جاتے ہیں۔ وہ تو وردی میں ہوتے ہیں اور بغیر وردی میں خاموشی سے شہادت پا کر امر ہو جا۔ ربّ کی مرضی کیا ہے اسے ہی قبول کر۔" اماں نے انتہائی خوشگوار لہجے میں کہا تو میں نے اماں کے چہرے پر دیکھا، وہاں سکون تھا۔ اماں نے میرا سر اپنی گود سے اٹھایا اور بولیں۔

"چل اب کچھ کھا پی لے۔"

"اماں! سوہنی کیوں نہیں آئی؟" میں نے دھیمے سے پوچھا تو وہ بولیں۔

"میں تو تھی ان پڑھ، جیسے سمجھ میں آیا زندگی گذارتی رہی، انتقام کی آگ میں سلگتی رہی، وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ سمجھو، وہ اگر چراغ کی طرح خود جل رہی ہے نا تو اس نے کئی دوسرے چراغ بھی روشن کر دیئے ہیں۔" اماں نے کہا تو میں سمجھ گیا۔ وجود اور روح کے درمیان جان موجود ہوتی ہے، تبھی زندگی چلتی ہے۔ اب روح کون ہے یا وجود کون، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں اٹھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

سہ پہر تک باتیں چلتی رہیں۔ نورنگر کے بارے میں ہر ایک کے بارے میں تائی، سارا اور اس کے بیٹے کے بارے میں۔ وہاں کی سکیورٹی کے بارے میں چھاکے نے بتایا تو میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا۔ سہ پہر کے بعد اماں نورنگر جانے کو تیار ہو گئیں تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اماں اتنی جلدی کیوں؟"

"بیٹا، وہاں میری زیادہ ضرورت ہے۔ میری ممتا سے زیادہ، تجھے پیغام دینا ضروری تھا۔ میں نے تجھے

رَبّ کے حوالے کیا ہے، اب وہی تیرا رکھوالا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے میرا ماتھا چوما اور جانے کے لیے بڑھ گئیں۔ میں پورچ تک ان کے ساتھ گیا۔ وہ کار میں بیٹھیں اور چل دیں۔ ایک بار تو میرا دل عجیب سا ہوا، پھر مجھے اطمینان سا آتا چلا گیا۔

میں واپس آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہی تھا کہ گیت کی کال آ گئی۔

''تم کدھر ہو؟''

''میں لاہور میں ہوں۔'' میں نے جواب دیا

''یہاں بات بہت آگے تک بڑھ گئی ہے۔ سیٹھ نیلا اور اس کے پس پردہ باس ایک طرف ہیں اور اس کے مخالفین ایک طرف کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

''مطلب وہی کچھ جو تم لوگ چاہ رہے تھے؟'' میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اس سے بھی آگے، تمام تر ڈیٹا حکومتی اداروں اور سیٹھ نیلا کے مخالفین کو دے دیا ہے۔ اب بس چھاپے ہی پڑنے ہیں لیکن اس سے ایک بہت ہی اہم بات سامنے آئی ہے۔'' اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے بتایا

''وہ کیا؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''سیٹھ نیلا کا جو پس پردہ باس ہے، وہ اس وقت دوبئی میں ہے۔ اس کا صرف یہی بزنس نہیں ہے۔ وہ اسلحہ اور منشیات کے دھندے میں بھی ملوث ہے۔ کراچی کے کچھ علاقے اس نے اپنی سلطنت بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن، جو بات ہمیں معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ چند غیر ملکی ایجنسیوں کے لوگ موجود ہیں، جنہیں یہ یہاں کے مقامی لوگوں کے ذریعے تحفظ دے رہا ہے۔'' اس نے بتایا

''ظاہر ہے وہ لوگ جرائم پیشہ لوگ ہوں گے۔ خیر، یہ بتاؤ یہ بات کہاں سے اور کیسے معلوم ہوئی؟'' میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

''فہیم کے جدید آلات بہت کارآمد ہیں۔ وہ اس باس کی اور مخالفین کی باتیں مسلسل سن رہا ہے۔ مخالفین نے یہ دھمکی دی ہے کہ اگر وہ باس کوئی نقصان کرے گا تو پھر اس کے لوگ بھی غیر ملکی ایجنٹوں کو اٹھا لیں گے۔''

''یہ معلوم ہوا کہ وہ ایجنٹ کون ہیں اور وہ کیا کارروائی کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی یہ پتہ نہیں چلا۔'' گیت نے بتایا

''تو پھر تم لوگوں نے کسی ایجنٹ کو اٹھایا ہے ابھی تک؟'' میں تیزی سے پوچھا۔

''تمہیں ہی بتانا تھا، ہمارا تو ارادہ ہے۔'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں دیکھو تو سہی وہ کون لوگ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ابھی فہیم اور مہوش لاہور پہنچ رہے ہیں۔ باقی باتیں وہ بتائیں گے۔'' اس نے کہا پھر الوداعی کلمات کے ساتھ فون بند کر دیا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ پہنچ گئے۔ انہیں وہی ڈرائیور چھوڑ کے گیا تھا جو مجھے یہاں لایا تھا۔ وہ آتے ہی ایک کمرے میں گھس گئے۔ بظاہر وہ ایک ایسے لڑکے کا کمرہ تھا جسے کمپیوٹر کا جنون ہوتا ہے۔ اس دوران فہیم نے مجھے سمجھا دیا کہ کراچی میں ہونے والی کارروائی میں ہم یہاں بیٹھ کر بھی آڈیو اور وڈیو آلات کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں۔ جب تک دارا چائے بنا کر لایا۔ انہوں نے اس کمرے کو کنٹرول روم کی صورت دے دی۔ ہم وہیں چائے پیتے ہوئے باقی لوگوں کے رابطے میں آ گئے۔ سامنے اسکرین پر زویا، گیت، سلمان، جنید اور اکبر علی دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی اکبر نے کہا۔

''صورت حال بڑی خطرناک ہو گئی ہے۔ سیٹھ نیلا کو اپنا کام ختم ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کی اپنے مخالفین کو دھمکیاں بڑھ گئی ہیں۔''

''یہ دھمکیاں ہی دیں گے یا کچھ کریں گے بھی؟''

میں نے پوچھا۔

"اصل میں ایک تیسری قوت بھی ان میں آ گئی ہے۔ جو دونوں کے معاملات حل کروانے کی کوشش میں ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ خود ہی ان میں جنگ کروا دیں اور وہ تیسری قوت ہم خود ہی ہیں۔" اکبر علی نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے؟"

"بس یہی کہ پہلا وار کس طرف کیا جائے۔ ایک طرف ایک ایجنٹ ہماری نگاہ میں آ گیا ہے تو دوسری طرف شاہ فیصل کالونی میں ایک اڈا، جہاں سے اسلحہ کی ڈلیوری ہو رہی ہے۔"

"ایجنٹ اٹھاؤ۔" میں نے کہا تو وہ اٹھتا ہوا بولا۔

"ڈن ہو گیا۔"

زویا، سلمان، جنید بھی اس کے ساتھ اٹھ گئے۔ گیت وہیں رہ گئی۔ زویا اور سلمان ایک کار میں ہو گئے اور اکبر کے ساتھ جنید بیٹھ گیا۔ وہ کاروں میں نکل پڑے۔ اسکرین پر چار منظر دکھائی دینے لگے۔ ان تینوں کے ساتھ ہم بھی وہیں تھے۔

سورج مغرب میں چھپ چکا تھا۔ شہر کی روشنیاں جل اٹھیں تھیں۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے گزری روڈ پر آ گئے۔ ان کا رخ ڈی ایچ اے سیون کی طرف تھا۔ کچھ دیر ہی میں وہاں پہنچ گئے۔ ایک کار اس کے گھر کے دائیں جانب، دوسری بائیں جانب کھڑی ہو گئی۔ تب گیت تیزی سے کمپیوٹر کے ساتھ منسلک سیل فون پر اسی ایجنٹ کے نمبر پر رابطہ کرنے لگی تھی، جسے اغوا کرنے کے لیے وہ جا رہے تھے۔ اس کمپیوٹر میں ایسا سوفٹ ویئر تھا، جس سے کال کرنے والا اپنا نمبر دینے کی بجائے کوئی بھی نمبر دے سکتا تھا۔ کال سننے والے کو اپنے سیل فون اسکرین پر وہی نمبر دکھائی دے گا، جو کال کرنے والا دینا چاہتا تھا۔ اس لیے یہی سمجھا جانا تھا کہ کال اسی سیل فون سے آ گئی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس پر اعتماد کر سکتا تھا۔

"میں دوبئی میں موجود باس والا نمبر دے کر کال کر رہی ہوں۔ غور سے سننا سب، بات کیا ہوتی ہے۔"

سب خاموش ہو گئے۔ بیل جانے لگی۔ چند لمحے بعد دوسری طرف سے ہیلو کہا گیا۔ گیت نے کسی تمہید کے بغیر انتہائی سنسنی خیز انداز سے انگریزی میں کہا۔

"سنو تمہاری جان کا خطرہ ہے۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً نکلو۔"

"مگر کہاں، مجھے کون مارنا چاہتا ہے اور تم کون ہو؟" دوسری طرف سے جواب آیا

"وقت ضائع کرنا ہے تو ٹھیک، مری بات سنی ہے تو سن لو۔" گیت کا لہجہ تحکمانہ تھا

"او کے۔"

"باہر نکلو، میں نے تمہاری سیکورٹی کے لیے کچھ بندے بھیجے ہیں۔ یہاں سے ایسے نکلنا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کیونکہ پتہ چلا ہے کہ تمہاری سیکورٹی سے کچھ بندے دشمن کے ساتھ ہیں۔ صرف ان تک پہنچ جاؤ، باقی وہ سنبھال لیں گے۔" گیت نے سمجھاتے ہوئے کہا لیکن اس کا لہجہ وہ حکم دینے والا ہی تھا۔

"کیا تم میری باس سے بات کروا سکتی ہو۔" اس نے بے اعتماد ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ بزی ہیں، انتظار کرو۔ اتنی دیر میں اگر تم مر گئے تو تمہارے اوپر والوں کو جواب دے دیا جائے گا۔" گیت نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ کال بیک کرے گا۔ فہیم نے اس کا نمبر ہیک کر لیا تھا۔ اس نے جیسے ہی کال ملائی، وہ سیدھے گیت کے سیل فون پر گئی۔

"بولو۔ اب کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آئی میری کوئی بات؟" وہ یوں ترش لہجے میں بولی جیسے ابھی کھا جائے گی۔

"نہیں نہیں، میرا مطلب تم نے یہ بتایا ہی نہیں کہ مجھے کن کے ساتھ جانا ہوگا۔"

''نہیں تمہیں اعتماد نہیں اس لیے تم اپنی مرضی کرو۔ اس تک کہ دشمن تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دیں کیونکہ وہ اس وقت تمہارے ارد گرد ہیں۔ صرف حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم کیسے ایجنٹ ہو، شہر میں ہونے والی اتنی بڑی واردات کے بارے میں نہیں جانتے ہو۔ ان کا اگلا قدم ہمارے دوست مارنا ہے۔ اس وقت ایمرجنسی ہے اور تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔ گٹ لاسٹ اور یہیں بیٹھ کر مرو۔''

''نہیں نہیں بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''او کے۔ کال سنتے ہوئے اسی طرح باہر نکلو۔ تم واک کے لیے نکلے ہو، یہی تاثر دینا۔ وہی دو گارڈ اپنے ساتھ لو جو روزانہ جاتے ہیں۔ کسی کو شک مت ہونے دینا۔ اپنا پسٹل لے کر نکلو، میں گائیڈ کرتی ہوں۔''

''او کے میں نکل رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سیکورٹی والوں کو آواز دی۔ انہیں ساتھ لیا اور باہر کی جانب چل دیئے۔ ''میں گیٹ سے باہر آ گیا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی اسکرین پر جنید اور سلمان نے اشارے سے سمجھا دیا کہ وہ باہر نکل آیا ہے۔ وہ زویا اور سلمان کی جانب چل پڑا تھا۔ جو دائیں جانب کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''او کے، سو قدم پر جا کر ان سے پیچھے ہو جاؤ، جیسے ہی یہ دونوں گارڈ ختم ہوں، تم سامنے کھڑی کار میں جا کر بیٹھ جاؤ، ہری اپ۔''

سو قدم ہوتے ہی یک بارگی دو فائر نکلے، اس کے ساتھ ہی دو چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ ایجنٹ سیدھا زویا اور سلمان والی کار میں پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ وہ اسکرین پر دکھائی دینے لگا تھا۔ مجھے وہ شکل ہی سے بھارتی لگا تھا۔ اس کا فون چل رہا تھا جو اس نے کان سے لگایا ہوا تھا۔

''ہری اپ جنٹل مین۔'' زویا بولی اور اس کے ساتھ ہی کار چل دی۔ ذرا دور جانے کے بعد گیت نے کہا۔

''دیکھو کہیں تعاقب تو نہیں ہو رہا؟''

''ایک سیاہ اکارڈ کار آ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''وونٹ وری، یہ ہمارے لوگ ہیں۔ یہ لوگ مجھے بتا دیں گے۔ وش یو گڈ لک۔'' جیسے ہی اس نے کہا فون بند ہو گیا۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر سلمان اور زویا کو دیکھا۔ کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر گھوم کر سیدھے واپس گھر آ گئے۔ انہوں نے پورچ میں کاریں کھڑی کیں اسے یوں لیا جیسے اس کی پوری حفاظت کر رہے ہوں۔ وہ ایک کمرے کی جانب بڑھ گئے اور اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ اس دوران اکبر نے اس کا پسٹل نکال لیا تھا۔ سلمان اس کے پاس گیا اور اس نے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''کچھ چاہئے؟''

''پلیز تھوڑی سے وسکی۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''او کے۔'' سلمان نے کہا اور باہر چلا گیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس نے جلدی سے کال ملائی تو گیت کی آواز ابھری

''یہ بھارت کے نمبر ملا رہا ہے، بات کروا دوں یا ڈراپ کر دوں؟''

''بات کرواؤ، تاکہ اسے پتہ چلے کہ یہ ٹریپ ہو چکا ہے پھر اس نمبر کی ہر کال سننا۔'' اکبر نے تیزی سے کہا۔

''نہیں، مجھے ذرا سا وقت دیں۔ نمبر تو آ ہی گیا ہے، پہلے میں...'' سلمان نے تیزی سے کہا شاید وہ اپنے انداز سے اس ایجنٹ کو قابو کرنا چاہ رہا تھا۔

''اسے بات کرنے دو، دیکھو تو سہی وہ کس سے بات کر رہا ہے۔ پھر اسے دیکھ لینا۔'' میں نے کہا تو بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ چند لمحے بعد اس کی کال مل گئی۔ اس

نے تیزی سے کہا۔
"سر! یہ کیا سچویشن ہے۔" اس نے پوچھا۔
"کیسی سچویشن، بات کیا ہے؟" دوسری طرف سے سوال کیا گیا۔ تب اس نے انتہائی اختصار سے روداد سنا دی تو دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ایسی کوئی صورت حال نہیں ہے، تم ٹریپ ہو چکے ہو۔ فوراً یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔"
"اوہ!" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ فون بند ہو گیا۔
سلمان نے وہ سب سنا اور اٹھ گیا۔ اس نے ایک الماری سے بوتل نکالی، گلاس لیا اور زویا کو برف لانے کا کہہ کر کمرے میں چلا گیا۔ اس نے بوتل میز پر رکھی اور گلاس اسے تھما دیا۔ ایجنٹ نے جلدی سے گلاس لیا اور بوتل کھول کر اس میں سے شراب انڈیلی۔ اتنے میں زویا برف لے کر پہنچ گئی۔ اس نے انتظار بھی نہ کیا اور شراب حلق میں انڈیل لی۔ زویا ساتھ میں بیٹھ گئی۔
"تم نے جس نمبر پر فون کیا ہے اب وہاں فون مت کرو۔ اب اس نمبر سے تمہاری کال کوئی نہیں سنے گا۔" سلمان نے اس کا سیل فون پکڑتے ہوئے سکون سے کہا۔
"کیوں؟" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔
"تمہیں درست بتایا گیا ہے کہ تم ٹریپ ہو چکے ہو۔ دراصل ہم خون خرابہ پسند نہیں کرتے اور نہ ہی تشدد کے قائل ہیں۔ ہم چاہیں گے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔" سلمان اسے یوں کہہ رہا تھا جیسے وہ اس کا بہت اچھا دوست ہو۔
"کون لوگ ہو تم؟" اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔
"فضول بکواس نہ کرو۔ ہم نے کوئی تمہارا نام پوچھا ہے، جو تم ہمارے بارے میں پوچھ رہے ہو۔" سلمان نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔
"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" اس نے پُراعتماد انداز میں کہا تو سلمان نے خوش ہو کر کہا۔
"ہاں یہ ہوئی نا بات۔" اس دوران اس نے گلاس میں شراب ڈالی اور گلاس اس کے آگے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"دیکھو ہم سے تعاون کرو گے تو کچھ نہیں کہیں گے، بلکہ مہمان نوازی کریں گے۔ اس کے علاوہ ہم کیا کر سکتے ہیں، تم وہ سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔"
"دھمکیاں مت دو، کام کی بات کرو۔" اس نے شراب کا گلاس اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
"کیا ٹاسک دیا گیا ہے تمہیں یہاں؟" سلمان نے کہا تو سامنے بیٹھے ایجنٹ نے اچانک گلاس سلمان کے منہ پر دے مارا۔ وہ پوری طرح تیار بیٹھا ہوا تھا، ہلکی سی جھکائی دے گیا۔ گلاس فرش سے ٹکرا کر چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ تب تک ایجنٹ نے سلمان پر چھلانگ لگا دی تھی۔ جب تک ایجنٹ زمین پر گرتا، تب تک زویا بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے فرش پر گرنے سے پہلے ایجنٹ کے منہ پر زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ ذرا سا اُچھلا اور فرش پر آ رہا۔ زویا نے اس کی گردن پر اپنی ہیل ماری تو وہ وہیں سُن ہو کر لیٹ گیا۔ سلمان نے آگے بڑھ کر اسے کالر سے پکڑا اور اسے اُٹھایا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔
"اے لڑکی تو نے بہت زور سے مارا، بھلا کوئی ایسے مارتا ہے، دیکھو، اس طرح مارتے ہیں۔" اس نے کالر والا ہاتھ اوپر کیا اور پھر پتلون کو پکڑا اور زور سے دیوار میں دے مارا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی پھر بے جان سا ہو کر فرش پر گر گیا۔ سلمان نے بڑھ کر میز سے شراب کی بوتل اٹھائی، اور اس کے دونوں پیروں پر انڈیل دی۔ پھر ماچس کی تیلی جلانے کے لیے رگڑی ہی تھی کہ وہ خوف سے چیخنے لگا۔
"نہیں، مجھے مت مارو۔"
"نہیں صرف پیر جلائیں گے۔ شراب کا یہ مزہ بھی تو چکھو، دیکھو کیسے جلاتی ہے۔" سلمان نے سرد لہجے میں یوں کہا جیسے بہت غصے میں ہو۔

"میں نے غلطی کی۔ میں مانتا ہوں۔" وہ رو دینے والے لہجے میں بولا تو سلمان نے کہا۔

"ہم نے تو کہا تھا کہ تعاون کرو۔"

"بولو کیا پوچھنا ہے؟" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کیا ٹاسک ہے تمہارا؟" سلمان نے دہرایا

"اِدھر اسلحہ آتا ہے، کہاں سے آتا ہے مجھے نہیں معلوم، میرا کام صرف یہ ہے کہ اسے بلوچستان اور سندھ کے علاقے تک پہنچانا ہوتا ہے۔ بہت سارے مقامی لوگ میرے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔" اس کا لہجہ تک درد بھرا تھا۔ سلمان چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر دھیمے سے پوچھا۔

"یہ کیسے ہوتا ہے؟"

"نوٹ، سب کچھ نوٹ کرتا ہے، یہاں ہر بندہ بکاؤ ہے، بس ریٹ اس کے مطابق لگانا پڑتا ہے۔" وہ کراہتے ہوئے جوش میں یوں بولا جیسے وہ گالی دے رہا ہو۔ تبھی میں نے کہا۔

"سلمان! فی الحال اسے باندھو اور یہیں پڑا رہنے دو۔ بعد میں دیکھتے ہیں۔"

اس نے ویسے ہی کیا اور روو چار منٹ میں اسے باندھ کر وہیں ایک کونے میں ڈال دیا۔ وہ ہولے ہولے کانپتے ہوئے کراہ رہا تھا، وہ دونوں اُسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گئے۔ واپس کنٹرول روم میں آ کر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ابھی اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔"

"جلدی کس بات کی ہے۔ رات بھر ہے نا تمہارے پاس، سیٹھ نیلا اور اس کے مخالف، دونوں طرف کی بات سنو، وہ کیا کہتے ہیں، اسی کے مطابق اس سے پوچھنا، اور پھر صبح ہونے سے پہلے......" میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"لیکن اس سے یہ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلحہ کیسے آتا جاتا ہے، کون لوگ ہیں اس میں؟" زویا نے تیزی سے کہا تو میں سکون سے بولا۔

"اسے اس وقت نہیں روکا جا سکتا، جب تک بیچنے والے خریدنے والے موجود ہیں۔ رسد تبھی آتی ہے جب طلب موجود ہو۔ ہمیں طلب ختم کرنی ہے۔"

"اوکے۔" اس نے یوں کہا جیسے میری بات سمجھ گئی ہو۔ اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ انہیں ابھی بہت کچھ سمجھانے کی ضرورت ہے۔

"تم لوگ کھانا وانا کھاؤ۔ پھر صبح تک کوئی آؤٹ پٹ نکلنا چاہئے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیئے۔ ہم وہاں سے اٹھ کر باہر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ جہاں دارے نے کھانا لگا دیا تھا۔

ہم کھانا کھا چکے تو مہوش اور فہیم اسی کمرے میں چلے گئے اور میں ہوا خوری کے لیے چھت پر آ گیا۔ مجھے سوہنی بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ اس گھر میں اس کا ہونا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی کسی کونے سے نکلے گی اور میرے سامنے آ کھڑی ہو گی۔ یہ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے رابطہ ضرور کرے گی۔ میں اس کی یادوں میں کھویا ہوا، چھت پر ٹہل رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا، یہ وہ فون تھا جو مجھے فہیم نے دیا تھا اور اس میں نمبر ٹریس نہ ہونے والی تکنیک تھی۔ مجھے نمبر بھی دکھائی نہیں دیا تھا تب میں فوراً سمجھ گیا کہ دوسری طرف بلاشبہ نوتن کور ہو گی۔ میں نے کال پک کر لی

"امرتسر پہنچ چکی ہوں اور اس وقت رتن دیپ سنگھ جی کے پاس ہوں۔"

"اتنی دیر بعد فون کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں آتے ہی افتاد پڑ گئی۔ بانیتا بس 'را' والوں کے ہتھے چڑھنے ہی والی تھی۔ یہ تو اسے رب نے ہی بچا لیا۔ یہاں امرتسر میں تو کیا پورے پنجاب میں اسے تلاش کیا جا رہا ہے اسے، بہت بڑا کام ڈال دیا ہے اس نے۔"

''کسی چھوٹے کام کی اس سے اُمید بھی نہیں ہے۔ لیکن اب وہ ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی پتہ نہیں کہاں ہے۔ آخری بار جالندھر میں تھی۔ اب دیکھیں کہاں ہو سکتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تم ممبئی کب جا رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ابھی یہاں سے نکل کر اپنے گھر جاؤں گی، صبح سویرے میری فلائیٹ ہے یہاں سے۔ وہاں جا کر بات کروں گی، یہ رتن دیپ سنگھ جی سے بات کرو۔'' اس نے کہا اور فون اُسے دے دیا۔ وہ کچھ دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا، پھر فون بند کر دیا۔

رات کے گہرے سناٹے میں سوہنی کی یاد اس قدر تھی کہ کچھ دیر پہلے کی ہنگامہ آرائی بھی اس کی یاد کو محو نہ کر سکی۔ ایک کے بعد ایک خیال آتا چلا جا رہا تھا۔ میں سوہنی کے خیالوں میں تھا کہ فون میں تھرتھراہٹ ہوئی۔ وہ فہیم کی کال تھی۔

''ہاں بولو۔'' میں نے کہا۔

''ابھی کال ٹریس ہوئی ہے کہ گھاس منڈی میں جہاں اس جوا مافیا کے لوگوں کا گڑھ ہے۔ وہاں سے کچھ لوگ ہنگامہ کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ ان کا ٹارگٹ شاہ فیصل کالونی میں موجود ایک مارکیٹ ہے۔ جو شاید ان کے مخالفین کی ہے۔'' فہیم نے تیزی سے بتایا

''مخالفین کی طرف سے کوئی پیش رفت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کی طرف سے ابھی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔'' اس نے بتایا

''یہ خبر ان تک پہنچا دو۔'' میں نے کہا تو گیت بولی۔

''میرے پاس ایک تجویز ہے۔ اگر کچھ دوسرے لوگوں کے ذریعے گھاس منڈی کے اڈے پر ہی حملہ کروا دیا جائے۔''

''تمہارے پاس ایسے لوگ ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل ہیں۔ جس وقت یہ ہنگامہ ہو رہا ہو، اس وقت ادھر بھی ......'' اس نے بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی

''اوکے' تو پھر رات بھر میں دونوں طرف کو ہلا کر رکھ دو۔ کوشش یہ کی جائے کہ گھاس منڈی میں جوا اڈے کا سرغنہ ساجد پولیس کے علاوہ دوسری فورسز پکڑ لیں۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' گیت نے کہا اور پھر فون آف ہو گیا۔ میرے اندر سنسنی پھیلنے لگی۔ میں کچھ دیر چھت پر رہا لیکن بے چین ہو گیا۔ یہاں سوہنی کی یادیں تھیں جو میری بے چینی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ میں نیچے چلا گیا۔ میری توقع کے مطابق مہوش اور فہیم کنٹرول روم میں تھے۔ سامنے اسکرین روشن تھی۔ وہ دونوں جب سے آئے تھے، اسی طرح مصروف تھے۔ میں نے مہوش کی طرف دیکھا اس کا چہرہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

''مہوش! تم آرام کر لو، میں اور......''

''میں بالکل ایزی ہوں، فکر نہ کریں۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جاؤ، تھوڑا اسکون کر لو۔ میں ہوں یہاں پر۔'' میں نے اس سے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ دارے نے اس کے لیے کمرہ سیٹ کر دیا ہوا تھا۔

سب سے پہلے شاہ فیصل کالونی کی مارکیٹ میں کچھ نامعلوم لوگ چند کاروں پر آئے اور آتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ مارکیٹ میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سیدھے اس مارکیٹ کی انتظامیہ والے دفتر کی جانب بڑھے۔ لیکن جیسے ہی ہنگامہ شروع ہوا تھا وہ لوگ دفتر چھوڑ کر چھپ گئے کیونکہ وہ لوگ ان کے منتظر تھے۔ انہوں نے ہنگامہ کرنے والے لوگوں کو گھیرے میں لے لیا۔ ان کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔

اس دوران گھاس منڈی میں جوئے کے اڈے پر دھاوا بول دیا گیا۔ وہاں پر جو عام لوگ موجود تھے۔ انہیں

ڈرا دھمکا کر بھگا دیا گیا۔ وہاں پر ساجد نامی وہ سرغنہ بھی موجود تھا۔ جوئے کے اڈے والوں نے فائرنگ کر کے مزاحمت کر دی تو معاملہ بڑھ گیا۔

ان دونوں ہنگاموں کی اطلاع پولیس کو معمول کے مطابق ہی ہوئی لیکن خفیہ فورسز کی مطلع کر دیا گیا تھا۔ جب یہ ایک ہی وقت میں دونوں ہنگامے شروع ہوئے وہ وہاں تک پہنچ چکے تھے۔ دونوں طرف سے ہی بندے مرے اور زخمی بھی ہوئے۔ لیکن کامیابی یہ ہوئی کہ ساجد نام کا وہ سرغنہ پکڑا گیا۔ ٹی وی اسکرین پر یہ خبریں چل رہی تھیں۔ فورسز نے ساجد کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ ایک طرف یہ ہنگامے چل رہے تھے تو دوسری طرف فون پر اطلاع دوبئی تک پہنچ گئی۔

مخالفین کا سارا زور اپنے ان لوگوں پر تھا جو حکومت میں تھے۔ وہ سیٹھ نیلا کا سارا ریکارڈ لے کر وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ رات گئے یہ فیصلہ ہوا کہ چھاپہ مارا جائے۔

صبح ہونے تک تین کام ہوئے۔ سیٹھ نیلا سمیت اس کے کارندوں کو پکڑ لیا گیا۔ سی ڈیز، کمپیوٹر اور وہ ریکارڈ جو ہنڈی کے ذریعے سرمایہ باہر منتقل کیا جا رہا تھا، وہ سب قبضے میں لے لیا۔ دوسرا ساجد نامی سرغنہ پولیس کی حراست سے نکل کے دوبئی فرار ہو گیا۔ پولیس صاف مکر گئی کہ ایسا بندہ انہوں نے پکڑا ہی نہیں تھا۔ تیسرا کام یہ ہوا کہ رات جو ایجنٹ پکڑا تھا، اسے زندگی سے آزاد کر کے زمزمہ پارک کے قریب پھینک دیا گیا۔ اس کے تمام نمبر حاصل کر لیے گئے تھے۔ دن نکلتے ہی اس کی لاش مل گئی۔ اس سے کراچی انڈر ورلڈ میں ہلچل مچ گئی۔ جس کا احساس ٹیلی فون کالز سے ہو گیا۔

☆......☆......☆

ابھی صبح کی روشنی پھیلی نہیں تھی جب ٹرین بوریولی اسٹیشن کے قریب پہنچ گئی۔ وہاں پر اُن کے چند خاص لوگ موجود تھے، جنہیں زور دار سنگھ نے بھیجا ہوا تھا۔ انہوں نے ہر طرح کا جائزہ لے لیا ہوا تھا۔ وہ جگہ ان کے لیے محفوظ تھی۔ ٹرین رُکی تو انہوں نے کھڑکی سے دیکھا۔ ان کی پہچان کے مطابق کافی لوگ تھے۔ وہ بڑے سکون سے اُترے اور باہر کی جانب چل دیئے۔ ان تینوں کے لیے ٹیکسی موجود تھی، وہ اس میں بیٹھے اور چل دیئے۔ وہ ہری اوم نگر کا علاقہ تھا جہاں کارٹر روڈ پر کویتا اپارٹمنٹ کے سامنے ٹیکسی جا رکی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تیسری منزل پر گئے تو ایک اپارٹمنٹ ان کا منتظر تھا۔ جس کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رونیت کے سارے دوست موجود تھے۔ تقریباً تیس گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد وہ کافی حد تک تھک چکے تھے۔ وہاں ان کے لیے ملازمین کے نام پر کچھ سیکورٹی گارڈ تھے۔ انہوں نے ایزی ہو کر کھانا کھایا۔ پھر چائے پیتے ہوئے سب اکٹھے تھے۔ تبھی بانیتا کور نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"یہاں ہم نے زیادہ دیر کے لیے نہیں رہنا لیکن جتنا بھی رہنا ہے، بالکل ایک عام سے شریف شہری کی طرح زندگی بسر کرنی ہے۔ اس شہر کو خوابوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ خواب پورے کرو، انجوائے کرو لیکن اپنے کان اور آنکھیں کھول کر رکھو۔ زندگی بہت قیمتی ہے مگر ہمارا مقصد زیادہ قیمتی ہے، جس نے آئندہ آنے والی نسلوں کو زندگی دینی ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں، ہم اپنی زندگی تک دینے کو تیار ہیں۔ لیکن یہاں کون ڈیل کرے گا، سندو تو ابھی اسپتال ہی میں ہوگا۔"

"جب تک سندو منظر عام پر نہیں آتا، تب تک رونیت کو رسب کو ڈیل کرے گی۔ تم لوگ کل ہی سے مختلف کمپنیوں کو جوائن کرو گے اور ممبئی میں پھیل کر رہو گے۔ میں اور جسپال سنگھ تم سب کے ساتھ بچ رہیں گے کیونکہ ہم ایک جگہ ٹک کر نہیں رہ سکتے یہ ہماری مجبوری ہے۔" اس

نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ گئی تو سب بھی چلے گئے۔
وہ تینوں ایک کمرے میں آ گئے تو باخیتا کور بولی۔
''نوتن کور یہاں پہنچ چکی ہے اور اس نے ہمارے لیے سارا سیٹ اپ بنالیا ہوا ہے۔ مجھے اور جسپال کو ابھی یہاں سے نکلنا ہے اور رونیت، جب تک یہ سب اپنے ٹھکانے تک نہیں پہنچ جاتے تجھے یہاں رہنا ہوگا۔''
''او کے۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ دونوں کویتا اپارٹمنٹ سے جانے کے لیے نکل پڑے، ان کی منزل کیا تھی، یہ انہیں نوتن نے بتانا تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر ہونے کو تھی۔ مقامی میڈیا چیخ رہا تھا۔ مگر ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پولیس فورس کے بارے میں مختلف باتیں گردش کرنے لگی تھیں۔ کراچی جو کبھی امن کا گہوارہ تھا ان دنوں مافیا اسٹائل کے قتل اور اغوا برائے تاوان سے لے کر عسکریت پسندی تک، بم دھماکے اور فرقہ وارانہ قتل، بوری بند لاشیں اور نوگوایریاز اب شہر کی پہچان بن گئی تھی۔ بارود کے ڈھیر پر پڑے اس شہر میں جرائم کی سطح آخر کیوں بڑھ رہی ہے؟ یہی وہ بنیادی سوال ہے، جس کا جواب ہر شہری کو سوچنا ہوگا۔ کراچی اور ممبئی میں جہاں کئی معاملات میں تضاد ہے وہاں مماثلت بھی ہے۔ کہیں جرائم کے معاملے میں ان شہروں کی مماثلت تو نہیں؟ کئی سارے سوال تھے جو میرے ذہن میں آتے چلے جا رہے تھے، مگر سب کا جواب ایک ہی تھا۔ کسی بھی بیماری کی علامت کو ختم کرنے کے لیے اس کی بنیادی وجہ کو تلاش کر کے ہی اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ بیماری کیا ہے؟ صرف علاج سے گھبرا رہے ہیں۔ جرائم کو ختم کرنے کے لیے جرائم کی دنیا میں اترنا بہت ضروری تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں سرایت کر گیا۔ میں کچھ دیر اس پر سوچتا رہا، پھر میں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ چونکہ یہ ایک تجربہ ہوگا، اس کے بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے، جب نتائج سامنے آئیں گے تو ہی اسے سب پر ظاہر کیا جائے۔ میں اسی وقت اٹھ گیا۔

کنٹرول روم میں مہوش اکیلی بیٹھی گیت اور زویا سے گپ شپ کر رہی تھی۔ ان کے درمیان کوئی نیا سوفٹ ویئر زیر بحث تھا۔ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔
''سوری، میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا، کہتے ہیں کہ جس مرد کی شامت آئی ہو وہ خواتین میں جا بیٹھتا ہے۔''
''اگر شوق ہے شامت کا تو وہ پورا کر دیتے ہیں۔'' گیت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
''نہیں مجھے کوئی شوق نہیں۔'' میں نے کہا لیکن ساتھ ہی سنجیدگی سے پوچھا۔
''زویا، یہ جو ہم نے کراچی میں سارا منظر بنا دیا ہے، کیا اس کا کوئی فائدہ ہے؟''
''سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں کہ دوبئی یا کسی دوسرے ملک میں بیٹھے ہوئے مداریوں کو اپنے ہونے کا احساس دلایا جائے۔'' گیت نے جواب دیا
''اور ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہونے والا، سوائے چند دن کام رُک جانے کے۔ وہ اپنے نئے گھوڑے بنا لیں گے۔''
''کیا وہ مداری قسم کے لوگ تم لوگوں نے ٹریس کر لیے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''نمبروں کی حد تک اور لوکیشن کے بارے میں ہمیں سو فیصد معلومات ہیں اور دوبئی میں موجود اس بندے کرامت جونیجو کے بارے میں پوری معلومات ہیں، جو یہاں جوا مافیا، اور اسلحہ اور دوسرے کئی جرائم میں ملوث ہے۔'' زویا نے بتایا تو میں نے پوچھا۔
''اس کے کام کا طریقہ کار بھی؟''
''کافی حد تک کی یہ ضروری ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر یہ ہوجائے تو کچھ نیا کیا جائے؟''میں نے کہاتو وہ سب آپس میں باتیں کرنے لگیں۔اس دوران جنید اور نعیم آگئے۔تھوڑی دیر بات سمجھتے رہنے کے بعد نعیم بولا۔

''ہم کوشش کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں ایسا ممکن ہے،ہوجائے گا۔''

''تو کرو،یہ سلمان اور اکبر کدھر ہیں؟''میں نے پوچھا۔

''وہ کچھ کارگو کروانے گئے ہیں لاہور کے لیے۔ آتے ہی ہوں گے۔''جنید نے بتایا

''میں رابطہ کرلیتا ہوں۔''میں نے کہااور اپنے سیل فون پر ان سے رابطہ کرنے لگا۔وہ ٹرکوں والے اڈے پر موجود تھے۔میں نے ان کے واپس آجانے تک انتظار کرنا مناسب سمجھا۔تین گھنٹوں کے بعد وہ اسکرین پر میرے سامنے تھے۔انہوں نے بتایا کہ سولہ کروڑ میں سے چودہ کروڑ لاہور کارگو کروادیئے ہیں۔وہ پہنچادیئے جائیں گے۔اس کے بعد وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ بات کیا ہے؟

''کیا تم آج ہی دوبئی جاسکتے ہو؟''میں نے پوچھا۔

''کیوں نہیں،بس ٹکٹ خریدنا ہوگا۔میں ایسا بندوبست رکھتا ہوں۔''اس نے جواب دیا

''تو پھر آج ہی دوبئی کے لیے نکلو،تمہارے ساتھ کوئی بھی جاسکتا ہے تو اسے لے جاؤ۔''

''کرنا کیا ہے؟''زویا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کرامت جونیجو کا قتل اور اسے یوں ٹھکانے بھی لگانا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔''

''میں جاتی ہوں اس کے ساتھ،ہوجائے گا۔''زویا نے کہاتو سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ دونوں دوبئی جانے کی تیاری میں لگ گئے اوران سب نے پوری توجہ اس پر لگادی کہ کرامت جونیجو کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات مل جائیں۔ دوگھنٹوں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کرامت جونیجو دوبئی کے جنوب میں واقع ایک صحرائی علاقے الفقع میں جارہا ہے۔جہاں کوئی فنکشن تھا۔

''میں فنکشن کے بارے میں جانتی ہوں۔یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ ہمیں وہاں مل جائے گا۔میرے خیال میں اس سے اچھا وقت کبھی نہیں مل پائے گا۔''زویا نے انتہائی پرجوش ہوتے ہوئے کہا۔

شام ہونے تک سلمان اور زویا دوبئی پہنچ گئے۔اس دوران۔وہ دونوں ہمارے رابطے میں تھے۔ان کی آواز ہی نہیں تصویر بھی ہمیں دکھائی دے رہی تھی۔اس وقت ان دونوں کے ساتھ بڑا جذباتی تعلق محسوس ہورہا تھا۔ سلمان کے دوبئی میں کچھ غیر پاکستانی دوست تھے۔ان میں دولڑکیاں اور دو ہی لڑکے تھے۔وہ ایک اعلیٰ ریسٹورانٹ میں کھانا کھاچکے تھے،جب کرامت جونیجو دوبئی سے نکل کر اس صحرائی علاقے کی جانب چل پڑا۔ اس کے ساتھ کتنا لاؤلشکر تھا یا نہیں تھا اس بارے میں کوئی معلومات نہیں تھی۔وہ بھی اسی وقت اس علاقے کی جانب چل نکلے۔انہوں نے پتہ کرلیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔یہ وہاں کی ثقافتی روایت ہے کہ بیچ صحرا میں رات کے وقت رقص اور مے کشی سے لطف اندوز ہوا جائے۔وقت اور حالات کے مطابق اس میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔لوگ بدلے تو انداز بھی بدل گئے۔

وہ گاؤں بیچ صحرا میں تھا،جس سے دوکلومیٹر آگے وہ میلہ نما تقریب تھی۔دور قناتیں لگی ہوئی تھیں،جس کے درمیان میں روشنی اتنی تھی کہ آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔وہیں پر سیکورٹی کا پہلا حصار تھا۔ان کی اچھی طرح سے جامہ تلاشی لی گئی اور آگے جانے دیا گیا۔قناتوں سے کوئی سوقدم پہلے پھر اسکیننگ کی گئی تو وہ اندر داخل ہوسکے۔غیر ملکی اور لڑکیوں کا ساتھ ہونے کے باعث ان سے کوئی پوچھ تاچھ نہیں ہوئی تھی۔ اندر کا سماں ہی کچھ عجیب تھا۔عربی موسیقی کی دھن

گونج رہی تھی۔ عین درمیان میں سرخ قالین بچھے ہوئے تھے، جن پر ایک نیم برہنہ رقاصہ تھرک رہی تھی۔ اس کا نیلے رنگ کا لباس چمک رہا تھا۔ ایک طرف بے شمار برانڈ کی شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں، جہاں سے لوگ پی رہے تھے۔ ایک طرف مختلف انواع واقسام میں بنے گوشت کے کھانے تھے، لوگ ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے، کچھ پہلو میں لڑکیوں کو بٹھائے اپنی مستی میں گم تھے۔ وہاں پر ہر طرح کی مستی کا پورا سامان میسر تھا۔ سلمان اور زویا کو وہاں کرامت جونیجو کی تلاش تھی۔ وہ بھی ایک قالین پر جا بیٹھیں۔

''ایک کمی ہے یہاں۔ مطلب ان کی مستیاں ایک خاص حد تک ہی جا سکتی ہیں، اس سے آگے تو بس تشنہ کامی ہے۔'' سلمان کے ایک دوست نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا تو دوسرا دوست ہنستے ہوئے بولا۔

''جس تشنہ کامی کی تم بات کر رہے ہو، اس کا راستہ یہیں کہیں سے نکلتا ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر خیمے لگائے گئے ہوں گے، کیونکہ یہ اس فنکشن کا حصہ ہے۔ جو جسے میسر ہوگا، وہی اپنے لیے مخصوص خیمے میں جا کر اپنی موج مستی کرے گا۔''

''یعنی پورا اہتمام ہے۔'' ایک لڑکی نے کہا۔

''مگر ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، ہمیں کسی وقت بھی چیک کیا جا سکتا ہے۔'' ایک دوست نے کہا۔

''لیکن یہ اس وقت ہوگا جب میزبان یہاں آئے گا اور وہ سب سے ملے گا۔'' دوسرے نے بتایا۔

''مصیبت یہ ہے کہ وہ بندہ بھی تو تلاش کرنا ہے۔'' سلمان نے کہا تو گیت کی آواز گونجی

''سلمان یہ حلیہ ذہن نشین کرو، گول بھاری چہرہ، سندھی انداز کی خشخشی داڑھی کے ساتھ بھاری مونچھیں، کنجی آنکھیں، ناک پتلا اور ذرا سا خمیدہ، موٹی گردن اور دائیں گال پر زخم کا ہلکا سا نشان۔ یہ تصویر اس کی بزنس کمپنی کی سائیٹ پر لگی ہوئی ہے۔''

''وہ رہا۔'' ایک دم سے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے زویا نے پرجوش لہجے میں کہا تو سلمان بولا۔

''اب اسے میں......''

''نہیں تم ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے زویا اٹھ گئی۔ تبھی سلمان اور اس کے ساتھی الرٹ ہو گئے۔

زویا دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی۔ وہ اس وقت جام ہاتھ میں لیے پوری توجہ سے رقاصہ کے رقص میں کھویا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب جا بیٹھی اور حتی الامکان اپنے لہجے کو خواب ناک بناتے ہوئے بولی۔

''ہیلو، سر کرامت! کیسے ہیں آپ؟''

اس نے زویا کو عجیب سی اجنبیت کے ساتھ دیکھا اور پھر اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔''

''میں کب کہتی ہوں کہ آپ مجھے پہچانیں، ماضی کو یاد رکھنا بھی نہیں چاہیے۔ میں تو ایک نئی ڈیل کے ساتھ یہاں آپ کے پاس آئی ہوں۔'' زویا نے لہجے کو بارعب بناتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں، کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جب بات ہوگی تو ہی سمجھ میں آئے گی۔ یہاں اس ماحول میں ہو نہیں سکتی۔ میں کراچی کی تازہ صورت حال کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔'' اس نے کہا تو کرامت نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''وہی جو میں اپنے باس کی طرف سے آپ کے لیے پیغام لے کر آئی ہوں۔ سیٹھ نیلا سمیت ساری ڈیل ہو جائے گی۔ باقی آپ کی مرضی۔'' زویا نے کہا تو اس نے چونک کر دیکھا اور اٹھ گئی۔ تبھی وہ جام رکھ کر اضطراری

انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم کون ہو؟ اور یہ باتیں......''

''آپ تو بچوں والی باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ میں کرامت جونیجو سے بات کر رہی ہوں۔'' زویا کا لہجہ اکتایا ہوا تھا۔

''چل بات کرتے ہیں۔'' اس نے ایک طرف آنے کا اشارہ کیا تو زویا جان بوجھ کر باہر کی جانب جانے لگی۔ وہ دونوں خاموشی میں آگے بڑھتے گئے۔ قناتوں سے باہر آجانے پر اس نے پوچھا

''اب بتا، کیا کہتی ہو؟''

''آپ کے مخالفین یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کراچی پر قابو پالیں۔ گھاس منڈی سے لے کر جہاں تک آپ کا سکہ چلتا ہے۔ یہ ان کی ابتدا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ ڈیل کر دو تو انہیں سمندر میں پھینک دیں گے۔'' زویا نے انتہائی اعتماد سے کہا۔

''ڈیل کون کرے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا باس، اگر آپ ابتدائی باتیں ڈن کر لیں تو'' زویا نے اسی بااعتماد لہجے میں کہا۔

''کہاں بات کرنی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جہاں آپ چاہیں۔'' اس نے تیزی سے جواب دیا تو وہ اسے ان خیموں کی جانب لے کر چل دیا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا وہ پلٹا اور اس طرف چل پڑا، جہاں ان کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ جیسے ہی ایک جدید فور وہیل کے پاس آیا، اس کے دو گارڈ فوراً سامنے آگئے۔ کرامت نے اشارہ کیا تو انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں اندر جا بیٹھے۔ اس سے پہلے وہ کوئی بات شروع کرتے سلمان کے ساتھ ایک دوست وہاں دہیں پہنچ گئے۔ گارڈ اگرچہ الرٹ تھے مگر انہیں صرف یہی احساس تھا کہ اندر ان کا باس ایک لڑکی کے ساتھ ہے۔ ان کی پوری توجہ اندر کی طرف ہی تھی۔ جیسے ہی سلمان ان کے سر پر پہنچا، وہ مڑے تب تک دونوں ان پر آن پڑے۔ سلمان نے پوری طرح انہیں ہلنے نہیں دیا ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ دوسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ریت پر پڑے تڑپ رہے تھے۔

''بولو، کیا ڈیل کرنی ہے؟'' کرامت جونیجو نے جیسے ہی کہا زویا اس پر ٹوٹ پڑی۔ وہ خاصا سخت جان تھا اور پہلے ہی سے محتاط تھا۔ اس کے وار سے بچ گیا۔ اس نے زویا کی گردن قابو میں کر لی اور اسے سیٹ پر لٹا دیا، ایسے میں دروازہ کھلا اور سلمان اندر آگیا۔ اس نے کرامت کی گردن پکڑی اور ایک زوردار جھٹکا دیا۔ وہ پورے بدن سے لرزا اور تڑپنے لگا۔ زویا نے اپنی گردن چھڑائی اور تیزی سے پیچھے ہٹی۔ اس کے دوست نے دروازے کھولے اور دونوں گارڈز کو گاڑی میں پھینک دیا۔ پھر دروازے بند کر کے واپس چل پڑا۔ سلمان نے چابی ٹٹولی تو کرامت کے پاس سے نکل آئی۔ اس نے فور وہیل موڑی اور چل دیا۔

وہ بستی میں جانے کی بجائے اس کے قریب سے آگے بڑھ گئے۔ اس کے دوست پیچھے پیچھے آتے ہوئے بستی سے سیدھے دوبئی کی جانب نکل پڑے۔ کرامت کی جیپ جاندار تھی۔ وہ صحرا کی جانب چل پڑے۔ کافی دور جا کر زویا نے اس کا سیل فون قابو میں کیا تو سلمان نے ان تینوں کو صحرا میں پھینکا اور واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ زویا نے سیل فون سے سم کارڈ نکالا اور سیل فون باہر پھینک دیا۔

''ویل ڈن۔ اب یہ سم کارڈ اپنے سیل میں ڈال لو اور کسی محفوظ مقام پر چلے جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''او کے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

میرے سامنے میز پر کراچی میں موجود ان دو لوگوں کے نمبر تھے، جن سے کرامت جونیجو کا رابطہ تھا۔ یہی اس کے تمام تر پھیلاؤ کے ذمے دار تھے۔ میں نے سب کو

پانی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''سب سنو کیا میں کرامت جونیجو کی آواز میں بات کرسکتا ہوں۔''

''سو فیصد تو نہیں لیکن چلے گا، ایک سوفٹ ویئر ہے جس سے آواز کو اس کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔'' گیت نے کہا تو مہوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہاں تو بے سُرے ترین لوگ گلوکار بنے ہوئے ہیں، یہ تو بس آواز کو ذرا بھاری کرنا ہے، تو نے کون سا گانے گنوانے ہیں؟''

اس سمیت سبھی سمجھ گئے تھے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ ان دونوں سے وہ کیسے کام لیتا ہے اور اس وقت ان کے درمیان کیسی بات چل رہی تھی۔ کرامت کے بات کرنے کا انداز میں سمجھ ہی گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد زویا اور سلمان بار دوبئی میں اپنے دوستوں کے پاس جا پہنچے۔ اس کا صرف فون آن رکھنا ضروری تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے کراچی میں موجود اس کے ایک کارندے فصیح صدیقی کو فون کردیا۔

''کیا صورت حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کیا خاک ہوگی۔ پیسہ پکڑا گیا، مخالفین نے سیٹھ نیلا کو پکڑ لیا اور ابھی تک آپ نے کچھ کیا نہیں۔''

''دیکھو، میں بہت کوشش کررہا ہوں۔ لیکن ساری کوشش کس لیے غلط ہورہی ہے معلوم ہے تجھے؟''

''نہیں تو، کیا مطلب؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''وہ لطیف شاہ یہ سارا کام اسی کا کیا دھرا ہے، وہ غدار ہوگیا ہے، گھاس منڈی پر حکومت کرنے کے لیے؟'' میں نے انتہائی غصے میں کہا۔

''ایسا کیا واقعی......'' اس نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''یہ ساجد آیا ہے نا یہاں پر، اس نے ساری بات تفصیل سے بتائی، میں نے اس کی تصدیق کی ہے تو کنفرم ہوگیا۔'' میں نے غصے کو کم نہیں ہونے دیا

''یہ تو ہمیں بھی لے ڈوبے گا۔'' وہ تشویش سے بولا۔

''لے ڈوبے گا کیا، اس نے سارے نام دے دیئے ہیں، تھانے سے پتہ تو کرو، اوپر سے آرڈر آنے والے ہیں۔ تم خود سوچو اتنی بڑی ڈکیتی، اندر کے بندے کے علاوہ کوئی دوسرا کرسکتا ہے۔ سیٹھ نیلا کیسے پکڑا گیا، اس کے سارے راز کس نے دیئے؟'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر، اب کیا کرنا ہے؟''

''لطیف شاہ کا جو بھی ٹھکانہ ہے، اسے اُڑا دو۔ اسے بھی ختم کردو۔ کوئی ثبوت نہ رہے۔ اب اس کے بغیر چارہ نہیں۔ یہ کام آج رات ہو جانا چاہئے، سورج نکلنے سے پہلے اس کا کام تمام کرکے میرے پاس یہاں دوبئی آجاؤ۔'' میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''ہوگیا سمجھو۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو میں نے فون بند کردیا۔ چند لمحے بعد میں نے لطیف شاہ کا نمبر ملالیا، یہی باتیں اس سے کرکے کہا کہ تجھے ختم کرنے کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہیں ختم کرے، تم اسے نیست و نابود کرکے دوبئی آجاؤ۔ وہ تیار ہوگیا۔

کوئی دو گھنٹے گذرے ہوں گے کہ گھاس منڈی اور اس کے گرد و نواح میں شدید فائرنگ کی اطلاعات ملنے لگیں۔ ٹی وی اسکرین پر خبریں دکھائی دینے لگیں تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ اس میں شدت آنے لگی۔ ہنگامے بڑھتے گئے۔

☆......☆......☆

جسپال سنگھ اور بانیتا کور دونوں دہلی کے پوش علاقے میں نوتعمیر بنگلے میں تھے۔ ممبئی میں اُن کا پہلا ٹھکانہ وہی تھا۔ وہ کچھ دیر نیند کے بعد ڈنر لے چکے تھے اور باہر جانے کے لیے تیار تھے۔ انہیں گوپال نند سے ملنا تھا۔ اگرچہ وہ ہندو تھا، لیکن وہ شوشلسٹ ہونے پر زیادہ فخر محسوس کرتا تھا۔ وہ انہی لوگوں میں سے ایک تھا، جنہوں نے ''را'' کی ٹاپ میٹنگ کی ویڈیو بانیتا کور تک

پہنچا دی تھی۔ اگر چہ وہ را سے تعلق نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی رسائی بہت دور تک تھی۔ بانیتا کور خود اس سے ملنا چاہتی تھی اور گوپال نند سے بھی کہا گیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے مل لے۔ اس کے پاس کوئی کام تھا، جسے وہ کر سکتے تھے۔ اس نے انہیں ایک بار کا وقت دیا تھا۔ وہ ایک ایسا بار تھا جو ممبئی میں جگہ جگہ کھل گئے تھے اور وہاں ناچ گانے اور شراب پینے کے علاوہ اور بہت کچھ ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر "بھائی لوگوں" ہی کی نگرانی میں چل رہے تھے۔ اس لیے ہر غیر قانونی کام وہاں ہو رہا تھا۔ انہوں نے کوئی گاڑی لینے کی بجائے پیدل ہی نکلنا پسند کیا تھا، وہ اس بنگلے سے نکلے اور پیدل ہی آگے بڑھتے گئے۔ کافی آگے جا کر انہیں ٹیکسی ملی تو وہ اس میں بیٹھ گئے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اس بار کے سامنے تھے۔ وہ مین سڑک سے ہٹ کر ایک گلی میں تھا۔ وہاں لوگوں کی رہائش کم اور اس طرح کے کلب اور بار کے علاوہ مختلف سٹور اور کھانے پینے کی دوکانیں تھیں۔ ایک طرح سے وہ جگہ نائیٹ فوڈ اسٹریٹ کے جیسی تھی۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہاں کچھ دیر پھرتے رہے پھر گوپال نند سے رابطہ کیا۔ وہ اسی بار کے اندر بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اندر گئے تو خاصا شور تھا۔ وہاں کافی سارے جوڑے تھے۔ اس کے علاوہ بھی خاصی خواتین دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے محتاط انداز میں اسے تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا، جلد ہی ان کے فون پر کال آ گئی۔ وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔

میز پر آمنے سامنے بیٹھتے ہی اس نے کھانے پینے کا پوچھا اور پھر کولڈ ڈرنک منگوا لیے۔ جب تک کولڈ ڈرنک آئے انہوں نے اپنے درمیان اجنبیت کو ختم کر لیا تھا

"بات یہ ہے کہ یہاں کے اور امرتسر کے ماحول میں بڑا فرق ہے میں بھی یہ مانتا ہوں ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے لیکن ماحول کوئی بھی ہو، اصل چیز حوصلہ ہے، جو کر جائے۔ معاف کرنا میں صرف دھرم کے لیے کام نہیں کرتا، بلکہ اپنے نظریے کے لیے کام کرتا ہوں اور ہر کام کے لیے سرمایہ بھی تو چاہئے نا۔"

"ہمیں اس سے غرض نہیں کہ تم کیا کرتے ہو اور کیسے کرتے ہو۔ تمہارے پاس ہمارے لیے کیا آفر ہے؟" بانیتا کور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

"روکڑے کی آپ فکر نہیں کریں۔ وہ اتنا ملے گا کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے اور کام بہت سے ہیں، جیسا کام ہوگا ویسا روکڑا ہوگا۔"

"مثلاً؟" بانیتا کور نے پوچھا۔

"مطلب، ان میں ایک کام یہ بھی ہے کہ ایک کمشنر لیول کے پولیس والے کو اڑانا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے استہزائیہ انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا تو جسپال سنگھ نے ایک دم سے کہا۔

"ڈن ہو گیا۔ جو اور جیسے تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اگلی بات کرو۔"

اس کے یوں کہنے پر گوپال نند نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ کام ایسا نہیں ہے کہ تم بازار جاؤ اور کوئی برگر پیزا لے کر آ جاؤ۔ پولیس کمشنر ہے وہ۔"

"وہ لوہے کا بنا ہوا ہے یا اس کے لیے کوئی مخصوص گولی بنی ہے؟" جسپال نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے یہ بندہ ہمیں کام دے گا۔" اس نے بانیتا کور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا پھر جسپال کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہیں کام سے غرض ہے نا، بولو، باقی میں دیکھ لوں گی۔" بانیتا کور نے بھی کہا تو ایک دم سے بے چین ہو گیا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ ایسا کام ہے لیکن تم

لوگوں کو شاید پتہ نہیں ہے کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ میرے پاس دوسرے کئی کام ہیں، مثلاً اغوا، کسی بزنس مین کا قتل، منشیات یا اسلحہ کی ڈلیوری۔ سوچ لو، ان میں جو تم لوگ کرنا چاہتے ہو تو کل شام میں تمہیں بتادوں گا۔''

''ڈن ہوگیا۔'' جسپال نے کہا وہ غور سے اسے دیکھنے لگا پھر اس نے جسپال سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

''مزید کچھ لیں گے؟''

گویا اس نے بات ختم ہو جانے کا اشارہ دے دیا تھا۔ وہ دونوں کوئی مزید بات کیے بنا وہاں سے اٹھ گئے۔ اس وقت وہ داخلی دروازے کی جانب جا رہے تھے۔ اچانک داخلی دروازہ دھڑ سے کھلا اور کئی سفید لباس والے اندر داخل ہوتے چلے گئے۔ وہ سبھی کالی پتلون، اور سفید ہاف سلیو شرٹوں میں تھے۔ ان میں تین لوگ آگے بڑھ گئے، دو ایک طرف چلے اور دو دوسری جانب، دو بند دروازے میں کھڑے رہے۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ پورا پلان کر کے آئے ہیں۔

''یہ چھاپہ ہے جسپال۔'' بانیتا کور نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو اس نے بھی ہولے سے کہا۔

''جو بھی ہو اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''دروازے میں......'' بانیتا کور نے کہنا چاہا کہ اندر سے چند لڑکیاں چیختی ہوئی باہر آ گئیں۔ وہ انہیں یوں دھکے دے رہے تھے جیسے وہ کوئی جانور ہوں۔ وہ بے تحاشا گالیاں بک رہے تھے۔ وہ وہاں پر موجود لوگوں کے ساتھ یوں سلوک کر رہے تھے جیسے یہ بہت بڑے مجرم ہوں۔ میوزک بند ہو گیا تھا۔ ناچتے تھرکتے ہوئے جوڑے ایک دم سے رُک گئے تھے۔ سفید لباس والوں نے انہیں بھی آگے لگا لیا۔ وہ انہیں ریوڑ کی مانند ہانکتے ہوئے باہر کی جانب لانے لگے تو ایک سفید لباس والے نے بانیتا کور کے کاندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور بازو سے پکڑ کر آگے کی جانب دھکیلا۔ دوسرے نے جسپال کی گردن پر مارا اور آگے دھکیلا۔ وہ دونوں بھی اس چھاپے کی زد میں آ گئے تھے۔ وہ ان سب کو ہانک کر سڑک پر لے آئے۔ ان میں گوپال نند بھی تھا، جو مسکراتے ہوئے اُن کی جانب دیکھ رہا تھا۔ باہر پولیس کی جیپ کے ساتھ قیدیوں والی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ ایک سفید لباس والے نے زور سے کہا۔

''چلو، سب بیٹھو گاڑی میں۔''

اس آواز کی بازگشت میں ایک موٹا سا بندہ بار کے دروازے میں سے باہر آیا اور اونچی آواز میں بولا۔

''میں اس بار کا مینجر ہوں۔ تم ایسے نہیں کر سکتے، یہ بھائی کا علاقہ ہے، پہلے اس سے بات کرو۔''

اس کے یوں کہنے پر جیپ میں سے کسی ولن کی طرح ایک پولیس آفیسر نکلا، اس نے بھی ویسا لباس پہنا ہوا تھا، وہ قد میں ان سے لمبا، سر سے کافی حد تک گنجا، بھاری چپٹی ٹائپ مونچھیں، فربہ مائل تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس مینجر کے پاس جا کر ایک زوردار تھپڑ مارا پھر کہا۔

''بولو کیا کہہ رہے تھے تم؟''

''دیکھو اے سی پی، تم مجھے چاہے مار دو، لیکن میں اپنے کسٹمر ایسے نہیں لے جانے دوں گا۔ بھائی......'' اس نے کہنا چاہا تو اے سی پی نے اسے گریبان سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ سڑک پر جا رہا۔ اے سی پی نے اپنا سروس ریوالور نکالتے ہوئے اونچی آواز میں حکم دیا

''سب کو بٹھاؤ گاڑی میں، دیکھتا ہوں اس کے بھائی کو۔'' یہ کہہ کر اس نے مینجر کو لات مارتے ہوئے کہا۔

''چل بلا اپنے بھائی کو، کتنی دیر میں آئے گا وہ سالا چوہا، میں کھڑا ہوں ادھر۔''

''بھائی تیرا جھگڑا بھائی سے ہے، کسٹمر کو جانے دے، ادھر ہی بات کرتے ہیں۔'' مینجر نے اُڑتے ہوئے کہا۔

''اوئے تیری تو ماں کا......'' اس نے زوردار گالی کے ساتھ اسے گریبان سے پکڑ کر پھر زمین پر دے مارا۔

اردگرد کھڑے لڑکے تو پریشان تھے لیکن لڑکیاں رُو رہی تھیں۔ تبھی ان میں سے ایک لڑکی نے آگے بڑھتے ہوئے اے سی پی سے کہا۔

"میں جرمنی سے آئی ہوں، ہم چھ لوگ ادھر وزٹ کے لیے آئے ہیں، آپ ہمیں ایسے نہیں پکڑ سکتے۔"

"اوئے اسے پہلے ڈال اندر، اس کی جرمنی تو ادھر پولیس اسٹیشن میں جا کر نکالتے ہیں۔ سالی جرمنی کی۔" اے سی پی نے انتہائی غصے میں کہا۔

اس دوران جسپال نے بانیتا کور کی طرف دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کرلیا۔ منیجر سیل فون پر وہاں کے حالات بتانے لگا تھا۔ سفید لباس والے لڑکے لڑکیوں کو پکڑ پکڑ کر گاڑی میں پھینک رہے تھے۔ جیسے ہی ایک سفید لباس والے نے بانیتا کور کو پکڑا۔ اس نے پوری قوت سے اس کی ناک پر پنچ مارا۔ تب تک جسپال نے ہوا ہی میں چھلانگ لگائی اور سیدھا اے سی پی جا پڑا۔ اس کا پہلا ٹارگٹ ریوالور کو قابو میں کرنا تھا۔ اے سی پی کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس پر یوں حملہ کر سکتا ہے۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جسپال اسے لیتا ہوا سڑک پر آ رہا۔ اے سی پی کسی اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ تب تک جسپال نے اس کی کنپٹی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت میں وہ مدہوش سا ہو گیا۔ اس دوران جسپال نے اپنا پسٹل نکال کر اے سی پی کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ سبھی سفید لباس والے ایک دم سے وہیں رُک گئے۔

"اوئے منیجر، جلدی کر، سب کو نکال لو گاڑی میں سے اور بھگا دو، میں دیکھتا ہوں اسے، لگتا ہے اسے زندگی نہیں پیاری۔" جسپال نے اونچی آواز میں کہا۔

منیجر یوں کایا پلٹنے پر ابھی تک حیران کھڑا تھا۔ جب تک وہ آگے بڑھا جو چند لوگ تھے، وہ گاڑی سے نکل آئے۔ وہاں موجود لڑکے لڑکیاں تیزی سے بھاگتے چلے گئے۔ ان بھاگنے والوں میں گوپال نند بھی تھا۔ وہاں میدان میں اے سی پی، سفید لباس والے، وہ دونوں اور منیجر دنگ رہ گئے۔ بانیتا کور کو وہ بندہ یاد تھا جس نے اسے دھکا مارا تھا، وہ اس کے پاس گئی اور بالوں سے پکڑ کر ان سے الگ کرلیا۔ پھر اپنا پسٹل نکال کر اس کے ماتھے پر نال رکھتے ہوئے بولی۔

"جسے زندگی پیاری ہے وہ اپنے ہتھیار پھینک دے۔" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ایک نے فائر کر دیا۔ وہ بہت محتاط تھی سفید لباس والے کو لیتے ہوئے سڑک پر لیٹ گئی۔ پھر وہیں پڑے پڑے اس پر فائر کر دیا۔ ان میں سے ایک چیخ مارتے ہوئے گر گیا۔ میدان صاف ہوا تھا یا انہیں باہر آنے میں دیر ہوگئی تھی، یا انہیں گمان نہیں تھا، کچھ بھی تھا، ایسے میں اس بار میں موجود غنڈے اسلحہ سے لیس باہر آ گئے۔ انہوں نے سب کو کور کرلیا۔ جسپال دوسری طرف مصروف تھا، اس نے ٹٹول کر اے سی پی کا دوسرا ریوالور نکال لیا تھا۔ نیچے پڑے سفید لباس والے نے بانیتا کور کو قابو کرنا چاہا تو بانیتا کور نے اس پر بھی فائر کر دیا۔ جسپال نے اے سی پی کی ٹانگ پر نال رکھی اور ٹرائیگر دبا دیا۔ جیسے ہی دونوں نے فائر کیا، اسی لمحے انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، اور پھر ایک دم سے ان سب کو چھوڑ کر وہ ایک طرف بھاگ نکلے۔ وہ بھاگتے چلے جا رہے تھے کہ ان کے ساتھ ایک ٹیکسی بھی دوڑنے لگی۔ گوپال نند اس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"آؤ بیٹھو۔"

اس کے ساتھ ہی ٹیکسی آہستہ ہوگئی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھے تو ٹیکسی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

"یار اتنی خطرناک جگہ پر بلایا تھا تو نے۔" جسپال نے گوپال نند کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں تو روز ادھر ہی آتا ہوں۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ

بھائی کی اس اے سی پی کے ساتھ لگ گئی ہے۔ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا، ضرور دادے نیچے لیول کی گیم ہوگی۔'' وہ بولا۔

''لیکن، ہم تو مارے جاتے نا، اب بھی پتہ نہیں کسی چوک پر دھر لیے جائیں۔'' بانیتا کور نے کہا۔

''دھیرج رکھو، اب کوئی ماں کا لال، اس علاقے میں سے ہمیں نہیں پکڑ سکتا۔'' وہ چہکتے ہوئے بولا۔

''اب، ہم کہاں جارہے ہیں؟'' بانیتا کور نے پوچھا۔

''کام مل گیا ہے، میں جس بندے سے ملوانے جا رہا ہوں، اس سے اتنی جلدی ملاقات ہو نہیں پاتی۔'' وہ اس لہجے میں بولا تو وہ کاندھے اُچکا کر رہ گئی۔

وہ ایک وسیع و عریض پرانے طرز کی حویلی تھی۔ وہ گیٹ پر ہی رک گئے تو ٹیکسی آگے نکل گئی۔ گوپال نند نے اگر اسے کرایہ نہیں دیا تھا تو یہی گمان کیا جا سکتا تھا کہ وہ انہی لوگوں کا آدمی ہوگا۔ گیٹ پر ہی ان کی تلاشی لے کر اسلحہ رکھ لیا گیا۔ ان میں وہ سروس ریوالور بھی تھا جو اس نے اے سی پی سے چھینا تھا۔ وہ نہتے ہو گئے تھے۔ وہ دونوں گوپال نند کے پیچھے چلتے چلے گئے۔ وہ حویلی کے اندر نہیں گیا، بلکہ اوپر سے گھوم کر حویلی کی پچھلی جانب بائیں باغ کے لان تک چلا گیا۔ جہاں کافی ساری کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ آس پاس چند سیکورٹی والے گھوم رہے تھے۔ وہ ان پر جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی دو ملازم مشروبات کے ساتھ کافی کچھ کھانے کو بھی رکھ گئے۔ گوپال انہیں سرو کر کے بولا۔

''یہ رام تیواری لعل جی کی آبائی حویلی ہے۔ اس وقت حکومت میں ہیں اور تین منسٹریز ان کے پاس ہیں۔''

''تو پھر تم نے ہمیں یہاں لا کر بہت بڑا رسک لیا ہے۔'' جسپال نے کہا۔

''ایسا شاید دِلی میں ہو سکتا تھا، یہاں تو یہ بے تاج بادشاہ ہیں۔ لو آپ آ گئے۔'' گوپال نند نے کہتے ہوئے سامنے دیکھا اور تومند سا چھوٹے قد کا سر سے گنجا شخص آتا ہوا دکھائی دیا جس نے کرتا پاجامہ اور واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں میں لیدر کے ہلکے سلیپر تھے۔ اس نے دور ہی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ویلکم ویلکم جی، بھئی ابھی تم لوگوں کی میں نے تعریف سنی، بہت دنوں سے میں ایسے ہی کسی بندے کی تلاش میں تھا۔''

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جی جو آپ کو فون پر بتایا۔'' گوپال نے خوشگوار لہجے میں کہا تو رام تیواری نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس نے بتایا تو ہوگا آپ کو لیکن ابھی تفصیلات نہیں بتا پاؤں گا۔ رابطے میں رہو۔ ہم کام بتا دیں گے۔''

''کام جو بھی ہو، وہ آپ کی مرضی کا، لیکن کرنا کیسے ہوگا، یہ ہم جانیں اور ہمارا کام۔'' جسپال نے کہا۔

''بس، ہماری طرف کوئی انگلی بھی نہ ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ایسا ہی ہوگا۔'' جسپال نے کہا تو وہ اٹھ گیا پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''ہم آپ جیسے لوگوں کی قدر کرتے ہیں، اس لیے ملنے ادھر ملنے کو آگئے، ورنہ اندر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، خیر ملتے رہیں گے باتیں ہوتی رہیں گی۔'' یہ کہہ کر وہ اُسی تیزی سے اندر چلا گیا۔

''چل، اب تم لوگوں کو چھوڑ دوں۔'' گوپال نے کہا تو وہ اس کے ساتھ باہر کی جانب چل پڑے۔ وہ گیٹ پر آئے تو سوٹ میں ملبوس ایک بندہ وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا پیکٹ انہیں دیتے ہوئے کہا۔

''یہ صاحب کی طرف سے آپ کو منہ دکھائی ہے۔''

اس پر جسپال نے گوپال کی جانب دیکھا اس نے لے لینے کا اشارہ کیا تو اس نے وہ پیکٹ لے لیا تو وہ شخص واپس حویلی کی طرف پلٹ گیا۔ وہاں گیٹ سے انہوں نے اپنے پسٹل لیے، سروس ریوالور وہیں چھوڑ دیا اور

باہر آ گئے۔ چند لمحوں بعد وہی ٹیکسی آ گئی۔ وہ اس میں بیٹھ گئے۔ گوپال نندان کے ساتھ ہی ٹیکسی میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھ گئے۔ ذرا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد گوپال نند نے جسپال سے کہا۔

''اتنی جلدی، اتنے بڑے بندے کے ساتھ ملاقات ہو جانا، کچھ عجیب سا نہیں لگا تمہیں؟''

''لگا تو ہے، میں تم سے یہ پوچھنے والا تھا، خیر تم بتاؤ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' جسپال نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

''میں تمہیں صاف بتا دوں، یہ سب اتفاق نہیں تھا، بلکہ میں نے اس کی پوری پلاننگ کی تھی، بولو تو ایک تیر سے تین شکار کیے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا سا خاموش ہوا، جس پر انہوں نے کوئی بات نہ کی تب وہ کہتا چلا گیا۔

''بانیتا کور کے بارے میں بہت سنا تھا، اس کے بہت دور تک تعلقات ہیں یہ بھی میں جانتا ہوں، لیکن خود کیا ہے، یہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ سوچا تھا کہ اس سے وہ کام لیا جائے جو ان دنوں ہمارے لیے وبال بنا ہوا ہے، لیکن ساتھ میں یہ سوال بھی تھا کہ یہ کرے گی؟''

''تو پھر؟'' بانیتا کور نے چبھتے ہوئے کہا۔

''میں نے پلان کیا، تمہیں جان بوجھ کر اس بار میں بلایا۔ ادھر پولیس کو انفارم کیا کہ اس بار میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ بار کے مالک اور اے سی پی کی آپس میں لگی ہوئی تھی۔ اسے موقعہ دیا گیا، کیونکہ بار کا مالک خود کو بھائی سمجھنے لگا تھا اور پچھلے کئی ماہ سے تیواری صاحب کو ہفتہ نہیں بھیج رہا تھا۔ تم لوگوں کا حوصلہ بھی دیکھ لیا، بار کے مالک کو سبق سکھا دیا اور اے سی پی کو اس کی اوقات یاد دلا دی، ہمارے کئی کام اڑا کر بیٹھا ہوا تھا۔''

''مطلب تم ہم پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم بہت خطرناک بندے ہو؟ ایسے ہی نا؟'' بانیتا کور نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم اسے جو مرضی سمجھ لو۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''چل روک ٹیکسی۔'' بانیتا کور نے ایک دم سے کہا تو ٹیکسی روک دی گئی۔ وہ دونوں اترے اور جسپال نے وہ پیکٹ واپس اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

''میں ایسا کوئی تحفہ نہیں لیتا، میرے ساتھ کام ڈن کرو تو اپنی مرضی سے لوں گا۔ واپس کر دینا تیواری کو۔''

وہ ایک مارکیٹ میں اتر گئے۔

کیا خیال ہے تمہارا، یہ گوپال نند......'' بانیتا کور نے مارکیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے کہنا چاہا تو جسپال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تبصرہ کیا

''اعتماد والا بندہ نہیں ہے۔''

''لیکن تم جانتے نہیں، یہ رام تیواری شکل سے جتنا احمق لگتا ہے، یہ اتنا ہی خطرناک ہے اور خفیہ والوں کے اندر تک رسائی رکھتا ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' بانیتا کور نے عام سے لہجے میں کہا۔

''چلو، دیکھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے موضوع ہی ختم کر دیا اور دوسری باتیں کرنے لگے۔ ایسے میں نوتن کور کا فون آ گیا کہ وہ ان کے ہاں پہنچ چکی ہے۔ کچھ دیر وہاں وقت گزارنے کے بعد وہ بنگلے کی جانب چل پڑے۔

نوتن کور ان کے انتظار میں بیٹھی سیل فون پر گیم کھیل رہی تھی۔ جسپال نے محسوس کیا کہ نوتن کا رویہ بانیتا کور کے ساتھ مودبانہ تھا۔ اس نے پاکستان میں ہونے والی تمام باتیں بتا دیں۔ پھر دو سیل فون نکال کر انہیں دیئے۔

''یہ وہاں سے تم لوگوں کے لیے تحفہ آیا ہے۔''

''ان میں کیا خصوصیت ہے۔'' بانیتا کور نے پوچھا۔

''یہ جدید ترین ٹیکنالوجی ہے، ابھی بلیک مارکیٹ میں ہے۔ ان سے تمہاری کال کہیں بھی ٹریس نہیں ہو گی۔ بے دھڑک جمال سے بات کر سکتی ہو۔'' نوتن کور نے کہا تو بانیتا کور کے چہرے پر انہونی خوشی پھیل گئی۔ چند لمحے بعد حسرت سے بولی۔

"میں اس سے تب ہی بات کروں گی جب میں اسے کوئی تحفہ دینے کے لائق ہوئی۔"

وہ رات گئے تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اس وقت صبح کے آثار واضح ہو رہے تھے جب جسپال نے جمال کو کال کر دی۔

☆......☆......☆

اس وقت میں سونے کے لیے بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ میرا اسیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے پر جوش لہجے میں جسپال سنگھ بولا۔

"کیسے ہو؟"

"اوئے جسپالے تُو؟ مطلب میرا تحفہ پہنچ گیا۔ اوئے کیسا ہے تُو؟"

"بہت ٹھیک ہوں۔ واہ گرو کی مہر ہے۔ ممبئی میں ہوں" اس نے چہکتے ہوئے کہا۔

"اُو خوش کیا۔ تو ایسے کر ساری صورت حال لکھ دے، پھر میں تجھے بتاتا ہوں کیا کرنا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، مجھے یہاں سیٹ اپ بنانے میں وقت لگ سکتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، اتنے دن موج کر، بانیتا کور بڑے دل والی ہے، وہ بڑی اچھی دوست بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن تیرے لیے بڑا جذباتی ہو جاتی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا

"وہ اس لیے کہ وہ خود بہت اچھی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے الوداعی باتیں کیں اور فون بند کر دیا۔ میرے اندر عجیب سا خوشگوار تاثر پھیل گیا تھا۔

میں سو کر اٹھا تو کراچی کے ماحول میں تیزی تھی۔ عام آدمی کے لیے وہی سیاست دانوں کی بیان بازی تھی اور آفیسروں کی طفل تسلیاں جاری تھیں۔ ان میں ایک اعلیٰ پولیس آفیسر ثناء اللہ عباسی کا بھی بیان تھا۔ وہ بہت حقیقت کے قریب تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ آفیسر اس معاملے کو گہرائی کے ساتھ جانتا ہے۔ میں نے وہ نام ذہن میں رکھ لیا۔

دوپہر کے بعد میں نے فریش ہو کر لیپ ٹاپ کھولا۔ مجھے یقین تھا کہ جسپال کی ای میل آئی ہوئی ہو گی۔ اس نے ممبئی کی ساری روداد لکھ دی، حتیٰ کہ رات اے سی پی اور رام تیواری کی بات بھی لکھ دی تھی۔ تمام حالات پڑھنے کے بعد میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ میرے خیال میں اب ممبئی میں کام کا آغاز ہو جانا چاہئے۔ میں نے اسے میل کا جواب دیا اور نوتن کور کا کچھ ہدایات دیں۔ مطمئن ہو کر نیچے آ گیا تو ڈرائنگ روم میں مہوش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس دارا بیٹھا ہوا گپیں لگا رہا تھا۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر دارا لنچ لگانے چلا گیا۔ مہوش نے بتایا کہ زویا اور سلمان واپس کراچی آ گئے ہیں۔ فہیم چونکہ لاہور ہی کا ہے، اس لیے اپنے گھر گیا ہوا ہے۔ واپسی پر اسے کراچی سے آیا ہوا کار گو لانا ہے۔ میں اور مہوش حالات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ گیت کا فون آ گیا۔

"ایک بری خبر ہے۔" اس نے تیزی سے بتایا۔

"وہ کیا؟" میں نے تحمل سے پوچھا۔

"کرامت جونیجو گروپ کو رات دھچکا ملا سو ملا، لیکن مخالف گروپ کا بھی علاقہ چھین لینے کی کوشش کی ہے۔"

"یہ بری خبر تو نہیں، اب یہ جرائم پیشہ کچھ دن آپس میں لڑتے رہیں گے، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اصل خبر تو اس کے پس منظر میں ہے، یہاں جس بندے کو لا رہے ہیں، وہ بہت بڑا ڈرگ کا سپلائیر ہے اور منشیات کی سپلائی کے لیے بچوں تک کو استعمال کرتا ہے۔" اس نے تیزی سے بتایا

"یہ بھی ان لوگوں کا عام کام ہے۔ ہمارے لیے بری خبر......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

"یہ ہے کہ انہوں نے بھتہ خوری آج ہی سے شروع کر دی ہے اور بوری بند لاشوں کی دھمکیاں عام بزنس مین کو بھی دینے لگے ہیں۔ کہیں ہم نے کم برے لوگوں کو ختم کر کے زیادہ برے لوگوں کو آگے تو نہیں کر دیا۔ وہ اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کریں گے۔"

"ان کے بڑوں کا پتہ ہے کچھ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو پتہ ہے ایک اہم سیاست دان ہے رضا ہمدانی، بظاہر بڑا تاجر ہے لیکن جرائم پیشہ ہے۔ وہی سب یہاں دیکھ رہا ہے۔ لیکن انہیں ختم کیسے کریں گے؟" گیت نے میری بات سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"تم اس کے بارے میں مجھے معلومات دو، کچھ کرتے ہیں۔" میں نے اسے کہا۔ تو وہ تیزی سے بتانے لگی۔ میں نے اسی لمحے روہی میں سرمد سے رابطہ کیا۔ وہ آن لائن تھا۔ میں نے اسے اپنی ضرورت کے بارے میں بتایا۔ اس نے کچھ دیر بعد بتانے کو کہا۔ میں مطمئن ہو گیا اور گیت سے کہا ابھی کچھ مزید تلاش کرے۔ میں اور مہوش اٹھ گئے۔ لنچ لینے کے بعد ہم دوبارہ کمرے میں آئے تو گیت کے پاس کچھ مزید معلومات تھیں۔ اس وقت تک سرمد کا فون آ گیا تھا۔ اس نے یہی بتایا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد آپ کو علی نواز کا فون آئے گا۔ میں کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ اس کا فون آ گیا۔ وہ سندھی تھا لیکن بلا کا حوصلے مند اور جرأت والا تھا۔ میں نے اپنا فون کمپیوٹر کے ساتھ منسلک کر دیا کہ سب لوگ بات سن لیں۔

"بہت کچھ سیکھا اور پھر بہت سنا ہے جی آپ کے بارے میں، بہت خوشی ہوئی کہ میں آپ کے کسی کام آ رہا ہوں۔" اس نے سندھی لہجے میں کہا۔

"مجھ سے سیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو شاید یاد نہیں، میں نے آپ سے نشانہ بازی سیکھی تھی روہی میں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی تھا۔" اس نے خوشی بھرے انداز میں بات کی۔

"علی نواز! تم میرے لیے نہیں انسانیت کے لیے کام کر رہے ہو۔ فرض کرو تمہارا بیٹا ہے اور کوئی اسے نشے کی لت میں اس حد تک لگا دے کہ وہ نہ مرا ہوا ہو اور نہ زندہ ہو تو تمہاری حالت کیا ہوگی۔" میں دکھی دل سے کہا۔

"میں آپ کے جذبات سمجھ گیا ہوں۔ آپ حکم کریں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"رضا ہمدانی کا نام سنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل سنا ہے؟" اس نے کہا۔

"ابھی، اس وقت وہ اپنے لگژری آفس میں ہے، میرا ایک دوست اور تمہارے جیسا بھائی تم سے بات کرے گا اور تم اس سے ڈن کر لو۔ آج شام سے پہلے پہلے اس کا وجود مٹ جائے۔" میں جذباتی ہو گیا تھا۔

"ہو جائے گا۔ بھائی سمجھو، میں انتظار میں ہوں۔" اس نے کہا تو میں نے فون بند کر کے جنید اور اکبر سے کہا کہ وہ فوراً اس سے ملنے کے لیے چلے جائیں۔ اسکرین پر رضا ہمدانی کی تصویر آ گئی تھی۔ یہ ان کی کسی سائیٹ سے اٹھائی ہوئی تصویر تھی۔ اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ عام لوگوں کی زندگی بچانے کے لیے اگر چند لوگ مار دیئے جائیں تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ میں نے گیت سے کہہ دیا کہ ایسے چند بندوں کے نام بتا دے۔ وہ اس کام میں لگ گئی۔

میں ان کے لیے سوچ رہا تھا کہ نوتن کور کا فون آ گیا۔

"میں انہی کے پاس ہوں، جس طرح کے بندے تم نے بتائے تھے، ان میں سے صرف ایک آدمی ملا ہے۔ نوجوان ہے، بنگلور کی سیلکون سٹی کا تربیت یافتہ ہے۔ اروند سنگھ نام ہے اس کا۔"

"اسے فوراً اُن کے پاس پہنچا دو۔ رونیت کور کو بھی

ادھر ہی بلا لو۔'' میں نے کہا۔

''وہ رات کسی وقت تک آ جائے گا۔ اس وقت وہ تھائی لینڈ میں ہے اور بنکاک ائر پورٹ پر ہوگا۔ وہ جب بھی ممبئی پہنچا، اس کے لیے قریب ہی ایک ہوٹل میں بکنگ ہے، وہ ادھر آ کر آرام کرے گا۔ پھر ہم اسے لے لیں گے۔'' نوتن کور نے تفصیل سے بتایا

''وہ جیسے ہی ادھر آئے تو مجھے بتانا، میں اس سے بات کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

کوئی دو گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران فہیم واپس آ گیا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے چار کارٹن لا کر رکھ دیئے۔ میں نے اسے تازہ صورت حال کے بارے میں بتایا تو وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ جیسے ہی علی نواز کے پاس جنید اور اکبر پہنچ گئے اور انہوں نے ساری بات اسے سمجھا دی تھی تو جنید نے مجھے فون کر کے سب کچھ بتا دیا۔ سامنے اسکرین پر وہ مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ علی نواز ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی ترشی ہوئی داڑھی، مونچھیں اور سرخ و سپید چہرہ۔ وہ مجھے اچھا لگا۔ تبھی فہیم نے کہا۔

''شام کے چار بج رہے ہیں۔ رضا ہمدانی اس وقت تک اپنے آفس ہی میں ہے۔ جیسے ہی تم لوگ وہاں پہنچو گے، میں سارے آفس کے نظام کو اپنے کنٹرول میں لے لوں گا۔ شرط یہ ہے کہ آفس میں داخلے سے پہلے اسی کمپنی کا کوئی ایک کارڈ حاصل کر لو پھر وہ آفس میرے قابو میں آئے گا۔''

''ہو جائے گا۔'' جنید نے کہا۔

''تو پھر سمجھو اس کا آفس کیسا ہے۔'' فہیم بولا پھر اس نے اسکرین پر اس کے آفس کا نقشہ ظاہر کر کے انہیں گائیڈ کرنے لگا۔

''اس کا آفس پورے کا پورا اس کے اپنے کنٹرول میں ہے۔ روڈ سے لیکر اس کے اپنے بیٹھنے والی جگہ تک کوئی بھی اس کی مرضی کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے وہ وہاں پر محتاط نہیں ہوگا۔ جب وہ نہیں ہوتا تو اس کی صورت حال کیا ہوتی ہوگی، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کارڈ میں نے اس لیے کہا ہے کہ سارے دروازے کارڈ ہی سے کھلتے ہیں۔ وہ کسی کا بھی ہو، میں اسی کارڈ کا استعمال کر لوں گا۔ تم لوگوں نے وہاں استقبالیہ پر نہیں جانا۔ سیدھے اندر داخل ہو جانا۔ باقی میں تمہیں وہیں پر گائیڈ کر دوں گا۔''

وہ تینوں وہاں سے نکل کر باہر آ گئے۔ وہ ریلوے کالونی کی بڑی گلیوں والا پرانا علاقہ تھا۔ جب تک وہ مین روڈ پر آئے، اس کے ساتھ چار پانچ گاڑیاں چل پڑی تھیں۔ عبداللہ ہارون روڈ سے آگے چورنگی کے مین روڈ پر پہنچتے ہوئے انہیں کوئی گھنٹہ لگ گیا۔ راستے میں اس نے اپنے لوگوں کو سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ انہوں نے گاڑیاں ایک طرف پارک کیں اور اس عمارت کے اطراف میں پھیل گئے۔ ہر کوئی اسلحے سے لیس تھا۔ ہم صرف وہی منظر دیکھ سکتے تھے، جو جنید اور اکبر کی رینج میں آتا تھا۔ وہ ایسا وقت تھا جب آفس بند ہونے والا تھا۔ وہاں سے دو تین لوگ نکل کر پارکنگ کی جانب گئے۔ علی نواز کے لوگوں نے انہیں وہیں دبوچ لیا ہوگا کیونکہ ذرا سی دیر بعد دو کارڈ ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔

''صرف ایک کارڈ ہی استعمال کرنا ہے جو پہلے جائے اس کے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ نہ ہو۔'' فہیم نے انہیں تیزی سے کہا تو جنید آفس کے اندر چلا گیا۔ علی نواز اور اکبر باہر ہی تھے۔ جنید اسکرین پر دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ آفس میں داخل ہوتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ جیسے ہی اس نے دروازے میں کارڈ ڈالا، ایک لمحے سے بھی کم وقت میں اسکرین پر ایک جھپکا آیا، پھر نارمل ہو گیا۔ تبھی فہیم کی آواز آئی ''دروازہ کھل گیا ہے۔ رضا ہمدانی کا سارا نظام اب

میرے قبضے میں ہے۔ کوئی کیمرہ نہیں چل رہا اور ہر دروازے میں کارڈ ڈالتے جاؤ، وہ کھلتا جائے گا۔"

"میں اور علی نواز اندر جا رہے ہیں۔" اکبر کی آواز آئی۔ علی نواز وہیں نیچے رُک گیا اور اکبر آگے کی جانب بڑھا۔ لفٹ کا دروازہ بھی کارڈ ہی سے کھلا۔ جنید لفٹ میں چلا گیا اس کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ اکبر نے اسے پسٹل دیا اور خود سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

جنید ایک راہداری میں پہنچ گیا تھا۔ نعیم نے اسے بتا دیا تھا کہ بالکل سامنے والا کمرہ رضا ہمدانی کا ہے، تمہارے پاس چند سیکنڈ ہیں۔ وہ اپنے کمپیوٹر کے پروگرام بند کر رہا ہے۔ اگر وہ کمپیوٹر بند ہو گیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ تبھی سائیڈ والے کمرے سے چند لوگ باہر آ گئے۔ انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کسی نے ایک دم سے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

ان کی ساری توجہ جنید کی طرف تھی۔ شاید وہ اسے پکڑنا چاہتے تھے لیکن ان کی یہ خواہش ادھوری رہ گئی۔ جنید ایک دم سے بیٹھ گیا تو اکبر ان پر فائر کرنے لگا۔ دو لمحے بعد وہ زمین بوس ہو چکے تھے۔ اس نے بیٹھے بیٹھے ہی کارڈ دروازے میں ڈالا، ایک دم سے الارم بج اٹھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ سامنے میز کی دوسری طرف رضا ہمدانی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی درجے کی حیرت اور پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے جنید کو دیکھتے ہی دراز میں ہاتھ ڈالا، تب تک اس نے میز پر فائر کر دیا۔ وہ پیچھے کی جانب الٹا۔ جنید اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے کمپیوٹر کی طرف دیکھا اور پسٹل کی نال اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت تک تمہیں نہیں ماروں گا جب تک تم خود نہیں چاہو گے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے کافی حوصلے سے کہا۔

"میں تم سے ایک ڈیل چاہتا ہوں۔ اٹھو اور اپنا کمپیوٹر کھولو، جلدی۔" اس نے دباؤ دیتے ہوئے کہا۔

"اور اگر میں نہ کھولوں تو" وہ ایک دم سے سمجھ گیا تھا کہ جنید کیا چاہتا ہے۔ کیونکہ نعیم نے بتا دیا تھا کہ الارم اس لیے بجا کہ اس نے اپنا کمپیوٹر بند کر دیا تھا۔

"تو پھر یہ لو۔" یہ کہہ کر اس نے اس کی ٹانگ پر فائر کر دیا۔ پھر دوسری پر کیا۔ وہ چیخنے لگا۔ ایسے میں راہداری میں فائرنگ ہونے لگی۔ دو بندے لفٹ کے ذریعے اوپر آئے تھے، اکبر نے انہیں پار کر دیا۔ یہی وہ وقت تھا، جب علی نواز اور اس کے بندوں نے ایکشن میں آنا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا لفٹ کے پاس چلا گیا۔

"جنید ختم کر دو اسے اور پلٹو وقت کم ہے۔" میں نے کہا تو اس نے سر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس نے ایک لمحہ کو اسے گرتے ہوئے دیکھا اور پلٹ پڑا۔ اکبر اور جنید ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے سیڑھیاں اُترتے چلے گئے۔ استقبالیہ والا ہال خالی تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے ہال میں آئے اور پھر باہر نکلتے چلے گئے۔ باہر گاڑیاں اسٹارٹ تھیں وہ مختلف گاڑیوں میں بیٹھے اور نکل پڑے۔

"جنید! اس کے باقی لوگوں کو چھوڑ کر صرف علی نواز کو اپنے ساتھ لے آ، میں نے کچھ بات کرنی ہے۔"

کوئی ایک گھنٹے بعد وہ لوگ پہنچ گئے۔ علی نواز کے لیے وہ کنٹرول روم کافی حیرت کا باعث بنا تھا۔ وہ فریش ہو چکے تو میں نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جرم کی دنیا میں یہ جو انڈر ورلڈ ہے نا اس میں صرف ایک چیز کے لیے سارا ہنگامہ لگا رہتا ہے کہ کس کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ذاتی فائدہ، ہی سب سے اہم ہے۔ لیکن میں یہ سب اپنے ذاتی فائدے کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں چند لمحے رکا اور پھر بولا۔

"تم سب کے ذہن میں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ تو پھر

یہ سارا سلسلہ کیوں؟ میں نہیں جانتا کہ کس کے بھی ذہن میں کیا ہے۔ مگر میں یہاں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اگر میری کوشش سے کسی کو رتی برابر بھی اختلاف ہو وہ خاموشی سے ہمیں چھوڑ کر جا سکتا ہے کیونکہ اب میں ایک بہت بڑا رسک لینے جا رہا ہوں۔"

"رسک، وہ کیا؟" گیت نے پوچھا۔

"وہ میں بعد میں بتاتا ہوں، پہلے میری بات سننے کے لیے تم سب خود کو تیار کر لینا۔" میں نے کہا۔

"او کے، تم کہو۔" سلمان نے کہا۔

"یہ جو ہماری پاکستانی قوم ہے، ان کے چہروں پر رونق کیوں نہیں ہے۔ احساس محرومی، ناامیدی، بے یقینی، ذہنی بیماری کیوں ہے؟ ان میں خودداری کیوں نہیں، ان کی عزت نفس کیوں محفوظ نہیں؟ وہ لوگ ہیں جو عزت، مال، جان کی قربانی دے کر بھی آج بھی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، اور وہ کون لوگ ہیں، جنھوں نے قربانیاں تک نہیں دیں اور وہ اس ملک کے سیاہ سفید کے مالک بن بیٹھے ہیں؟ اسی ملک پر حکومت کر رہے ہیں اور اسی عوام کو فتح کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں جو اسی عوام کی رگوں سے قطرہ قطرہ لہو نچوڑ رہے ہیں؟ انگریزوں نے جاتے ہوئے اس قوم سے بہت بڑا انتقام لیا، یہ نام نہاد اشرافیہ، چھوڑ گئے، جو آج بھی ان انگریزوں کے غلام ہیں۔ انہی کے ایماء پر اپنے مفادات کی خاطر اور انگریزی سازش کے تحت یہ اس قوم کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔ اسلام تو مساوات کا درس دیتا ہے۔ انصاف امیر اور غریب کے لیے ایک جیسا ہو۔ قانون کی پاسداری ایک جیسی ہو، جیسا حضرت عمرؓ نے کر کے دکھایا۔

کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک کے عوام بے وقوف ہیں کہ وہ اپنے ایسے نمائندے کیوں چنتے ہیں؟ وہ قوم جس کے پیروں میں جوتا تک نہیں ہوتا وہ ان کے جھنڈے اٹھائے کیوں پھرتے ہیں۔ یہ بات اس عوام کی ان قربانیوں کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ جو ہر طرح کی قربانی دے چکے ہیں اور دیتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ اب بھی سب کچھ کرنے کو تیار ہے کہ یہاں وہ نظام آئے، جس کے لیے پاکستان بنا۔ وہ کون لوگ ہیں جو دین اسلام کے نام پر آج بھی اس عوام کو سنہرے خواب دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ عوام تو آج بھی دین اور ملت کے لیے اپنا آپ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ وہ لوگ جو محب ملت و وطن ہیں، دین و ملت کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں، انہیں کس نے روکا ہوا ہے؟ پارلیمنٹ ہی کو لے لیں، ایک عام آدمی کو اس تک پہنچنے کے لیے کتنے بیریئر پار کرنا ہوں گے، دولت، قومیت، برادری ازم، صوبائی عصبیت، فرقہ بازی، یہ بیریئر کس نے بنائے، یہ نظام بنانے والا کون ہے؟ جس نے قوم کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا، ان میں اس حد تک تفریق پیدا کر دی کہ وہ کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ یہاں قانون ایک نہیں، امیر کے لیے قانون دوسرا ہے اور غریب کی تھانوں میں کھال اُدھیڑ دی جاتی ہے۔ نظام تعلیم ایک نہیں، تعلیم کا معیار دولت کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ علاج کی سہولت غریب کے لیے نہیں، لیکن غریب کے سرمائے سے نام نہاد اشرافیہ بیرون ملک سے اپنا علاج کرواتے ہیں۔ کس نے اس قوم کی سوچ فکر کو پیٹ میں بند کر دیا کہ ان کا شعور ہی کام نہ کر سکے۔ یہ وڈیرہ شاہی، جاگیرداری، سرمایہ داری ہے، جس نے اس ملک کا نظام بنایا ہوا ہے۔ یہ خون آشام اشرافیہ عوام کا لہو چاٹ کر بھی آزاد ہے اور عوام پس رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ اس نام نہاد بے غیرت اشرافیہ کو وہ پاکستان نہیں چاہیے، جس مقصد کے لیے پاکستان بنا تھا۔ یہاں محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام چلنا ہے۔ جو انسانی بقا اور حیات جاودانی کا باعث ہے۔ اس نام نہاد اشرافیہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام نہ لا کر دین سے علیحدگی اختیار کر لی ہے، یہ سراسر نافرمانی ہے۔

اسلام کے حقیقی ثمرات سے دور رکھنے والے یہی بے غیرت اشرافیہ ہے، جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام نہ لاکر ان ثمرات سے محروم کردیا اور یہ قربانیاں دینے والی قوم کے اُن جذبات سے کھیل رہے ہیں، جو وہ آج بھی محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام لانے کو بے تاب ہیں۔

یہ موجودہ نظام ایسا نہیں ہے جس میں قوم کی صلاحیتوں کو ملکی تعمیر و ترقی کے لیے پوری طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہاں تو قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں کہ کہیں یہ لوگ باصلاحیت یا ہنر مند نہ بن جائیں، بے روزگاری کا عفریت آج بھی نوجوان کو نگل رہا ہے۔ کیوں؟ کیا یہ نام نہاد اشرافیہ خود کو آسمانی مخلوق سمجھتی ہے؟

فلاحی مملکت میں ٹیکس کے عوض سہولیات دی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں ایک بھکاری بھی ماچس کی ڈبیا لیتا ہے تو وہ بھی اس پر ٹیکس دیتا ہے۔ عوام کو سرتاپا ٹیکس دینے والی مشین بنانے کے باوجود انہیں کوئی فائدہ نہیں۔ ٹیکس کے نام پر یہ وہ بھتہ ہے، جو روزانہ عوام دے رہے ہیں اور ہر ماہ بعد گیس، پانی اور بجلی کا ایک "ترقی پذیر بل" تھما دیا جاتا ہے۔ جس کی پوری طرح رسائی ہی نہیں ہے۔

پاکستان میں نہ تو دریاؤں کے پلوں کی توسیع ہوسکی اور نہ ہی نئے ڈیم بنانے کی روایات موجود ہے۔ ہر سال عوام کو غرق اور تباہ و برباد کرنے والے یہ کون لوگ ہیں؟ جن کا کوئی بھائی، بہن یا بیٹا کبھی نہیں ڈوبا، ان کے محلات قائم ہیں۔ کبھی سیلاب میں کسی کا محل ڈوبا؟ صرف قوم غوطے کھا رہی ہے۔ پھر عوام کی مدد کا ڈرامہ کرنے والے، ہر برس کرپشن کرپشن کا راگ الاپنے والے ہی درحقیقت اُمت کے دشمن ہیں اور قانون الٰہی، نظام مصطفیٰ کی مخالفت کا طوق گلے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ جعلی ہمدرد ہیں۔ جو ایک جال کی مانند ہیں تاکہ قوم اس سے نکل ہی نہ سکے اور پانی میں ڈوب کر مرتی رہے۔ عوام ڈوبتی رہے اور سر اٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ خدارا، شعور کی آنکھیں کھولو اور ان کے اصل چہرے دیکھو۔ ان کے پاؤں کے نیچے سے نکلو اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجاؤ۔ ڈیم بنانے میں رکاوٹ کون ہیں؟ یہ سیلاب میں ڈوبتی عوام یا بیرونی امداد کھانے والے بے غیرت اشرافیہ؟

اس نام نہاد اشرافیہ کو یہ معلوم ہے کہ جس دن قلندر لاہوری کا پیغام اس قوم نے پڑھ اور سمجھ لیا تو ہر انسان ایک تلوار ہوگا اور اگر ان بیس کروڑ تلواروں میں سے ایک کروڑ تلواریں بھی نکل آئیں تو کون کیا کرے گا؟ نام نہاد اشرافیہ کیا کرے گی، یہ لوگ تو پہلے ہی موت سے گذر گئے ہیں۔ بغیر تیغ وسناں، موت سے گزر کر یہ ملک حاصل کیا۔ اس قوم کے سامنے لا الہ الا اللہ ہی تھا۔ تو اب یہ محمد رسول للہ کے لیے کیا کچھ نہیں کرسکتے ہیں۔ نام نہاد اشرافیہ اور وہ لوگ جو اس ملک و قوم کے دشمن ہیں، یہ جان لیں جب پاکستان بنا تھا تو ان کے پاس کچھ نہیں تھا، آج ان کے پاس ضربِ حیدری ہے، وقت لگ سکتا ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام یہاں کوئی نہیں روک سکتا کہ یہ ملک بنا ہی اسی لیے ہے۔ اس ملک کی قبا اور عزت فقط یہی نظام ہے کیونکہ خودی کا سرنہاں لا الہ الا اللہ..... خودی کا سرعیاں محمد رسول اللہ۔ یہی میرا پیغام ہے اور یہی میرا مقصد۔"

میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگیا تھا۔ اس لیے کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے ہی کہا۔

"تم لوگ اگر سوچنا چاہتے ہو تو سوچ لو۔ جو رہنا چاہتا ہے رہے جو جانا چاہتا ہے چلا جائے۔"

میں نے کہا اور اٹھ کر اوپر چلا گیا۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا کیونکہ میں نے انہیں صاف بتادیا تھا، میں کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

مغرب ہوجانے کے بعد جب میں نیچے آیا تو سبھی کو اپنی اپنی جگہ دیکھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔

"مزید کوئی بات نہیں ہوگی، سب تمہارے ساتھ متفق

ہیں اور شاید ہم بھی یہی چاہتے ہیں کیونکہ ہماری اس دنیا میں رہنے کی وجہ بھی انتقام ہی ہے، جو اس معاشرے کی ناانصافی کے باعث پیدا ہوا۔ اب بتاؤ کرنا کیا ہے؟"

"وہ بھی بتا دوں گا، ابھی معاشرے کے ان ناسوروں کو ختم کرنا ہے، میرے خیال میں گیت تم نے....." میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

"تین بندے چنے ہیں ہیں میں نے۔"

"وہ علی نواز کو بتا دو۔ ادھر کراچی میں گیت، زویا اور سلمان رہیں گے، اکبر اور جنید ادھر آ جائیں۔ ہمیں اب ایک بڑے پراجیکٹ پر کام کرنا ہے۔"

"اوکے ہو گیا۔" سلمان نے کہا۔

"اب یہ کام جلد از جلد ہو جائے تو بہتر ہے۔" میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر باہر لان کی جانب چل دیا۔

☆......☆......☆

جسپال اور بانیتا کور کا حلیہ کافی حد تک بدلا ہوا تھا۔ وہ دونوں یوں دکھائی دے رہے تھے، جیسے کسی دفتر میں کام کرنے والا کوئی جوڑا ہو اور ابھی ابھی کسی دفتر سے اٹھ کر آئے ہوں۔ ان کے پاس پرانے ماڈل کی کار تھی جسے جسپال ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے جا رہے تھے۔ ان کا رخ ائر پورٹ کی طرف تھا، جس کے قریب ہی ایک ہوٹل میں اروند سنگھ آ کر ٹھہرا تھا۔ جس طرح کی معلومات اس کے بارے میں تھیں، وہ لوگ اسے بہت چھپا کر رکھنا چاہتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔ ان کے درمیان اروند کے بارے میں بہت دیر تک بات ہو چکی تھی۔

اس وقت وہ مہاتما گاندھی روڈ پر اگروال مارکیٹ کے پاس تھے۔ وہاں سے کچھ آگے انہوں نے ٹرن لے کر نہرو روڈ پر جانا تھا کہ بانیتا کور کا سیل بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا اور اضطراری انداز میں بولی۔

"رب خیر کرے، انکل زوردار سنگھ جی کا فون ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے کال رسیو کر لی اور ساتھ ہی اسپیکر آن کر دیا کہ جسپال بھی سن لے۔

"او پتر کہاں ہو تم؟" زوردار سنگھ نے پوچھا۔

"جی، ادھر ہی ہوں، ایئر پورٹ کی طرف جا رہی ہوں۔" اس نے جواب دیا

"وہ بات یہ ہے پتر کہ وہ سندیپ سنگھ نہیں ہے جو ڈاکٹر کے پاس ایڈمٹ تھا۔" اس نے سکون سے کہا۔

"جی، جی ہاں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"ڈاکٹر کا فون آیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کچھ لوگ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئے ہیں۔" بوڑھا زوردار سنگھ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"وہ کون تھے۔" بانیتا کور ایک دم سے پریشان ہو گئی

"یہ اسے نہیں معلوم ہوا، وہ اُسے گن پوائنٹ پر لے گئے ہیں۔" اس نے بتایا

"اب کیا ہو گا؟" وہ تشویش سے بولی۔

"تلاش کرتے ہیں، کہتا ہوں کسی کو کیونکہ میں تو سامنے نہیں آ سکتا۔" اس نے کہا۔

"اوکے، پھر ہم ہی اُسے دیکھتے ہیں۔ کہاں ہے اس کا اسپتال؟" بانیتا کور نے کہا تو زوردار سنگھ نے وہ پوری لوکیشن میسج کر دینے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ جسپال نے گاڑی روک دی۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت بڑا الارم ہے بانیتا؟"

"میں سمجھتی ہوں، ایسا ہی ہے۔ مگر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم سے غلطی کہاں پر ہوئی؟" بانیتا کور نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔ کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" جسپال نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"بظاہر سندو کا کسی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے پاس وہ پرسوں رات پہنچا، مطلب کوئی اس کی تاک میں

تھا؟ اگر کوئی اس کی تاک میں تھا تو کیا چاہتا ہے؟"

"بانیتا! دو طرح کے لوگ ہی ہیں جو اسے پکڑنا چاہتے ہوں گے۔ ایک وہ جنہوں نے اسے جزیرے کے لیے اغوا کیا تھا۔ دوسرا وہ جنہیں ہم نے مل کر مارا ہے۔ میرے خیال میں تیسری پارٹی ابھی کوئی ہے نہیں ۔"

جسپال نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اگر یہ بھی نہ ہوئے تو؟" بانیتا کور نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر سوچنا ہوگا۔ پھر معاملہ لمبا ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"دوسری بات یہ ہے کہ سندو بھی زوردار سنگھ جی کا نام جانتا ہے اور ڈاکٹر بھی۔ اگر تشدد کے ذریعے انہوں نے نام اُگل دیا تو میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔" اس نے غصے میں بھرے ہوئے لہجے میں کہا تبھی زوردار سنگھ کی طرف سے پیغام مل گیا۔ اس نے پڑھا اور زیر لب دھیمے سے بولی۔

"یہ تو کلابہ کا علاقہ ہے۔ یہاں سے کافی دور۔ اب ہمیں وہاں نکلنا ہوگا۔"

"دیکھو، جو ہونا تھا وہ ہوا، جنہیں مارنا ہوتا ہے وہ مار ہی دیتے ہیں اور اغوا کرنے والے ہمیشہ رابطہ کرتے ہیں۔ انتظار کرنا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی رابطہ تو ہوگا۔" جسپال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم جو کہہ رہے ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ وہ نام اگلوانے کے لیے......" بانیتا کور نے کہا۔

"اس اروند سنگھ جی کا کیا کرنا ہے۔ اب فیصلہ تمہارا ہے، اسے پہلے ٹھکانے تک پہنچائیں یا چلیں کولابہ میں؟" جسپال نے پوچھا۔

"میرے خیال میں نوتن کور کے ذمے لگاتے ہیں کہ وہ اسے ڈیل کرلے، ہم چلتے ہیں کولابہ۔ کیا کہتے ہو؟" اس نے جسپال کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اوکے۔" جسپال نے کاندھے اُچکاتے ہوئے کہا اور گاڑی بڑھا دی۔

راستے میں اس نے نوتن کور سے رابطہ کیا اور اسے صورت حال بتائی۔ پھر ان کے درمیان یہ رابطہ مسلسل رہا۔ یہاں تک کہ وہ کولابہ پہنچ گئے۔ ان کا ٹریکر بتارہا تھا کہ جانا کہاں ہے۔

وہ اسپتال کے سامنے تھے۔ نیلے رنگ کا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ انہوں نے کار پارک کی اور سیدھے ڈاکٹر جگدیش سنگھ کے کمرے میں جا پہنچے۔ وہ ادھیڑ عمر، پتلا سا، لمبے قد کا تھا۔ اس نے عینک لگائی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور اپنا تعارف کرایا۔ تب اس نے کہا۔

"ہاں ابھی بھائی زوردار کا فون آیا تھا۔ میں تو بہت پریشان ہوں۔ وہ بندہ آیا بھی پرسوں رات تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے کل ہی فارغ کر دوں لیکن......"

"وہ کون لوگ تھے، کوئی پتہ چلا؟" جسپال نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں اس وقت یہاں نہیں تھا، عملے کے لوگ ہی تھے۔ میں نے اس کے اغوا کے بارے میں ابھی پولیس کو بھی نہیں بتایا۔"

"آپ نے اس کی فائل تو نہیں بنوائی اور یہاں لوگوں کو......" بانیتا کور نے پوچھا۔ تو اس نے تیزی سے کہا۔

"نہیں، ابھی کچھ نہیں تھا۔"

"آپ پولیس کو اطلاع دے دیں۔ انہیں یہی بتائیں کہ اسے کچھ لوگ بے ہوشی کی حالت میں لائے تھے۔ ایک فائل تیار کرلیں اور اس میں کوئی بھی جعلی ایڈریس اور نام لکھ لیں کہ وہ یہی لکھوا گئے ہیں۔ آج انہی لوگوں نے آ کر اسپتال کے چارجز دیئے اور اسے لے گئے ہیں۔ جبکہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔"

"اور یہ کہ آپ کو پہلے ہی سے شک تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ایک دو دن دیکھنے کے بعد وہ مریض بالکل ٹھیک تھا۔" بانیتا کور نے کہا۔

''اوکے میں کہہ دوں گا، بلکہ ابھی پولیس بلوا لیتا ہوں۔ اب میں اس معاملے کو اپنے انداز میں دیکھوں گا۔ اب مجھے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا جائے۔ آپ لوگ جائیں اور وہ مریض جانے، میں مزید کچھ نہیں کر پاؤں گا۔'' اس نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔ اس کا یہ کورا پن دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ فورسز کو سب کچھ بتا سکتا ہے۔ انہیں ڈاکٹر جگدیش سنگھ کے کمرے سے نکلتے ہوئے کافی مایوسی ہوئی تھی۔ وہ اس لیے گئے تھے کہ اغوا کرنے والوں کا کوئی سراغ ملے۔ مگر انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

''اب بولو کیا کرنا ہے؟'' بانیتا کور نے راہداری میں چلتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے تو یہ ڈاکٹر ہی غلط لگتا ہے۔'' جسپال نے کہا تو بانیتا کور نے ایک دم سے چونک کر کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''ممکن ہے یہ زوردار سنگھ کو دھوکا دے رہا ہو؟'' اس نے تیزی سے کہا۔

''پھر بھی یہ سوال رہے گا کہ کیوں اور کون لوگ؟'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک لمبی بحث ہو سکتی ہے۔ بہت سارے سوال پیدا ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے، ہمیں زوردار سنگھ سے بات کر لینی چاہئے، ان کے پاس کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا۔ کوئی راستہ نکلے گا، پھر کرنا تو ہمی نے ہے۔ یہاں سے نکلو، پھر دیکھتے ہیں۔'' جسپال نے کہا تو وہ ایک دم سے مانتے ہوئے بولی۔

''اوکے ڈن۔ چلو۔''

دو دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے راہداری پار کر کے استقبالیہ ہال میں آ گئے۔ وہ وہاں رکے نہیں، آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

وہ اسپتال سے باہر آ گئے۔ اس دوران بانیتا کور نے فون کر کے پوری صورت حال زوردار سنگھ کو بتا دی۔ اس نے بھی آ جانے کو کہا۔ اس وقت وہ پارکنگ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایک دم سے چار لوگ کاروں کی اوٹ سے نکلے اور ان پر پل پڑے۔ ایک زوردار پنچ جسپال کی گردن پر پڑا تھا۔ اگرچہ وہ سہار گیا لیکن اس کے ساتھ دوسرے نے اس کے پیٹ میں لات ماری۔ یہی کچھ بانیتا کور کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اچانک افتاد پر وہ گھیرے تو گئے لیکن انہوں نے جیسے ہی مزاحمت کی ایک پانچواں بندہ ریوالور تانے سامنے آ گیا۔ اس نے بڑے کھردرے لہجے میں حکم دیتے ہوئے کہا۔

''رک جاؤ۔''

وہ چاروں انہیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے اور فوراً ہی انہوں نے بھی اپنے اپنے ریوالور نکال لیے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' جسپال نے پوچھا۔

''سوال کرنے کا حق صرف ہمیں ہے۔ صرف ہم نے پوچھنا ہے اور تم لوگوں نے جواب دینا ہے۔'' سامنے والے نے اسی کھردرے انداز میں کہا تو پارکنگ میں ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



اعترافِ جرم

ریاض بٹ

ساتھی میرے خلوص کی شدت کو دیکھنا
پھر آگیا ہوں گردش دوراں کو ٹال کر

قارئین! کچھ وقفے کے بعد ایک اور تفتیشی کہانی لے کر حاضر ہورہا ہوں۔ میری کی تکلف کے باعث میں گزشتہ دنوں کچھ لکھنے سے قاصر رہا' یہ سب آپ لوگوں کی دعائیں اور خلوص کا اثر ہے کہ میں دوبارہ قلم اٹھانے کے قابل ہوا ہوں۔ بہرحال میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ آپ کہانی پڑھیے۔

وہ چاند رات تھی' صبح عید سعید تھی۔ میں چند ضروری کام نمٹانے کے سلسلے میں تھانے میں موجود تھا' ہر چاند رات کو میں مینا بازار (جہاں چوڑیاں اور خواتین کی دوسری چیزیں فروخت ہوتی ہیں) میں پولیس اہلکاروں کو تعینات کرتا تھا یعنی ان کی ڈیوٹیاں لگاتا تھا۔ منچلے نوجوان خواتین کے ساتھ شرارتیں کرتے تھے اور ہم انہیں حوالات کی سیر کرواتے تھے۔ اس روز میں کچھ کاغذات پر سائن کررہا تھا کہ کانسٹیبل وزیر میرے کمرے میں داخل ہوا اور سیلوٹ کرکے گویا ہوا۔

"سر! قتل کی ایک اطلاع آئی ہے۔"

میں نے قلم روک کر وال کلاک کی طرف دیکھا' رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے' کام کے دوران مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا وہ غالباً جولائی کے آخری ایام تھے' گرمی عروج پر تھی۔

"بھئی ذرا اطلاع لانے والے بندے کو تو بھیجو۔" میں نے قلم رکھ کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر کے بعد ایک کی بجائے دو بندے میرے سامنے موجود تھے۔ ایک خوبرو جوان تھا اس نے شاید آج ہی شیو کی تھی رنگ گورا' آنکھیں بھوری تھیں' ہلکی ہلکی مونچھیں اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کررہی تھیں' اس وقت وہ پریشان لگتا تھا۔

دوسرا ادھیڑ عمر تھا اور صاحب حیثیت لگتا تھا' بات ادھیڑ عمر شخص نے شروع کی۔

تھانیدار صاحب! سرور کے گھر میں قتل ہوگیا ہے۔ لاش ایک کمرے میں پڑی ہے۔"

"کیا مطلب...... بات کچھ پلے نہیں پڑی' ذرا وضاحت کریں۔ کیسے قتل ہوا' مقتول کون ہے اور قتل کس نے کیا؟" میں نے جوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا وہ تھوک نگل کر بولا۔

"جناب! ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہمارے گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔"

"ڈاکو گھس آئے تھے......" میں نے زیر لب دہرایا۔

"جی ہاں! میں اور میری بیوی بھی ابھی بازار سے عید کی خریداری کرکے آئے تھے۔"

قارئین اس طرح بات بہت لمبی ہوجائے گی میں مختصراً آپ کی خدمت میں پیش کردیتا ہوں۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے جوان کا نام سرور تھا وہ اور

اس کی بیوی (گڑیا) کو بازار سے آئے ابھی دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ باہر دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ سرور سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے بغیر پوچھے دروازہ کھول دیا (کبھی کبھی انسان سے غیر ارادی طور پر ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں)۔ دروازہ کھلنے کی دیر تھی کہ دو ڈاکو جن کے ہاتھوں میں پستول تھے اور چہرے کالے کپڑوں میں چھپے ہوئے تھے' سرور کو دھکیل کر اندر آ گئے۔

اتنے میں سرور کی بیوی بھی کمرے سے باہر نکل آئی تھی' ایک ڈاکو نے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی جبکہ دوسرے نے سرور کو کور کرتے ہوئے کہا۔

"یہ پستول بالکل خاموشی سے بندے کو اِس جہان سے اُس جہان میں پہنچا دیتی ہے اس لیے تم بھی خاموشی سے انعامی بانڈ کی رقم ہمارے حوالے کردو۔ دیکھو کسی قسم کے جھوٹ کا سہارا نہ لینا' ہمیں پتا چل چکا ہے کہ کچھ دن پہلے تمہارا ایک لاکھ کا انعام نکلا ہے اور تم نے آج ہی وہ رقم حاصل کی ہے۔"

ڈاکو باخبر لگتا تھا مختصراً یہ کہ سرور نے رقم لا کر ڈاکو کے حوالے کردی لیکن ایک بالکل غیر متوقع بات ہوگئی اچانک اس ڈاکو نے جو سرور کی بیوی کی کنپٹی سے پستول کی نال لگا کر اچانک اپنے ساتھی کی طرف پستول کرکے ٹرائیگر دبا دیا اور ساتھ ہی اس کا منہ بھی اور اس وقت تک دبائے رہا جب تک وہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔

یہ تھی ساری کہانی...... پستول پر واقعی سائلنسر لگا ہوا تھا' اپنے ساتھی کی لاش چھوڑ کر دوسرا ڈاکو تو چلا گیا لیکن ہماری رات غارت کر گیا۔

ضروری کارروائی کرتے ہوئے صبح کی اذانیں ہوگئیں' لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج کر مجھے اپنے کوارٹر میں جانے کا موقع ملا' ہمارے لیے کیا عیدیں اور کیا چاند راتیں...... عید کی نماز پڑھ کر میں نے دوبارہ وردی پہنی اور تھانے میں چلا گیا۔

دونوں اے ایس آئی (ابرار اور شاہد) کو میں نے چھٹی دے دی تھی البتہ کانسٹیبل وزیر اور سپاہی بشارت تھانے میں موجود تھے کچھ اور اہلکار بھی موجود تھے۔

سب سے بڑا مسئلہ ڈاکوؤں کی شناخت کا تھا' مقتول تو ہمارے ہاتھ میں تھا لیکن قاتل لاپتا ہوگیا تھا۔ ہم نے اس کی نقاب کشائی کردی تھی یہ دونوں (سرور اور گڑیا) کے لیے اجنبی تھے دوسرا ڈاکو تو ظاہر ہے اپنے چہرے کا دیدار کروائے بغیر رفو چکر ہوگیا تھا اب اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پتا نہیں ہمیں کتنے چکر آنے تھے اور دوسروں کو کتنے چکر دینے تھے' ان دنوں اتنے ڈاکے نہیں پڑتے تھے کبھی کبھی ایسی وارداتیں ہو جاتی تھیں۔

میں نے سپاہی بشارت کو کمرے میں طلب کیا اور اسے چائے لانے کے لیے کہا لیکن چائے آنے سے پہلے کانسٹیبل وزیر میرے کمرے میں داخل ہوا' اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ٹفن کیریئر تھا اور اس نے جب اسے کھولا تو دودھ میں پکی ہوئی سویوں کی خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا شاید وہ اس دوران گھر چلا گیا تھا۔

بہرحال اگلے لمحے چائے بھی آگئی اور کانسٹیبل وزیر میرا حصہ مجھے دے کر باقی سویاں تھانے میں موجود عملے کے لیے لے کر چلا گیا۔

اس دن اس کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی' اگلے دن لاش اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ساتھ آئی' رپورٹ میں لکھا تھا کہ ریوالور کی نال کنپٹی سے لگا کر ٹرائیگر دبایا گیا ہے۔ موت کا وقت رات دس اور گیارہ بجے کا لکھا تھا' اب مسئلہ تھا لاش کا......

اس کی شناخت بھی ضروری تھی اور دفنانے وغیرہ کا مسئلہ بھی درپیش تھا ویسے ہم نے لاش کے چہرے

کے فوٹو بنا لیے تھے۔ اسی دن ہم نے یہ فوٹو مختلف تھانوں میں بھیج دیئے یہ تو وہ کارروائیاں ہوتی ہیں جو ہمیں ایسے کیسوں میں کرنی پڑتی ہیں۔

شام کو ہم نے لاش ایک رفاعی ادارے کے سپرد کردی اور انہوں نے ہماری اجازت سے اسے امانتاً دفن کردیا' ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کوئی کھرا کھوج نہیں تھا۔

کچھ باتوں کی تصدیق ضروری تھی لیکن عید کی چھٹیوں کی وجہ سے دو تین دن تک یہ بات ممکن نہیں تھی مگر ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتے تھے' کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا وہ ہم نے کیا کچھ پیشہ ور بدمعاشوں کو ہم نے تھانے بلالیا (یہ عید کے تیسرے دن کی بات ہے)۔

شام تک ان کے ساتھ مغز ماری ہوتی رہی' کچھ تشدد بھی کرنا پڑا لیکن ان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکا۔ وہ اتنے استاد بھی نہیں تھے کہ ہمیں دھوکا دے سکتے۔ شام ڈھلے ہم نے ان کو اس تاکید کے ساتھ چھوڑ دیا کہ جونہی انہیں اس کیس کے سلسلہ میں کوئی بات' کوئی کھرا کھوج ملے تھانے میں آ کر اطلاع دیں' ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو درپردہ ہمارے بہت کام آتے تھے۔

قارئین! میں آپ کو ایک بات بتاتا چلوں کہ ایک بدمعاش ہمیں میسر نہیں آسکا تھا اس کا اصل نام تو اللہ بخش تھا لیکن بخشو کہلاتا تھا سپاہی اس کے گھر بتا آیا تھا کہ جونہی وہ آئے اسے تھانے بھیج دیا جائے۔ وہ گھر یہی بتا کر گیا تھا کہ وہ لاہور جارہا ہے داتا دربار حاضری دے کر اور گھوم پھر کر آجائے گا۔ وہ عید کے دن گھر سے نکلا تھا اس کی غلطی یہ تھی کہ وہ تھانے میں بتا کر نہیں گیا تھا' ایسے بدمعاشوں کو ہم نے پابند کیا تھا کہ تھانے میں بتائے بغیر شہر سے باہر نہ جائیں' دال میں کچھ کالا نظر آرہا تھا۔

بخشو ایک دفعہ جیب کاٹنے کے جرم میں کچھ عرصہ جیل میں گزار آیا تھا اس کا ہاتھ لگنا ضروری تھا۔ اس دوران اے ایس آئی ابرار اور شاہد ڈیوٹی پر آچکے تھے' ابرار اس وقت میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

''سر! یہ کیس تو بہت الجھا ہوا ہے۔'' اس کی آواز سے میں خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو' دراصل ایسے کیسوں کی تفتیش مشکل ہوتی ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ ڈاکو وقتی بنے ہوئے تھے یعنی استاد نہیں تھے اور ایک ڈاکو نے شاید ساری رقم حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھی کو ہلاک کردیا۔''

یہ اس کے اناڑی پن کا واقعی ثبوت ہے' میں نے اپنے ذہن میں پکنے والے خیالات سے اسے آگاہ کردیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا اس کے ماتھے پر ابھری ہوئی لکیریں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ گہرائی میں جا کر سوچ رہا ہے۔

''سر! بخشو کے لیے کیا کرنا چاہیے۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔ وہ ایک ذہین بندہ تھا اور میں اس کے ذہن کو ٹٹولتا رہتا تھا۔

''اگر وہ دوسرا ڈاکو ہے تو سر! وہ لاہور میں وہیں گیا ہوگا جہاں ایسا مال خرچ کیا جاتا ہے۔''

''ویری گڈ! تم تو دور کی کوڑی لائے ہو لیکن موجودہ حالات میں یہ ایک ایسا چراغ ثابت ہوسکتی ہے جو ہمیں اس اندھیری گلی سے نکال سکے۔'' میں نے داد دیتے ہوئے کہا۔

وہ خوش ہوگیا اور ساتھ ہی اس کا ذہن مزید روشن ہوگیا اور وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔

''سر! مقتول کی تصویریں آپ نے لاہور بھجوائی

ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"سر! مجھے آپ مقتول کے چہرے کی ایک تصویر دے دیں، میں آج ہی لاہور روانہ ہو جاتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل وزیر کو طلب کیا۔

"یس سر! میرے لیے حکم؟" اس نے اندر داخل ہو کر مجھے سیلوٹ کرنے کے بعد کہا۔

جیسا کہ میری کئی تفتیشی کہانیوں میں ذکر آ چکا ہے کہ کانسٹیبل وزیر اسی شہر کا رہنے والا تھا اور اپنے تھانے کی حدود کے متعلق وسیع معلومات رکھتا تھا، خاص کر بازار حسن کے متعلق۔

"دیکھو وزیر! بخشو کے متعلق مجھے اب زیادہ فکر لاحق ہو گئی ہے۔ تم سفید کپڑوں میں بازار حسن کے چکر لگاتے رہو، باقی تم خود ذہین ہو۔"

"سر! آپ بالکل فکر ہی نہ کریں اگر وہ ہمارے تھانے کی حدود میں ہوا تو میری نظروں سے نہیں بچ سکتا۔"

"مجھے پتا ہے وزیر! تمہاری عقابی نگاہیں ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور اسے مزید تیز کرنے کے لیے ایک لطیفہ سنا دیا۔ لیجیے قارئین! آپ بھی سنئے اور اندازہ لگایئے کہ میں نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ خوشگوار ماحول میں کیسے حیرت انگیز نتائج حاصل کیے تھے۔

"استاد! شاگرد سے...... "بتاؤ پرندوں کی نظریں زیادہ تیز ہوتی ہیں یا انسان کی؟"

شاگرد۔ "جناب پرندوں کی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ اس طرح جناب کہ میں نے کبھی کسی پرندے کو عینک لگائے نہیں دیکھا۔"

کانسٹیبل وزیر اپنے مشن پر چلا گیا تو میں میز پر بکھرے کاغذات کو نمٹانے میں لگ گیا، اس دوران آفس بوائے چائے رکھ کر چلا گیا اور میں نے اس سے بھی دو دو ہاتھ کیے۔

شام تک مجھے پتا چل گیا کہ واقعی سرور کا انعامی بانڈ پر ایک لاکھ روپیہ انعام لگا تھا اور اس نے ڈاکے والے دن میں ہی رقم حاصل کی تھی۔

رات جب میں سونے کے لیے چارپائی پر لیٹا تو یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اٹھنے لگا کہ مقتول کے لواحقین میں سے ابھی تک کوئی بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ کیا اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا یا کوئی اور بات تھی؟

جو کچھ تھا حیرت انگیز تھا انہی سوچوں سے الجھتے الجھتے نہ جانے رات کے کون سے پہر نیند کی پری مجھ پر مہربان ہو گئی۔

دوسری صبح جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو قسمت کی دیوی بھی مجھ پر مہربان تھی۔ کانسٹیبل وزیر نے آ کر مجھے سیلوٹ کیا اور پُرجوش لہجے میں بولا۔

"سر! بخشو کے متعلق اطلاع ہے۔"

"کیا بھئی۔" میں نے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اسے امجد نے عید کے دن لاہور جانے والی بس میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔"

"اوہ اس کا مطلب ہے اس نے اپنے گھر والوں کو بالکل صحیح بات بتائی تھی۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بالکل سر! لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے۔"

"وہ بھی اُگل دو تا کہ تمہارے اندر کی کھٹ کھٹ ختم ہو جائے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"آخر بخشو ایسی کون سی ایمرجنسی ہوگئی تھی کہ اس نے تھانے میں بتائے بغیر لاہور کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔" اس نے اپنی طرف سے ایک اہم نقطہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہی بات تو غور طلب ہے خیر تم ہوشیار رہنا جونہی وہ نظر آئے اسے پکڑ کر تھانے لے آنا۔" میں نے اسے جانے کا اشارہ کرنے سے پہلے کہا' وہ چلا گیا۔

یہاں یہ بات بتانا مناسب ہوگا کہ امجد اڈے پر بسیں وغیرہ نکالتا تھا اور در پردہ ہمارا مخبر تھا کئی کیسوں میں اس نے ہماری بہت مدد کی تھی۔

میں نے لاہور کے اس تھانے کا نمبر ملایا جہاں ابرار گیا ہوا تھا خوش قسمتی سے وہ اس وقت تھانے میں موجود تھا۔ تھانے دار نے رسمی علیک سلیک کے بعد ریسیور کریڈل کردیا اس دور میں یہی سہولت ہمارے پاس تھی۔

وہ دن گزر گیا اگلی صبح ابھی میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی' تیسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھالیا۔

دوسری طرف اے ایس آئی ابرار بول رہا تھا اس نے بتایا کہ بخشو قابو آ گیا ہے لیکن ہمیں نہیں مل سکتا' میں نے ساری معلومات حاصل کرلی ہیں جو ہمارے کام آ سکتی ہیں باقی تفصیل میں آ کر بتاؤں گا۔

ریسیور کریڈل کرنے کے بعد میں نے کافی دیر سوچ کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔

"سر! ناشتا......" آفس بوائے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اوہ شفقت ...... رکھ دو۔" وہ ناشتا رکھ کر چلا گیا اور میں اس کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے لگا۔

ان دنوں میں تھانے کے قریب ملے ہوئے گھر

> **قلم کی نوک**
>
> انسان جب قلم سے کچھ لکھتا ہے تو وہ تحریر کسی کے لیے خوشی تو کسی کے لیے غم کا باعث ہوتی ہے۔ کسی کے لیے امرت تو کسی کے لیے زہر۔ کسی کی تقدیر بدل سکتی ہے تو کسی کا مقدر مٹا سکتی ہے۔ قلم کی نوک سے کسی کا سر قلم ہوتا ہے تو کسی کو سربلند بھی کیا جاتا ہے۔ قلم کی نوک سے کسی کے لیے آزادی کا سندیسہ ملتا ہے تو کسی کے لیے موت کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ قلم سے کسی کے نصیب کو چار چاند لگائے جاسکتے ہیں تو اسی قلم سے کسی نے نصیب پر سیاہی بھی مل دی جاتی ہے۔
>
> خنساء عبد المالک...... راولپنڈی

میں اکیلا رہتا تھا اور صبح کا ناشتا تھانے میں آ کر کرتا تھا۔

مجھے امید پیدا ہو چلی تھی کہ اب یہ کیس تیزی سے آگے بڑھے گا' وہی ہوا سہ پہر کو اے ایس آئی آ گیا اور اس نے جو کہانی سنائی اس کو سن کر میری سوچوں کے گھوڑے کسی اور سمت ہی دوڑنے لگے۔

لیجیے قارئین! آپ کہانی اسی کی زبانی سنیے۔

"سر! میں آپ کے کہنے کے مطابق بخشو کی سن گن لے رہا تھا لیکن مجھے کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ میرا زیادہ تر فوکس بازار حسن ہی تھا' میں مایوس نہیں تھا جب آپ نے فون پر مجھے بتایا کہ بخشو کو لاہور جانے والی بس میں سوار ہوتے دیکھا گیا ہے تو میں نے اپنی تگ و دو اور تیز کردی پھر......" وہ سانس لینے کے لیے رکا' کھنکار کر گلا صاف کیا اور دوبارہ گویا ہوا۔

کل رات وہ ہوگیا جس کے متعلق میں نے سوچا بھی نہیں تھا' تھانے دار صاحب کو اطلاع ملی کہ ایک مکان میں فحاشی کا اڈہ ہے اور اس وقت وہاں کھیل شروع ہے۔ انہوں نے وہاں کے اے ایس آئی کے

ساتھ کچھ سپاہی بھیج دیئے اور صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ آٹھ عورتوں اور تقریباً اتنے ہی مردوں کو لے کر آگئے ان میں بخشو بھی تھا یہ سب رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے اور پولیس نے ان کے رنگ میں جو بھنگ ڈالی تھی اس سے خاصے پریشان تھے۔

یہ اس تھانے کا کیس تھا لیکن بخشو سے ہمیں کچھ معلومات درکار تھیں' کچھ خاطر تواضع کروانے کے بعد اس نے بتایا کہ چاند رات کو اس نے چار پانچ جیبیں کاٹی تھیں۔ اس کے ہاتھ کافی رقم لگ گئی تھی' اس کا ارادہ تھا کہ وہ لاہور میں موج میلہ کرے گا اور جب پیسے ختم ہوجائیں گے تو واپس آجائے گا اور تھانے میں بتائے گا کہ عید تھی اس لیے وہ بتائے بغیر چلا گیا تھا یہ تو سر بعد کی بات تھی کہ ہم اس کے ساتھ کیا کرتے؟ اب تو اس کا موج میلہ لمبا ہوگیا ہے...... یہاں پہنچ کر اے ایس آئی نے توقف کیا پھر بولا۔

''سر! ایک اہم سراغ بخشو نے ضائع کردیا' یہ اس کی مجبوری تھی لیکن میں نے غصے میں آکر اسے دو تین تھپڑ جڑ دیئے تھے۔''

''اچھا......'' میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ''وہ کون سا سراغ تھا جس کے ضائع ہوجانے پر تمہیں غصہ آگیا تھا؟''

''سر! جب میں نے مقتول (ڈاکو) کی تصویر اس کو دکھائی تو وہ بولا میں نے اس کو مینا بازار میں دیکھا تھا پھر اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بتایا اس کی جیب بھی میں نے کاٹی تھی' اس کے بٹوے کے اندر اس کا شناختی کارڈ بھی تھا جو میں نے رقم نکال کر ایک جگہ پھینک دیا تھا۔'' میں نے ساری کہانی سننے کے بعد اے ایس آئی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی یہ تو بہت بڑا سراغ تھا' خیر گرے ہوئے دودھ پر منہ بنانے کا کیا فائدہ...... ان شاء اللہ جلد ہی کوئی اور راستہ نکل آئے گا۔''

پھر اے ایس آئی چلا گیا وہ اتنے دن باہر رہا تھا میں نے اسے ایک دن ریسٹ کرنے کی اجازت دے دی اور دوسرے اے ایس آئی کو بلالیا۔ جب وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''شاہد! میں نے تمہارے ذمہ جو ڈیوٹی لگائی تھی اس کا کیا ہوا؟''

''سر! اگر آپ نہ بھی بلاتے تو میں خود ہی حاضر ہونے والا تھا۔'' اس نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا پھر اس نے اپنی معلومات سے مجھے آگاہ کیا تھا۔

اس کا ذکر آگے آئے گا یہاں کچھ باتیں میں آپ کو بتا دیتا ہوں میں نے اور سپاہی انور نے سرور کے گھر جاکر اس سے اور اس کی بیوی گڑیا سے چھوٹا سا انٹرویو کیا تھا لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی تھی۔ علاوہ ازیں لاش کی جامہ تلاشی کے دوران بھی کچھ برآمد نہیں ہوا تھا۔ مجھے حیرانگی ہوئی تھی اور میں نے اس سلسلے میں سرور اور اس کی بیوی سے استفسار کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم ہر قسم کی قسم اٹھانے کو تیار ہیں ہم نے لاش کی جامہ تلاشی نہیں لی۔ اب تو یہ بات ہمارے علم میں آچکی تھی کہ سب کچھ تو بخشو لے گیا تھا۔

مگر اب یہ سوال سر اٹھا رہا تھا کہ مقتول مینا بازار میں کیا کررہا تھا؟ اس کا دوسرا ساتھی کون تھا؟ اور انہیں یہ کیسے پتا چلا تھا کہ سرور کا انعامی بانڈ پر ایک لاکھ روپیہ نکلا ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب ایک لاکھ روپیہ ایک بہت بڑی رقم تھی اس کے لیے بھائی بھائی کا گلہ کاٹ سکتا تھا۔ یہ اسی دن کی بات ہے کہ دس میل دور کے ایک تھانے کا ہیڈ کانسٹیبل دو آدمیوں کے ساتھ میرے پاس آیا' اے ایس آئی شاہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

جب وہ سب میرے سامنے بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ چکے تو میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''سر! ہم اس سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے ایک شناختی کارڈ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

شناختی کارڈ دیکھ کر میں اچھل پڑا' یہ تو مقتول کا شناختی کارڈ تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔

''یہ آپ کو کہاں ملا؟'' اے ایس آئی نے بے ساختہ پوچھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ آئے دو آدمیوں کو میں نے اب بغور دیکھا ایک کی عمر ساٹھ سال سے ایک دو سال اوپر نیچے ہوگی۔ رنگ اس کا گورا تھا' بائیں آنکھ میں شاید کوئی نقص تھا جبکہ اس کا ساتھی جوان تھا عمر بائیس اور پچیس سال کے اریب قریب ہوگی۔ میری تجربہ کار نگاہیں یہ کہتی تھیں کہ دونوں باپ بیٹا ہیں اور...... اچانک ایک اور سوچ میرے ذہن میں در آئی' مقتول کی شکل بھی ان سے ملتی تھی جب بزرگ بولے تو......

''تھانیدار صاحب! بات اس طرح واضح نہیں ہوگی۔'' اس نے آنکھ میں آئے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کہا۔

''فیاض میرا بیٹا ہے اس کو کسی نے مار دیا۔ وہ تو گھر یہ بتا کر آیا تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات جا رہا ہے۔ دس دن بعد آئے گا اس کی بیس ہزار کی کمیٹی نکلی تھی' آج ہمیں ڈاکیا اس کا شناختی کارڈ دے گیا تو......'' لگتا تھا ہیڈ کانسٹیبل ساری بات بتا کر اسے لایا تھا ہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ جس تھانے کا ہیڈ کانسٹیبل تھا وہاں ہم نے مقتول کے چہرے کی تصویر بھیجی تھی۔

کہانی کچھ یوں بنی کہ وہ تو بیٹے کی دس دن بعد واپسی کے منتظر تھے جب ان کو شناختی کارڈ ملا تو ان کی وہی حالت ہوئی جو کسی باپ یا رشتے دار کی اس وقت ہوتی ہے جب گھوڑا بغیر سوار کے واپس آ جائے۔ قارئین آپ سمجھ گئے ہوں گے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ بزرگ بیٹے کو لے کر اپنے حلقے کے تھانے میں گئے اور اب وہ یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

''بزرگو! یہ سب کچھ تو اپنی جگہ ہے لیکن آپ کا بیٹا ایک اور بندے کے ساتھ ایک گھر میں ڈاکہ ڈالنے گیا تھا۔''

''ڈاکہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب! میرا بھائی اور ڈاکو...... ناممکن' قطعی ناممکن۔'' چھوٹے بھائی نے تیزی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''حالات تو ایسے ہی ہمارے علم میں آئے ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کی جیب خالی ہو چکی تھی۔

''تھانے دار پتر! جس گھر میں وہ گیا' میرا مطلب ہے گئے تھے مجھے ذرا اس گھر تک تو لے چلو۔'' بزرگوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''پھر مجھے بیٹے کی لاش بھی لے جانی ہے۔''

''میرا خیال ہے سر! سرور کو یہیں بلا لیتے ہیں۔'' اے ایس آئی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں شاہد! تم انہیں......'' میں نے مقتول کے بھائی اور ہیڈ کانسٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وزیری بیرک میں لے جاؤ اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔'' میں نے ایک لمحے کو توقف کیا اور پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں بزرگوں اور سپاہی انور کو لے کر سرور کے گھر جاتا ہوں۔'' جب ہم وہاں پہنچے تو سرور گھر میں ہی تھا۔

"گڑیا تم......" بزرگوں نے سرور کی بیوی کو دیکھتے ہی چیخ نما آواز میں کہا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

میری چھٹی حس نے مجھے خطرہ سے آگاہ کر دیا' اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچے میں نے اسے پکڑ لیا اور اس کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"ہوش میں آئیں آپ میرے ساتھ آئے ہیں۔" اس دوران میں نے دیکھا کہ گڑیا کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا ہو گیا ہے۔ سپاہی انور بھی اس دوران ہائی الرٹ ہو گیا تھا لیکن اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سرور نے اندر کمرے میں بٹھا کر مجھے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

پھر ہم اسے لے کر تھانے میں آ گئے اس کی بیوی کا رونا ہم سے دیکھا نہیں جاتا تھا لیکن ہم اپنے فرض سے مجبور تھے۔ بزرگوں کا سر جھکا ہوا تھا بات ہی ایسی تھی کہ ان کا سر جھک گیا تھا اور ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

تھانے میں واپس آ کر بزرگ چپ چاپ اپنے بیٹے کو لے کر چلے گئے' میں نے لاش حاصل کرنے کا طریقہ انہیں بتا دیا تھا۔

ہم نے سرور کو کیوں پکڑا تھا اور وہ اس وقت حوالات میں کیوں تھا یہ میں بعد میں بتاؤں گا پہلے یہ سن لیں کہ میں نے اے ایس آئی شاہد کی کیا ڈیوٹی لگائی تھی اور اس نے کیا معلومات مجھ تک پہنچائی تھیں۔

میں نے سرور کے گھرانے کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے شاہد کی ڈیوٹی لگائی تھی' مجھے سرور کی کہانی پر شروع ہی سے تحفظات تھے۔

سرور جس مکان میں رہتا تھا یہ اس کے والدین چھوڑ کر مرے تھے' اس کا ایک بھائی اور والدین بس کے ایک اندوہناک حادثے میں جاں بحق ہوئے تھے۔ یہ اس کی شادی کے صرف دو ماہ بعد کی بات تھی' سرور کا اب آگے پیچھے کوئی نہیں رہا تھا' وہ گڑیا کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ وہی اس کا سہارا تھی' گڑیا ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی اس نے گھر کو جنت بنانے کا تہیہ کر لیا تھا لیکن اچانک وہ ہو گیا جس کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

اب سرور کے متعلق سنیئے جیسا کہ ذکر آ چکا ہے دونوں میاں بیوی چاند رات کو خریداری کرنے مینا بازار گئے تھے' ان کی واپسی کے کچھ دیر بعد اچانک چھت سے کوئی کودا' دھمک کی آواز سن کر دونوں میاں بیوی کمرے سے باہر نکلے' وہاں انہوں نے ایک ریوالور بردار کو دیکھا۔

"فیاض تم......" گڑیا نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں میں' تم تو گھر بسا کر بیٹھ گئی ہو میں دربدر بھٹک رہا ہوں۔ آج میں نے تمہیں اچانک مینا بازار میں دیکھ لیا پھر میں سائے کی طرح تم لوگوں کے ساتھ لگا رہا اور یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو گی ابھی تمہارا شوہر تمہیں طلاق دے گا اور......" وہ خاموش ہو گیا۔ سرور اس کی طرف بڑھنے لگا لیکن گڑیا نے اسے روک دیا اور دلیری سے بولی۔

"وہ میری ایک بھول تھی جوانی کی لغزش سمجھو لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ تم تو کلی کلی منڈلانے والے بھنورے ہو۔ میں نے ماں باپ کے پسند کیے ہوئے رشتے پر ہاں کہہ دی۔"

"تم چپ چاپ رات کے اندھیرے کی چادر اوڑھ کر دفع ہو جاؤ ورنہ......" سرور نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ فیاض حقارت سے ہنسا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے بڑی مشکل سے دیوار پھاند کر یہاں تک پہنچا ہوں اور تم لوگ کہتے ہو کہ خالی ہاتھ واپس چلا جاؤں۔" پھر اس نے

گڑیا کی طرف قدم بڑھائے تھے۔
لیکن اب یہ سب کچھ سرور کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا بقول اس کے وہ ایک صلح جو اور ٹھنڈے مزاج کا بندہ تھا لیکن جب اس قسم کے حالات ہو جائیں تو برف میں بھی آگ لگ جاتی ہے۔
اس نے پھرتی سے فیاض کے ریوالور والے ہاتھ کو پکڑ لیا اس وقت ویسے بھی اس میں مردانہ غیرت جاگی ہوئی تھی اس نے فیاض کا ہاتھ مروڑ کر ریوالور اس سے چھین لیا اور اس کی کنپٹی سے لگا کر کہا۔
''اب بھی وقت ہے چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ' ہمیں بھی جینے دو اور خود بھی زندہ رہو۔'' بات اس کی معقول تھی لیکن فیاض پتا نہیں کیا سوچ کر آیا تھا اس نے پستول چھیننے کی کوشش شروع کر دی اچانک گولی چل گئی اور فیاض گر کر تڑپنے لگا' یہ بات بھی سرور نے بتائی تھی کہ ریوالور پر سائلنسر فٹ تھا' وہ دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو گیا۔
دونوں میاں بیوی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے آخر کافی سوچ بچار کے بعد سرور نے تھانے میں آ کر مجھے وہ کہانی سنا دی جس کا ذکر شروع میں آ چکا ہے۔
کچھ باتیں مجھے کھٹک رہی تھیں لیکن ان کی وضاحت کرنے کے لیے فیاض نہیں آ سکتا تھا میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ سرور نے جان بوجھ کر فیاض کو نہیں مارا تھا' دوسرے فیاض ان کے گھر میں داخل ہوا تھا وہیں مرا تھا' میں نے سرور کا کیس سپردِ عدالت کر دیا۔
میں اس بندے کا مشکور تھا جس نے مقتول کا شناختی کارڈ لیٹر بکس میں ڈال دیا تھا لیکن قارئین ٹھہریئے! یہ تو سرور کا اعتراف جرم تھا میں اپنی بھی کوتاہی اور غلطی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ تھانیدار بھی انسان ہوتے ہیں وہ بھی کبھی کبھی حالات کے دھارے میں بہہ جاتے ہیں اور نادانستہ وہ بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔
جی ہاں...... یہ کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہے میں ایک میڈیکل اسٹور سے دوائی خرید رہا تھا کہ وہاں سرور اور اس کی بیوی سے ملاقات ہو گئی یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جن حالات میں فیاض کی موت واقع ہوئی تھی سرور کو زیادہ سے زیادہ پانچ سال قید کی سزا ہوئی تھی۔
دونوں کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا' جو ان کا بیٹا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی' وہ گھر انہوں نے بیچ دیا تھا آج کل یہاں رہ رہے تھے۔ میں نے آنے سے معذرت کی تو گڑیا بولی۔
''تھانیدار صاحب! پلیز ضرور آیئے گا آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''
''بھئی اب میں تھانیدار کہاں رہا ہوں' ایک عرصہ ہوا ریٹائر ہو چکا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
قصہ مختصر میں دو دن بعد ان کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا میرے منع کرنے کے باوجود گڑیا میری خاطر تواضع کرنے میں لگ گئی اس وقت ان کا بیٹا گھر میں نہیں تھا پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا' سرور نے دھیمی آواز میں کہا۔
''جناب! وہ قتل دراصل میں نے نہیں میری بیوی نے کیا تھا۔''
''کیا مطلب......؟'' میں اچھل پڑا۔
''بات اس طرح ہے اس رات گڑیا چوڑیاں اور لپ اسٹک دکان پر چھوڑ آئی تھی جب گھر آ کر ہمیں پتا چلا تو میں بازار کی طرف دوبارہ چلا گیا۔ واپس آ کر میں نے دیکھا کہ ایک بندہ مرا پڑا ہے اور گڑیا میرا ریوالور ہاتھ میں لیے سوگوار بیٹھی ہے پھر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اس نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

"صاحب! جونہی سرور دوبارہ بازار کی طرف گئے' دروازے پر دستک ہوئی میں سمجھی سرور کو کوئی بات یاد آ گئی ہے میں نے دروازہ کھول دیا لیکن وہ تو فیاض تھا۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا اندر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اس سے میں نے محبت کی تھی وہ ایک شریف نوجوان تھا' میری اور اس کی شادی نہ ہو سکی پھر میں نے والدین کی پسند کے آگے سر جھکا دیا اور اس کو بھول گئی۔ اتنے عرصہ بعد میں نے اسے دیکھا اور اس کی منت کرنے لگی کہ وہ چلا جائے میں کسی کی امانت ہوں' میری زندگی برباد نہ کرے۔" اس نے شیطانی مسکراہٹ چہرے پر سجائے ہوئے کہا۔

"تمہارا شوہر آدھے پونے گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گا' تم نے اپنا گھر بسا لیا میں در بدر پھر رہا ہوں۔ میں سب صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تنہائی کے چند لمحے مجھے دے دو' میں چلا جاؤں گا اور پھر کبھی تمہیں اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

"دیکھو فیاض! خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو' میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا' آخر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی میں نے کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو' میں لباس بدل کر آتی ہوں پھر تمہیں بیڈ روم میں لے جاؤں گی۔"

سرور نے اپنی حفاظت کے لیے سائلنسر لگا ریوالور رکھا ہوا تھا میں نے وہ نکالا اور باہر آ گئی۔ وہ دوسری طرف منہ کیے کھڑا تھا اور ہلکے سروں میں سیٹی بجا رہا تھا میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"چپ چاپ چلے جاؤ ورنہ میں اپنا گھر اور عزت بچانے کے لیے تمہارے سر میں سوراخ بھی کر سکتی ہوں۔"

"تم کرو گی سوراخ۔" اس نے غصہ دلانے والے انداز میں کہا۔ "میں تمہاری بے وفائی کا انتقام ضرور لوں گا۔"

میرا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا اور پھر غیر ارادی طور پر ٹرائیگر دب گیا اس کو چیخنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔" وہ خاموش ہوگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بہن! چپ ہو جاؤ' تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں اتنی محبت کرنے والا اور قربانی دینے والا شوہر ملا ہے۔"

اس کے بعد سرور نے کہا "صاحب! جب میں گھر واپس آیا تو گڑیا نے مجھے سب کچھ بتا دیا' میں نے ڈرامہ کیا آپ کے ساتھ۔ جس کے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے تھا کہ جلد یا بدیر یہ راز کھل جائے گا۔ میں نے گڑیا کو بڑی مشکل سے اور ہونے والے بچے کے مستقبل کا واسطہ دے کر راضی کیا کہ اگر یہ ڈرامہ فلاپ ہو جاتا ہے تو میں گرفتاری دے دوں گا۔ جی ہاں صاحب! ان دنوں ایک ننھی سی جان گڑیا کے پیٹ میں پرورش پا رہی تھی' کتنے دکھ اور پریشانی کی بات ہوتی اگر گڑیا جیل میں بچے کو جنم دیتی۔" وہ خاموش ہو گیا اور میں چپکے سے اٹھ کر بوجھل قدموں اور دکھی دل کے ساتھ ان کے گھر سے باہر آ گیا۔

آسمان کی ٹھوکر

رفعت محمود

کبھی کبھی انسان اپنے انجام سے بے خبر ایسے گناہ کر جاتا ہے جس کی اسے معافی بھی نہیں ملتی اور وہ تاحیات سزا کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔

ایک ایسے ٹھگ کی کہانی جس نے پیسوں کے لالچ میں ایک بڑھیا کی عزت داؤ پر لگا دی تھی۔

میرے والد صاحب ایک سرکاری ادارے میں چپراسی تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے پھل فروٹ کی ریڑھی لگانی شروع کر دی تاکہ گھر کا نظام چلتا رہے۔ میں ان دنوں میٹرک کر کے نوکری کی تلاش میں تھا مگر نوکری نہیں مل رہی تھی ابا جان چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے سابقہ محکمہ میں بطور چپراسی بھرتی ہو جاؤں مگر میں چپراسی نہیں بننا چاہتا تھا۔ میرے خواب بہت بڑے اور اونچے تھے میں میٹرک کے بعد مزید پڑھنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ میرے نمبر اتنے کم تھے کہ تھرڈ ڈویژن کو کسی کالج میں داخلہ نہ ملنا تھا میں سارا دن اِدھر اُدھر دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہتا ابا جان کو ریٹائرمنٹ پر جو رقم ملی تھی اس سے انہوں نے ایک تو میری بڑی بہن کی شادی کر دی اور باقی رقم گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے رکھ دی۔ مگر آہستہ آہستہ میں نے وہ بھی ختم کرا دی۔ یہی وجہ تھی کہ ابا جان اب آرام کرنے کے بجائے فروٹ کی ریڑھی لگاتے تھے جس سے دال روٹی چل رہی تھی۔ میں باوجود کوشش کے بھی کوئی نوکری حاصل نہ کر پایا تھا میری خواہشیں تھیں کہ دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھیں نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ ایک دن آئے گا میں بھی دولت میں کھیلوں گا میرے خوابوں کی تعبیر ملے گی۔ ابھی مجھے کوئی تعبیر نہ ملی تھی کہ میرے ابا جان کا انتقال ہو گیا اور گھر کا سارا بوجھ مجھ پر آن پڑا، مجبوراً میں نے ابا جان والی ریڑھی تھام لی اور فروٹ بیچنے لگا۔

شہر میں، میں جس جگہ ریڑھی لگاتا تھا اس کے قریب ہی لاری اڈہ تھا اس لیے وہاں کافی گہما گہمی رہتی تھی۔ ابا مرحوم کے وقت میں کافی اچھا کام چل رہا تھا مگر اب آہستہ آہستہ میرا یہ چھوٹا سا کاروبار خسارے میں جا رہا تھا۔ چونکہ مہنگائی زیادہ ہو گئی تھی اس لیے زیادہ تر لوگ منڈی جا کر فروٹ خرید لاتے تھے۔ غریب کے بس میں ہی نہ تھا کہ وہ فروٹ کھائے۔ حالانکہ میں دوسروں کی نسبت کم ریٹ پر فروٹ فروخت کرتا تھا مگر لوگوں کی شاید قوت خرید ہی کم ہو چکی تھی۔ ابا جان کی وفات کے بعد امی نے سادگی سے میری شادی اپنی بھانجی سے کر دی تھی۔ تین سال گزرے تو میں دو بچوں کا باپ بن گیا یوں میرے گھریلو اخراجات میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ مثلاً منڈی سے فروٹ لانے کا کرایہ، بچوں کے دودھ کے اخراجات، مکان کا کرایہ بل سب کچھ ہی بڑھ گیا اب ریڑھی سے جو بھی بچت ہوتی اس سے بمشکل گھر کا چولہا جلتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں دو ماہ مکان کا کرایہ ادا نہیں کر سکا تھا بچوں کا دودھ نہ لا پایا

تھا ہر طرف سے پریشانیوں نے مجھے گھیر رکھا تھا آخر کوئی تو حل ہوگا ان پریشانیوں کا؟ میں سوچتا اور الجھتا ہی جاتا میں سارا دن فارغ بیٹھا رہتا کبھی طبیعت بوجھل ہوتی تو ریڑھی لے کر ساتھ والے محلہ میں چلا جاتا اور وہاں کا ایک چکر لگا کر پھر اپنے اڈہ پر آجاتا سارا دن اِکا دُکا گاہک آتے یوں بعض دفعہ نفع کی بجائے نقصان ہوجاتا کہ کچھ فروٹ خراب ہوجاتا، میں اس عالم میں بھی اپنے پروردگا کو یاد نہ کرتا، ابا جان پکے نمازی تھے مگر میں نے نہ کبھی نماز پڑھی اور نہ ہی اپنے پروردگار کو یاد کیا تھا خوابوں اور خیالوں کی دنیا نے مجھے مذہب سے دور کردیا تھا، جمعہ کی نماز میں کبھی کبھار ہی پڑھا کرتا تھا میں کتنا بدبخت تھا کہ میں اپنے رب سے کرم کی بارش کی امید لگائے بیٹھا تھا مگر اس کی بندگی کو بھول گیا تھا وہ کتنا بے نیاز ہے کہ پھر بھی مجھے رزق تو دے رہا تھا۔

اس روز بھی اِکا دُکا گاہک ہی آئے تھے بس یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ آج اتنی کمائی ضرور ہو جائے گی کہ میں مکان کا کرایہ ادا کرسکوں گا مگر آہستہ آہستہ میری امیدوں پر اوس پڑنے لگی تھی شام ہونے والی تھی اور لاری اڈہ پر بھی مسافروں کا ہجوم کچھ کم ہونے لگا تھا۔ میں نے روزانہ کی بکری گنی، ابھی ایک ہزار روپے کم تھا۔ کرایہ کی رقم پوری نہ ہوئی تھی میری نگاہیں مسافروں کا جائزہ لے رہی تھیں کہ شاید کوئی فروٹ خریدنے آجائے مگر یوں لگتا تھا کہ جیسے میری ریڑھی کسی کو نظر ہی نہیں آرہی ہے اور میں جو آوازیں لگا رہا ہوں ''آم اسی روپے کلو، آلو بخارہ سو روپے کلو'' میری آوازیں بھی کوئی نہیں سن رہا ہے۔

دفعتاً میری نظر ایک بڑھیا پر پڑی وہ میری مستقل خریدار تھی اور اکثر فروٹ خریدتی رہتی تھی مگر وہ بہت کم مقدار میں خریدتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ غریب تھی لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی اسے آتا دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ تو خریدے گی ہی۔ اس نے آتے ہی ہزار روپے کا نوٹ نکالا میں نے ہزار کا نوٹ دیکھ کر دل میں سوچا کاش یہ آج ہزار روپے کی خریداری کرے۔

''بیٹا، آم کا ریٹ کیا ہے؟''

''اسی روپے کلو، ماں جی۔'' میں نے بتایا۔

''اچھا پھر ایک کلو دے دو۔'' بڑھیا نے ہزار کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے اماں جی، آج تو بڑے نوٹ اٹھائے ہوئے ہو۔'' میں نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔

''بس بیٹا، آج تنخواہ ملی ہے۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آج زیادہ فروٹ خرید لیں نا، ہوسکتا ہے بعد میں پیسے نہ ہوں آپ کے پاس۔'' میں نے اپنا مطلب سیدھا کرنا چاہا۔

''بیٹا، میں اتنے فروٹ کا کیا کروں گی میں اکیلی جان ہوں، اس بھری دنیا میں کوئی بھی تو نہیں ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے افسوس کرتے ہوئے آم تول کر انہیں پکڑا دیے۔

''بس بیٹا، بھلی بری گزر رہی ہے۔'' بڑھیا کچھ سوچتے ہوئے بولی اور آم لے کر چل دی۔ مگر چند قدم آگے جانے کے بعد واپس پلٹ آئی اسے یاد آ گیا تھا کہ اس نے بقایا رقم تو لی ہی نہیں اس کے قریب آنے سے پہلے ہی میں نے بہت کچھ طے کرلیا تھا میری نیت بدل گئی تھی میں اس کو بقایا واپس نہیں کروں گا۔

"بیٹا بقایا پیسے تو دے دے، مجھے یاد ہی نہیں رہا بڑھاپے نے مت ماردی ہے۔" اس نے میرے قریب آ کر خود کو کوستے ہوئے کہا۔

"کون سا بقایا؟" میں انجان بن گیا۔ بڑھیا حیران و پریشان ہو کر مجھے دیکھنے لگی اسے مجھ سے یہ توقع نہیں تھی۔

"بیٹا، وہی بقایا جو میرا بنتا ہے ابھی میں نے تمہیں ہزار کا نوٹ پکڑایا ہے نا۔"

"کون سا ہزار کا نوٹ اماں تم نے تو مجھے پوری رقم دی ہے یہ دیکھو اسی روپے۔"

"دیکھ بیٹا، ایسا مت کر میں تیری ماں جیسی ہوں اور بڑی مشکل سے گزارا کرتی ہوں یہ میرے ایک مہینے کا خرچہ ہے اب ایک ماہ بعد تنخواہ ملے گی بیٹا مجھ پر ترس کھالے تو میری مدد نہیں کرسکتا تو مجھے لوٹنا کیوں چاہتا ہے۔"

"اماں لگتا ہے تیری مت ماری گئی ہے تو مجھے ذلیل کیوں کرنا چاہتی ہے کیا میں اپنی دن بھر کی کمائی تجھے دے دوں؟" میری آواز تھوڑی اونچی ہوگئی کچھ ہی دیر میں میری ریڑھی کے قریب کافی لوگ جمع ہوگئے۔

"بھائی کیا مسئلہ ہے؟" ایک نے پوچھا۔

"مسئلہ کیا ہونا ہے بھائی، یہ بوڑھی دھوکے سے میرے پیسے ہتھیانا چاہتی ہے کہتی ہے میں نے اس سے ہزار کا نوٹ لیا ہے حالانکہ سارا دن میرے پاس ہزار کا نوٹ ہی نہیں آیا۔" میں نے بڑھیا پر الزام لگا دیا تھا۔

مگر بڑھیا اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی اور میں بھی اپنے بیان پر ڈٹ گیا میں نے اس طرح بڑھیا کو دھوکہ باز ثابت کیا کہ میں خود بھی حیران تھا لوگوں کو بھی یقین آ گیا کہ میں سچا اور بڑھیا جھوٹی ہے۔

جسمانی آرائش

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "ہمارے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کی غرض سے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آدمی کے پاس کوئی کنگھا نہیں ہے جس سے یہ اپنے بالوں کو درست کر لیتا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے آدمی کو دیکھا جس نے میلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کیا اس آدمی کے پاس وہ چیز (صابن وغیرہ) نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑے دھو لیتا۔ (مشکوٰۃ)

مرسلہ: شہروز..... کراچی

"دیکھ بیٹا تو نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے نا میرا سوہنا رب تجھ سے اس کا حساب ضرور لے گا۔ تجھ پر خدا کا قہر نازل ہوگا، اس جہاں نہ ہوا تو اگلے جہاں سہی۔"

میری آنکھوں پر لالچ اور خود غرضی کی پٹی بندھ گئی تھی میرا ضمیر مردہ ہوگیا تھا میں نے ہزار روپے کی خاطر اپنا ایمان بیچ ڈالا اور اپنا مستقبل شاندار بنانے کی خاطر بڑھیا کی دنیا تاریک کردی۔

"جاؤ اماں جاؤ، اپنی مکاری اور فریب کسی اور پر آزماؤ، میں تمہارے جال میں نہیں آؤں گا۔" بڑھیا روتی ہوئی چلی گئی اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے لگتا تھا ابھی چکرا کر گر پڑے گی کچھ لوگ افسوس کر رہے تھے اور بڑھیا کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور توبہ توبہ کر رہے تھے۔

پھر اچانک وہ ہوا جس کا کوئی تصور بھی نہ کرسکتا

تھا۔ بڑھیا پریشانی کے عالم میں سڑک کے درمیان چلنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تیز رفتار جیپ نے اسے ٹکر ماردی اور یہ جا وہ جا لوگ بھاگ کر وہاں گئے، دیکھا تو بڑھیا مر چکی تھی۔ آموں کا لفافہ دور جا کر گرا تھا اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی کچھ ہی دیر میں ایمبولینس آ گئی اور بڑھیا کی لاش اسپتال لے گئی اب اس کی موت پر تبصرے ہونے لگے لوگ کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے

''توبہ ہے بھئی بڑھیا کو اس عمر میں بھی ایسی حرکتیں کرتے ہوئے شرم نہ آئی۔''

''وہ تو نوید صاحب کو بددعائیں دے رہی تھی اور خود ہی چل بسی۔'' ایک دوسرا شخص بولا۔

''جناب، اللہ تو دیکھ رہا ہے جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود ہی اس میں گرتا ہے۔''

''نوید صاحب، مبارک ہو اللہ نے بہت جلد آپ کی بے گناہی ثابت کردی۔''

''میں تو پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ نوید جیسا انسان ایسی گھٹیا حرکت کیسے کر سکتا ہے۔''

غرض تمام لوگ اس قسم کی گفتگو کرنے لگے، اس واقعہ کے بعد مارکیٹ میں میرا مقام بہت ہی بلند ہو گیا، ہر شخص بڑھیا کی مکاری کو بڑھا چڑھا کا بیان کر رہا تھا۔ مگر چند لوگ خاموش تھے۔ شاید انہیں ابھی تک بڑھیا کے مجرم ہونے پر شبہ تھا مگر مجھے کیا میری واردات تو کامیاب ہو چکی تھی مجھے اس بڑھیا کے لٹنے اور مرنے کا کوئی افسوس نہ تھا۔ میں نے ریڑھی لی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

آج میری جیب معمول سے زیادہ بھری ہوئی تھی اور پھر مارکیٹ والوں پر میری شرافت، بڑائی اور بزرگی کا سکہ بیٹھ گیا۔ لوگ مجھے سچا اور اللہ کا پسندیدہ انسان سمجھنے لگے اتنا کہ وہ مجھ سے فروٹ خریدنے کو بابرکت سمجھنے لگے۔ آہستہ آہستہ میری بکری بڑھنے لگی اور میرے گھر کے، بچوں کے اور دیگر مالی مسائل حل ہونے لگے میں اپنی عقل مندی پر ناز کرنے لگا۔

اس واقعہ نے میرے حالات اور زندگی ہی بدل ڈالی، مارکیٹ کے مالک نے میرے کردار سے متاثر ہو کر اپنی مارکیٹ میں نہایت مناسب کرایہ پر دکان دے دی اور میں ریڑھی چھوڑ کر دکان میں آ گیا اب میرا پہلے سے چار گنا فروٹ فروخت ہونے لگا شام تک میرا سارا فروٹ فروخت ہو جاتا۔ میرا کاروبار بڑھنے لگا یعنی دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا میرے رہنے کا انداز بدل گیا گھر میں خوشحالی آ گئی ضروریات زندگی کی ہر چیز میں نے خرید لی، پھر میں نے دکان چھوڑ کر فروٹ منڈی میں دکان لے کر ہول سیل کا کام شروع کر دیا۔ میں نے تین ملازم بھی رکھ لیے۔ اب میں اپنے ہاتھوں سے کوئی کام نہ کرتا تھا اور ملازموں سے کام لیتا تھا اب میں ریڑھی والا نوید نہیں بلکہ سیٹھ نوید کہلانے لگا۔ میں نے ایک کالونی میں کوٹھی لی اور وہاں شفٹ ہو گیا۔ میرا کام اور کاروبار دن بدن بڑھنے لگا۔ پھر میں نے امپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس حاصل کر لیا اور فروٹ انگلینڈ اور متحدہ عرب میں بھیجنے لگا۔ اب میرے پاس بینک بیلنس گاڑی اور کوٹھی سب کچھ تھا۔ میری یہ خواہش تھی کہ میری بیٹی اور بیٹا دونوں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں میں ان کو مہنگے تعلیمی اداروں میں تعلیم دلاؤں مگر وہ دونوں ہی اس معاملہ میں کھوٹے نکلے۔ انہیں پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی انہوں نے مشکل سے میٹرک کا امتحان پاس کیا گھر میں دولت کی ریل پیل نے ان کو بگاڑ

ڈالا۔ انہیں دن رات نت نئے فیشن کرنے کا شوق تھا میں نے بیٹے کو کاروبار میں ساتھ لگانے کی بہت کوشش کی مگر اسے کاروبار سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی اسے نوٹوں سے غرض تھی جو اسے آسانی سے مل جاتے تھے اسی آزادی اور دولت نے اسے بگاڑ ڈالا۔ اس کے دوست ہی اسے لوٹنے لگے تھے۔ میں نے اسے سدھارنے کی بہت کوشش کی مگر میرے اور اس کی ماں کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ ڈالا تھا گھر میں دولت کی ریل پیل تھی ہر کمرے میں ٹیلی فون، ٹی وی اور ڈی وی ڈی تھا۔ ہر طرف خوشیاں اور خوشحالی تھی ان میں کھو کر میں ماضی کو بھول ہی گیا تھا ان لمحات میں مجھے ایک بار بھی اس بڑھیا کی یاد نہ آئی جسے میں نے ٹھگ لیا تھا اور جس کی موت کا ذمہ دار بھی میں ہی تھا ہاں میں ہی تو اس کا قاتل تھا میرے اس کاروبار کے عروج میں اس کا لہو بھی شامل تھا۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود میں بدبخت ہی رہا کہ میں نے اس عالم میں نہ اپنے رب کو یاد کیا اور نہ ہی اس کا شکر کیا حالانکہ یہ سب اس کا کرم تھا اس کی دین تھی اس کی آزمائش تھی میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ یہ سب میری دن رات کی محنت کا پھل ہے۔ کہ میں فرش سے عرش تک آ گیا ہوں مجھے تو نماز پڑھنے کی بھی توفیق نہ تھی البتہ کبھی کبھار جمعہ کی نماز پڑھ لیا کرتا تھا اس کے علاوہ میں کوئی فرض ادا نہ کرتا تھا میں نام کا مسلمان تھا۔

مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ میں ہواؤں میں اُڑنے لگا تھا مگر میرا بیٹا نشہ کرنے لگا تھا اس انکشاف نے مجھے بہت پریشان کر دیا تھا ریاض اب راتوں کو بھی گھر سے باہر رہنے لگا تھا گھر میں جب بھی وہ آتا تو ماں سے پیسے لے کر گھر سے باہر نکل جاتا میں دن رات اس کے لیے پریشان رہنے لگا۔ میں اسے ڈھونڈ کر گھر لاتا تھا کئی ڈاکٹروں سے علاج بھی کرایا مگر کچھ حاصل نہ ہوا ریاض سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا۔ میں تین دن سے اسے تلاش کر رہا تھا وہ گھر نہ آیا اس کی ماں بھی رو رہی تھی چوتھے دن اس کی لاش ایک ویران میں پڑی ہوئی ملی اس روز میں بہت رویا تھا میرا ایک بازو مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ ریاض کی موت نے ہمیں بہت دکھی کر ڈالا تھا۔

ہم بیٹی کی طرف سے پہلے ہی بے پروا تھے مگر اب ریاض کے غم میں کھو کر ہم اور بھی غافل ہو گئے سلمٰی کا کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا۔ کافی دنوں سے سلمٰی کچھ پریشان لگ رہی تھی وہ ہم دونوں کے سامنے کم ہی آتی اور اپنے کمرے میں ہی بند رہتی ایک دن اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اسے بخار تھا اور ساتھ ہی الٹیاں بھی ہوئی تھیں۔ اس کو زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا چیک اپ کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ سلمٰی ماں بننے والی ہے۔ یہ ایک اور تازیانہ تھا جو ہم پر برسا تھا سلمٰی نے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔ نجانے وہ کس کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی تھی۔ اس نے تو ہماری غیرت کا جنازہ ہی نکال دیا بڑی مشکل سے اس کا بچہ ضائع کرایا گیا۔ جب سلمٰی کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو ایک رات وہ گھر سے اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔

وہ اپنے ساتھ ڈھیر د زیور اور رقم بھی لے گئی اس نے ہمارے نام یہ پیغام چھوڑا کہ اب اسے تلاش نہ کیا جائے کیونکہ وہ اب بھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

یہ دوسرا زخم تھا جو میری اولاد نے میرے سینے میں لگایا تھا زندگی مجھے یہ دن بھی دکھائے گی میں

نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اولاد کے دکھ نے میری کمر ہی توڑ کر رکھ دی۔ میں نے دوسروں کی نگرانی میں فروٹ ایکسپورٹ کیا تھا مگر وہ فروٹ صحیح نہ نکلا تو انگلینڈ اور متحدہ عرب امارات والوں نے میری کمپنی پر پابندی لگا دی اور میرے خلاف شکایت ہماری حکومت کو بھیج دی۔ حکومت پاکستان نے میرا لائسنس منسوخ کر دیا میں اپنا لائسنس بحال کرانے کے چکر میں اسلام آباد گیا ہوا تھا میں نے بہت کوشش کی سفارش بھی لڑائی مگر لائسنس بحال نہ ہوا۔ اسی پریشانی میں، میں گھر لوٹ رہا تھا کہ میری گاڑی کسی اور گاڑی سے جا ٹکرائی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور پھر مجھے ہوش نہ رہا اور جب آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا۔

''آپ کی ٹانگ پر شدید چوٹ لگی تھی جو مجبوراً ہمیں کاٹنی پڑی۔'' ڈاکٹر نے اداس لہجے میں بتایا تو میرا دماغ سن ہو گیا۔ ماضی یاد آنے لگا اور بڑھیا کا بھولا بسرا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا کہ میں اس کا مجرم تھا اس کا قاتل تھا اب احساس جرم مجھے کچوکے لگانے لگا مگر اب تو بہت دیر ہو گئی تھی میں لٹ چکا تھا برباد ہو گیا تھا مجھے اپنے بیٹے اور بیٹی کی یاد ستانے لگی۔ جب انسان ڈوب رہا ہو تو بچنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے میں بھی اسی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر میری سب تدبیریں الٹی ہو گئیں اور کوئی کام نہ آئی میری بیوی میرے پاس اسپتال میں آئی تھی میرا گھر بند تھا وہاں کوئی بھی نہ تھا اس سے ڈاکوؤں نے فائدہ اٹھایا اور میرے گھر میں چوری کر کے سب کچھ لوٹ لیا۔

اس طرح آناً فاناً میری دنیا اندھیر ہو گئی میرا کاروبار ختم ہو گیا میری اولاد اور میرا مال و دولت میرے گناہ کی بھینٹ چڑھ گیا اور میں جیتے جی مر گیا۔ میرے کرب و ملال کا کوئی اندازہ نہ کر سکتا تھا وہ بوڑھی عورت ایک عذاب بن کر میرے اعصاب پر سوار ہو گئی اس کے الفاظ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند کھولنے لگے۔

''تو نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے نا، میرا سوہنا رب تجھ سے حساب لے گا اس کا قہر تجھ پر نازل ہوگا۔''

کاش میرا ضمیر پہلے جاگ جاتا اور میں تھوڑی سی تنگی سہہ لیتا، کاش میں خدا کو پکار لیتا اس پر یقین کر کے اسے دیکھ لیتا کاش میں توبہ کر لیتا تو آج میرا آنگن خوشیوں کا گہوارا ہوتا مگر میں بد بخت ہوں میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بن سکا میں نے اپنے رب کی عنایتوں کی قدر نہ کی میں سراب کے پیچھے بھاگتا رہا میں خوشیاں دینے والے کو بھول گیا تھا اب پچھتاوے ہیں اور میں ہوں، میری بیوی بھی اس دنیا میں نہیں رہی میں جو سیٹھ نوید کہلاتا تھا اب کوڑی کوڑی کا محتاج ہے آج میں اسی بس اسٹاپ پر بھکاری بن کر پڑا ہوں اور اس بات کا منتظر ہوں کہ کوئی مجھے آخر ٹھگ لے مجھے کوئی جیپ ٹکر مار دے نجانے کب مجھے کوئی ایسا سفاک انسان ملے گا، نجانے کب......؟



گوشۂ مسرت

جاوید احمد صدیقی

فرسودہ رسم و رواج انسانی زندگی کو مفلوج کرنے کے ساتھ اس کو تنگ نظر بھی بنا دیتے ہیں اور انسان ایسے خول میں قید ہو جاتا ہے جس سے وہ خود بھی باہر نکلنا نہیں چاہتا لیکن دوسرے لوگ اس سے بغاوت کرتے ہیں۔

ایک ایسی ہی رسم و رواج کی ماری اک لڑکی کی کہانی جس نے اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر خاموشی اختیار کرلی تھی۔

جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا اور جو ہوا نہ صرف بُرا ہوا بلکہ ایک نیک سیرت اور پاک دامن موت کے منہ میں چلی گئی' سوچنے کی بات کہ تمام پابندیاں' رسم و رواج اور ان گنت سختیاں صرف صنفِ نازک کے لیے ہی رہ گئی ہیں اور یہ جھوٹی آن بان شان والے اپنا شملہ اونچا رکھ لیں مگر کبھی سوچا کہ ان سب کو بھی ایک دن خالق کائنات کے روبرو کھڑے ہونا ہے اور پھر حکم الٰہی سے جہنم کی تاریک ترین تہوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اذیت ناک ترین مرحلوں سے گزرتے رہنا ہے۔ ہاں...... مگر انسان کی نہ صرف آنکھیں بند ہیں بلکہ دل کے دروازے بھی بند کر رکھے ہیں اور اب دھاڑیں مار مار کر رونے اور معافیاں مانگنے سے وہ معصوم تو واپس نہ آئے گی نا۔

ہمارا خاندان اونچی شان والا تھا اور زمیندار اور فیکٹریوں والے ہو کر بھی ہمارے ہاں کے قبائلی طرز کے رسم و رواج سے کوئی اختلاف نہ کرسکتا تھا اور خاندان میں شادی تو ہوگی باہر ناممکن۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں تھیں' رابعہ مجھ سے بڑی اور میں ماہا سب سے چھوٹی۔

اب تک تینوں بھائی پڑھائی کر کے بہترین جگہوں پر لگے ہوئے تھے اور زمینداری بھی دیکھ رہے تھے۔ رابعہ نے ابھی گریجویشن کیا تھا اور منت سماجت کے بعد یونیورسٹی میں جانے کا فیصلہ کروایا تھا۔

مجھے معلوم ہے ہم لوگ ایک شادی میں گئے ہوئے تھے کہ وہاں صائم خان نے رابعہ کو دیکھ لیا' ویسے میں بتاتی چلوں کہ ہمارے دادا پردادا اور ننھیال والے عربی النسل تھے اور ننھیال والے کشمیری۔ یہی وجہ تھی کہ خوب صورتی اور حسن خاندان کی میراث تھی۔ صائم خان تو ڈاکٹر بن چکا تھا اور اسی محفل میں کہیں آتے جاتے رابعہ کا سامنا بھی ہوا اور فیصلہ یہ کیا کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے وگرنہ نہیں حالانکہ صائم خان کے خاندان والوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ یہ لوگ اپنے خاندان سے باہر نہیں کرتے۔

اتفاق کی بات کہ والد صاحب کو اپنا کاروبار دیکھنے باہر جانا پڑا اور کہہ گئے کہ تینوں بیٹے ہی تمام کاروبار کو دیکھیں گے شاید سالوں کے حساب سے ٹائم لگ جائے مگر سختی سے کہہ گئے کہ خاندان سے باہر ہرگز شادی نہ ہوگی۔ والدہ ہوتیں تو شاید کچھ معاملہ اور ہو جاتا مگر جو قدرت کو منظور......!

قدرت کو کچھ اور ہی منظور ہوتا ہے' ابو باہر گئے اور عنقریب دو سال کے بعد ان کی خیر خیریت بھی نہ معلوم ہوتی تھی۔ بیٹے یہاں اتنے مصروف کہ سر اٹھانے کی فرصت نہ تھی' تیسرا سال بھی گزر گیا تھا۔

ادھر صائم خان نے شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی اور ہمارے گھر میں بڑے بھائی نے خاندان کا ہی لڑکا دیکھ کر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق تین ہفتوں میں رابعہ کو شادی کر کے رخصت کر دیا۔ رابعہ وہاں کسی طرح بھی خوش نہ تھی' خاوند بھی عام قسم کا آدمی تھا' پڑھا لکھا بھی صرف میٹرک تھا۔ اب رابعہ اسی غم میں گھلنے لگی' آخر کار کچھ عرصہ کے بعد اللہ نے ایک لڑکی دی جو تین ماہ کی ہو کر اللہ ہی نے بلا لی۔ بھائیوں میں سے بڑے بھائی نے اس کے سسرال چکر لگایا تو رابعہ کی ناگفتہ بہ حالت یہ دیکھ کر بڑا ترس آیا۔ ان لوگوں کی خوب بے عزتی کی اور بہن کو فارغ کروا کر اپنے ساتھ ہی لے آیا' رابعہ اب پھر اسی گھر میں تھی اور اب بھی صائم کی یاد آتی تھی۔

ادھر صائم خان کو جب رابعہ کے واپس گھر آنے کا معلوم ہوا تو اس نے اپنے والدین پر زور دیا کہ رشتہ لے کر جائیں اور پوری کوشش کریں اس کا دل تو رابعہ کے نام ہی سے دھڑکتا تھا اب جو رشتہ آیا تو بڑے بھائی کے دل میں نرم گوشہ جگہ لے چکا تھا پھر سوچا کہ مطلقہ کو بھی ہمارے معاشرے میں کون لیتا ہے؟ آخر اس نے بھائیوں کو منا کر اس رشتے کو منظور کرنے کے لیے منا لیا اور آخر کار شادی نہایت سادگی سے کر دی گئی۔ بھائی بھی خوش کہ صائم خان نے رابعہ کو انتہائی خوش رکھا ہوا ہے اور سسرال والے بھی بے حد عزت کرتے ہیں۔

صائم خان کے اپنے رشتہ داروں میں اس طرح کا ایک رشتہ کیا گیا تھا مگر افسوس کہ اس کا انجام بھیانک نکلا تھا کہ دونوں میاں بیوی کو ایک سال کے بعد ڈھونڈ کر ختم کر دیا تھا' یہ اس لیے رابعہ کو خیال آیا کہ ایک اچانک ہمارے والد صاحب آوارد ہوئے اور تمام حالات معلوم ہونے پر انہوں نے اس رشتہ کو ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ بھائیوں نے لاکھ سمجھایا مگر یہ نہ سمجھے اور صاف کہہ دیا کہ اب یہ دونوں ہی زندہ نہیں رہیں گے۔

تینوں بھائیوں نے بڑوں کو بلا کر ایک پنچائت ٹائپ میٹنگ بلوائی' تمام لوگوں نے فیصلہ دیا کہ دیکھیں اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا پھر اس طرح کی قتل و غارت یا اسی طرح کا کوئی اقدام خاندان میں لمبی دشمنی ڈال دیں گے لیکن والد صاحب نہ ماننے تھے نہ مانے۔ کئی دنوں کی بے حد کوشش کے بعد آخر والد صاب نے راضی نامہ تو نہ کیا مگر صاف کہہ دیا کہ رابعہ سے کہہ دو کہ ہم ہمیشہ کے لیے تمہارے لیے مر چکے ہیں اور کوئی ملنا جلنا نہ ہوگا۔

ادھر رابعہ کو اس فیصلہ کا پتا نہ لگ سکا تھا وہ ادھر گھر آنے کی تیاری کرتی رہ گئی کہ یہ والد صاحب کا فیصلہ بھی سنا دیا گیا وہ تو آگے ہی دکھی تھی اور پہلے سسرال والوں کی سختیوں کے بعد کمزور دل بن چکی تھی اور دل کی دل میں لے کر رہ گئی۔ کئی ماہ بعد ہمارے ہاں معلوم ہوا کہ رابعہ سخت بیمار ہے اور موت کے کنارے پہنچ چکی ہے اور ڈاکٹر اس کو سخت اور مسلسل صدمہ کی وجہ سے تمام حوصلے کھو بیٹھی ہے۔ صائم خان اور رابعہ ان سے دور

دراز علاقے میں آ گئے تھے جہاں ہمارے گھر میں سے کوئی بھی نہ گیا تھا بہر حال رابعہ کی سخت بیماری کا ہمیں وہاں سے چند لوگوں کے آنے کے بعد جو ڈاکٹر صائم کے دوست تھے معلوم ہوا کہ رابعہ کی تو جینے کی بھی کوئی امید نہیں۔

اب والد صاحب بھی اسی طرح ہی غصہ دکھا رہے تھے اور آخر کار ایک دن معلوم ہوا کہ رابعہ دنیا چھوڑ چکی ہے اور سب کچھ بالا بالا ہی کر دیا گیا ہے۔ نہ کسی نے ہمارے جانے کی تمنا کی اور نہ ہی یہ جاننے کی کوشش کہ حقیقت کیا تھی۔

چند ماہ میں والد صاحب اس خبر کو سن کر چپ چاپ صدمہ کھاتے رہے اور پھر ایک دن چار پائی سے لگ گئے۔

ابھی چند دن پہلے اتفاق تھا کہ صائم خان کے خاندان نے ایک صاحب زادے جو انجینئر تھے کہ والدین میرا رشتہ لے کر تشریف لائے' انہوں نے آتے ہی والد صاحب کے ساتھ میٹنگ کی اور صاف کہہ دیا۔

''دیکھیں جناب آپ نے اس ضدی پن کی وجہ سے اور رسم و رواج کے کالے قانون کی وجہ سے اپنی ایک بیٹی کھو دی۔''

ادھر والد صاحب نے تینوں بیٹوں کو بلایا اور اس معاملہ کے متعلق پوچھا' بیٹے سمجھ گئے تھے اور صاف کہہ دیا۔

''آپ یہ رشتہ منظور کر کے ہماری بہن رابعہ کی قربانی کو قبول کرتے ہوئے یہ روایت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم فرما دیں۔'' خاصی بحث کے بعد والد صاحب راضی ہو گئے۔

میں سمجھتی ہوں کہ رابعہ باجی کی قربانی نے صدیوں پرانا یہ رواج ختم کروا دیا تھا اور اچھے

اب کیا فائدہ

ایک عورت کو اس کی چالاک سہیلی نے مشورہ دیا۔ ''اگر شوہر کو الو بنانا یعنی اپنے تابع کرنا ہے تو گدھے کا سر پکا کر کھلا دو وہ احمق ہو جائے گا۔''

بیوی نے بڑی مشکل سے اپنی نوکرانی سے گدھے کا سر منگوالیا۔ اتفاق سے اسی وقت شوہر موصوف بھی گھر آ گئے اور گدھے کا سر دیکھ کر پوچھنے لگے۔ ''بیگم یہ کیسا سر ہے؟''

بیگم نے جواب دیا۔ ''ابھی ابھی ایک کوا اپنی چونچ میں دبائے جا رہا تھا کہ چیل نے اس پر جھپٹا مارا اور یہ سر کوے کی چونچ سے چھوٹ کر یہاں آ گرا۔'' شوہر نے بیگم کی بات کا اعتبار کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد بیگم نے نوکرانی سے کہا۔ ''سر کو باہر پھینک آؤ۔''

نوکرانی نے حیرت سے سوال کیا۔ ''جس سر کو آپ نے اتنی مشکل سے منگوایا تھا اسے آپ پکوا کر شوہر کو کھلانے کی بجائے باہر پھنکوا رہی ہیں آخر کیوں؟''

بیگم نے جواب دیا میرا شوہر تو اسے دیکھتے ہی الو ہو گیا اب خواہ مخواہ اس کو کھلانے کا فائدہ؟''

کیوں آگئے......!

بچہ (ماں سے) ''امی یہ آسمان کیوں بنایا گیا ہے؟''

ماں: ''تاکہ اوپر کی بلائیں زمین پر نہ آ سکیں۔''

بچہ: ''پھر ہمارے ماسٹر صاحب زمین پر کیوں آ گئے۔''

حسن اختر پیرزادہ...... نارتھ ناظم آباد ٹاؤن

لوگوں کے لیے دروازے کھول دیئے تھے۔

آخر رشتہ طے پا گیا اور وہ بیاہ کر مجھے سسرال والے اپنے گھر بیاہ کر لے آئے۔ نسیم وہاں انجینئر بن چکے تھے۔ بہت اچھی طبیعت کے مالک اور ایک فرم میں اب جنرل منیجر جیسی اونچی پوسٹ پر فائز تھے۔

دھماکہ تو اس دن ہوا جب ہماری شادی کو چھ ماہ ہو چکے تھے کہ بھائی صائم خان کا فون آیا وہ تقریباً چیختے ہوئے بول رہے تھے۔

"بابا ہم تمہیں مبارک باد دینے آرہے ہیں اور کئی خوشخبریاں بھی ساتھ لائیں گے۔"

رابعہ کے زندہ بچ جانے کی اطلاع نے پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ آخر چند روز کے بعد بھائی صائم خان اور رابعہ بھی ہمارے ہاں آگئے۔ ہماری تو ایسی خوشی جیسی عید کا چاند دیکھ کر محسوس ہوتی ہے۔ رابعہ انتہائی کمزور تھی مگر ساتھ میں چند ماہ کا بیٹا دیکھ کر تو دل باغ باغ ہوگیا۔ ادھر حویلی میں جشن کا سا سماں تھا پھر جب سب آرام سے بیٹھے تو صائم نے حقیقت بتائی۔

"آپ لوگوں کے ساتھ تو میرا رابطہ نہ تھا اتفاق کی بات کہ رابعہ کی بیماری کے علاج کے لیے میں امریکہ کے چند بڑے ڈاکٹروں سے ٹائم لے لیا تھا اور چند روز میں ہم لوگ امریکہ آگئے تھے۔

یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ڈاکٹروں کی ٹیم میں دو ڈاکٹر میرے کلاس فیلو بھی رہ چکے تھے جب میں سرجری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گیا تھا اور ہم دونوں نے امریکہ پہنچتے ہی رابعہ کا علاج شروع کروا دیا۔ ادھر میرے پیچھے اتفاقات ہیں زمانے کے..... امریکہ آنے کے روز ایک مریضہ داخل ہوئی تھی جو سانس کی نالی کی مریضہ تھی اور کینسر کی آخری اسٹیج پر تھی کہ رشتہ داروں نے ڈاکٹروں کو دکھانے کے لیے داخل کروا دیا۔ تقریباً تین ہفتہ علاج کے بعد رضائے الٰہی سے وفات پا گئی۔ اسی عورت کی وفات کو کسی طرح رابعہ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا جبکہ اس وقت ہم امریکہ میں رابعہ کا کامیاب علاج کروا رہے تھے اور رابعہ روبصحت تھی۔

چند ماہ کے زبردست سخت علاج کے بعد رابعہ تندرست ہوگئی اور ایک سال ہم وہاں رہے۔ اللہ نے مکمل صحت عطا کر دی اور یہ ننھا سا پوتا ہمارے بڑوں کے لیے تحفہ بھی دے دیا۔"

والد صاحب کی آنکھیں اس وقت تک آنسو گرا رہی تھیں اور آخر میں بولے۔

"صائم بیٹا اور رابعہ! میں تم دونوں سے شرمندہ ہوں۔ اللہ مجھے معاف کر دے اور اس کا ازالہ میں نے ماما کا بندھن غیر خاندان میں کر کے کیا ہے۔" تمام خاندان والے انہیں تسلی دینے لگے اور یہ انتہائی پُرمسرت محفل اختتام کو پہنچی۔

میں ماما کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ خدا جانے اس رسم و رواج نے کتنی جانوں کو نگل لیا ہوگا اور کتنی معصوم روحیں اپنی محبت کو قربان کرتے ہوئے موت کے منہ میں جا چکی ہوں گی۔ یہ تھی داستان جو بگڑتے بگڑتے بھی اللہ نے خوشیوں سے بھر دی۔

وضع دار

اقبال بھٹی

کچھ لوگ عشق کو دماغ کا خلل قرار دیتے ہیں اور کچھ اسے زندگی کی معراج تصور کرتے ہیں یہ تو خیر اپنی اپنی سوچ اور تجربہ کی بات ہے لیکن یہ بات تو مسلم ہے جو بھی اس کے پھیر میں آتا ہے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ضرور مفلوج ہوجاتی ہیں یہاں تک کہ وہ عشق سمندر میں غوطہ زن ہو کر اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مہینوال جیسا شہزادہ ایک کمہارن کے' رانجھے جیسا صاحب جائیداد ہیر کی بھینسوں کا چرواہا اور مکران کا ولی عہد پنوں ایک دھوبن کے لیے شہزادگی نہ ترک کرتا۔

عشق کی کارفرمائیوں کا احوال' قارئین نئے افق کے لیے ایک ہنستی مسکراتی تحریر۔

ائرپورٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے منصور کے چہرے پر کسی قدر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آفاق پورے ایک ماہ تک اس سے دور رہے گا۔ یہ احساس اسے اداس کررہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ اظہر حسین صاحب کا دماغ کسی کے تابع نہیں تھا جس طرف بھی چل جائے اس کا رخ بدلنے والا اس جہاں میں کوئی نہیں تھا۔

خدا ایسا سخت گیر باپ کسی کو نہ دے' بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ بگڑے ہوئے نوابوں کے ہاں تو اولاد ہونا ہی نہیں چاہیے۔ اگر انسان کبھی نواب نہ رہا ہو تو انسان ہی رہتا ہے اور اگر کبھی غلطی سے وہ نواب رہ چکا ہو تو نوابی چھن جانے کے بعد اور بھی خراب ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی حکم چلانے کی عادت برقرار رہتی ہے اور جب دوسرے لوگ نہیں ہوتے تو یہ حکم گھر پر ہی چلتا ہے۔ منصور تو بے چارہ اور زیادہ عتاب کا شکار تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اب یہاں حکم سننے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

مظہر حسین اور اکبر حسین چالاک تھے کہ باہر کے ملکوں کا ٹکٹ کٹا لیا۔ مقصد بظاہر نوکری تھا لیکن اصلیت کچھ اور ہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ والد صاحب قبلہ حکومت کے شوقین ہیں اور اب یہ حکومت گھر تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ الٹے سیدھے احکامات صادر ہوتے رہیں گے اور ان کی زندگی عذاب کا شکار رہے گی۔ اس لیے دونوں ہی جھانسہ دے کر نکل گئے تھے۔

باہر کی دنیا میں اگر ناکام رہتے تو شاید کان پکڑ کر بلوائے جاتے لیکن دونوں نے شاندار ملازمتیں کرلی تھیں اور اس کے بعد چھوٹے موٹے کاروبار بھی۔ اتنی دولت بھیجی تھی انہوں نے کہ اظہر حسین کی اصلی نوابی لوٹ آئی اور پھر ایسے کماؤ پوتوں کو کون کچھ کہتا' لے دے کر نکھٹو منصور رہ گیا تھا۔ جو نواب اظہر حسین کی آنکھ کا آخری تارا تھا۔ اس نے بھی اس جال سے نکلنے کے لیے کافی زور لگایا لیکن نہ ای حضور اس کے لیے تیار تھیں نہ نواب صاحب۔ تنہا رہ جانے کا احساس تھا اور پھر زیادہ ضد کی تو نادر شاہ زندہ ہوگیا۔

”تم نہیں جاؤ گے بس اس کے بعد دوبارہ یہ الفاظ نہ سنوں۔“ یہ آخری وارننگ تھی۔ اس کے بعد کچھ کہنا قیامت لانے کے مترادف تھا۔ باہر جانے کے الفاظ گویا لغت سے پھاڑ کر پھینک دیئے گئے تھے۔

منصور کے دل میں حسرت ہی رہ گئی کہ وہ بھی

مغرب کی فضاؤں میں آزاد پرندے کی طرح پرواز کرے۔ اب تو یہ ننھیال ہی ذہن سے نکال دیا تھا۔ دونوں بھائی آتے جاتے رہتے تھے۔ دونوں کے سسرال بھی تھے کس کا دل نہ چاہا ہوگا کہ حسب روایت مغرب کی کسی گل کو زندگی کا ساتھی بنالے لیکن اظہر حسین شاید حضرت اسرافیل کے رشتے دار معلوم ہوتے تھے کہ ایسے کسی حادثے پر ان کے ہاتھ سے صور لے کر پھونک دیتے۔ یوں وقت سے پہلے قیامت کسے پسند تھی۔ اس لیے بے چارے کان دبائے آئے اور ایک بیوی بغل میں دبائے واپس چلے گئے اور اس کے بعد وہ بڑی باقاعدگی سے ہر سال ایک بے بی کی اطلاع بھیج دیتے کہ نواب صاحب کی یہی ہدایت تھی۔

منصور کو بھی ایک فرم کا جنرل منیجر بنادیا گیا تھا اور اب وہ بھی کاروبار کررہا تھا۔ کاروبار سے تو اسے کوئی اختلاف نہیں تھا لیکن بے حد پابندیاں تھیں۔ یہاں نہ جاؤ وہاں نہ جاؤ دوستوں کے انتخاب میں احتیاط سے کام لو۔ پھر ہر دوست کو نواب صاحب سے پاس کرا کرا ین او سی لو اس کے بعد دوستی بڑھاؤ۔ وغیرہ وغیرہ منصور ان پابندیوں کو برداشت کررہا تھا اور اب تو عادت بن چکی تھی۔

آفاق اس کا واحد دوست تھا جس سے وہ دل کی ہر بات کرلیتا تھا۔ آفاق کے والدین فوت ہوچکے تھے وہ اسپیئر پارٹس کا بہت بڑا تاجر تھا لیکن نہایت سادہ مزاج اور کسی قدر سنکی۔ اسے دنیا میں منصور کے علاوہ کوئی پسند نہیں تھا۔ خود میں مگن رہنا یا منصور میں۔ باقی دنیا کا اس کی نگاہوں میں کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ منصور کی ہر بات پر گردن ہلانا اس کی عادت تھی خواہ غلط ہو یا درست۔ بس جو منصور نے کہا اس نے مان لیا۔

چھ سال کی دوستی میں آفاق کو پہلی بار ملک سے باہر جانا پڑا تھا۔ وہ جاپان گیا تھا اور اس نے کوشش کی تھی کہ منصور بھی اس کے ساتھ چلے۔

"یار! مجبوری ہے۔ جاپانی گاڑیوں کے پرزوں کی بہت مانگ ہے اور وہاں جائے بغیر یہاں مجھے ایجنسی نہیں مل سکتی۔ اب بتاؤ کیا کروں؟"

"چلے جاؤ۔" منصور نے کھوکھلے پن سے کہا اور آفاق نے گردن ہلادی۔

"ٹھیک ہے چلا جاؤں گا۔"

"کتنے دن کا پروگرام ہوگا؟"

"کم از کم ایک ماہ۔"

"کیا؟" منصور چیخ پڑا۔

"ہاں بس ایک ماہ کا۔ تم بھی میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

"اے کاش یہ ممکن ہوتا۔" منصور نے حسرت سے کہا۔ "ابا حضور کبھی اجازت نہیں دیں گے۔"

"اطہر اجازت چلو۔"

"واپسی میں کہاں جاؤں گا؟" منصور نے کہا۔

"کیوں؟" وہ معصومیت سے بولا۔

"تم تو احمق ہو بس۔" منصور جھلا کر بولا۔

"مگر کیوں؟ آخر پریشانی کیا ہے؟" آفاق نے پوچھا لیکن منصور نے اسے پریشانی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ البتہ اس شام اس نے اظہر صاحب سے کہا۔

"ابا حضور! جاپانی ریگزین کی ان دنوں ملک میں بہت مانگ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سلسلے میں کوشش کروں؟"

"نیا آئٹم ہے ہم نے کبھی نہیں منگایا۔ سوچ لو۔"

"بہت نفع بخش چیز ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو جاپان چلا جاؤں اور کوئی بڑا سودا کر کے آؤں۔"

جب تک اظہر صاحب سوچتے رہے منصور کا دل امید و بیم کی کیفیت سے دھڑکتا رہا اور پھر اظہر حسین کی گردن مخالف سمتوں میں ہل گئی۔

"نہیں ہمارے پاس دوسری بہت سی چیزیں ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے اس خیال کو ذہن سے نکال دو۔"

اور منصور آفاق کو ائرپورٹ چھوڑنے چلا آیا تھا۔

واپسی میں وہ سخت اداس تھا اور آہستگی سے ائرپورٹ کی سیڑھیاں طے کررہا تھا۔ اس کے بالکل نزدیک کوئی اور بھی زینہ اتر رہا تھا لیکن منصور اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

تب ایک کریہہ آواز اس کے کانوں میں ابھری۔

''اے بابو اوے دے اللہ کے نام پر، سیٹھ جی اللہ دولت دے، دے دے پہلوان اپنی جوانی کا صدقہ، او بابو! اللہ تجھے نوکری دے، بی بی جی! دے وے بی بی جی!''

منصور کی نگاہ چند قدم پر موجود بھکارن یا اداکارہ پر پڑی۔ ماہر فن تھی۔ سیٹھ جی کو دولت کی دعا، پہلوان کو جوانی کی، بابو کو نوکری کی دعا، بڑی ماہر نفسیات تھی یہ میلی کچیلی بھکارن۔

لیکن جس بی بی جی کو اس نے دعا دی تھی وہ اسے نظر نہیں آئی لیکن اس بار بھکارن نے جیسے اصلی شکار پکڑ لیا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کھڑی ہوگئی۔ تب منصور کی نگاہ اپنے بالکل قریب صرف دو قدم کے فاصلے پر نیچے اترتی ہوئی خاتون پر پڑی۔ یہی خاتون اس کے ساتھ ساتھ نیچے اتر رہی تھیں اور منصور نے خیالات میں الجھے ہونے کی وجہ سے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔

''دے دو بی بی جی! اللہ کے نام پر۔ اللہ جوڑی سلامت رکھے بابو! نئی دلہن کی خیرات دے دے۔ اللہ بیٹا دے، اے بابو!''

منصور نے گھبرا کر اجنبی خاتون کی طرف اور خاتون نے اس کی طرف دیکھا۔ قرب وجوار میں ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے ان دونوں کی جوڑی ملادی تھی۔ بے اختیار منصور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ خاتون گھبرا کر منصور سے دور ہٹ گئیں۔

''بابو! اے بابو! دے دے اللہ کے نام پر اللہ جوڑی سلامت رکھے۔'' بھکارن نے پھر آواز لگائی۔

''پرس بیگم صاحبہ کے پاس ہے۔ ان سے لے لو۔'' منصور نے مسکراتے ہوئے کہا اور بھکارن اس طرف دوڑ گئی۔

''تیرا بابو بول رہا ہے بی بی! اللہ جوڑی سلامت رکھے۔''

''شٹ اپ۔'' لڑکی کی لرزتی آواز ابھری۔ منصور اس دوران تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔

بھکارن کے اس مذاق نے ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن سے اداسی جھاڑ دی تھی لیکن اس نے پلٹ کر ایک بار بھی اس طرف نہیں دیکھا کہ بھکارن نے لڑکی کی کیا درگت بنائی اور پھر وہ اپنی کار تک پہنچ گیا۔

کار میں بیٹھتے ہوئے اچانک اسے احساس ہوا کہ لڑکی بے حد حسین اور بہت دلکش تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ اس کے ساتھ اتری تھی اور بھکارن ان دونوں کو نجانے کیا سمجھ بیٹھی تھی۔

''اللہ جوڑی سلامت رکھے۔'' بھکارن کی آواز اس کے کانوں میں گونجی اور اس کے دل میں عجیب سی خلش بیدار ہوگئی۔ جوڑی، اس نے عقب نما آئینے کا رخ بدل کر دیکھا۔ اس نے بھکارن سے جان چھڑالی تھی اور اب شاید کسی سواری کے انتظار میں کھڑی تھی۔ منصور کا دل دھک سے رہ گیا، بہت سی فلمی کہانیاں یاد آگئیں۔

گاڑی ریورس کرو۔ رومانس تیار، لیکن اگر لڑکی فلمیں نہ دیکھتی ہو تو؟ ائرپورٹ پر جوتے بھی پڑ سکتے ہیں۔ خاصی بڑی فرم چلا رہا تھا مگر اس فیلڈ میں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ کبھی عشق کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ اگر اس وقت آفاق ہوتا تو بڑی مدد ملتی۔ کیا کروں؟ کئی منٹ تک کھڑا رہا اور پھر ہمت بندھ گئی۔ اس دوران لڑکی کو ٹیکسی نہیں ملی تھی۔ کار ریورس کرتے ہوئے اس کا دل کانپ رہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح کار اس کے قریب پہنچ گئی۔ تب اس نے کھڑکی سے سر نکالا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کو کسی مناسب جگہ چھوڑ دوں؟'' اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شٹ اپ'' نسوانی دہاڑ سنائی دی۔

منصور نے جلدی سے سر اندر کیا۔ کتنی بڑی حماقت

ہوئی تھی سر نکال کر۔ لڑکی غصیلے انداز میں چند قدم آگے بڑھ گئی تھی' لوگ دیکھ رہے ہوں گے' سوچ رہے ہوں گے کہ میں لڑکی کو تنہا دیکھ کر چھیڑ رہا ہوں۔

"ارے باپ رے۔" اس کے منہ سے نکلا اور پھر وہ دوسری بار زور سے چیخا۔ "ارے باپ رے باپ" باپ کا نام بے اختیار ہی منہ سے نکلا تھا لیکن دوسری بار اسے سچ مچ ہی باپ یاد آ گیا تھا۔ اخبار میں ایک خبر نظر آ ئی تھی۔

ائرپورٹ پر غنڈہ گردی۔

نواب اظہر حسین کے صاحبزادے ائرپورٹ پر ایک نوجوان لڑکی کو چھیڑتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔

اور دوسرے ہی لمحے اس نے کار دوڑا دی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اظہر حسین صاحب اس کی کار کے پیچھے اپنی کار دوڑا رہے ہوں اور ڈرائیور سے کہہ رہے ہوں اور تیز...... اور تیز...... میں اس ملعون کو ابھی بتاتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی منصور کی کار کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔



لیکن یہ رات منصور کے لیے ذرا اجنبی سی تھی کئی بار اسے لڑکی کا خیال آیا تھا اور وہ دل میں ایک کسک سی محسوس کر رہا تھا۔ لڑکی نے کیا سوچا ہو گا میرے بارے میں؟ کون تھی وہ' کہاں رہتی تھی۔

بہت سے فلمی مناظر اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ فلمی ہیرو کو بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ہیروئن کہیں بھی ہو' کہانی نویس اسے کسی نہ کسی طرح گھسیٹ ہی لاتا ہے اور ہیرو کے عشق ہو جاتے ہیں۔ اگر ابتدا میں ہیروئن عشق کے لیے راضی نہ بھی ہو اور اسے ہیرو کے جوتے لگانے ہوں تو یہ جوتے کئی فٹ دور سے گزر جاتے ہیں اور جوتے لگانے کی رسم پوری ہو جاتی ہے۔

ان فلمی مناظر نے اسے تقویت دی اور اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی اسے تلاش کروں۔ اگر فلمی ہیرو کو ہیروئن مل سکتی ہے تو...... تو' نہ جانے اس کے ذہن میں کیا کیا خیالات آتے رہے اور پھر وہ سو گیا۔ دوسرے دن دفتر میں بھی وہ اس لڑکی کو یاد کرتا رہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

اور اس گڑبڑ کو دل میں چھپائے' وہ فرصت کے اوقات میں اسے تلاش کر رہا تھا۔ پارکوں میں' سڑکوں پر' اور نہ جانے کہاں کہاں...... اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ فلم سازوں کو گالیاں بھی دیتا رہتا جنہوں نے اس کا کا کباڑا کر دیا تھا۔

آفاق کا فون ملا کہ وہ واپس پہنچ رہا ہے اور منصور کو کسی قدر ڈھارس ہوئی۔ آفاق آ جائے تو ممکن ہے کچھ کام بنے۔ اس نے سوچا اور پھر وہ آفاق کو لینے ائرپورٹ پہنچ گیا۔ جاپان ائرلائنز کے طیارے سے آفاق آ پہنچا۔ نہ جانے کیوں منصور کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ آفاق اس کے گلے لگ گیا تھا۔ "یار! بالکل مزہ نہیں آیا' جاپان میں' بس تم یاد آتے رہے۔" آفاق کہہ رہا تھا۔

"مزا تو مجھے بھی نہیں آیا آفاق۔" منصور نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"اللہ جوڑی سلامت رکھے بابو دے دے دے اللہ کے نام پر۔" وہی مانوس آواز اس کے کانوں میں ابھری اور وہ چونک پڑا۔ اس کی نگاہ اس آواز کی طرف اٹھ گئی۔

سیاہ رنگ کی ایک لمبی مرسڈیز اسٹارٹ ہو رہی تھی اور اس میں چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی تھی۔ ایک جھلک ہی کافی تھی۔ یہ شکل تو اس کی نگاہوں میں بس گئی تھی۔

"آفاق آفاق! دوڑو۔" اس نے آفاق کا ہاتھ پکڑ کر دوڑ لگا دی اور آفاق کا وزنی سوٹ کیس جسے وہ خود ہی اٹھائے کھڑا تھا اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ خود آفاق بھی گرتے گرتے بچا تھا۔

"ہائیں' ہائیں' ارے بھائی سوٹ کیس' کیا ہوا؟" آفاق اس سے ہاتھ چھڑا کر سوٹ کیس کی طرف دوڑا۔

"جلدی' جلدی آفاق! نکل گئی۔ ارے نکل گئی۔" وہ دور جاتی ہوئی مرسڈیز کو دیکھتا ہوا حسرت سے بولا۔

آفاق نے سوٹ کیس اٹھالیا تھا۔ منصور نے خود سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے چھینا اور اپنی کار کی طرف دوڑنے لگا لیکن یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا کہ کوئی صاحب اس کی گاڑی کے پیچھے اس طرح اپنی گاڑی پارک کر گئے تھے کہ اس کا گاڑی نکالنا آسان نہ رہا تھا۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو ممکن ہے مرسڈیز کے تعاقب میں اتنی دقت نہ ہوتی۔

''لعنت ہے لعنت ہے۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولا اور پھر اس نے نہایت بددلی سے ڈکی کھول کر سوٹ کیس اس میں رکھ دیا۔ ''دیکھ رہے ہو؟'' اس نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''ابا جان نے دلا دی ہوگی، چچا جان پولیس مین ہوں گے انہوں نے ڈرائیونگ لائسنس دے دیا ہوگا۔ یا نہ دیا ہوگا اور کہہ دیا ہوگا کہ اگر کانسٹیبل چالان کرے تو ان کا نام لکھا دیا جائے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' آفاق نے گردن ہلا کر کہا۔

''اب کیا کریں؟''

''اگر یہ تھوڑی سی آگے سرک جائے تو کام بن سکتا ہے۔'' آفاق بولا۔

یہی شکر تھا کہ موصوف نے گاڑی گیئر میں نہیں ڈالی تھی۔ البتہ ہینڈ بریک کھینچا ہوا تھا لیکن اسے تھوڑا سا کھسکانے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی اور دونوں کار میں آبیٹھے۔ منصور نے بددلی سے کار نکالی اور سڑک پر لے آیا اور جب کار سیدھے راستے پر دوڑنے لگی تو آفاق نے پوچھا۔

''اس دورے کی شکایت کب سے ہوئی؟''

''کیا بکواس ہے؟''

''اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کیا کالی مرسڈیز تمہاری کمزوری بن گئی ہے؟''

''تم نے دیکھا تھا اسے؟'' منصور چونک کر بولا۔

''ہاں میرا خیال ہے تمہاری یہ کیفیت اسی گاڑی کو دیکھ کر ہوئی تھی۔''

''آفاق! تم اس کا نمبر دیکھنے میں کامیاب ہوسکے تھے؟'' منصور نے اشتیاق سے پوچھا۔

''جی نہیں، ٹریفک پولیس سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ لیکن قصہ کیا ہے؟'' آفاق نے کہا۔

''بس اسی دن سے یہ قصہ شروع ہوگیا ہے جس دن تم جاپان گئے تھے۔'' منصور نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''یعنی اس دن سے تم کالے رنگ کی گاڑیوں کے پیچھے دوڑنے لگے ہو لیکن مرسڈیز ہی اس جنون کا محرک بنتی ہے یا دوسری گاڑیاں بھی؟'' آفاق نے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''نہیں یار! مجھے عشق ہوگیا ہے۔''

''سبحان اللہ! کونسی بڑی بات ہے۔ ایک مرسڈیز خرید لو۔''

''سنجیدہ ہوجاؤ، ورنہ گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھا دوں گا۔'' منصور جھلا کر بولا۔

''اوہو ٹھیک ہے۔ میں بالکل سنجیدہ ہوچکا ہوں۔'' آفاق فوراً بولا۔

''اس دن ائرپورٹ سے واپسی پر وہ واقعہ پیش آیا۔'' منصور نے آفاق کو پوری تفصیل بتادی۔ ''اب یہ اتفاق دیکھو کہ آج بھی جب میں ائرپورٹ پہنچا تو وہ مجھے یاد آگئی اور وہ مجھے سیاہ مرسڈیز میں بیٹھی نظر آگئی۔'' منصور نے کہا اور آفاق اچھل پڑا۔

''آئیڈیا اللہ قسم آئیڈیا کسی فلم ساز کو دے دو وہ فوراً محبت کا ائرپورٹ عرف بھکارن کی صدا۔ بنا ڈالے گا۔''

''پھر وہی بدتمیزی۔'' منصور نے اسے گھور کر دیکھا۔

''نہ نہ..... اللہ قسم میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' آفاق گھبرا کر بولا اور پھر کہنے لگا۔ ''یہ بتاؤ میرے پیچھے کیا فلمیں دیکھتے رہے ہو؟''

''ہرگز نہیں کیوں؟''

''سو فیصد کسی مقامی فلم کی کہانی ہے جس کا ریڈیو پروگرام کچھ یوں ہوتا ہوگا۔ نہایت گمبھیر آواز میں کہا جاتا ہوگا۔ محبت کی دل نشین داستان، انوکھے پیار کی کہانی،

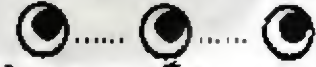
ائرپورٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے منصور نے اسے دیکھا اور تبھی ایک بھکارن کی آواز ابھری۔ اللہ جوڑی سلامت رکھے لیکن وقت کے بے رحم ہاتھوں نے یہ جوڑی سلامت نہ رہنے دی۔ سیاہ رنگ کی ایک مرسڈیز اس محبت کے درمیان دیوار بن گئی منصور دیوانہ ہوگیا۔ اس کی اداس نگاہیں اب سیاہ رنگ کی گاڑیوں کو گھورتی رہتی ہیں۔ سیاہ مرسڈیز......

''بس بس آگے بکواس مت کرو۔ سنو آفاق۔ کام مشکل ضرور ہے لیکن ہمیں سیاہ مرسڈیز کو تلاش کرنا ہوگا۔ ایک ایک گاڑی کے مالک کا پتہ چلانا ہوگا۔''

''گویا کاروبار بند؟'' آفاق نے پوچھا۔

''نہیں' شام کا وقت مناسب رہے گا اس کام کے لیے۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں آفاق۔''

''خداوند قدوس تمہیں ہمیشہ سنجیدہ رکھے۔'' آفاق ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔



دونوں سنجیدہ تھے۔ اچھے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ اس سے قبل کبھی ایسی کسی حماقت کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ کاروبار میں خودمختار تھے جس کی وجہ سے ان کے اندر ایک خاص رکھ رکھاؤ پیدا ہوگیا تھا لیکن یہ ساری سنجیدگی سارا وقار پانچ بجے کے بعد رخصت ہوجاتا تھا۔ کبھی آفاق اس کے پاس پہنچ جاتا اور کبھی خود منصور آفاق کے پاس۔ اس کے بعد دونوں میں سے کسی ایک کی گاڑی ہوتی اور شہر کی سڑکیں۔ پارک' تفریح گاہیں۔ کبھی کوئی سیاہ مرسڈیز نظر آجاتی تو گھنٹوں اس کے پیچھے گزار دیے جاتے۔ تعاقب ہوتا' معلومات حاصل کی جاتی لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

''یار منصور! اللہ قسم اب یہ فضولیات چھوڑ دو کتنے دن اس مصیبت میں گرفتار رہوگے۔ دنیا میں ایک سے ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ کسی اور کا انتخاب کرلو۔'' آفاق گڑگڑایا تھا مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔

منصور ایک ہی جواب دیتا۔ ''دیکھو آفاق میں ساری دنیا میں صرف اپنے باپ سے ڈرتا ہوں' ان کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا لیکن اس معاملے میں ان سے بھی نہیں ڈروں گا۔ میں اگر شادی کروں گا تو صرف اس لڑکی سے۔''

''بندہ خدا! اس کا اتا پتا تو معلوم ہو۔ کوئی نشانی تو ملے۔ شادی کیسے کرلوگے؟''

''تلاش' میری جان' تلاش' ڈھونڈنے سے کیا نہیں ملتا۔''

''کتابی باتیں ہیں' کسی کو خدا ملا ہے کبھی؟ ذرا مجھے اس کا نام بتاؤ۔''

''وہ ضرور مل جائے گی۔''

''جی ہاں۔ انتظار کررہی ہوگی آپ کا۔'' آفاق جھلا کر بولا۔

''یار آفاق! ایک بات کہوں؟'' منصور سنجیدگی سے بولا۔

''کہو ضرور کہو۔''

''اسے تلاش کرنا ہے' ہر قیمت پر' سمجھے؟''

''ہاں سمجھ گیا۔'' آفاق بے بسی سے گردن ہلا کر بولا۔

اس شام وہ دفتر سے نکلے ہی تھے کہ ایک سیاہ رنگ کی مرسڈیز نزدیک سے گزر گئی۔ پچھلی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ منصور کے حلق سے چیخ سی نکل گئی۔

''آفاق' ہری اپ۔ ہری اپ۔'' دونوں دوڑتے ہوئے اپنی کار تک پہنچے اور منصور نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

''وہی تھی؟'' آفاق نے تجسس سے پوچھا۔

''سو فیصد۔ میں نے بس ایک جھلک دیکھی تھی لیکن وہی تھی آفاق۔ خدا کرے آگے سگنل بند ہو جائے' خدا کرے ٹریفک رک جائے۔'' منصور دعائیں مانگ رہا تھا۔

مرسڈیز بہت دور نکل چکی تھی' اس وقت وہ شہر کی ایک بھری پری سڑک سے گزر رہے تھے۔ دفعتاً منصور کی دعا پوری ہوگئی۔ سگنل کی سرخ بتی جل اٹھی تھی لیکن

مرسڈیز سگنل سے آگے نکل گئی اور منصور کے سامنے والی گاڑی رک گئی۔

''ارے ستیاناس۔'' منصور چیخا۔ اگر گاڑی نکالنے کی جگہ ہوتی تو شاید وہ سگنل کی پروانہ کرتا لیکن اب آگے پیچھے دونوں طرف گاڑیاں تھیں۔ ریورس کر کے بھی گاڑی نہیں نکالی جا سکتی تھی۔

''اسی لیے کہتے ہیں الٹی سیدھی دعائیں نہ مانگا کرو۔ اب بے چارے فرشتوں کو کیا معلوم کہ تم سگنل بند ہونے کی دعا کیوں مانگ رہے ہو۔'' آفاق نے کہا اور منصور غرا کر رہ گیا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ آگے اور بھی سگنل ہیں میں اسے ضرور پکڑ لوں گا۔'' اس نے ضدی انداز میں کہا۔

آفاق ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ سگنل کھلا تو منصور نے بڑے ہی وحشیانہ انداز میں گاڑی دوسری گاڑیوں کے درمیان سے نکالی اور تیر کی طرح آگے بڑھا دی۔ تیسرے سگنل پر سیاہ مرسڈیز پھر نظر آ گئی تھی۔ منصور دیوانہ ہو گیا اور پھر ایک موڑ پر وہ دوبارہ سیاہ مرسڈیز کو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن تھوڑی دور چل کر ہی مرسڈیز ایک رہائشی عمارت کے گیٹ کی طرف مڑ گئی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اس لیے وہ رکے بغیر اندر داخل ہو گئی۔

''آج تقدیر یاور ہے۔'' منصور نے خوش ہو کر کہا اور گاڑی ایک سائڈ کر کے روک دی۔ ''آؤ دیکھیں۔'' وہ بولا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

آفاق بھی بحالت مجبوری اتر آیا تھا۔ دونوں آگے بڑھے اور رہائشی عمارت کے خوبصورت گیٹ کے پاس پہنچ گئے اور پھر منصور نے گیٹ سے اندر جھانکا ہی تھا کہ دو تندرست و توانا افراد اسے بالکل قریب نظر آئے اور منصور بے اختیار پیچھے ہٹا۔ آفاق اس کے دھکے سے گرتے گرتے بچا تھا۔

''تشریف لائیے۔'' ان میں سے ایک نے سخت لہجے میں کہا۔

''کیا..... کیا مومن علی صاحب کی یہی کوٹھی ہے؟'' منصور نے صورت حال بگڑتی دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

''جی ہاں' وہ اندر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چلو آگے بڑھو۔'' دونوں قوی ہیکل آدمیوں نے ان کی گردنیں پکڑ لیں اور گیٹ کے اندر دھکا دے دیا۔ وہ دونوں اس قدر قوی ہیکل تھے کہ ان کے چنگل سے نکل بھاگنے کا تصور بھی بے کار تھا۔ دونوں ہی گرتے گرتے بچے تھے۔

''ارے ارے۔ کیا بدتمیزی ہے۔ اللہ قسم۔'' آفاق نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمیز سکھاؤں ابھی آگے بڑھو۔'' وہ خطرناک شخص بولا اور عافیت اسی میں تھی کہ ان کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ آفاق کی حالت زیادہ خراب تھی۔ خوف کے مارے دانت نکلے ہوئے تھے اور شکل بگڑ کر رہ گئی تھی۔

''چ..... چل تو رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولا اور جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔ منصور بھی ساتھ ہی تھا۔ اسے اچانک پیش آنے والے خطرے کی کوئی توقع نہیں تھی جو کچھ ہوا تھا اتفاقیہ ہوا تھا لیکن اندر چل کر کیا ہوگا؟ دونوں کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

خوبصورت کوٹھی کے پورچ میں مرسڈیز کھڑی ہوئی تھی۔ برآمدے سے گزر کر ان دونوں کو اندر لے جایا گیا۔ برآمدے کے فوراً بعد ہال تھا جس میں ایک خونخوار قسم کے والد صاحب موجود تھے۔ ان کے ہاتھ میں چھڑی دیکھ کر دونوں کی جان نکل گئی۔

انہیں لانے والے دروازے پر جم گئے تھے اور قبلہ ابا جان چشمے کے عقب سے انہیں گھور رہے تھے۔ وہ دیر تک انہیں دیکھتے رہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کو۔ پھر ابا جان کی آواز ابھری۔ ''تعجب ہے یہاں میرا تجربہ دھوکا کھا رہا ہے۔ مجھے چہرہ شناسی پر بڑا ناز ہے لیکن تم دونوں مجھے ایسے نہیں معلوم ہوتے۔''

''م..... مومن علی صاحب!'' آفاق گھگھیایا۔

ذرا سی تشنگی رہ گئی۔ تم نے غور نہیں کیا تھا وہ دونوں تو ہی ہکل مایوسی سے ہاتھ مل رہے تھے جن کے ہاتھوں کی تھیلی نہیں مٹی تھی۔" آفاق نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم نے غور نہیں کیا' آفاق وہ لڑکی مجھے بڑی میٹھی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ بس بیٹھ جانے کی دیر تھی۔ نئی کہانی شروع ہو جاتی۔"

"تمہیں کیا سوجھی ہے منصور؟ خدا کے واسطے اگر اس سلسلے میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہو تو اب یہ تفریح ترک کردو بہت ہوگئی۔ ہم دونوں کا ایک چھوٹا موٹا مقام ہے۔ باعزت لوگ کہلاتے ہیں اگر کہیں نادانستگی میں بے عزت ہوگئے تو لوگ کیا کہیں گے؟"

"یار آفاق! کیسی باتیں کررہے ہو یقین کرو جس دن سے اسے دیکھا ہے مجھے اس سے عشق ہوگیا ہے۔ تنہا تھا تو بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کررہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے تمہارے آتے ہی یہ مسئلہ چٹکی بجاتے حل ہو جائے گا لیکن اب تم ایسی باتیں کررہے ہو۔"

"بندہ خدا! تمہیں چاہیے تھا کہ اگر وہ اتنی ہی پسند آگئی تھی تو اسی دن تعاقب کرتے' گھر معلوم کرلیتے تاکہ اتنی الجھن نہ پیش آتی۔ شریفانہ طور پر کوشش کرتے اور اسے تمہاری منکوحہ بنا ڈالتے۔ اب یوں گاڑیوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے کسی دن عزت نہ اتر جائے۔"

"بس یہی تو غلطی ہوگئی یار۔ اب میں تربیت یافتہ عاشق تو ہوں نہیں۔ کہانی نویس جس طرح ہیرو کی مدد کرتے ہیں اسی طرح تم بھی میری مدد کرو۔ ہم اس کی تلاش جاری رکھیں گے۔"

"تم واقعی سنجیدہ ہو منصور؟"

"سو فیصدی۔"

اگر وہ مل گئی تو کیا کرو گے؟"

"شادی۔"

"اور حضور چچا جان؟" آفاق نے کہا اور منصور کسی سوچ میں گم ہوگیا پھر بولا۔

"خدا کی قسم آفاق اگر وہ مجھے مل جائے تو میں آخری کوشش تک کرڈالوں گا۔ ابا حضور سے بہت ڈرتا ہوں لیکن اس سلسلے میں پہلی بار ہمت کروں گا اور انہیں اپنی پسند کے لیے مجبور کردوں گا۔"

"ہوں۔" آفاق سوچ میں ڈوب گیا پھر دیر تک گردن ہلا کر بولا۔ "کاش اپنی عقل بھی کسی سائڈ ہیرو کی سی ہوتی۔ چٹکی بجاتے اسے تلاش کرلیتا۔ ٹھیک ہے بھائی! تقدیر میں جوتے پڑنا ہی لکھا ہے تو یہی سہی' کسی دن اخبارات میں اپنی تصویر بھی دیکھ لیں گے۔"



درخشاں خود بھی آزردہ تھی۔ کیا محبت اس طرح بھی ہوجاتی ہے؟ کیا دل یوں بھی ہارے جاتے ہیں؟ کیا خوبی تھی اس میں؟ ایک عام سا نوجوان تھا۔ دوسرے بہت سے نوجوانوں کی طرح۔ بس ایک ذرا سی خوبی تھی اس میں جو دل کو بھا گئی' بے غیرت یا چھچھورا نہیں تھا۔

ائرپورٹ کے مخصوص حصے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بھی اس نے نوجوان کو دیکھا تھا۔ خیالات میں کھویا کھویا' اداس اداس' اگر وہ بدنگاہ ہوتا تو اسے دیکھنے کی کوشش کرتا۔ وہ بھی اس وقت چونکا تھا جب اس بھکارن کی کرخت آواز ابھری تھی۔ اب بھکارن کی بکواس ہی ایسی تھی کہ کسی کے ذہن میں بھی شوخی ابھر سکتی تھی۔ اس کے انداز میں بھی تھوڑی سی شوخی ابھر آئی تھی تو کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔ پھر اس نے نہایت شریفانہ انداز میں اسے لفٹ دینے کی کوشش کی تھی۔

انسان بھی خوب ہے۔ جھوٹی انا میں لپٹ کر وہ کیا سے کیا ہوجاتا ہے۔ ائرپورٹ سے سواری کی دشواریوں کا اسے احساس تھا اور اتنی دیر تک ٹیکسی نہ ملنے کی وجہ سے پریشان بھی تھی اگر اس کے ساتھ بیٹھ ہی جاتی تو کیا تھا۔ شکل وصورت سے وہ کوئی غلط نوجوان تو نہیں لگتا تھا لیکن اس نے بلاوجہ اسے ڈانٹ دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ذرا بھی تو بدتمیزی نہیں کی یہ اس کی شرافت کا ثبوت تھا۔

ابتدا میں اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی لیکن کوشش کے باوجود وہ اس نوجوان کو نہیں بھول سکی تھی۔ اکثر تنہائی میں وہ اس کے ذہن میں ابھر آتا تھا اور وہ اس سوچ میں گم ہو جاتی تھی۔

چوہدری غلام رسول قصور کے بہت بڑے زمیندار تھے' لاکھوں روپے ماہوار کی آمدنی تھی اور بہترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ تقسیم سے قبل ہی قصور میں رہتے تھے اور تقسیم کے بعد بے خانماں لوگوں کی امداد میں ان کی کارکردگی نمایاں رہی تھی۔ بہت معزز لوگوں میں گردانے جاتے تھے اور تھے بھی بڑے روشن خیال اور صاف ستھری طبیعت کے مالک ان کا خاندان گنے چنے صاحب اقتدار خاندانوں میں شمار ہوتا تھا لیکن انہوں نے بدلے ہوئے ماحول سے بالکل ہی منہ نہیں موڑا تھا۔ وقت کے تقاضوں کو ایک دائرے میں پورا کرنے کے عادی تھے۔ یہی وجہ تھی درخشاں کو تعلیم دلائی گئی تھی۔ اکلوتی بیٹی تھی' جس کی ہر خوشی چوہدری صاحب کو عزیز تھی۔ درخشاں ہی کی وجہ سے انہوں نے لاہور میں ایک عالیشان کوٹھی تعمیر کرائی تھی اور وہاں منتقل ہو گئے تھے۔ درخشاں لاہور میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ چوہدری صاحب کے چھوٹے بھائی کراچی میں تھے اور دونوں خاندانوں میں بے حد قربت' آنا جانا باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ چوہدری مہر رسول کے چھ بچے تھے' تین لڑکیاں اور تین لڑکے جو اب جوان ہو چکے تھے۔ کبھی یہ لوگ دو تین ماہ کے لیے لاہور چلے جاتے اور کبھی درخشاں یہاں آ جاتی۔ درخشاں کی فطرت میں کسی قدر ایڈونچر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس بار وہ کسی کو بتائے بغیر اچانک آ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اچانک ان لوگوں کو بھونچکا کر دے گی۔

اور یہی ہوا۔ اسے اچانک دیکھ کر اس کے چچا چچی اور دوسرے لوگ اس قدر حیران اور خوش ہوئے تھے کہ درخشاں کو لطف آ گیا تھا اور اس کے بعد درخشاں کے آنے کی خوشی میں ہنگامے شروع ہو گئے لیکن ان تمام تر تفریحات کے باوجود درخشاں کے سینے میں دل کی دھڑکن بعض اوقات ایک نیا رخ اختیار کر جاتی تھی۔ ایک صورت اس کی آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ وہ سوچ میں ڈوب کر رہ جاتی تھی۔ ابتدا میں تو اس نے کچھ خیال نہیں کیا لیکن جب خاصا وقت گزر گیا اور وہ شکل اس کے ذہن سے نہ اتر سکی تو وہ پریشان ہو گئی۔ اب کیا کروں؟ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ اباجی میرے اوپر کس قدر اعتبار کرتے ہیں' زمانے کی نزاکتوں کے بارے میں انہوں نے کتنی نصیحتیں کی ہیں مجھے۔ کیا مجھے کوئی ایسی بات سوچنا چاہیے۔ کیا مجھے خاندانی روایات سے بغاوت کرنا چاہیے۔

لیکن...... لیکن' یہ خیال' یہ شکل...... اونہہ' سب بے کار باتیں ہیں۔ ساری کی ساری فضول۔ وہ خود کو سمجھاتی رہی۔ لیکن پھر ایک دن' نزہت کی سہیلی اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب سے آ رہی تھی۔ وہ اور نزہت بھی حق صاحب کی گاڑی میں ائرپورٹ پہنچ گئے۔ حق صاحب نزہت کی سہیلی کے سسر تھے انہوں نے اپنی سیاہ مرسڈیز ائرپورٹ بھیج دی تھی۔ ائرپورٹ کے اس مخصوص حصے میں وہی منحوس بھکارن موجود تھی اور اس کی مخصوص صدائیں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ درخشاں کھو سی گئی۔ اس کے دل میں آواز ابھری۔ کاش' گزرے ہوئے لمحات ایک بار پھر گزریں اور بعض دعائیں خوب ہوتی ہیں کہتے ہیں چوبیس گھنٹے میں ایک لمحہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو دعاؤں کی قبولیت کا لمحہ ہوتا ہے لیکن یہ فرشتے بھی تاک میں رہتے ہیں کہ انسان کوئی چھوٹی سی آرزو کرے۔

یہی ہوا۔ اس وقت جب وہ نزہت کی سہیلی رعنا اور اس کے شوہر کو لے کر واپس ہو رہے تھے تو وہ نظر آ گیا تھا۔ دونوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے اس کے بعد مرسڈیز فراٹے بھرنے لگی تھی۔ کاش وہ اس ظالم ڈرائیور کی گردن دبا دیتی۔ کاش وہ کار کے بریک جام کر دیتی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں کیا کہتی۔

دل پھر سے زخمی ہو گیا تھا۔ بے کلی بڑھ گئی تھی لیکن یہ بے کلی کس طرح دور ہوتی۔ کراچی میں ابھی طویل قیام تھا۔ عام حالات میں وہ زیادہ گھومنا پسند نہیں کرتی تھی۔ دیکھی ہوئی جگہوں کو کیا دیکھنا' لیکن اس بار نزہت حیران رہ گئی تھی۔ روزانہ شام کو وہ کہیں چلنے کی فرمائش کر دیتی تھی۔ گاڑی موجود تھی۔ ڈرائیور بھی' کون انکار کرتا۔ آوارہ گردی ہوتی اور درخشاں کی آوارہ نگاہیں اپنا مرکز تلاش کرتی رہتیں لیکن انسانوں کے سمندر سے کوئی ایک صورت نکال لینا آسان بات تو نہیں ہے۔ کیا مجھے واقعی محبت ہو گئی ہے؟

کراچی آ کر اس بار وہ خاصی کشمکش کا شکار ہو گئی تھی۔ اس سے قبل کی زندگی حسن و عشق کے قصوں سے آشنا ضرور تھی لیکن خود اسی اس کا تجربہ کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ ایک بے کلی' ایک بے چینی اسے پریشان رکھتی تھی۔

پھر ایک شام وہ ساحل سمندر کے ایک پُر رونق حصے میں گئی۔ اکثر یہ لوگ یہاں آتے رہتے تھے۔ فن لینڈ کی حسین زندگی اسے بہت خوبصورت لگتی تھی اور اکثر وہ یہاں کی فرمائش کر دیتی تھی۔ برق رفتار ٹرین جو ساری کائنات کو گھما کر رکھ دیتی تھی' اس کی اولین پسند تھی۔ نزہت کو بھی اس ٹرین میں بیٹھنا پسند تھا چنانچہ یہاں آ کر نزہت نے اپنے بھائیوں سے فرمائش کر دی۔

''ہاں...... یہاں آ کر تم اس ٹرین میں نہ بیٹھو۔ جاؤ بھئی ٹھیک ہے۔'' نزہت کے بھائی نے کہا۔

وہ دونوں چوبی سیڑھیوں سے گزر کر ٹرین کی سیٹ پر آ بیٹھیں۔ لوگ ٹرین میں بیٹھ رہے تھے۔ ان کے خوف کا تماشا دیکھنے والے بھی سامنے ہی کھڑے تھے۔ آہستہ آہستہ تمام سیٹیں بھر گئیں اور ٹرین کی گھنٹی بج اٹھی۔

تبھی اچانک درخشاں کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ بالکل سامنے سے گزر رہا تھا۔ حسین ترین سوٹ میں ملبوس' بالوں کی ایک پریشان لٹ کو سنوارتا ہوا' آہستہ آہستہ' بھٹکی بھٹکی نگاہوں سے کسی کو تلاش کرتا ہوا۔

درخشاں کا ہاتھ بے اختیار نزہت کی کلائی پر جا پڑا۔

''نزہت!'' اس نے آہستہ سے پکارا۔

نزہت نے درخشاں کی گرفت غیر معمولی محسوس کی۔ اسی وقت ٹرین حرکت میں آ گئی اور نزہت کو ہنسی آ گئی۔

''کیا بات ہے؟ خوف محسوس ہو رہا ہے؟'' نزہت نے پوچھا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اس کی سیٹ اوپر اٹھتی ہوئی پیچھے کی گہرائیوں میں چلی گئی تھی اور اس کے بعد رنگین لباس' مسکراتے لوگ گول گول دائرے بن کر رہ گئے تھے۔ کسی شکل پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی' ٹرین کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ چیخیں ابھر رہی تھیں لیکن وہ خاموش تھی۔ کاش میں اس وقت ٹرین میں نہ بیٹھتی۔ کاش میں نیچے ہی ہوتی' ممکن ہے وہ بھی مجھے دیکھ لیتا۔ میرے قریب آنے کی کوشش کرتا' اگر وہ میرے قریب آ جاتا تو میں کیا کرتی؟ کیا کہتی اس سے؟ وہ شریف نوجوان ہے۔ ایک بار میری بے رخی دیکھ چکا ہے' دوبارہ میرے قریب آنے کی کوشش نہ کرتا۔ ایسی صورت میں؟ ارے ہاں' ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ...... اگر وہ واقعی کبھی مل ہی جائے تو؟ تو کیا وہ مجھ سے مخاطب ہو گا؟ کیا اسے میری تلخی یاد نہ ہو گی؟ لیکن میرے خیال میں' میں خود ہی آگے بڑھوں گی۔ اس کی خیریت پوچھوں گی اور ممکن ہوا تو اس سے معذرت بھی کر لوں گی۔

''اٹھو گی نہیں درخشاں؟'' نزہت نے اس کا شانہ ہلا کر کہا۔

ٹرین رک گئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ تیز رفتاری سے فرش سے گزر کر باہر آ گئی۔ ''آؤ نزہت آگے بڑھیں۔'' اس نے بے اختیار بوٹنگ کلب کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ اسی طرف گیا تھا۔ کوئی اور بھی تو تھا اس کے ساتھ۔ نہ جانے کون؟ اس کی مضطرب نگاہیں بھٹکتی

رہیں لیکن وہ تو سورج کی طرح غروب ہوگیا تھا۔ نہ جانے کہاں؟

تبھی عقب سے اسے آواز سنائی دی۔ ''اے بابو! اللہ کے نام پر دے دے بابو اللہ کے نام پر۔ اپنے بچوں کا صدقہ..... اپنی جوانی کا صدقہ۔'' وہ ششدر رہ گئی۔ یہ کیا قصہ ہے؟ یہ کیا سحر ہے؟ اس بھکارن کا ہم دونوں سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو گویا ٹریڈ مارک بن کر رہ گئی ہے۔ واقعی کیسی انوکھی بات ہے۔ پہلی بار اس آواز نے اس کی طرف متوجہ کیا۔ دوسری بار بھی جب وہ نظر آیا تو یہی آواز سنائی دی اور آج بھی۔

وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ ایک موہوم سی امید کے تحت ممکن ہے وہ نظر آجائے لیکن اس کے بعد وہ نہیں دکھائی دیا۔ ہاں بھکارن کی صدائیں کانوں میں گونجتی رہیں۔

''درخشاں!'' نزہت نے اسے پکارا اور وہ چونک پڑی۔ ''کہاں کھوئی ہوئی ہو بھئی؟''

''کہیں نہیں' اس بھکارن کو دیکھ رہی تھی۔''

''نہ دیکھو' خدا کے واسطے نہ دیکھو۔ اگر اس نے تمہیں متوجہ دیکھ لیا تو جان کو آجائے گی۔ ایسی ایسی دعائیں دے گی کہ تم شرم سے پانی پانی ہوکر رہ جاؤ گی۔ خدا محفوظ رکھے ان فقیروں سے۔ یقین کرو درخشاں اب تو کراچی کی سڑکوں سے خوف محسوس ہونے لگا ہے۔''

''کیوں؟'' وہ خواہ مخواہ مسکرا دی۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جیسے وہ نزہت کی باتوں میں دلچسپی لے رہی ہے' حالانکہ اس کی آنکھیں اب بھی بھٹک رہی تھیں۔ وہ اب بھی کچھ تلاش کر رہی تھی۔

''ارے بس کچھ نہ پوچھو۔ کراچی کے کسی کونے میں نکل جاؤ۔ تفریح گاہ' اسپتال' عبادت گاہیں' سرکاری ادارے' پررونق بازار۔ کوئی ملے نہ ملے لیکن فقیروں کا ہجوم ضرور ملے گا۔ ایک منٹ کے لیے کھڑے ہوگے ایک درجن آموجود ہوں گے۔ ایک کے بعد ایک' ناک میں دم کردیں گے' مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے اب عام لوگوں نے بھی پارٹ ٹائم کے طور پر گداگری شروع کردی ہے۔ بھئی درخشاں!'' نزہت نے اس کی غیر حاضری پھر محسوس کرلی۔

''ہاں...... ہوں کیا بات ہے......؟''

''تم بتاؤ کیا بات ہے؟'' اس بار نزہت نے اس کی گرفت کرلی۔

درخشاں جانتی تھی کہ نزہت کس قدر چالاک ہے۔ اس لیے اس نے خود کو پوری طرح سنبھالتے ہوئے کہا۔

''طبیعت پر کچھ گرانی محسوس کررہی ہوں نزہت۔''

''کیوں کیا بات ہے؟'' نزہت کا تجسس ہمدردی میں بدل گیا۔

''جب سے ٹرین میں بیٹھی ہوں' میرا خیال ہے آج میں اسے برداشت نہیں کرسکی۔'' درخشاں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''ہاں' تم اسی وقت سے کچھ افسردہ سی ہو۔ میں سوچ رہی تھی چلو واپس چلیں۔'' نزہت نے کہا۔

''سوری نزہت! تمہاری تفریح بھی خراب ہوئی۔''

''کیا بات ہوئی...... چلو بے کار باتیں مت کرو۔'' نزہت بڑے پیار سے بولی اور وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گئیں۔

سرخ ٹینس اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھ گئی۔ درخشاں نے سیٹ کی پشت گاہ سے گردن ٹکادی تھی۔ وہ بڑی شدید ذہنی تھکن محسوس کررہی تھی۔



کئی بار اس نے خود کو ٹٹولا۔ خود اپنا مذاق اڑایا۔ میں ایک عملی انسان ہوں۔ ایک سخت گیر باپ کا بیٹا ہوں جس نے نوجوانی کی حدود میں داخل ہوتے ہی ذمے داریوں کا بوجھ کاندھے پر رکھ دیا تھا۔ بجا نہیں تھا کہ باپ کی اس سوچ کو سمجھ نہ سکتا۔ دولت بہت تھی' عزت و وقار بھی لیکن اظہر حسین اسے بے عمل نوجوان نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ والدین کی دولت کے عادی ہو کر خود کچھ نہیں رہتے۔ مجھے ان حماقتوں کا شکار نہیں ہونا

چاہیے۔ بس ایک ہی بھرپور نگاہ تو پڑی تھی اس پر۔ نام نہ پتہ، حسب نسب بھی نہیں معلوم اگر مل بھی جائے اور معیار کی نہ نکلے تو یہ بیل منڈھے کیسے چڑھے گی؟

لیکن پسلیوں کے خول میں بند دنیا کا سب سے بڑا باغی کچھ نہیں مانتا تھا۔ وہ صورت ایسی رچی تھی کہ بھولے نہ بھولتی تھی اور دل کی یہ بغاوت سڑکوں پر لے آئی، بے چارہ آفاق تو موم کا پتلا تھا۔ بھلا اس کی کیا مجال کہ وہ منصور سے اختلاف کرے، چنانچہ اس کی بھی یہی ڈیوٹی تھی۔ فرصت ملتے ہی دونوں نکل پڑتے وہ کاروں کو لڑکیوں کو گھورتے گھورتے خاصے لفنگے بن گئے تھے۔

اس وقت بھی کلفٹن کے دائیں گوشے میں اونچی بارہ دری پر بیٹھے دونوں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے رہے تھے۔ کافی آوارہ گردی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے آفاق بری طرح تھک گیا تھا۔ وہ بارہ دری کی منڈیر پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور منصور اس سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہینڈی کرافٹ کی دکانوں پر خریداری کرنے والوں کا جائزہ لے رہی تھیں اور ذہن میں طرح طرح کے خیالات تھے۔ کاش وہ بھی کسی دکان پر کچھ خریداری کرتی نظر آجائے...... کاش......

اور اسی وقت اس کی آنکھوں نے اسے ایک دھوکا دیا۔ دھوکا، نہیں یہ تو حقیقت تھی۔ وہی تھی، ایک سرخ ٹینس کار میں بیٹھ رہی تھی۔ ہاں وہی تو تھی، سو فیصد وہی تھی۔ بے اختیار اس نے آفاق کو جھنجوڑا۔ ''وہ گئی...... وہ...... وہ سرخ ٹینس......'' اس نے بے اختیار آفاق کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی اور چونک پڑا۔ ''ارے آفاق!'' اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا لیکن آفاق موجود نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے بے اختیار منڈیر کے نیچے جھانکا۔ ڈھلان کے اختتام پر آفاق بگڑی ہوئی شکل لیے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔

چونکہ وہ منڈیر پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور منصور کا انداز بے حد پرجوش تھا۔ اس لیے وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اطمینان سے ڈھلان سے پھسلتا ہوا نیچے جا پڑا تھا۔

دوسرے لمحے منصور چھلانگیں مارتا ہوا سیڑھیاں طے کر کے آفاق کے پاس پہنچ گیا۔ ''کیسے...... کیسے گر گئے؟''

''بس یونہی اخلاقاً'' آفاق مسمسی شکل بنا کر بولا۔

''وہ...... وہ جارہی ہے آفاق! جلدی...... پلیز جلدی۔'' اس نے آفاق کا ہاتھ پکڑا اور اپنی کار کی طرف دوڑنے لگا۔ آفاق بے چارہ دوڑ کیا رہا تھا۔ اس کے شکنجے میں پھنسا گھسٹ رہا تھا۔ برق رفتاری سے دوڑتے ہوئے وہ کار کے قریب پہنچ گئے۔ ''جلدی آفاق! جلدی۔ چابی نکالو۔ آہ وہ پھر نکلی جارہی ہے۔''

آفاق بوکھلائے ہوئے انداز میں جیب میں کار کی چابی ٹٹولنے لگا۔ چابی اسی کے پاس تھی لیکن ایک جیب دوسری جیب پھر تیسری۔ چابی نہیں ملی اور وہ بوکھلاہٹ میں ناچنے لگا۔

''نہیں ہے۔''

''کہاں گئی؟''

ھنسی کا فوارہ

ایک دکان دار نے اپنے ملازم سے کہا۔ ''محنت اور ہوشیاری سے کام کرو گے تو ایک دن ضرور ترقی کرو گے۔ مجھے دیکھو اس دکان پر ملازم بن کے آیا تھا آج مالک بن کے بیٹھا ہوں۔''

نیا ملازم آہ بھر کر بولا۔ ''مگر جناب! آپ کے سابق مالک جیسے بھولے بھالے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔''

......☆......

استاد (شاگرد سے) ''تمہارا سن پیدائش کیا ہے؟''

شاگرد: جناب 1995 ق م۔''

استاد (حیرت سے) ''یہ ق م سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

شاگرد: ''میری مراد قتیل منیر سے ہے۔ میں اپنے بھائی قتیل منیر سے دو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔

ندیم احمد...... ملتان

''تم اپنی جیبوں میں دیکھو۔'' آفاق بولا۔

''میرے پاس کہاں سے آئی۔''

''اوہ..... کہیں گر نہ گئی ہو۔'' آفاق نے بارہ دری کی طرف دوڑنا شروع کر دیا اور منصور غمناک نگاہوں سے اس شاہراہ کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں اب ٹینس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

اسی وقت اس کے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز ابھری۔ ''دے دے بابو! اپنے بچوں کا صدقہ۔ جوانی کی خیرات۔ اللہ جوڑی بنائے رکھے بابو۔'' اور وہ خونخوار نگاہوں سے بھکارن کی طرف دیکھنے لگا۔ بھکارن اپنے مخصوص انداز میں صدائیں لگا رہی تھی۔

آفاق جھکا ہوا چابی تلاش کر رہا تھا۔ چابی مل گئی تو وہ اسی طرح دوڑتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ ''مل گئی۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اب کوئی فائدہ نہیں۔'' منصور نے افسردگی سے کہا اور پھر اس کا بازو پکڑے ہوئے بھکارن کے پاس پہنچ گیا۔ ''تو یہاں بھی آ گئی؟'' وہ غرایا۔

''اللہ بھائیوں کی جوڑی سلامت رکھے۔'' بھکارن نے ان دونوں کو دیکھتے ہی جلدی سے پینترا بدلا۔

''ایک منٹ' ایک منٹ۔ یہ لے۔'' منصور نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''بول' اے اللہ وہ مل جائے۔''

''اللہ..... اللہ وہ مل جائے۔'' بھکارن نے آواز لگائی اور منصور نے دوسرا نوٹ نکال لیا۔

''آواز لگا' اللہ اس کی کار پنکچر ہو جائے۔''

''اللہ جی' اس کی کار..... اس کی کار' کیا ہو جائے بابو؟'' بھکارن نے رک کر پوچھا۔

''پنکچر..... پنکچر۔'' منصور نے دانت پیس کر کہا۔

''پکچر پکچر' اے اللہ پکچر پکچر ہو جائے۔'' بھکارن نے کہا۔

منصور نے تیسرا نوٹ نکال لیا۔ ''شروع ہو جا۔ شروع ہو جا۔ اے اللہ.....''

''منصور یہ کیا حماقت ہے۔ لوگ ہمیں پاگل سمجھ رہے ہیں۔'' آفاق نے منصور کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''آ جاؤ' بس آ جاؤ۔'' آفاق اسے چمکارتے ہوئے بولا۔ ''تم واقعی عشق کی آفاقی داستانوں میں ایک گراں قدر اضافہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ آ جاؤ۔'' آفاق اسے چمکارتا ہوا بھکارن کے پاس سے ہٹا لے گیا۔

''تم نہیں جانتے آفاق' یہ وہی بھکارن ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا اس لڑکی سے کوئی پراسرار تعلق بھی ہے۔ جب وہ نظر آتی ہے تو یہ بھی موجود ہوتی ہے۔'' منصور گھونسا ہلا کر بولا۔

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ ہم مناسب وقت پر اس سے بھی نمٹ لیں گے۔ آؤ گاڑی میں بیٹھو۔'' آفاق نے کہا اور منصور ایک جھٹکے سے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر بیٹھ گیا۔ ''تو آج سے سیاہ مرسڈیز کی تلاش ختم؟'' آفاق نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''وہ ٹینس تھی' سرخ ٹینس۔''

''ہاں۔ گاڑی بدل دی اس نے۔''

''ویسے آسانی ضرور ہو گئی کسی قدر۔''

''کیوں؟''

''سیاہ مرسڈیز کی بہ نسبت سرخ ٹینس گاڑیاں بہت کم ہیں' ان کی تلاش میں آسانی ہو گی۔''

''ٹھیک ہے آج سے سرخ ٹینس۔'' منصور نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

''آج سے نہیں' کل سے۔ میرے دوست' آج رات کو مجھے بہت ضروری کام ہے۔'' آفاق نے عاجزی سے کہا اور منصور گردن ہلانے لگا۔



نزہت نے کوشش کی کہ کسی ڈاکٹر سے رجوع کر کے دوا لے لی جائے لیکن درخشاں نے سختی سے منع کر دیا۔ ''نہیں نزہت! یقین کرو ڈاکٹر کے تصور سے ہی

میری بیماری اور بڑھ جاتی ہے۔ بس تھکن سی ہو گئی ہے۔ سو جاؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔" درخشاں نے کہا اور نزہت خاموش ہو گئی۔

لیکن رات کو بستر پر لیٹی تو نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ بس ایک ہی احساس ذہن پر طاری تھا۔ اب کیا ہوگا؟ میں تو کہیں کی نہیں رہی۔ یہ دور ایسا نہیں ہے میں ایک روشن خیال لڑکی ہوں۔ مجھے اتنا احمق نہیں ہونا چاہیے۔" ذہنی کیفیت عجیب تھی۔ ایک انوکھا سا خوف اس کے ذہن پر طاری تھا۔ اسی عالم میں نیم غنودگی سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں انوکھے خواب در آئے۔ ایک پراسرار شکل بھکارن کی آواز اور پھر دو چلتے ہوئے قدم جو اس کی طرف بڑھے آ رہے تھے مسلسل چل رہے تھے۔ لیکن فاصلہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ یہ قدم...... یہ قدم...... قدموں کی چاپ اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ جاگ اٹھی۔ اسے اپنے بدن میں سنسنی سی محسوس ہوئی تھی اور پھر دفعتاً اسے ایک سایہ سا اپنے بدن پر پڑتا محسوس ہوا۔ ایک انسانی سایہ۔ جو اس کے بدن سے مس ہوتا ہوا دیوار پر پڑا تھا۔ فیلٹ ہیٹ کالر شانے اور...... اور شاید اوورکوٹ۔

دوسرے لمحے وہ دہشت سے اچھل پڑی۔ پائنتی پر پڑی ہوئی چادر اس نے خود پر کھینچ لی اور کہنی کے بل اٹھ کر سائے کو گھورنے لگی۔ سایہ ساکت و جامد تھا۔ کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق سے دہشت بھری چیخ نکل گئی اور دوسرے بیڈ پر سوئی ہوئی نزہت بھی جاگ گئی۔ ایک لمحے تک وہ ذہنی طور پر بیدار نہ ہوئی لیکن جب اسے درخشاں کی چیخ کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے بیڈ سے اتر کر اس کے پاس پہنچ گئی۔

"درخشاں درخشاں۔ کیا بات ہے؟"

"یہ...... یہ سایہ...... یہ کون ہے؟" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

سائے کو دیکھ کر نزہت کی بھی گھگھی بندھ گئی۔ دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن سایہ جس طرح ساکت و جامد تھا وہ انوکھی بات تھی۔ اس میں کوئی تحریک تو ہونی چاہیے تھی۔ نزہت نے ہی اس پر غور کیا اور دیر تک دیکھتی رہی۔ سایہ ایک کھلی ہوئی قد آدم کھڑکی سے پڑ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ نزہت کے حواس بحال ہونے لگے اور وہ درخشاں کے پاس سے اٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ پھر درخشاں کو اس کی ہنسی سنائی دی۔

"آیئے مس درخشاں! میں آپ کو ان حضرت سے ملاؤں۔ اگر ہم باہر نکل کر ان سے ملاقات نہیں کریں گے تو یہ بے چارے ساری رات یونہی کھڑے ہمیں خوف زدہ کرتے رہیں گے۔ بھئی آ جاؤ نہایت شریف ہستی ہیں یہ۔" نزہت کی آواز کے اطمینان نے اس کی ہمت بندھائی اور وہ بدن سے چادر لپیٹ کر دروازے پر آ گئی۔

لیکن باہر کوئی نہیں تھا۔ "تعجب ہے پہلے کبھی ان حضرت سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ملوان سے۔" نزہت نے کہا اور بات اب درخشاں کی سمجھ میں آ گئی۔ کمرے کے سامنے چھوٹا سا صحن تھا جس میں ایک لیمپ پوسٹ لگا ہوا تھا۔ اس کا اوپری شیڈ فیلٹ ہیٹ سے مشابہہ تھا۔ خود اس کی روشنی تو بند تھی لیکن کافی فاصلے پر یعنی صحن کے دوسری سمت ایک کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے تیز روشنی اس پر پڑ رہی تھی۔ یہی روشنی ایک سرو کے درخت پر بھی پڑ رہی تھی اور دونوں کی ملی جلی شکلوں نے ایک انسان ترتیب دے دیا تھا جس کا سایہ اندر نظر آ رہا تھا۔

"یقیناً تمہیں ان سے مل کر خوشی ہوئی ہوگی۔" نزہت ہنس پڑی۔

"لاحول ولا قوۃ۔" درخشاں بھی کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولی اور نزہت اسے دیکھنے لگی۔

"ویسے درخشاں تم کچھ پریشان ضرور ہو۔ کوئی خاص بات ہے۔"

"ہاں نزہت! نہ جانے کیوں بار بار گھر کا خیال آ رہا ہے۔ طبیعت پر کچھ گرانی بھی ہے۔" درخشاں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں کل لاہور فون کرلیں گے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' درخشاں نے کہا۔ اس کے بعد وہ باتیں کرتی رہیں اور دوبارہ نیند آئی تو سونے لیٹ گئیں۔

دوسری صبح درخشاں کی طبیعت کچھ بحال تھی اور یوں بھی وہ سنبھل گئی تھی دوسروں کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ دس بجے انہوں نے لاہور فون کیا تو ایک اور ہی انکشاف ہوا۔ بات چوہدری غلام رسول سے ہوئی تھی۔

''کیسی ہو بیٹے؟ کیا حال ہے کراچی کا؟'' چوہدری صاحب نے اس سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں ابا جی۔''

''کراچی تمہیں بہت پسند ہے درخشاں بیٹے؟'' چوہدری صاحب نے کہا۔

''جی ابا جی''

''بس تو ٹھیک ہے۔ ہم اب کراچی ہی میں رہیں گے۔ تمہارے چاچا بھی طویل عرصے سے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور میرے کچھ دوست بھی اگر آج تم فون نہ کرتیں تو میں ہی تمہیں فون کرتا۔ میں آج رات کی فلائٹ سے آرہا ہوں۔''

''سچ ابا جی۔'' وہ خوش ہوگئی۔

''ہم نے کبھی اپنے بیٹے سے جھوٹ بولا ہے۔'' چوہدری صاحب نے کہا اور پھر دوسرے لوگوں سے بات کرکے انہوں نے فون بند کردیا۔

پورے گھر میں گویا عید ہوگئی تھی۔ سارے کاروبار اس خوشی میں بند ہوگئے تھے۔ چوہدری صاحب کا کراچی میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ معمولی بات نہیں تھی۔ ان لوگوں کی سالہا سال کی خواہش تھی۔ چوہدری صاحب کو اس قدر مجبور کردیا گیا تھا کہ پچھلے چند ماہ سے وہ اس بارے میں سوچنے لگے تھے اور بالآخر آج یہ خوش خبری مل گئی تھی۔

رات کو سب لوگ چوہدری صاحب کو لینے ائرپورٹ پہنچ گئے۔ لیکن ائرپورٹ درخشاں کے لیے عجیب دہشت اختیار کرگیا تھا۔ رات کا وقت تھا اس لیے کوئی فقیر وغیرہ نہیں تھا۔ درخشاں کے کان اس آواز کو سننے کے منتظر تھے۔

''وے وے بابو اللہ جوڑی سلامت رکھے۔''

چوہدری صاحب کو ریسیو کرنے ان کے چند دوست بھی آئے تھے۔ ایک قیمتی کار میں نواب اظہر حسین صاحب بھی موجود تھے۔ چوہدری مہر رسول بڑے تپاک سے ان سے ملے تھے۔ نواب اظہر حسین ان سے کراچی میں رہ کر ملاقات نہ کرنے کا شکوہ کرنے لگے اور پھر بولے۔ ''بھئی غلام رسول کو کراچی آنے کے لیے مجبور کرنے میں میرا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ تم لوگ یہ نہ سمجھنا کہ یہ صرف تمہارا کارنامہ ہے۔''

چوہدری غلام رسول آگئے۔ پرمحبت انسان ایک ایک سے گلے ملے تھے۔ اظہر حسین سے وہ دیر تک چمٹے رہے۔ ''بھئی اب مزہ آئے گا زندگی کا۔ دل تو چاہتا تھا کراچی آکر رہنے کو لیکن انسان بھی کیا چیز ہے۔'' چوہدری صاحب بولے پھر کہنے لگے۔ ''میرے خاندان سے تو تمہارا تعارف ہے اظہر حسین؟''

''کیوں نہیں' کیوں نہیں۔''

''یہ میری بیٹی درخشاں ہے۔ اس سے ملے؟''

''نہیں' یہ کب آئی کراچی؟'' اظہر حسین نے درخشاں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''واہ بھئی اپنے اظہر چاچا سے نہیں ملنے گئی درخشاں تم؟'' چوہدری صاحب نے کہا اور نواب صاحب اسے دعائیں دینے لگے۔

چوہدری غلام رسول تنہا آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کراچی میں کوئی کوٹھی وغیرہ خریدنے کے بعد اپنے اہل خانہ کو یہاں بلائیں گے۔ ذرا جلد باز قسم کے آدمی تھے چنانچہ دوسرے ہی دن سے مصروف ہوگئے اور جب دولت کی فراوانی ہو تو لاکھ دو لاکھ کم یا زیادہ کون پروا کرتا ہے۔ ایک انتہائی خوبصورت کوٹھی خریدی گئی اور ڈیکوریشن کرنے والی ایک فرم کو اس کی ڈیکوریشن کرنے

کا ٹھیکہ دے دیا گیا۔ آن کی آن میں ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ چنانچہ ایک ہفتے قیام کے بعد وہ بیٹی کو ساتھ لے کر لاہور واپس چلے گئے۔ دوسرے ہفتے میں انہیں اپنے اہل خاندان کے ساتھ کراچی واپس آنا تھا۔



سرخ ٹینس بوٹن مارکیٹ پر نظر آئی تھی۔ دونوں اس کے پیچھے چل پڑے۔ ٹینس میں اس وقت کوئی لڑکی نہیں تھی۔ اگلی سیٹ پر دو افراد بیٹھے تھے۔ یہ تیسری سرخ ٹینس کار تھی جس کا انہوں نے تعاقب کیا تھا۔ پہلی دو کاروں میں سے ایک سفارت خانے کی تھی۔ دوسری ایک میمن تاجر کی تھی اور اب یہ تیسری نظر آئی تھی' چنانچہ اب وہ دونوں اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ کار برنس روڈ سے ہوتی ہوئی پرانی نمائش تک آئی اور پھر یہاں سے مزار قائداعظم کی طرف مڑ گئی۔

کار میں بیٹھے لوگ اب اس تعاقب سے بے خبر نہیں رہے تھے اور کسی قدر پریشان نظر آ رہے تھے۔ مزار قائداعظم سے وہ سیدھے شاہراہ قائدین پر چل پڑے اور وہاں سے ڈرگ روڈ پر نکل آئے۔

''میرا خیال ہے ہمیں کامیابی نصیب ہونے والی ہے۔ یہی مطلوبہ کار ہے۔'' منصور نے اظہار خیال کیا۔

''اس خیال کی وجہ؟'' آفاق نے پوچھا۔

''وجہ تو کوئی نہیں ہے۔''

''بس تو خاموشی سے چلتے رہو۔ اسے اس کے گھر تک پہنچا آئیں۔'' آفاق گہری سانس لے کر بولا۔

لیکن کار تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس میں سفر کرنے والے اب کسی قدر بدحواس نظر آ رہے تھے۔ ڈرگ روڈ کا پل کراس کیا' ائرپورٹ سے نکلے' ملیر آئے وہاں سے لانڈھی پہنچے اور پھر جب کار لانڈھی سے بھی آگے نکلی تو آفاق نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے اب یہ ٹھٹھہ یا حیدرآباد جا رہے ہیں۔''

''چلتے رہو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔'' منصور بولا۔

''رات ہوگئی ہے میرے بھائی۔'' آفاق رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''روزانہ ہوتی ہے۔ آج کون سی نئی بات ہے۔'' منصور نے جواب دیا۔

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' آفاق ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

دونوں کاریں سنسان سڑک پر آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔ لانڈھی کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ چوکھنڈی کے قریب کار آثار قدیمہ کی طرف مڑ گئی اور اب آفاق نے کار روک دی۔

''اب کیا حکم ہے؟''

''یہ...... یہ کیا حماقت ہے۔ رات کی تاریکی میں یہ کار اس طرف کیوں آئی ہے؟'' منصور نے پرخیال انداز میں کہا۔

''میں سمجھ گیا۔ آج مجھے معلوم ہوگیا کہ کیا قصہ ہے۔ آہ سارا معمہ ہی حل ہو کر رہ گیا۔'' آفاق عجیب انداز میں بولا۔

''کیا مطلب؟''

''بھکارن کی مدد...... سحر انگیز مدد...... ایک بے چین روح جو تمہارے حواس پر مسلط ہوگئی۔ یقیناً یہ سارا طلسم کسی روح کا ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں منصور تم کسی روح کے چکر......''

ابھی آفاق کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ دفعتاً دو فائر ہوئے۔ گولیاں کار کی باڈی اور ایک ٹائر کے وھیل کیپ سے ٹکرائی تھیں۔ فائر دوبارہ ہوئے اور اس بار ایک ٹائر نشانہ بن گیا۔ وہ زوردار آواز کے ساتھ پھٹا تھا۔

''جھک جاؤ' جھک جاؤ۔'' آفاق زور سے چیخا اور بے اختیار منصور نیچے جھک گیا۔ اسی وقت سرخ ٹینس واپس سڑک کی طرف پلٹی اور راہ پر چڑھتے ہی مزید دو فائر ہوئے دونوں گولیوں نے باڈی میں دو سوراخ اور کردیئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کار واپس شہر کی طرف چل پڑی۔

آفاق تھر تھر کانپ رہا تھا اور منصور بھی حواس باختہ تھا۔ یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ بمشکل تمام حواس بحال ہوئے تو وہ دونوں سیدھے ہو گئے۔ جھکے جھکے گردن اکڑ گئی تھی۔ انہوں نے خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ دور دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ آفاق دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

"یہ روح کچھ زیادہ ہی بے چین ہے۔ چلو ٹائر نکالو۔"

"اور گولیوں کے سوراخ؟"

"ان پر اسٹیکر لگالیں گے' آج کل بازار میں کافی خوبصورت اسٹیکر مل جاتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کسی کی پھٹی ہوئی پتلون پر بروس لی نظر آتا ہے تو کسی پر بایونک وومن' لی میجر بھی خوب چل رہا ہے۔" آفاق نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

وہ کافی جھلایا ہوا تھا۔ منصور خاموشی سے ٹائر نکالنے چلا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خیریت ہو گئی۔ سرخ ٹینس میں یقیناً جرائم پیشہ لوگ تھے۔ اگر وہ نیچے اترتے تو؟ دوسرے لمحے وہ ٹائر لے کر جلدی سے آفاق کے پاس پہنچ گیا۔ جو وسیل کیپ کے بیچوں بیچ بن جانے والے سوراخ میں انگلی ڈال کر گولی تلاش کر رہا تھا۔

◉......◉......◉

اظہر حسین صاحب کافی خوش تھے اور اس وقت ایک موٹے سگار کے کش لیتے ہوئے پر خیال نگاہوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھ رہے تھے۔ "منصور کی عمر کتنی ہو گئی؟" انہوں نے پوچھا۔

"ماشاءاللہ چوبیسویں سال میں ہے۔" بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔

"بس اس سال اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میں نے لڑکی تو دیکھ لی ہے۔"

"کہاں؟" بیگم صاحبہ کو بھی یہ موضوع پسند آیا تھا۔

"میرے ایک گہرے دوست چوہدری غلام رسول لاہور سے یہاں آگئے ہیں' ان کی بیٹی ہے۔ صاحب حیثیت لوگ ہیں سن سینتالیس میں انہوں نے مہاجرین کی دل کھول کر مدد کی تھی' اس وقت سے میری ان سے دوستی ہے۔ ان کی بیٹی مجھے پسند ہے۔"

"منصور سے بھی پوچھ لیا جائے۔" بیگم صاحبہ دبی دبی زبان میں بولیں۔

"کیا......؟ کیا؟" اظہر حسین صاحب کے منہ سے سگار نکل گیا۔

"میرا مطلب ہے منصور......"

"خوب' خوب ماڈرن ہو گئی ہیں آپ' جدت پسندی گھس آئی ہے ذہن میں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں۔"

"پھر کیا مطلب ہے سمجھائیے۔ وہ دونوں جو یورپ میں بیٹھے ہیں میرے سامنے کچھ نہ بولے۔ میرے انتخاب کے آگے سر جھکا لیا تو یہ صاحبزادے خود لڑکی پسند کریں گے۔ میں کہتا ہوں تم میری نگاہوں میں اس کی پوزیشن کیوں خراب کر رہی ہو۔"

"اوہ' بس ایسے ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ آپ نے غلام رسول صاحب سے بات کی؟" بیگم صاحبہ شوہر کو خوب سمجھتی تھیں۔

"کیا مطلب ہے؟ کیا مطلب ہے؟ یعنی وہ انکار کر دیں گے مجھے۔ یعنی اظہر حسین کو ایں؟"

"ممکن ہے بچی کسی سے منسوب ہو۔ بات تو کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ کل چل رہے ہیں ان کے ہاں۔" نواب صاحب نے کہا اور بیگم خاموش ہو گئیں لیکن وہ کسی قدر پریشان ہو گئی تھیں۔

منصور اپنے دونوں بھائیوں کی طرح سعادت مند نہیں تھا لیکن شوہر کے سامنے بھی دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ چنانچہ دوسرے دن وہ غلام رسول صاحب کی خوبصورت کوٹھی پر پہنچ گئے۔ غلام رسول اور ان کے اہل خاندان نے دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ رسمی گفتگو کے بعد اظہر حسین صاحب نے پوچھا۔

''غلام رسول، یہ بتاؤ بیٹی کی نسبت طے کی ہے کہیں؟''

''ابھی نہیں اظہر بھائی! یہ کام آپ ہی کریں گے۔ میں کون ہوں۔''

''کریں گے نہیں میاں کر چکے ہیں۔ لڑکا مجھے بہت پسند ہے۔ اپنا کاروبار کرتا ہے اور ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اسی سال یہ کام کرڈالو۔ ابھی سال ختم ہونے میں تین ماہ باقی ہیں۔''

''میری مجال کہ میں انکار کردوں اس نادر شاہی حکم سے۔ یہ حکم تو ایک تاریخی شخصیت کی یاد دلاتا ہے۔'' غلام رسول ہنس کر بولے۔

''کون لوگ ہیں بھائی جان! کہاں سے تعلق رکھتے ہیں؟'' بیگم غلام رسول نے پوچھا۔

''ارے ارے کیوں شامت آئی ہے تمہاری۔'' غلام رسول جلدی سے بول پڑے۔ ''بھئی اظہر بھائی نے انہیں پسند کرلیا ٹھیک ہے۔''

''تو میں انہیں زبان دے دوں؟'' اظہر حسین نے کہا۔

''انکار کی کسے مجال ہے اظہر بھائی! آپ نے تو میرے شانوں سے بوجھ ہلکا کردیا ہے۔'' غلام رسول عاجزی سے بولے۔ اور اظہر حسین خوش ہوگئے۔

''بس تو کل وہ مٹھائی اور انگوٹھی لے کر آرہے ہیں تمہارے گھر۔''

''کل کس وقت بھائی جان؟'' بیگم غلام رسول نے پوچھا۔

''شام سات بجے۔'' اور دونوں میاں بیوی خاموش ہوگئے۔

دوسرے دن سات بجے نواب اظہر حسین مٹھائی کے ٹوکروں، زیورات کے ڈبوں اور پھولوں سے لدے پھندے غلام رسول کے گھر پہنچ گئے۔ غلام رسول اور ان کی بیگم بھی استقبال کے لیے تیار تھے لیکن ان لوگوں کے ساتھ دوسرے مہمانوں کو نہ دیکھ کر انہیں تعجب ہوا۔

''وہ لوگ کہاں ہیں اظہر بھائی؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''کون لوگ؟'' اظہر حسین نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

''مم...... میرا مطلب ہے لڑکے والے۔''

''میاں دونوں تمہارے سامنے ہیں۔'' نواب صاحب نے اپنی شہد ملت کیپ درست کرتے ہوئے کہا۔ ''خادم لڑکے کا باپ ہے اور یہ اس کی ماں۔'' غلام رسول کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''کوئی اعتراض ہے تمہیں؟'' نواب صاحب نے پوچھا۔

غلام رسول نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگالیا۔ ''نہیں اظہر بھائی آپ نے مجھے جو اعزاز بخشا ہے اس پر بھلا میں اعتراض کروں گا۔ میری اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوگی کہ مجھے اتنے اعلیٰ نسب خاندان میں جگہ مل رہی ہے۔'' غلام رسول صاحب کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

''نہیں میرے یار! تیری اعلیٰ نسبی تو میرے خاندان کو چمک دے گی۔ کوئی ایسا ویسا ہوتا تو میں بھلا اس سے رشتہ مانگنے جاتا۔ چلو بیگم شرمائی شرمائی کیا کھڑی ہو سمدھی کا منہ میٹھا کرو میں ذرا سمدھن سے راز و نیاز کرتا ہوں۔'' اظہر حسین نے کہا اور بیگم چوہدری شرما گئیں۔

کافی دیر تک یہ محفل جمی رہی۔ درخشاں کو طلب کیا گیا اور اس کی انگلی میں انگوٹھی اور مانگ میں ٹیکا سجادیا گیا۔ درخشاں پتھر کے بت کی مانند ساکت وجامد تھی۔ اس کے چہرے پر نہ شرماہٹ تھی نہ آنکھوں میں کوئی خوشی کی چمک۔ اس کے بعد محفل برخاست ہوگئی اور اظہر حسین صاحب خوش خوش چلے گئے۔



سارے جہاں میں اگر کوئی محرم راز تھا تو بدر جہاں تھی۔ دونوں نے ساتھ پرورش اور تعلیم پائی تھی۔ سن سینتالیس میں بدر جہاں کی ماں نور جہاں جو ایک اچھے خاندان کی بہو تھی پورے کنبے کے قتل کے بعد مہاجر

کیمپ میں پہنچی تھی اور چوہدری صاحب اسے بہن بنا کر لے آئے تھے۔ انہوں نے زبان کا رشتہ ایسا نبھایا تھا کہ ایک مثال قائم ہوگئی تھی۔

پھر نور جہاں کی قسمت نے زور مارا اور پھر پورے گیارہ سال بعد اس کا شوہر مل گیا جو زخمی ہوا تھا مرا نہیں تھا۔ گیارہ سال کی مسلسل کاوشوں کے بعد اس نے بہر حال بیوی کو تلاش کرلیا تھا۔ چوہدری صاحب اس کے مل جانے سے اتنے ہی خوش ہوئے تھے جتنا کسی بہن کا بھائی ہوسکتا تھا۔ انہوں نے زبردست جشن منایا تھا اور پھر بھلا ان دونوں کو یہاں سے جانے کون دیتا۔ امجد علی کو چوہدری صاحب نے اپنے کاروبار کے ایک حصے کا منتظم بنادیا اور ان کی خوشیوں میں اضافہ ہوگیا۔ تب بدر پیدا ہوئی اور اس کے دو ماہ بعد درخشاں۔ خاندانوں کی کوئی تمیز ہی نہیں رہی تھی اس لیے بدر جہاں اور درخشاں میں کوئی فرق نہیں کیا گیا لیکن امجد علی کی عمر وفا نہ کرسکی۔ بدر کی پیدائش کے تین سال بعد اس کا انتقال ہوگیا اور نور جہاں کے دل کو کچھ ایسی لگی کہ ایک سال کے بعد وہ خود بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ چوہدری صاحب نے تہیہ کرلیا کہ بدر کو والدین کی کمی محسوس نہ ہونے دیں گے۔ ان کی بیگم بھی صاحب دل تھیں اس لیے بدر اسی گھر کی بیٹی بن کر جوان ہوئی۔ دوسرے لوگوں نے حالات اسے بتادیے تھے لیکن وہ اس گھر کو اور یہاں والوں کو غیر نہیں سمجھتی تھی اور درخشاں تو اس کی زندگی تھی۔ اتنا چاہتی تھی اسے کہ دنیا میں کسی نے کسی کو ایسے نہ چاہا ہوگا۔

درخشاں کا اس سے زیادہ مزاج شناس کوئی نہیں تھا۔

''تم خوش نہیں ہو درخشاں؟'' بدر نے کہا۔

''ارے بدر! زندگی کی ڈور الجھ گئی۔ جن خوشیوں اور مسرتوں میں پروان چڑھی تھی اس عمر میں آکر چھن گئیں۔'' درخشاں کی آنکھوں میں پہلی بار نمی آئی تھی اور بدر دیوانی ہوگئی۔

''کیا ہوا درخشاں! کیا بات ہے میری جان! مجھے نہیں بتاؤ گی؟'' اس کی آنکھوں سے سیلاب رواں ہوگیا۔

''ہاں بدر! سب کچھ غلط ہوگیا لیکن قصور میرا نہیں ہے۔'' درخشاں نے اسے ساری کہانی سنادی۔

''کوئی اتا پتہ نہیں؟''

''کچھ نہیں' پھر نہیں ملا' کبھی' یا یوں کہو تقدیر نے ملنے نہیں دیا۔''

''اسے بھول جانے کی کوئی گنجائش ہے؟''

''بڑی کوشش کی ہے بدر' دل نہیں مانتا۔'' درخشاں رو پڑی اور بدر اس کے ساتھ آنسو بہانے لگی۔

''اگر کوئی نشان ہوتا اس کا تو میں آخری کوشش کرتی۔''

''تو صرف ایک کوشش کر بدر' کسی طرح یہ شادی ملتوی کرادے۔ کسی بھی طرح میں اسے ڈھونڈ لوں گی۔ وہ کراچی میں ہی ہے ایک نہ ایک دن ضرور مل جائے گا۔ بس یہ شادی کی مصیبت ٹال دے۔''

''ہائے میں یہ کیسے کردوں گی۔ تیرے لیے میں عزت' جان سب کچھ دے سکتی ہوں لیکن ابا جی کی زبان۔''

''کچھ بھی ہوجائے بدر' دیکھ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں لیکن اگر مجھے شادی کے لیے مجبور کیا گیا تو میں مرجاؤں گی۔''

''تجھے نہیں مرنے دیں گے درخشاں! ہم خود مرجائیں گے۔'' بدر نے بڑے عزم سے کہا اور درخشاں اس کی صورت دیکھنے لگی۔ ''بے فکر رہ کوشش کریں گے کہ کامیاب نہ ہوسکے تب بھی آخری کارڈ ہے ہمارے پاس۔''



''یہ...... یہ سب کیا ہے ابی حضور! میں کہتا ہوں یہ سب کیا ہے؟'' نواب اظہر حسین کے باہر نکلتے ہی منصور پھٹ پڑا۔ باپ کے سامنے تو بولنے کی ہمت ہی نہیں تھی لیکن اس وقت وہ بپھرا ہوا تھا' ابھی تھوڑی دیر قبل چوہدری

صاحب اوران کی بیگم اسے انگوٹھی پہنا کر گئے تھے۔

''تم اپنے ابا حضور کو جانتے ہو منصور؟ چوہدری صاحب ان کے پرانے دوست ہیں اور پھر لڑکی میں دیکھ چکی ہوں' بہت خوبصورت۔''

''گولی ماردوں گا میں اس لڑکی کو سمجھیں آپ؟''

''میں بے بس ہوں منصور۔''

''دیکھیے امی! یہاں آپ کی بے بسی کام نہیں دے گی۔ یہ میری خواہش ہے کہ آپ اس معاملے کو درمیان میں ہی ختم کردیں۔ کیا فائدہ میں ابا حضور کے منہ آؤں۔ کیا فائدہ کہ میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔''

''منصور! گستاخی کی آخری حدوں کو چھور ہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ خود کو کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ کیا تمہارے بھائیوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟''

''مگر میں اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس خاندان میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔''

''کیا یہ کوئی فلمی خاندان ہے؟ چھوڑیے ان فرسودہ باتوں کو۔ مجھے زندگی گزارنی ہے' میں...... میں یہ شادی نہیں کروں گا۔''

''ٹھیک ہے' یہ کام خود کرلو۔'' بیگم اظہر حسین نے سخت لہجے میں کہا۔

''تو آپ میری مدد نہیں کریں گی؟''

''میں تمہارے لیے زندگی دے سکتی ہوں۔ بولو۔ ماں ہوں تو ماں ہونے کا ثبوت دوں گی۔ اشارہ کرو خدا کی قسم زہر کھالوں۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کرو منصور کہ تم سے پہلے میرے شوہر ہیں' تقدیر نے ان سے ریاست چھین لی کیا میں ان سے باپ کا مان اور شوہر کی عظمت بھی چھین لوں؟ یقین کرو منصور' دنیا ادھر سے ادھر ہوجائے میں ایسا نہیں کروں گی۔''

''چاہے میں مرجاؤں؟'' منصور متاثر ہوگیا۔

''اگر تم مرگئے منصور تو میں تمہارا غم لے کر مرجاؤں گی لیکن اظہر حسین کو ان کے کسی فیصلے پر شرمندہ نہ ہونے دوں گی۔ میں انہیں جانتی ہوں۔'' بیگم اظہر حسین نے کہا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ منصور کو ان کا آخری فیصلہ معلوم ہوگیا تھا وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

آفاق کے سوا اور کون مونس و غمخوار تھا۔ وہ بیچارہ ساری روداد سن کر خود بھی پریشان ہوگیا تھا۔ ''یہ تو واقعی مشکل کی بات ہے لیکن اس دور میں اس طرح شادی......''

''یہ ظلم ہے آفاق! میں نے اس لڑکی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔''

''یوں کریں کسی طور اسے دیکھ لیں۔'' آفاق نے کہا۔

''میں لعنت بھیجتا ہوں۔ اگر شادی کی تو اسی لڑکی سے کروں گا ورنہ کروں گا ہی نہیں۔''

''میں تمہاری اس ضد سے متفق نہیں ہوں منصور! وہ تو چھلاوہ ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں پھر کیسے کروگے اس سے شادی؟''

''معلوم نہیں ہے لیکن ہوجائے گا۔ میں اسے تلاش کروں گا زندگی کی آخری سانس تک تلاش کروں گا۔''

''جی ہاں اور جب وہ آپ کو ملے گی تو اس کے نو پوتے اور سات پوتیاں ہوں گی جو اپنی دادی جان سے آپ کا اظہار عشق کسی طور برداشت نہیں کرسکیں گے۔'' آفاق نے کہا۔

''یار آفاق! تم تو میرے حال پر رحم کھاؤ۔ خدا کے واسطے میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔''

''میں بھی سنجیدہ ہوں منصور! لیکن کوئی حل تو ہو۔''

''حل سوچنا ہوگا۔''

''سوچو۔'' آفاق نے گردن ہلادی۔



بیگم صاحبہ نے کہا۔ ''آپ نے منصور کا رویہ دیکھا ہے ان دنوں؟''

''کیا بات ہے خیریت؟''

''وہ...... وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' بیگم صاحبہ

نے نہ جانے کس طرح ہمت کر کے یہ الفاظ کہہ دیے لیکن نتیجہ ان کی توقع کے برعکس نہیں تھا۔ نواب اظہر حسین کا رنگ بدل گیا۔ آگ کی طرح سرخ ہوگئے۔

''کیا مطلب ہے؟ کیا مطلب ہوا اس بات کا؟''

''میرا مطلب ہے کہ اسے یہ شادی پسند نہیں ہے۔''

''کیوں...... کیا چاہتا ہے وہ؟''

''بس کہتا ہے وہاں شادی نہیں کروں گا۔''

''وہ کون ہوتا ہے یہ کہنے والا۔'' نواب صاحب دہاڑے۔

''دیکھیے وقت بدل گیا ہے' حالات بدل گئے ہیں' اب ہماری فکر میں بھی تھوڑی سی تبدیلی ہونی چاہیے۔ بچوں کی خوشی پوچھ لینی چاہیے۔''

''کیا یہ بھی ممکن ہے' کیا اب ہم اتنے بے حیثیت ہوگئے۔ کیا واقعی' مگر بچی بری نہیں ہے' لوگ برے نہیں ہیں۔ ہم نے کسی غلط جذبے سے یہ سب کچھ نہیں کیا ہے' پھر اسے کیوں اعتراض ہے۔''

''بس وہ نہیں چاہتا۔''

''اسے چاہنا ہوگا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں' چوہدری کی عزت مانگ چکا ہوں۔ اگر درخشاں اس گھر میں نہ آئی تو مجھے خودکشی کرنا ہوگی۔ اتنا کچھ چھن چکا ہے کہ اب کچھ اور چھنا تو وہ آخری ہوگا۔'' نواب صاحب نے کہا اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔

بیگم صاحبہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں پھر انہوں نے الماری کی طرف رخ کر کے آواز دی۔ ''اب وہاں کیوں گھسے ہوئے ہو باہر نکل آؤ۔'' اور لماری کے پیچھے سے منصور نکل آیا۔ اس کی گردن لٹکی ہوئی تھی۔

''سن لیا اپنے کانوں سے؟'' بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

''ہاں امی حضور! ابا حضور بلاوجہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا رہے ہیں۔'' منصور نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا اور خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔



''یار خدا کی قسم...... مم...... مارا جاؤں گا۔ تیرا اکلوتا دوست ہوں۔ تجھے رحم نہیں آتا مجھ پر۔'' آفاق نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور منصور نے اسے زبردست دھکا دے دیا۔

آفاق اس دھکے سے دوڑتا چلا گیا تھا اور اس کے قدموں کی چاپ پر اظہر حسین صاحب اس کی طرف متوجہ ہوگئے پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آؤ آؤ آفاق میاں' بیٹھو بیٹے! خیریت؟''

''جی ابا حضور۔'' آفاق نے کھکھیائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کاروبار کیسا ہو رہا ہے؟''

''نہایت مناسب۔''

''سنا ہے پچھلے دنوں جاپان گئے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''خریداری کی کچھ؟''

''جی ہاں۔'' آفاق مشینی انداز میں بولا۔

نواب صاحب بغور اسے دیکھنے لگے ''کوئی کام ہے مجھ سے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''بتاؤ بتاؤ بیٹے! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' نواب صاحب کی نرم آواز ابھری۔

''منصور...... منصور۔'' آفاق کے حلق سے بمشکل آواز نکلی اور اظہر حسین نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''اس نے بھیجا ہے تمہیں۔'' انہوں نے پوچھا۔

آفاق نے زور زور سے گردن ہلا دی۔

''دیکھو بیٹے! تم اس کے دوست ہو۔ اس سے بات کرو۔ اس سے کہو کہ میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے بہت زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ میرے دونوں بیٹوں نے مجھے اس سلسلے میں مایوس نہیں کیا اور میرے حکم پر ہمیشہ گردن جھکا دی۔ خدا کا احسان ہے کہ میرے انتخاب سے انہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا۔ اپنی اسی

ساکھ کے سہارے میں نے چوہدری غلام رسول سے بھی بات کر لی تھی۔ اب اسے چاہیے کہ میرے فیصلے کو قبول کر لے ورنہ میری عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔ میں نے چوہدری غلام رسول سے مزید بات چیت کی ہے اور بہت جلد شادی کی کوئی تاریخ متعین کر دی جائے گی۔ اس کے علاوہ پرسوں منصور کے دونوں بھائی بھی آ رہے ہیں۔ یوں سمجھو اب اس سلسلے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔" نواب صاحب کا لہجہ نرم لیکن فولاد سے زیادہ سخت تھا۔ "سمجھ گئے تم؟"

"جی۔"

"جاؤ۔" نواب صاحب بولے اور آفاق دم دبا کر اٹھ آیا۔

دروازے کے عقب میں منصور کھڑا دانت پیس رہا تھا۔ آفاق اس کے قریب رکے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا اور منصور اس کے پیچھے دوڑ گیا۔

"یہ تم میری وکالت کرنے گئے تھے؟" اس نے آفاق کا کالر پکڑتے ہوئے کہا۔

"یار منصور! اب تو تو میری ہی گردن دبا دے۔ اف کیسا دم گھٹ رہا تھا' جان نکلی جا رہی تھی میری تو۔ خدا کی پناہ۔"

"سوچ لے آفاق! اچھی طرح سوچ لے۔ اچھا نہیں ہوگا۔ خدا کی قسم اچھا نہیں ہوگا۔" منصور نے دھمکی دی اور آفاق الوؤں کی طرح پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھتا رہا۔

⊙...... ⊙...... ⊙

منصور کی تلاش جاری تھی۔ اگر وہ مل جائے تو اس سے پوچھ تو لیا جائے۔ ایک بار حال دل سنا تو دیا جائے لیکن وہ چھلاوہ بھی اس کا تو کوئی نشان ہی نہیں ملتا تھا۔ دوسری طرف منصور کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ دونوں بھائی اپنی بیگمات اور بچوں کے ساتھ آ چکے تھے۔ منصور کی بھابیاں بڑی چاہ سے دیور کی شادی کی تیاریاں کر رہی تھیں لیکن انہیں منصور کے عجیب رویے کا بھی احساس تھا۔

چھوٹی بھاوج نے اپنے شوہر اکبر حسین سے کہا۔

"کیا بات ہے' یہ منصور اس قدر بدلا بدلا سا کیوں ہے؟"

"آج ہی امی سے میں نے پوچھا تھا۔ انہوں نے عجیب بات بتائی۔" اکبر حسین نے کہا۔

"کیا؟"

"امی کا کہنا ہے کہ منصور شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ارے کیوں؟ لڑکی تو بہت پیاری ہے۔"

"بس اسے پسند نہیں۔"

"تو پھر؟"

"ابا حضور بات کر چکے ہیں' اس لیے وہ بھی اپنی جگہ سے ہلنے کے لیے تیار نہیں اور اب تو تاریخ بھی طے ہو چکی ہے۔"

"بڑی پریشان کن خبر ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

"میں خود پریشان ہوں۔"

"منصور سے بات کرو۔" بیگم نے مشورہ دیا۔

"یہی سوچا ہے۔ آج رات کو پکڑوں گا اسے۔" اکبر حسین نے کہا۔

رات کو وہ دونوں میاں بیوی دیر تک جاگتے رہے۔ منصور گیارہ بجے کے قریب گھر آیا تھا۔ وہ دونوں اس کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

"تمہاری بھابی کے خیال میں تمہارا رویہ قابل اعتراض حدود میں داخل ہو گیا ہے۔" اکبر حسین نے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں بھائی جان! بھابی میں آپ سے بھی معافی چاہتا ہوں۔" منصور نے کہا۔

"ایک شرط پر معاف کیا جا سکتا ہے۔" صالحہ بیگم نے کہا۔

"حکم دیجیے۔"

"بیٹھو اور بتاؤ یہ سب کیا ہے؟"

"بس میں اس لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"تم نے اسے دیکھا ہے؟"

''دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔''

''کوئی خاص وجہ ضرور ہوگی۔ دیکھو منصور! میں تمہارا بھائی تو ہوں' دوست بھی بننا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔''

''مشکل ہے بھائی جان! آپ دوست نہ بن سکیں گے۔'' منصور نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''

''کیوں کہ آپ سب لوگ بھی ابا جان کی جھوٹی انا کے رکھوالے ہیں۔''

''اپنے لیے تھے' تمہارے لیے نہیں ہیں۔ تم ہمیں دوست بنا کر تو دیکھو۔ ممکن ہے تمہارے کام آ جائیں۔'' اکبر حسین نے کہا۔

''آپ وہ بات کہہ رہے ہیں بھائی جان جو کر نہیں سکتے۔''

''توہین کرنے پر تلے ہوئے ہو تو دوسری بات ہے۔ ورنہ میں تمہیں اپنے بچوں سے زیادہ چاہتا ہوں۔''

''خدا کی قسم بھائی جان! مجھے اس بات پر یقین ہے لیکن آپ ابا حضور کو کیسے مجبور کر سکتے ہیں؟'' منصور نے کہا۔

''کوئی لڑکی تمہاری نگاہ میں ہے؟''

''جی ہاں۔'' منصور نے گردن ہلا دی۔

''اوہ...... کون ہے وہ؟ کس کو بتا دیتے بھلے آدمی۔''

''میں ابھی خود اس کے بارے میں نہیں جانتا لیکن اگر مجھے مہلت مل جائے تو میں اسے تلاش کر لوں گا۔''

''سخت الجھی ہوئی سچویشن ہے۔ اگر وہ لڑکی نگاہوں کے سامنے ہوتی تو کچھ کیا بھی جا سکتا تھا لیکن ان حالات میں۔'' اکبر حسین نے پریشانی سے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا پھر بولے۔ ''اچھا منصور! اگر تم مجبور ہی ہو جاؤ اور آخری وقت آ جائے تو؟''

''اگر دوست بن کر پوچھ رہے ہیں بھائی جان تو میری میز کی دراز دیکھ لیں۔'' منصور نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' اکبر حسین چونک پڑے۔

صالحہ بیگم تیزی سے منصور کی میز کی طرف گئی تھیں اور پھر انہوں نے میز کی دراز سے کریم ہی کی گولیوں کی شیشی نکال لی۔ یہ ایک مہلک زہر تھا۔ دونوں میاں بیوی بھونچکے رہ گئے تھے۔

''یہ...... یہ کیا نالائقی ہے منصور؟'' اکبر حسین نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ ایک حقیقت ہے بھائی جان! منصور مسکرا کر بولا۔

گولیوں کی یہ شیشی اس نے پروگرام کے تحت خریدی تھی۔ ایک بار ابا حضور کے سامنے جیب سے گر بھی چکا تھا لیکن وہ سیدھی سادی خاتون ان کی حقیقت سے ناواقف تھیں۔ انہوں نے جلدی سے شیشی اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ یہ کہہ کر کہ منصور یہ تمہاری جیب سے گر گئی ہے اور منصور سر پیٹ کر رہ گیا تھا۔ پھر اس نے اسے اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا۔ اس امید پر کہ کوئی تو اسے دیکھ کر پہچان ہی لے گا لیکن کوئی اس کی چیزوں کو نہیں چھیڑتا تھا۔

وہ ہر ممکن کوشش کرتا رہا تھا لیکن ان تلوں سے تیل ہی نہیں نکل رہا تھا۔ آج پھر کچھ امید بندھی تھی لیکن صورت حال بڑی ہی مشکل ہو گئی۔

''میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا۔ حواس قابو میں رکھو ہم لوگ کیا مر گئے ہیں جو تم ان حرکتوں پر اتر آئے ہو۔ بے وقوف آدمی۔ ہم تینوں کی زندگی ضروری ہے منصور' تم آئندہ ایسی حماقت کی کوئی بات مت سوچنا۔''

''شرط وہی ہے بھائی جان۔''

''میں ای سے بات کرتا ہوں۔ ویسے تم اطمینان رکھو۔ صورت حال خواہ کتنی ہی بگڑ جائے' میں کوشش کروں گا کہ فیصلہ تمہاری مرضی کے مطابق ہو۔''

''سوچ لیجیے بھائی جان۔''

''صالحہ! صالحہ! اسے سمجھاؤ۔ کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔'' اکبر حسین نے لرزتی آواز میں کہا۔

زہر کی شیشی دیکھ کر وہ بیچارہ سراسیمہ ہوگیا تھا۔ بہر حال وہ دونوں اسے سمجھا بجھا کر نکل آئے لیکن اکبر حسین کو اب صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوگیا تھا۔ پہلے دونوں میاں بیوی ماں سے ملے لیکن بیگم اظہر حسین شوہر کی پرستش کرتی تھیں۔ وہ اپنی عبادت ترک نہیں کرسکتی تھیں۔

"تم ہی مجھے بتاؤ اکبر! اب میں کیا کروں؟"

"ابا حضور کو سمجھائیں۔"

"میں ان سے ایک ہی بات کہہ سکتی ہوں اب تو......"

"کیا؟" اکبر حسین نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ خودکشی کرلیں یا یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے اس منصور سے یہ امید نہیں تھی۔" بیگم صاحبہ رونے لگیں۔

"لیکن امی! اگر ابا حضور اپنے اندر تھوڑی سی لچک پیدا کرلیں تو کیا ہرج ہے۔ منصور کی پوری زندگی کا سوال ہے۔ ہمارے اوپر کیا اثر پڑے گا اور پھر......" اکبر حسین خاموش ہوگئے۔ اظہر حسین صاحب اس وقت اندر داخل ہوئے تھے۔

"میں سن چکا ہوں اکبر بیٹے! لیکن سنو، چوہدری غلام رسول ایسا انسان ہے جس کی آن اور عزت کے لیے میں اس خاندان کے ایک ایک فرد کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ میں اپنے اندر لچک پیدا کرلوں لیکن غلام رسول لوگوں کو کیا بتاتا پھرے گا۔ ہمارے اوپر کوئی اثر نہیں پڑے گا' لیکن اس کے اوپر......"

"ابا حضور! میں نے آپ کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولی لیکن اس سلسلے میں میری گزارش ہے کہ......"

"اکبر حسین! میں جانتا ہوں کہ تم کس الجھن سے دوچار ہو۔ میں خود بھی اس سلسلے میں بہت غور کرچکا ہوں۔ بعض اوقات انسان کی خوداعتمادی اسے کہاں سے کہاں پہنچادیتی ہے۔ منصور نے ہمارا غرور توڑ دیا لیکن کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ہماری اولاد ہے' اگر کوئی گنجائش ہوتی تو ہم ضرور سوچتے لیکن اب ضرورت ایک ایسے دھماکے کی ہے جو خود بخود سارے طلسم کو توڑ دے۔ منصور خودکشی کرلے' ہم مرجائیں یا غلام رسول۔ اس کے علاوہ اور کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر قرعہ فال ہمارے نام نکلے تو بخدا ہم مرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں اطلاع دے دینا۔" اظہر حسین صاحب باہر نکل گئے اور کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ ساکت و جامد رہ گئے۔

اکبر حسین پریشانی سے ماں کی صورت دیکھتے رہے تھے۔ پھر وہ گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

شادی کی تیاریاں بھی ہورہی تھیں اور خوف کا ماحول بھی تھا۔ بڑے بھائی مظہر حسین منصور کی نالائقی پر بپھرے ہوئے تھے اور منصور کے کوٹ کی جیب سے نئے نئے زہر برآمد ہورہے تھے۔ بہت سی میٹنگیں ہوچکی تھیں۔ منصور نے کہہ دیا تھا کہ نہ وہ گھر سے بھاگے گا اور نہ کوئی اور حرکت کرے گا لیکن یہ شادی نہیں ہوگی اور نہ جانے اس کے اس اعتماد کی کیا بنیاد تھی۔

البتہ آفاق کا کاروبار آج کل بند تھا۔ ملازمین ہی جو کچھ کررہے تھے سو کررہے تھے آفاق بستر علالت پر پڑا تھا۔ اسے کوئی بیماری نہیں تھی سوائے خوف کی بیماری کے۔ منصور اس سے اقرار لے چکا تھا اور وہ اپنے دوست کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی جان تو اسی وقت نکل گئی تھی جب منصور نے یہ تجویز پیش کی تھی۔

"سب ناکام ہوچکے ہیں آفاق۔ لیکن ابھی مجھے چند لوگوں پر بھروسہ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"چوہدری غلام رسول بلاشبہ خاندانی انسان ہیں۔ میں ان کی بیٹی کو بھی بے قصور سمجھتا ہوں۔ سنا ہے وہ خوبصورت بھی ہے اس لیے میں نے ایک اور فیصلہ کرلیا ہے آفاق۔"

"کیا؟"

"درخشاں بنت غلام رسول کی شادی تم سے ہوگی۔"

آفاق بستر سے نیچے جاپڑا۔ اس کی آنکھیں حلقوں

سے ابل آئی تھیں۔ "مم...... مجھے ایسا مذاق پسند نہیں۔"
وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولا۔

"ایک گلاس پانی لے آؤ۔" منصور نے جیب سے زہر کی شیشی نکال کر میز پر رکھ دی۔

"یہ...... یہ کیا ہے؟ ارے باپ رے۔" آفاق کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔

"اور یہ میرا وصیت نامہ ہے۔" منصور نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر کھول لیا۔ "ذرا غور سے سن لو۔

(۱) میں محبت میں ناکام ہو کر خودکشی کر رہا ہوں۔ زہر کی یہ شیشی میں نے ایک کیمسٹ کی دکان سے چرائی ہے اس سلسلے میں کسی پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔

(۲) میری لاش کو ائرپورٹ کے قریب دفن کیا جائے اور قبر پر یہ کتبہ نصب کیا جائے۔ 'شہید محبت' منصور حسین۔

(۳) میری موت کے بعد اس بھکارن کو ضرور پھانسی پر چڑھا دیا جائے جو لوگوں کو الٹی سیدھی دعائیں دیتی ہے۔ فقط

منصور حسین عرف شہید محبت بقلم خود۔

"یار یار کیوں میری جان نکال رہا ہے۔" آفاق کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ایک گلاس پانی لادو آفاق کیا تم مرنے سے پہلے اپنے دوست کا اتنا سا کام بھی نہ کرو گے؟"

"پانی کی ایسی کی تیسی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" آفاق نے جھپٹا مار کر شیشی اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

"تو تم مجھے پانی نہیں دو گے۔ ٹھیک ہے آفاق۔ کہیں اور سہی۔" منصور نے دوسری جیب سے ویسی ہی شیشی نکال کر دکھائی اور آفاق کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"یہ...... یہ دوسری شیشی کہاں سے آئی؟" وہ بے اختیار بولا۔

"ابھی ایسی اور بھی ہیں۔ میں نے پورا پیکٹ پار کر دیا تھا۔"

"مم...... مگر منصور! یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے میری جان؟"

"فلمیں نہیں دیکھیں کیا؟ ایسا ناممکن بھی نہیں ہے۔"

"ارے ان فلموں کی ایسی تیسی حقیقت ان سے بہت مختلف ہوتی ہے۔"

"تم چاہو تو میری موت کے بعد ان بے شمار فلم سازوں پر مقدمہ کر سکتے ہو جو ایسی فلمیں بناتے ہیں۔"

"یار منصور سنجیدہ ہو جاؤ۔"

"تم بتاؤ اس کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

"مگر میری موت کی ذمے داری کون قبول کرے گا؟ آہ منصور! میں نواب اظہر حسین کے ہاتھوں قتل ہونا نہیں چاہتا۔" آفاق نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں تمہاری جان بچالوں گا نیک دل نوجوان' بس تم ہاں کر دو۔"

"ہاں۔" آفاق نے کہا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔

اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ منصور جانے کیا کرتا پھر رہا تھا لیکن آفاق کی حالت اسی دن سے خراب تھی۔ پھر ایک دن اکبر حسین نے ہی منصور کو پکڑا۔

"میں خود بھی ابا حضور کی ضد سے متفق نہیں ہوں لیکن حالات ایسے الجھ گئے ہیں منصور کہ میں پاگل ہو کر رہ گیا ہوں۔ تم حیرت انگیز طور پر خاموش ہو گیا اب بھی تمہارے ذہن میں کوئی خطرناک منصوبہ ہے؟"

"راز داری کا وعدہ کرتے ہیں بھائی جان؟"

"منصور! میری جان حاضر ہے تمہارے لیے۔ یقین نہ ہو تو آزما لو۔"

"مجھے بھابی کی مدد کی بھی ضرورت ہوگی۔"

"صالحہ تمہیں اپنی اولاد کی مانند چاہتی ہے۔" اکبر حسین نے کہا۔

"تو پھر سنیے۔ درخشاں بنت چوہدری غلام رسول کا نکاح منصور حسین ولد اظہر حسین سے نہیں ہوگا بلکہ آفاق علی ولد فرزند علی سے ہوگا۔ میں نے سارے انتظامات

اس طرح کیے ہیں کہ بس کوئی خطرہ باقی نہیں رہ گیا۔

''کیا بکواس ہے۔ دلہا۔ قاضی؟'' اکبر حسین لرزتے ہوئے بولے۔

''میں نے سب ٹھیک کرلیا ہے بھائی جان۔ دلہا میں بنوں گا' بارات آفاق کی جائے گی۔ نکاح اس کا ہوگا۔ قاضی صاحب رجسٹر میں وہ سب کچھ لکھیں گے جو ہمارے حق میں ہوگا۔ انہیں پہلے سے ہدایت کردی گئی ہے۔''

''کیا وہ تیار ہوگئے ہیں اس غلط کام پر؟''

''اول تو کام غلط نہیں ہوگا۔ جس سے نکاح ہوگا چوہدری صاحب کی بیٹی اسی کی بیوی ہوگی۔ دوسرے قاضی صاحب کو ایک خاص ترکیب سے حقیقت سے لاعلم رکھا گیا ہے۔ ان کے ہاتھ سے کوئی غلط کام نہیں ہوگا۔ ہاں اگر آپ پسند کریں تو اس سلسلے میں میری مدد کردیں۔ بھابی جان کی بھی ضرورت ہوگی۔''

''لیکن اس کے بعد؟''

''دیکھیے بھائی جان! کچھ نہ کچھ تو ہونا ہے۔ پہلے یا بعد میں۔ ہاں بعد میں حالات کسی حد تک سنبھالے جاسکتے ہیں۔'' منصور نے کہا اور اکبر حسین شدید پریشانی کے عالم میں گردن ہلانے لگے' پھر گہری سوچ کے بعد بولے۔

''اچھی بات ہے بیٹے' اللہ مالک ہے۔ اس خاندان کی عزت بچانے کی کوئی ترکیب اب ذہن میں نہیں آرہی ہے۔ سو جو اللہ کی مرضی۔''

⊙......⊙......⊙

سب کو حیرت تھی۔ منصور نے اب مخالفت چھوڑ دی تھی۔ شادی کے دن اس کی سخت نگرانی کی گئی تھی لیکن وہ خوشی خوشی دولہا بنا اور لوگوں کو کسی حد تک اطمینان ہوگیا۔ دولہا کے لباس کا بندوبست اکبر حسین نے کیا تھا اور یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی کہ ہر چیز کی ڈبلی کیٹ تیار ہوئی ہے۔

بارات کی روانگی سے چند ساعت قبل منصور نے باتھ روم جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور اکبر حسین اسے لے کر چل پڑے۔ بس وہیں سے گڑبڑ ہوگئی۔ اکبر حسین دلہا کو سنبھالے ہوئے واپس آئے جس کے قدم لرز رہے تھے اور بدن کانپ رہا تھا۔

نکاح کے وقت قاضی صاحب کے نزدیک اکبر حسین کے سوا کوئی نہیں تھا۔ دوسرے لوگ قرب وجوار میں ضرور تھے لیکن ان عام سی باتوں پر کون توجہ دیتا ہے۔ اس لیے کسی نے قاضی صاحب کے رجسٹر پر نہیں دیکھا کہ کیا لکھا ہوا ہے۔ سارے کام اکبر حسین بڑے مردانہ وار کررہے تھے اور انہوں نے باقی معاملات خدا پر چھوڑ دیے تھے۔

قاضی صاحب نے ایجاب وقبول کرایا تب بھی کسی دوسرے کو ان کے نزدیک نہیں پھٹکنے دیا گیا۔ نکاح کے بعد دلہا کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی جس کا اظہار اکبر حسین نے کیا اور خود ہی چوہدری صاحب سے اجازت طلب کرلی کہ اگر وہ محسوس نہ کریں تو دلہا کو واپس لے جایا جائے۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔

اظہر حسین صاحب کا دل دھک سے ہوگیا تھا۔ منصور کی شدید مخالفت سے وہ بخوبی واقف تھے یہ بھی سن چکے تھے کہ منصور زہر کھانے کی دھمکی دے چکا ہے لیکن دو خاندانوں کے وقار کا سوال تھا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ دم سادھے بیٹھے رہے۔ اکبر حسین صاحب دلہا کو لے کر گھر واپس پہنچ چکے تھے۔ دلہا کی حالت واقعی خراب تھی۔ آفاق بے چارہ نیم جان ہورہا تھا۔ گھر کی فضا بے حد پراسرار تھی۔ آفاق نے جلدی سے لباس تبدیل کیا اور منصور اسے شربت مفرح قلب پلانے لگا۔ اکبر حسین نے سخت خطرہ مول لیا تھا۔ ساری بلا بے چارے نے اپنے ذمے لے لی تھی لیکن بھائی کی زندگی کا معاملہ تھا جو کچھ بھی بیتے گی دیکھا جائے گا۔ منصور نے نیا سوٹ پہن لیا' آفاق کو ایک کمرے میں پوشیدہ کردیا گیا تھا۔ سسرال سے ٹیلی فون آیا تو منصور نے خود ہی فون ریسیو کیا تھا۔ چوہدری صاحب خود بول رہے تھے۔

"کیسی طبیعت ہے منصور میاں؟"

"اب ٹھیک ہوں چچا جان! آپ لوگ فکر مند نہ ہوں۔ کیا بھائی جان واپس پہنچ گئے؟"

"ابھی نہیں اگر مناسب سمجھو بیٹے تو آ جاؤ۔ کیا ڈاکٹر سے رجوع کیا ہے؟"

"جی ہاں اگر محسوس نہ کریں چچا جان تو اس وقت۔"

"اچھا اچھا کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے مہمانوں سے کہہ دیا ہے۔ ہمیں رسموں کے لیے ضرورتوں کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ تم آرام کرو۔" چوہدری صاحب نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شام کو بارات رخصت ہو کر آ گئی۔ بے چارے اظہر حسین صاحب کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ گھر آ کر بیٹے کی شکل دیکھی تو سکون ہوا اور پھر خوش ہو گئے لیکن انہوں نے منصور سے کوئی بات نہیں کی تھی بس مطمئن ہو گئے تھے کہ بالآخر بیٹے نے ان کی خواہش پوری کر دی تھی۔

باقی ساری رسومات میں منصور کو ہی سامنے رکھا گیا۔ منہ دکھائی کے لیے وقت نہیں تھا' اسے دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ رات ہوئی تو صالحہ بیگم کا دور شروع ہو گیا۔ وہ منصور کو لے کر چل پڑیں اور پھر اندرونی کمرے میں دلہا بدل گیا۔ آفاق کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ اسے منصور نے سنبھال رکھا تھا' ورنہ اس میں تو چلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

"آفاق! میری جان' بس آخری مرحلہ اور ہے۔ اس کے بعد تو سب کچھ' لوگ کچھ بھی کہتے رہیں۔" منصور نے خوشامدانہ لہجے میں کہا اور دروازہ کھول کر آفاق کو اندر دھکیل دیا۔

اس نے خود ہی دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ صالحہ بیگم ہنس رہی تھیں۔ "منصور بھیا! ہم تو بس ابھی جا کر بستر باندھ لیتے ہیں۔ دیکھو کیسے نکالے جاتے ہیں۔"

"مجھے بھی ساتھ لے چلنا بھابی' جو کچھ ہوا وہ بہت اچھا ہوا ہے لیکن اب جو کچھ ہوگا بہت برا ہوگا۔"

"ارے اللہ مالک ہے۔ تم دل چھوٹا مت کرو۔ کسی نہ کسی طرح منا ہی لیں گے ابا حضور کو۔" صالحہ بیگم کی حالت خراب تھی لیکن انہوں نے منصور کو دلاسہ دیا۔



راز کھلا اور بڑا بے موقع کھلا آفاق نے رات کیسے گزاری یہ تو خدا ہی جانے لیکن رات بھر وہ جاگتا ضرور رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ علی الصبح نکل بھاگے گا اور پھر اس وقت تک واپس نہیں آئے گا جب تک زندگی کی ضمانت نہ مل جائے۔ چنانچہ منہ اندھیرے اس نے جوتے پہنے اور چوروں کی طرح دروازہ کھول کر باہر نکل آیا' لیکن اب اسے کیا کہا جائے کہ خود اظہر حسین صاحب بھی صبح خیزی کے عادی تھے۔ وہ پانچ بجے اٹھ جاتے تھے' نماز کے بعد پوری کوٹھی کا ایک چکر لگاتے تھے۔ اس معمول کو انہوں نے آج بھی ترک نہیں کیا تھا اور اس وقت وہ اسی کمرے کے سامنے سے گزر رہے تھے' ہاتھ میں تسبیح تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر بے اختیار ہی نگاہ اٹھ گئی تھی لیکن دوسرے لمحے تسبیح ان کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔

ان کی بینائی بالکل ٹھیک تھی اور انہوں نے آفاق کو صاف پہچان لیا تھا۔ انہیں علم تھا کہ یہ منصور کی خواب گاہ تھی جسے حجلہ عروسی بنایا گیا تھا اور پہلی رات کی دلہن کے کمرے سے سورج نکلنے سے پہلے ایک اجنبی کا برآمد ہونا جس قدر حیرت انگیز ہو سکتا تھا' انہیں بھی محسوس ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے انہیں بصارت پر یقین نہ آیا لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل کر اس طرف لپکے جہاں آفاق پھونک پھونک کر قدم رکھتا جا رہا تھا۔

"آفاق!" ان کی گرج دار آواز ابھری اور آفاق اچھل کر نیچے گر پڑا۔ اس خوفناک آواز سے اس کے حواس بحال نہیں رہے تھے۔ "آفاق" اظہر صاحب کی آواز میں بے پناہ حیرتیں تھیں اور آفاق ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح زمین پر پڑا انہیں گھور رہا تھا۔

"اٹھو" اظہر صاحب کی آواز دبی دبی سی تھی لیکن اس میں قہر کی بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔

آفاق کے ہاتھ پاؤں قطعی بے جان تھے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور پھر اس نے بے بسی سے اظہر حسین صاحب کو دیکھا جن کے چہرے پر آگ روشن تھی۔ انہوں نے آفاق کی حالت محسوس کرلی تھی اس لیے وہ جھکے اور اسے سہارا دے کر اٹھالیا۔ آفاق کے پورے بدن میں شدید تھرتھری تھی اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

اظہر صاحب اسے گھورتے رہے اور پھر بولے۔

"میرے پیچھے چلے آؤ۔"

جس طرح آفاق نے یہ فاصلہ طے کیا تھا اس کا دل ہی جانتا تھا۔ پھانسی کے مجرم کی کیفیت پھانسی کے پھندے تک جاتے ہوئے اس سے مختلف نہیں ہوتی ہوگی۔ اظہر حسین صاحب اسے اپنے کمرے میں لے گئے تھے اور پھر ان کی سنجیدہ آواز ابھری۔ "بیٹھ جاؤ۔" اور آفاق صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تم حجلہ عروسی سے نکلے تھے۔"

"جھ جھی..... جی....." آفاق کے حلق سے آواز نکلی۔ بالکل ہی مشینی انداز تھا ورنہ اس وقت بولنے کی سکت کس میں تھی۔

"منصور کہاں ہے؟" اظہر حسین صاحب نے پوچھا۔ آفاق نے بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکا۔ "جواب دو۔" اظہر حسین غرائے۔ ان کی عقل کام نہیں کررہی تھی کہ یہ کیا راز ہے۔

"م..... مجھے نہیں معلوم۔ اللہ قسم مجھے نہیں معلوم چچا جان۔ میں بے قصور ہوں۔ اللہ قسم میرا قصور نہیں ہے ہائے۔" آفاق کراہا۔ خوف سے اس کی شکل بگڑی ہوئی تھی۔ نہ جانے اظہر حسین صاحب کس طرح اس کی کیفیت سے متاثر ہوگئے۔ "دلہن اسی کمرے میں موجود ہے جس سے تم نکلے تھے؟" انہوں نے پوچھا اور آفاق نے زور زور سے گردن ہلادی۔ "دیکھو آفاق' ذرومت' مجھے صورت حال سے آگاہ کرو میں سخت پریشان ہورہا ہوں۔"

"اس حرکت میں کون کون شریک تھا؟" انہوں نے پوچھا۔

"منصور' اکبر بھائی' بھابی..... ہائے۔"

"مرومت..... ورنہ میں..... میں..... تم لوگ مجھے بے بس سمجھتے ہو۔ میری عزت سے کھیل کر یہ گھر باقی رہ سکتا ہے۔ خون کی ندیاں بہادوں گا' ایک ایک سے نمٹ لوں گا' ایک ایک سے اچھی طرح نمٹ لوں گا' زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اظہر حسین صاحب زخمی شیر کی طرح غرارہے تھے اور آفاق پر جاں کنی کی کیفیت طاری تھی۔ پھر وہ غرائے۔

"اٹھو۔" اور آفاق جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ "اس وقت کہاں جارہے تھے؟"

"گھگ..... گھر..... گھر۔" آفاق نے جواب دیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ دوبارہ کمرے سے نکل آئے۔

آفاق کسی قیدی کی طرح ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ اظہر صاحب اسے لے کر کوٹھی کے آخری حصے میں بنے ہوئے کمرے تک پہنچ گئے پھر انہوں نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور آفاق کو اس میں داخل کرکے دروازہ بند کردیا۔ اس کے بعد وہ واپس پلٹ پڑے۔ ان کے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے۔ دماغ الٹا جارہا تھا۔ چوہدری صاحب کی شکل بار بار ذہن میں ابھر رہی تھی۔ کیا کہیں گے ان سے کیا جواب دیں گے انہیں؟ دل چاہ رہا تھا سارے گھر والوں کو جگادیں ایک ایک سے نمٹ لیں۔

پریشانی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ گیٹ سے سفید رنگ کی ایک کار داخل ہورہی تھی جسے دیکھ کر انہیں چکر آگیا۔ چوہدری صاحب کی کار تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ چوہدری غلام رسول بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب صاحب ساکت ہوگئے۔ اس وقت جبکہ صبح بھی نہیں ہوئی تھی' چوہدری صاحب کی آمد بے معنی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ راز کھل گیا۔ وہ ساکت وجامد کھڑے رہ گئے۔ ان کے بدن میں لرزش تھی' کوئی

بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

چوہدری صاحب کار سے اترے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ نواب صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ "اظہر بھیا' میرے ساتھ آؤ۔ اندر چلو۔" چوہدری صاحب کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

اظہر حسین ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے اپنی ٹوپی اتاری اور چوہدری صاحب کے قدموں میں رکھ دی۔

اسی وقت چوہدری صاحب بھی جھکے اور ان کی سفید پگڑی نواب صاحب کے قدموں میں آ گئی۔

"نہیں بھائی غلام رسول' مجرم میں ہوں' قصور......"

"جوتے مارلو اظہر بھائی! اتارو جوتا۔ وہ ہوا ہے جو کبھی نہیں ہوا۔ ہم اتنے گرے ہوئے خاندان کے نہیں ہیں۔ مجھے معاف کردو اظہر بھائی۔"

"میں تمہاری اعلیٰ ظرفی کا دل سے قائل ہوں۔ غلام رسول! جوتے تم میرے سر پر مارو! آہ۔ اب اظہر حسین کی کوئی عزت نہیں رہی اس دنیا میں۔"

"مجھے احساس ہے۔ مجھے پورا پورا احساس ہے بھائی۔ آہ' میرا خون اس قدر خراب تو نہیں تھا۔ ہمیں گمان بھی نہیں تھا کہ ہمارے بچے ہمارے ساتھ یہ سلوک کریں گے۔" چوہدری صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔

اظہر حسین صاحب کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ شرمندگی کے احساس سے وہ زمین میں گڑھے جا رہے تھے۔ "چپ ہو جاؤ چوہدری' چپ ہو جاؤ۔ میں برداشت نہیں کرسکوں گا۔"

"تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے اظہر بھائی! دھوکا اور وہ بھی چوہدریوں کے گھر سے۔" چوہدری صاحب روتے ہوئے بولے۔

"تمہارے گھر سے؟ کیا کہہ رہے ہو چوہدری؟"

"ہاں' میں نے اس بچی کو بھی بیٹی کی طرح پرورش کیا ہے۔ بلاشبہ شریف ماں باپ کی بچی ہے اور قصور اس کا بھی نہیں ہے۔ میں نے تحقیقات کرلی ہے۔ وہ اپنی محبت میں یہ قدم اٹھا بیٹھی ہے۔ بہت چاہتی ہے وہ درخشاں کو۔"

"ایں کون؟ کس بچی کی بات کر رہے ہو؟"

"بدر جہاں کی۔ وہ معصوم ہے۔ اتنی نیک بچی ہے کہ......"

"مگر...... مگر اس بچی کو کیا ہوا؟" نواب صاحب نے پوچھا۔

"آہ تو کیا...... تو کیا تمہیں ابھی تک صورت حال کا علم نہیں ہوا؟ یہ بات میرے لیے اور تکلیف دہ ہے۔" چوہدری صاحب نے بھی اسی انداز میں پوچھا۔

"صورت حال مجھے معلوم ہے۔ مگر وہ بچی؟"

"جو لڑکی بیاہ کر آئی ہے وہ درخشاں نہیں بدر جہاں ہے۔ نکاح بھی اسی کا ہوا ہے۔" چوہدری صاحب نے کہا اور نواب صاحب اچھل پڑے۔

"کیا...... کیا؟" ان کی چیختی ہوئی آواز ابھری۔

"مجھے معاف کردو اظہر بھائی' مجھے......" چوہدری صاحب پھر پگڑی اٹھا کر دوڑے۔

نواب اظہر حسین کا بلند آہنگ قہقہہ ڈرائنگ ہال میں گونج اٹھا۔ وہ بے اختیار چوہدری غلام رسول سے لپٹ گئے تھے۔ "اماں نہیں واللہ...... کیا سچ کہہ رہے ہو؟ اماں واللہ۔ کیا یہی بات ہے؟ غلام رسول۔"

اظہر حسین کی آواز میں بے پناہ خوشیاں رقص کر رہی تھیں اور چوہدری صاحب پاگلوں کی طرح انہیں دیکھ رہے تھے۔ "اماں واللہ۔ عجیب تماشہ ہوا ہے۔ میاں غلام رسول! میں نے بھی تو ٹوپی تمہارے قدموں میں رکھی ہے۔ بھلا کیوں؟ آؤ یوں کریں کہ دونوں ایک دوسرے کا سر ڈھک دیں۔ رب العزت نے ہم دونوں کی لاج رکھ لی ہے۔ بس میاں یوں سمجھو میں بھی اسی اذیت کا شکار تھا۔ وہ صاحبزادے جن کا نکاح ہوا ہے میرا بیٹا نہیں بلکہ اس کا دوست آفاق ہے۔ منصور نے بھی یہی حرکت کی ہے۔ جو تمہاری بیٹی نے کی۔ اماں

واللہ۔ کیا مذاق ہے۔"

نواب صاحب ہنس رہے تھے اور چوہدری صاحب احمقوں کی طرح انہیں دیکھ رہے تھے۔ "میری بھی بہت بری حالت ہوئی جب یہ انکشاف ہوا تھا مگر بات سمجھ میں نہیں آئی چوہدری یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف کیوں ہیں؟"

"اللہ جانے مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا اظہر بھائی! کس چالاکی سے ان لوگوں نے ہمیں الو بنایا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ اس نے ہمارے تمہارے درمیان کوئی دیوار نہ کھڑی ہونے دی لیکن دنیا والوں کو کیا منہ دکھائیں گے اظہر حسین۔ یہ تو سوچو میں نے بیٹی رخصت کی تم بہو بیاہ کر لائے لیکن دونوں نے کچھ نہیں کیا۔ لوگ پوچھیں گے تو اس مذاق کا کیا جواب دیں گے؟"

"ہوں بات تو سوچنے کی ہے۔" نواب اظہر حسین نے کہا۔

دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر اظہر حسین نے کہا۔ "میرا خیال ہے چوہدری بات یہیں دفن کر دیتے ہیں۔ ان دونوں کی ایسی تیسی۔ تم نے بچی سے کچھ کہا ہے؟"

"ابھی تک نہیں۔"

"تو پھر جاؤ خاموشی سے جاؤ اور گھر کے لوگوں کو ہوا بھی نہ لگنے دو۔ ہاں قاضی جی کو ساتھ لیتے جانا۔ ان سے کہہ دینا رجسٹر وغیرہ ساتھ لے لیں۔ میں نو ساڑھے نو بجے تک منصور کو کسی بہانے سے لے کر تمہارے گھر آتا ہوں دونوں نکاح کرواؤ اور میں بہو کو رخصت کر کے گھر لے آؤں گا۔ بات گھر کی گھر میں رہے گی اور باہر والوں کو ہوا بھی نہیں لگنے پائے گی۔"

چوہدری صاحب ایک لمحے تک انہیں حیرت سے دیکھتے رہے پھر ان کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔ وہ اٹھ کر اظہر حسین سے لپٹ گئے۔

"کیا سمجھا ہے ان لونڈوں نے ہمیں ابھی یہ ہماری ذہانت سے ٹکرانے کے قابل کہاں۔ میاں! پرانے چاول پرانے ہی ہوتے ہیں ہوں۔"

⦿ ...... ⦿ ...... ⦿

منصور سر سے کفن باندھ کر بیٹھا تھا لیکن کوئی بات نہیں ہوئی۔ سارے کام حسب معمول جاری تھے۔ البتہ آفاق نہیں ملا تھا۔ اکبر حسین اور ان کی اہلیہ بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکے تھے۔ منصور اس بے چارے کے لیے بھی سخت پریشان تھا۔ ناشتہ تمام مردوں نے ساتھ ہی کیا تھا۔ پھر ناشتے کے فوراً بعد نواب صاحب نرم لہجے میں منصور سے بولے۔

"منصور بیٹے! کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے؟"

"نہیں ابا حضور۔"

"ذرا تیار ہو جاؤ تھوڑی دیر کے لیے چلیں گے ایک کام سے۔"

"جی ابا حضور۔" منصور جلدی سے بولا۔

پھر اس نے تیار ہونے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ نواب صاحب اسے لے کر چل پڑے۔ کار منصور ڈرائیو کر رہا تھا لیکن جب نواب صاحب نے اسے چوہدری صاحب کی کوٹھی میں اترنے کے لیے کہا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کچھ بولنے کی تو مجال ہی نہیں تھی۔ بس خاموشی سے کوٹھی میں داخل ہو گیا جہاں پہلی ملاقات چوہدری صاحب سے ہی ہوئی تھی۔ چوہدری صاحب انہیں کوٹھی کے ایک اندرونی حصے میں لے گئے جہاں قاضی صاحب بیگم چوہدری اور دو اور حضرات موجود تھے۔ چوہدری نے منصور کے گلے میں ہار ڈال دیا اور قاضی صاحب نے رجسٹر کھول لیا۔ رجسٹر کی کارروائی مکمل تھی لڑکی کی منظوری بھی موجود تھی چنانچہ نکاح شروع ہو گیا۔ منصور نیم پاگل ہو رہا تھا لیکن اپنی دیوانگی کا اظہار کیسے کرتا۔ نواب صاحب نے ڈانٹا۔ "ابے قبول کر۔" تو اس نے قبول کر لیا۔

"ہاں میاں کیا دیر ہے؟" نواب صاحب نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس چائے۔"

''شام کو سب کچھ شام کو۔ خدا حافظ۔'' نواب صاحب اٹھ گئے۔

سادہ لباس میں جولڑکی چادر اوڑھے گردن جھکائے بیٹھی تھی اسے منصور بالکل نہیں جانتا تھا لیکن اس لڑکی سے ابھی ابھی اس کا نکاح ہوا تھا۔ اس کا دل خون ہو رہا تھا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا' پانی سر سے گزر چکا تھا۔

کوٹھی آ کر نواب صاحب نے کار کوٹھی کے پچھلے حصے میں رکوائی اور دونوں کو لے کر اتر آئے۔ لڑکی کو انہوں نے خاموشی سے بیگم صاحبہ کے حوالے کیا اور خود منصور کو ساتھ لے کر چل پڑے۔ منصور ڈگمگاتے قدموں سے چل رہا تھا۔ تب نواب صاحب نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔

''شور مچانے یا یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو دونوں کی ٹانگیں توڑ دوں گا سمجھے؟''

منصور چونک کر اس دوسرے کو تلاش کرنے لگا۔ پھر آفاق کو دیکھ کر اس کا دماغ بالکل ہی جواب دے گیا۔ کوئی بات جو سمجھ میں آ رہی ہو۔



نواب صاحب خوشی سے اکڑے پھر رہے تھے۔ منصور تو کمرے میں بند تھا' بے چارے اکبر حسین اور ان کی بیوی کی شامت آئی ہوئی تھی۔ وہی ذلیل وخوار ہو رہے تھے۔ گھر کے خاص افراد کو تفصیل بتا دی گئی تھی۔ دونوں مجرم دلہا ایک کمرے میں بند تھے اور دونوں دلہنیں دوسرے کمرے میں۔ گھر کی فضا عجیب ہو رہی تھی۔ وہ تو خیریت تھی کہ ولیمے کا پروگرام پہلے ہی ایک ہفتے بعد کا طے تھا ورنہ زیادہ مشکلات پیش آتیں۔ پورا دن پراسرار حالات میں گزرا۔ چوہدری صاحب اور ان کی بیگم آئے تھے لیکن مصلحتاً انہیں بیٹی سے نہ ملایا گیا البتہ نواب صاحب نے بتایا تھا کہ دوسرا لڑکا بھی ٹھیک ہے۔ تنہا ہے کاروباری ہے اور چوہدری صاحب مطمئن ہو گئے تھے۔

رات کو دونوں مجرموں کو کال کوٹھری سے نکالا گیا اور حجلہ عروسی میں دھکیل دیا گیا۔ منصور کو آفاق کی زبانی صورت حال کسی قدر معلوم ہو گئی تھی لیکن بہت سی باتیں اس کے ذہن میں تشنہ تھیں اور وہ سخت پریشان تھا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا جس کا نام درخشاں تھا' پھر وہ کون تھی جو پچھلے دن رخصت ہو کر آئی تھی۔ بدر جہاں نے آفاق کو منصور ہی سمجھا تھا اور اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

تب منصور نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''محترمہ! حالات نے ہمارے ساتھ جو مذاق کیا ہے' مجھے اس پر افسوس ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا' کل جو لڑکی رخصت ......''

منصور یکدم رک گیا۔ کہیں دور سے ایک کرخت آواز ابھری تھی۔

''دے دے بابو! اللہ کے نام پر۔ جمعرات کا روز ہے بابو' اے بابو' اللہ کے نام پر دے دے۔ اللہ تیرے بچوں کو۔''

''لعنت ہے اس ذلیل عورت پر۔'' منصور دانت پیس کر بولا اور اسی وقت دلہن نے چونک کر گھونگھٹ ہٹا دیا۔ اس نے منصور کو دیکھا اور منصور نے اسے اور سیکڑوں بجلیاں چمک اٹھیں۔ دونوں کے ذہنوں کو شدید جھٹکے لگے۔ ''تم؟''

''آپ؟'' درخشاں بڑبڑائی۔

''اللہ جوڑی سلامت رکھے' بابو خدا چاند سا بیٹا دے' دے دے اللہ کے نام پر۔''

''آہ کیسی مبارک آواز ہے۔'' منصور کے منہ سے نکلا۔

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

رعیشاء خان......ملتان

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ رحمن کی تلاوت کیا کریں۔

بی بی شمائلہ......ہری پور ہزارہ

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ ترقی اور ویزے دونوں کے لیے پڑھیں روزانہ۔

ف س......آزاد کشمیر

جواب:۔ آیات شفا 7 مرتبہ سرمہ پر دم کر کے رات کو لگایا کریں۔

رکاوٹ ختم کرنے کے لیے سورۃ اخلاص ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ۔

احمرین......گلشن اقبال، کراچی

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ (جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں)

بعد نماز عشاء۔ سورۃ الفلق سورۃ الناس ایک ایک تسبیح روزانہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ (رکاوٹ/ بندش ختم کرنے کے لیے)

صدقہ دیں ہر ماہ گوشت کا۔ پچھلے تمام وظائف بند کر دیں۔

عذرا سعید......کوئٹہ

جواب:۔ (2) جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کر دیں چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے۔

(3) وظیفہ پھر سے کریں۔

صدقہ خیرات کرتی رہا کریں۔ امتحان میں کامیابی کے لیے سورۃ قریش ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ پڑھیں۔

قرۃ العین......پاکپتن

جواب:۔ سورۃ شمس 41 مرتبہ بعد نماز فجر' اول و آخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔

روزانہ پانی پر دم کر کے شوہر کو پلائیں۔ پڑھتے وقت مقصد بھی ذہن میں ہو۔ روزانہ ایک تسبیح استغفار' ایک تسبیح درود شریف پڑھا کریں۔ دعا بھی کریں۔

شاہپور

جواب:۔ (۱) بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ اپنے شادی والے مسئلے کے لیے دعا کریں۔

(۲) سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 21,21 مرتبہ بعد نماز مغرب۔ اول و آخر 3,3 مرتبہ درود شریف پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔

تنزیلہ......گجرات

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف یہ سوچ کر پڑھیں اگر میرے حق میں یہاں بہتر ہے تو ہو جائے ورنہ کہیں اور جگہ سے رشتہ آ جائے۔

مریم......سرگودھا

جواب:۔ (۱) یا لطیف یا ودود 101 مرتبہ روزانہ پانی پر دم کر کے پلایا کریں۔ اول و

آخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔

(۲)سورۃ قریش 111 مرتبہ بعد نماز عشاء اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔نوکری کے لیے۔

ک ز...... ہمدانی ٹریڈر، بارن موڑ

جواب:۔جادو ہے۔

سورۃ عبس بعد نماز عشاء 3 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔پانی پر دم کر کے خود بھی پیئں اور شوہر کو بھی پلائیں۔صدقہ بھی دیں۔(عمل کی مدت 3 ماہ)(پاکی میں کرنا ہے)

بی بی شمائلہ...... گوجرانوالہ

جواب:رشتہ کے لیے بعد نماز فجر سورۃ فرقان کی آیت نمبر 74،70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں۔

سورۃ عبس بعد نماز عشاء 3 مرتبہ پڑھا کریں۔پانی پر دم کر کے پورے گھر میں چھڑکاؤ کریں (حمام کے علاوہ)

طاہرہ بتول...... ملتان

جواب:۔بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74،70 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔جلد اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں۔

بعد نماز عشاء سورۃ اخلاص، سورۃ فلق، سورۃ الناس 11,11 مرتبہ رکاوٹ بندش ختم کرنے کے لیے دعا بھی کریں۔

زینب بی بی...... سرگودھا

جواب:۔ رشتے والا وظیفہ جاری رکھیں۔ یاسین شریف بھی پڑھا کریں۔

وظیفہ پڑھتے وقت ان کے والدین کا بھی تصور رکھا کریں۔

روزگار کے لیے سورۃ القریش 111 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔عشاء کی نماز کے بعد۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔
ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔
rohanimasail @ gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے دسمبر 2014ء

نام...... والدہ کا نام...... گھر کا مکمل پتا......

......

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پذیر ہیں......

خوشبوسخن

عمراسرار

رنگ

نہ رنگ آنکھوں کا لال رکھنا
نہ ذہن میں اپنے ملال رکھنا
نہ رنگ آنکھوں کا لال رکھنا
محبت تو نام ہے رت جگوں کا
محبت کا حوالہ سنبھال رکھنا
عاشقی کا کھیل ہے نرالا
جیتی بازی میں مات رکھنا
نہ ذہن میں اپنے ملال رکھنا
نہ رنگ آنکھوں کا لال رکھنا
چاہتوں کا سودا ہے مختلف سا
نہ سود و زیاں کا حساب رکھنا
سرائے نہ بن جائے دل کہیں پر
بس اک مکین کا ہی خیال رکھنا
متن تو ہوں گے بے حساب
پر اک عنوان ہی نایاب رکھنا
نہ ذہن میں اپنے ملال رکھنا
نہ رنگ آنکھوں کا لال رکھنا
سوکھے پھول بکھر نہ جائیں
تم اس ادا میں کمال رکھنا
نہ ذہن میں اپنے ملال رکھنا
نہ رنگ آنکھوں کا لال رکھنا

ریحانہ سعیدہ......لاہور

غزل

پھول سے ہونٹوں پر شرارے ہوں جیسے
میری چاہت میں یوں انگارے ہوں جیسے
جن سے نہیں تھی وفا کی امید ہم کو
گزرے دنوں میں وہ ہمارے ہوں جیسے
شام ہوتے ہی بجھ جاتے ہیں یادوں کے چراغ
ان دیکھی راہوں پہ روشن ستارے ہوں جیسے
جن کی محبت میں ہم سدا جلتے رہے
ان کی آنکھوں میں وفا کے اشارے ہوں جیسے
سوچا بھی نہ تھا وہ یوں بچھڑ جائے گا جاوید
ایک منزل کے پھر دو کنارے ہوں جیسے

محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

سن کے میرا نام شرماتا رہا
کیا یہ کم ہے میرا کہلاتا رہا
یہ اڑائی ہے کس دشمن نے بات
غیر پر وہ کرم فرماتا رہا
بھول بیٹھا اپنے گھر کا راستہ
رہنمائی پر جو اتراتا رہا
دشمنوں کی دشمنی اپنی جگہ
دوستوں کی چوٹ سہلاتا رہا
اس کی بربادی پر جو بھی تل گئے
ان کا اس مٹی سے کیا ناطہ رہا
ہم نے کیوں وہ پھول مرجھانے دیا
غمزدہ دل کو جو مہکاتا رہا
بے قراری دیکھ کر ان کی قمر
میرے دل کا بھی سکوں جاتا رہا

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

ہر شخص سے نفرت تھی اک میرے سوا تجھ کو
پھر مجھ سے کیوں نفرت ہوئی اتنا بتا مجھ کو
میں وہی ہوں کہتے تھے جسے پھولوں سا پیارا تم
اس پھول کے پہلو سے کیوں کانٹا چبھا تجھ کو

صد حیف کہ تیری آنکھوں سے اشارے ہوئے رقیبوں پر
میں کہتا تھا نا دیں گی آخر تیری آنکھیں دغا تجھ کو
بھگو دیتا ہوں تیری تصویر آنسوؤں سے ہر روز
ذرا دیکھو دیتا ہوں کیسی پیاری سزا تجھ کو
ادائے یار سے لگتا ہے ہو مائل بہ کرم اب بھی
پر بڑھنے نہیں دیتی آگے تیری انا تجھ کو
سر دھڑ کی بازی لگا کر بھی معتوب ہی ٹھہرے ہم
خوش کر نہ سکی میرے کوئی بھی ادا تجھ کو
ہر شخص کا شکوہ تم دل و جاں سے سنتے رہے
بس پہنچ نہ سکی فاروق اک میری صدا تجھ کو

عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس

ماں

تو نے سینے سے لگایا دل مسرور ہوگیا
تو نے ماتھا جو چوما نور ہی نور ہوگیا
کھلی جب آنکھ تیرا جلوہ ہوا
نجانے میرا دل کتنا مسرور ہوگیا
خود تکلیف اٹھا کے جب مجھے دی راحت
میرا دل تیرے قدم چومنے پر مجبور ہوگیا
معاف کرنا ماں بہت بری تھی میں
اس بات کا بھی اب مجھے شعور ہوگیا
تو ہی تو ہے جس کے دل میں محبت ہے
ورنہ زمانہ تو مجھ سے بہت دور ہوگیا

رقیہ نسیم..... ساہیوال

غزل

یاد بھی تیری فراموش ہوئی جاتی ہے
زندگی غم سے سبکدوش ہوئی جاتی ہے
کون دیتا ہے بصد شوق یہ آواز مجھے
دل کی دنیا ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے
وہ نظر جس سے ملا ہم کو پیام الفت
وہ نظر ساکت و خاموش ہوئی جاتی ہے

تیری زلفوں کے تصور سے مری دنیا میں
چاندنی رات سیاہ پوش ہوئی جاتی ہے
در آقا پر کبھی رانا پہنچ جائیں گے
اس کی رحمت بڑی پر جوش ہوئی جاتی ہے

قدیر رانا..... راولپنڈی

غزل

نجانے کون میرے آس پاس رہتا ہے
یہ دل نجانے میرا کیوں اداس رہتا ہے
کبھی کبھی تو میرا دل یہ بات کہتا ہے
تجھے پسند ہے جو وہ تیرے پاس رہتا ہے
مگر کہاں ہے وہ کیوں نظر نہیں آتا
حسین کون ہے دکھ جسا کا دل یہ سہتا ہے
نجانے کیوں وہ میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے؟
وہ شام کل بھی مجھے راہ میں ملی تھی یہیں
وہ ہنس رہی تھی مجھے دیکھ کر کھڑی تھی یہیں
پلٹ کے اس نے مجھے بار بار دیکھا تھا
کے اس کا چہرہ میری وسعتوں کے جیسا تھا
اسی لیے تو میرا دل یہ مجھ سے کہتا ہے
تجھے پسند ہے جو وہ تیرے ساتھ رہتا ہے
نجانے کون میرے آس پاس رہتا ہے

ادیب سمیع چمن..... حیدرآباد



ذوقِ آگہی

عفان احمد

بڑی بات

حضرت زبیر بن العوام صحابی تھے۔ ایک بار ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے ان سے پوچھا۔

یا ابی! کیا سبب ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی آپ اتنی باتیں بیان نہیں کرتے، جتنی دوسرے لوگ کرتے ہیں؟"

جواباً بولے...... "بیٹے حضور اقدس کی رفاقت میں دوسروں سے میرا حصہ کم نہیں ہے لیکن حضور کی صرف اس تنبیہ نے مجھے محتاط کر دیا ہے۔

"من کذب......"

(جس نے قصداً میری طرف کوئی غلط بات منسوب کی وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنائے گا)

وریشہ مختار...... اورنگی، کراچی

صافہ

فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدیؒ ایک روز کہیں جا رہے تھے۔ ایک دیہاتی انہیں ملا۔ اس نے انہیں ایک پرچہ دیا اور کہا ذرا اسے پڑھ کر سنا دو۔

سعدی نے کاغذ لے کر دیکھا۔ تحریر کچھ ایسی لکھی ہوئی تھی کہ پڑھی نہیں جا رہی تھی۔ انہوں نے کاغذ اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی۔ میں اسے نہیں پڑھ سکتا۔"

دیہاتی نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ عبا و قبا میں ملبوس تھے، سر پر بڑا سا صافہ تھا۔

دیہاتی نے غصے سے کہا۔ "کمال آدمی ہو اتنا بڑا سا صافہ سر پر باندھ رکھا ہے اور یہ چھوٹا سا پرچہ تک نہیں پڑھ سکتے۔"

شیخ سعدی نے اپنا صافہ اتار کر دیہاتی کے سر پر رکھ دیا اور بولے۔ "لے۔ تو اب اسے پڑھ لے۔"

دلنواز شاہ...... ملتان

سنہرے بول

- بے وجہ دعائیں دینے والی ہستی صرف ایک ہے اور وہ ہے ماں۔
- جب دوست مانگے تو کل کا سوال ہی نہیں۔
- جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ با صلاحیت نہیں ہوتے۔
- پیش کرنے کا انداز تحفے سے زیادہ قیمتی ہے۔
- سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔
- لہجے کا اثر الفاظ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

سارہ چوہدری...... ڈوگہ گجرات

فراقیات

فراق گورکھپوری اردو کے بڑے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ شراب کے نشے میں ہر وقت دھت رہتے تھے۔ بہت خود پسند واقع ہوئے تھے۔ ایک بار ایک مشاعرے میں گئے۔ انہیں نیند آ رہی تھی۔ بڑے شاعر ہونے کی وجہ سے انہیں آخر میں پڑھایا جاتا تھا۔ مشاعرے کے آغاز کے کچھ دیر بعد انہوں نے سیکریٹری سے کہا کہ انہیں جلدی پڑھوا دے۔

سیکریٹری نے حسب فرمائش انہیں بلا لیا۔

فراق اپنی غزل پڑھ چکے تو اٹھے اور مجمع کو دیکھتے رہے۔ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے مشاعرے میں بہت سے نامور شعرا آتے تھے۔

جب سامعین کو انہوں نے بیٹھے دیکھا تو کہا۔

"آپ نے فراق کو سن لیا۔ اب یہاں بیٹھے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔"

سیکریٹری بے چارہ بلبلا کر لپکا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ حضرات جانے کی ضرورت نہیں ابھی تو بہت

سے شعرا ہاتی ہیں۔ تب جا کر مسئلہ حل ہوا۔

تبسم فرید...... کراچی

مہکتی کلیاں

✦ میں اپنے حریفوں میں اکثر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ چار منٹ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے لیکن میں اس تھوڑے وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت سے بخوبی واقف ہوں۔

✦ عقل مند اور بے وقوف دونوں میں کچھ نہ کچھ عیب ہوتا ہے' فرق صرف اتنا ہے کہ عقل مند اپنے عیوب کو خود دیکھتا ہے دنیا نہیں دیکھتی اور بے وقوف اپنے عیوب کو خود نہیں دیکھتا دنیا دیکھتی ہے۔

✦ اللہ تعالیٰ ہمارے مقدر میں پتھریلے راستے لکھتا ہے تو ہمیں مضبوط جوتے بھی بخشتا ہے۔

✦ جس کے پاس مضبوط قوت ارادی ہے وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بناتا ہے۔

✦ آدمی کی زندگی کا بہتر حصہ وہ ہے جس میں وہ اچھے کام کر کے بھول چکا ہوتا ہے۔

✦ ایک کنجوس آدمی کی ذخیرہ اندوزی کا وہی حال ہوتا ہے جو شہد کی مکھیوں کے چھتے کا' محنت مکھیاں کرتی ہیں جبکہ شہد آدمی حاصل کرتا ہے۔

✦ کردار کے بغیر علم برائی کی طاقت بن جاتا ہے۔

✦ غصہ ہمیشہ حماقتوں سے شروع ہوتا ہے اور ندامتوں پر ختم۔

✦ خاموش رہنا اور بے وقوف شمار ہونا' بول کر تمام شبہات کو دور کرنے سے بہتر ہے۔

✦ ماں کا دل ایک ایسا بینک ہے جہاں ہم اپنی تمام پریشانیاں اور دکھ جمع کرا دیتے ہیں۔

مختار احمد...... لاہور

معلومات

☆ انسانی بدن میں پسلیوں کے 12 جوڑ ہوتے ہیں۔

☆ انسانی ہاتھ میں 27 ہڈیاں ہوتی ہیں۔

☆ انسانی جسم میں تقریباً پچیس لاکھ مساموں کی تعداد ہے۔

☆ انسانی سر میں تقریباً پندرہ ہزار بال ہوتے ہیں۔

☆ انسان کے مرنے کے بعد اس کا دماغ 2 سے 4 گھنٹے تک کام کرتا ہے۔

☆ انسانی جسم میں 61 فیصد حصہ پانی ہے۔

☆ انسانی آنکھ ایک منٹ میں 25 بار پلک جھپکتی ہے۔

فرح زینب...... رحیم یار خان

قلم کی نوک

انسان جب قلم سے کچھ لکھتا ہے تو وہ تحریر کسی کے لیے خوشی تو کسی کے لیے غم کا باعث ہوتی ہے۔ کسی کے لیے امرت تو کسی کے لیے زہر۔ کسی کی تقدیر بدل سکتی ہے تو کسی کا مقدر مٹا سکتی ہے۔ قلم کی نوک سے کسی کا سر قلم ہوتا ہے تو کسی کو سر بلند بھی کیا جاتا ہے۔ قلم کی نوک سے کسی کے لیے آزادی کا سندیسہ ملتا ہے تو کسی کے لیے موت کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ قلم سے کسی کے نصیب کو چار چاند لگائے جا سکتے ہیں تو اسی قلم سے کسی نے نصیب پر سیاہی بھی مل دی جاتی ہے۔

خنساء عبدالمالک...... راولپنڈی



قسط نمبر16

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے..... جورو جبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔

"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پرخطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

کرتارا کو جیپ لوٹا کر اور جوہری کا سونا فروخت کر کے ہوشیار سلامت واپس آیا تو جگت کو اطمینان ہوا۔ اب پیسے کی فکر نہیں رہی تھی۔

"مگر پولیس کی فکر ہمیں بہر حال کرنا پڑے گی۔" ہوشیار نے جگت کو نوٹ سپرد کرتے ہوئے کہا۔

"اب ہوشیار رہنا پڑے گا۔" نوٹوں کے بنڈل لیتے ہوئے جگا نے کہا۔

"جگت! پہلے میں کرتال کا ایک چکر لگا آتا ہوں۔ امرتسر سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں مہاجروں کی بڑی چھاؤنیاں ہیں۔ چار پانچ ساتھی وہاں مل جائیں گے۔" پھر آہستہ سے بولا۔ "اس چنا سنگھ پر کتنے دن اعتماد کیا جاسکتا ہے؟" ہوشیار نے دو ایک بار اسے ہوشیار کیا تھا مگر جگت کو چنا سنگھ ایسا خطرناک نظر نہیں آتا تھا۔ ابھی وہ نیا تھا اور اس کی نظر میں ہر طرح قابل اعتماد تھا۔ اپنی سرگرمیوں کی ابتدا کرنے کے لیے اسے ایسے ایک آدھ آدمی کی ضرورت تھی۔ اس نے جوہری والا ٹھکانہ تلاش کیا تھا۔ وہ چار ڈاکوں میں جم جائے گا۔ یا ایک آدھ قتل کرنے کے بعد.....

"جگت اس سے اس کی ماں کے عاشق کو قتل کرانا ہے۔" ہوشیار اس طرح بولا جیسے اس کے دل کی بات سمجھ گیا ہو۔ "وہ اس سے بہت زیادہ نفرت کرتا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا رائفل چلانا سیکھنے کے بعد اسے شوٹ کردوں گا۔"

"نہیں ہوشیار! ماں بیٹے کے جھگڑے میں ہمیں نہیں پڑنا۔" جگت اس بات کے پہلے ہی خلاف تھا۔ "میں نے اس سے کہا ہے کہ اب دوسرا ٹھکانہ تلاش کرے۔ اس طرح جلدی سے وہ تیار ہو جائے گا۔"

چنا خوش مزاج افراد میں آ گیا تھا۔ آج تک اسے طعنے سننے پڑے تھے۔ اسے کوئی پچیس روپے کی ملازمت بھی نہیں دے گا۔ چنا محسوس کررہا تھا کہ ماں بھی اس سے پہلے جیسا پیار نہیں کررہی ہے۔ قومی ہنگاموں میں باپ

مارا گیا تھا۔ سب چھوڑ کر امرتسر آ ئے۔ راستے میں چنا سنگھ کی ماں کے میکے کا رشتہ دار مل گیا۔ اس نے ہمدردی دکھائی' آسرا دیا۔ اس کے بدلے میں ماں کے دل کی خالی جگہ میں گھر بنا لیا۔ وہ شروع میں چنا سے باپ جیسی محبت سے پیش آیا' مگر پھر اچانک اس نے محسوس کیا کہ اگر یہ لڑکا بیکار رہا تو خراب ہو جائے گا۔ اسے کچھ کمانا چاہیے۔ ماں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''بیٹے! کام سے لگ جا' پھر تیری بھی شادی کرا دیں گے۔ گھر میں بہو آ جائے گی۔''

''ماں! تمہیں بیٹے پر اعتماد نہیں تھا اس لیے تم نے پرائے مرد کا آسرا تلاش کیا۔'' چنا کو یہ بات کھٹک رہی تھی۔ ''باپ کی موت کے وقت میرے دل میں ارمان تھے کہ ماں کو کسی طرح دکھی نہیں ہونے دوں گا' مگر ہائے رے ماں! تم نے دو ماہ میں باپ کی موت کا سوگ ختم کر دیا۔'' یہ سب کہنے کے لیے چنا کو ایک دن شراب کا آسرا لینا پڑا۔ جوان بیٹے کے یہ الفاظ ماں کے دل کو زخمی کر گئے۔ ''دو ٹکے بھی ایک پیسہ کماتا نہیں اور شراب پینے لگا۔ ماں کو روٹی کھلانے کی طاقت نہیں اور سبق دینے چلا ہے۔'' بس چنا نے اسی دن فیصلہ کر لیا کہ کسی طرح پیسے کمائے گا اور نیا سنگھ کو گھر کا دروازہ دکھا دے گا۔ پھر وہ ماں سے کہہ دیتا کہ اس کماؤ بیٹے یا پرائے مرد میں سے ایک کو پسند کر لو۔

مگر زیادہ پیسے کم وقت میں کمانے کے لیے مزدوری کرنا کافی نہیں تھا' بدمعاشی یا بہادری آزمانی ضروری تھی۔ دو تین چوریاں کیں مگر کچھ زیادہ نہیں ملا۔ بڑا ہاتھ مارنے کے لیے ہاتھ کھجا رہے تھے۔ انہی دنوں جگا سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اسے پہلی بار دیکھتے ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کی انگلی تھامنا چاہیے۔ اس کے بازوؤں میں طاقت ہے اور چہرے سے بھی خوفناک دکھائی دیتا ہے۔ اس کا اندازہ سچ ثابت ہوا۔ پہلا ڈاکہ نصیب والا تھا' کچا سونا ملا جسے نکالنے میں تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کے حصے میں بھی رقم آئی تھی۔ پھر شانے پر بندوق لٹکنے لگی' دو چار دن میں دوسرا ڈاکہ۔ کم محنت اور زیادہ پیسے۔ مگر ابھی ماں سے نہیں کہنا۔ وہ بات دل میں رکھ نہیں سکے گی پھر پنا سنگھ کو پتہ چل جائے گا اور..... وہ سوچنے لگا۔

''ماں..... مجھے کام مل گیا ہے۔ سڑک بنانے والے کنٹریکٹر کے ساتھ گھومنا پڑے گا۔ پیسے اچھے ملیں گے۔ دس پندرہ دن بعد چھٹی لے کر ملاقات کرنے آؤں گا۔''

چنا نے خوشی کا اظہار کیا۔

ماں بھی خوش ہو گئی۔ پنا سنگھ نے اس سلسلے میں اس سے چند سوالات کیے۔

''کیسا کام کرنا ہے؟ کتنی تنخواہ ملے گی؟ تمہارا سیٹھ کون ہے؟'' مگر چنا نے جواب نہ دے کر ناراضگی کا اظہار کیا۔

''میں کیوں کہوں؟ پیسے خود بتائیں گے۔''

امرتسر سے واپس لوٹ کر اس نے جگت سے کہا۔

''آج وہ مل میں آئی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے جگت کو آنکھ ماری۔ جگت نے بیہودگی محسوس کی۔

''وہ کون؟''

''ارے وہ.....'' چنا نے رنگ بھرے لہجے میں کہنا چاہا مگر جگت کے چہرے پر سختی دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔ 'میں بسنت کور کی بات کر رہا تھا۔ رات کی شفٹ والے منیجر کی خوب صورت عورت۔' بسنت کور کا نام سنتے ہی جگت کے چہرے پر نرمی آ گئی۔ ایسی خوبصورت عورت کی بات کرتے ہوئے چنا رنگ میں آ جائے یہ عام سی بات تھی۔ چنا نے ہی بسنت کور کو دکھایا تھا۔ بہت زیادہ حسین تھی۔ اس پر لباس کی رنگینی' جواہرات کی چمک دیکھ کر جگت بھی ساکت رہ گیا تھا۔

مل کا چوکیدار پالا سنگھ ہونٹ کاٹ کر بولا تھا۔ ''اتنی خوبصورت جوان عورت کو گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔''

بڑے بھائی! آپ کس سوچ میں ڈوب گئے؟'' چنا سنگھ نے جگت کو مخاطب کیا۔ ''ابھی تو میں نے بسنت کور کی پوری بات نہیں کی۔''

سچ تو یہ ہے کہ جگا نے جب سے بسنت کور کو دیکھا تھا' اسے دیر دیا آنے لگی تھی۔ ویر دبھی اگر اس طرح لباس اور

جواہرات پہن لیتی تو بسنت کور سے کم نہیں لگتی، چند لمحے وہ چونک کر چنا سنگھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں ...... کیا بات ہے؟''

''اس کے ہاں ڈاکہ ڈالنے کی بات۔'' چنا خوش ہوتا ہوا بولا۔ ''اس کا گھر مال دار ہے۔ پالا سنگھ نے دیکھا ہے دو تین بار وہاں ہو آیا ہے۔''

''منیجر کس قدر مالدار ہوگا؟'' جگت نے اب پیشہ ورانہ پوچھ گچھ شروع کی۔

''پالا کہہ رہا تھا چاندی کی اینٹیں ہیں اس کے گھر میں ...... پاکستان سے فرار ہوتے وقت بہت سارا مال ساتھ لے آیا ہے۔ نوکری تو صرف دکھانے کی خاطر کر رہا ہے۔'' چنا پرجوش لہجے میں بولا۔ ''ڈاکے میں پالا کا حصہ بھی ہوگا۔''

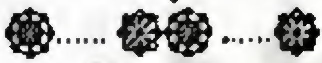
جگت کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نے پالا سے ہماری بات کہہ دی ہے؟'' اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر چنا گھبرا گیا۔

''نہیں نہیں جگت سنگھ! پالا سے میں نے کوئی بات نہیں کی۔ بسنت کور کی بات ہم نے پہلے بھی کی تھی۔ اس وقت میرے پاس ہتھیار یا ساتھی نہیں تھے اس لیے میں نے یہ بات ٹال دی۔ اب تو ہمیں ایسے ٹھکانوں کی ضرورت ہے اس لیے میں نے اسے چیک کیا۔'' چنا گھبراہٹ کے درمیان ایک ہی سانس میں بول گیا۔ وہ جگت کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے ساتھ رہنے کے لیے جگت نے پہلی شرط یہی رکھی تھی کہ بات باہر نہیں جانی چاہیے اور اگر اس نے کچھ چھپایا تو وہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس شرط کا احترام کرنے کا چنا نے فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے دل چاہنے کے باوجود اس نے پوچھا نہیں کہ جیپ کس کی ہے؟ کہاں سے لائے ہیں؟ اور ڈاکے کا سونا کہاں فروخت کرتا ہے؟ جگت اسے پراسرار معلوم ہوتا تھا پھر بھی اس نے جگت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مل میں پالا نے بھی بات کی کہ چوکیدار سوہن سنگھ کا لڑکا دو دن سے نظر نہیں آ رہا ہے تو اس نے کہا۔ ''کیا پتہ؟'' کہہ کر بات ڈال دی تھی۔

''چنا! اپنے دھندے میں زبان پر قابو نہ رکھ سکنے والا خود بھی پٹتا ہے اور ساتھیوں کو بھی پھنسا دیتا ہے۔'' جگت اب اسے نرمی سے سمجھانے لگا۔ ''بسنت کور کے ہاں ڈاکہ ڈالنے کے لیے پالا کا کیوں دل چاہتا ہے؟ اسے اگر وہ عورت پہچان گئی تو اس کی نوکری بھی جائے گی۔''

''وہ تو کہہ رہا تھا رقم ہاتھ لگنے پر ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ منیجر تو رات کی شفٹ میں مل میں ہوتا ہے۔ گھر میں بیمار باپ ہوگا۔ بسنت کور سامنا نہیں کر سکے گی لہٰذا کام آسان رہے گا۔'' جگت کو یہ خیال پسند آ گیا۔ ایک تو چاندی کی اینٹوں کا خیال تھا دوسرے بہت زیادہ خطرہ بھی نہیں تھا۔ ابھی اسے ایسے مال کی ضرورت تھی جسے جلد کیش کرا سکے۔ پولیس میں اس کا نام چڑھ چکا تھا لہٰذا مقابلے کی زوردار تیاری کرنی پڑے گی۔

''چنا! ہم دونوں ایک بار پنج گوریا گاؤں جا کر بسنت کور کا گھر دیکھ آئیں، تب تک ہوشیار کرنال کیمپ جا کر دوسرے ساتھیوں کو لے آئے گا۔'' یہ کہہ کر جگت سنگھ چنا سنگھ کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگا۔



اندھیرا بارش میں نہا رہا تھا۔ پنج گوریا گاؤں نیند کی آغوش میں سو چکا تھا۔ بسنت کور کو ابھی نیند نہیں آئی تھی۔ کافی میل دور کپڑے کی مل میں چلتی ہوئی مشینوں کی آواز سنائی نہ دینے کے باوجود بسنت کور کے دل پر ضربیں لگا رہی تھی۔ برابر والے کمرے سے بیمار سسر کے کھانسنے کی آواز چوکیدار کی طرح اسے ہوشیار کر رہی تھی۔ پلکیں ابھی بند نہ ہوئی تھیں کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ بسنت کور چونک کر بیٹھ گئی۔ لمحے بھر کو خیال آیا کہ اس کی طرح اس کا شوہر بھی بے چین ہوگا اور اسی لیے وہ رات کی شفٹ چھوڑ کر گھر چلا آیا ہے۔ سسر کو زور سے کھنکارنے کی عادت تھی۔ دروازہ کھولتے وقت بسنت کور کچھ بے چین اور جوش میں تھی۔

''کون ہے؟'' اس نے دروازہ کھول کر یہ پوچھنے کے

لیے منہ کھولا مگر اسی وقت کوئی طاقتور ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ بسنت کور خوفزدہ ہوگئی۔ اسے چیخنے کی خواہش ہوئی مگر چھت پر ہونے والے بندوق کے دھماکے سے حلق خشک ہوگیا۔ آنے والے نے پیر سے ہی کمرے کا دروازہ بند کردیا۔ چہرے پر کپڑا بندھا ہوا تھا اس لیے بسنت کور اسے نہ پہچان سکی مگر ہلکے اندھیرے میں اس شخص کی آنکھوں کو پہچان گئی۔ دو جوان اور بھوکی آنکھیں جو اسے مل میں گھورا کرتی تھیں۔ ویسے تو بہت سی آنکھیں اسے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں مگر ان دو آنکھوں نے اسے بیہودگی سے گھورا تھا۔ بسنت کور پیچھے ہٹنے لگی مگر اس نے بڑے زور سے اسے دبالیا۔

''پالا! تیری یہ ہمت؟'' چہرے پر سے ذرا ہاتھ ہٹتے ہی بسنت کور نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکہ ڈالنے آیا ہے؟''

''میرے ساتھی چاندی کی لالچ میں آئے ہیں مگر میں تو تمہارے حسن کا مزہ لوٹنے آیا ہوں۔'' پالا سنگھ گندی ہنسی کے ساتھ بولا' پھر اسے دھکیلتا ہوا بستر کی جانب کھینچ لے گیا۔

چھت پر کھڑا ہوا جگت بار بار فائر کرکے گاؤں والوں کو ڈرا رہا تھا۔ رائفل کے فائروں کو سن کر کوئی باہر آکر بہادری دکھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جگت نے یہ کام اپنے سر لیا تھا۔ وہ بسنت کور کی نظر میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ اس ڈاکے میں شامل ہے اس کا اگر پتہ چل جاتا تو اس کے باپو کی نوکری چلی جاتی۔ ہوشیار کو اس نے مکان کے نچلے حصے میں رکھا تھا' خود چھت سنبھال لی تھی اور چنا اور پالا کو چاندی کی اینٹیں نکال لانے کا کام سپرد کیا تھا۔ وہ تین گھوڑے ساتھ لائے تھے' اس لیے فرار کی سہولت تھی' اور ٹھکانہ جانا پہچانا تھا اس لیے دیر کی توقع نہیں تھی۔

چنا کو چھت پر آتے دیکھا تو جگت سمجھا کہ کام اندازے سے بھی جلدی ہوگیا مگر چنا سنگھ کے چہرے پر بے چینی نظر آرہی تھی۔ نزدیک آکر اس نے ہولے سے جگت کے کان میں سرگوشی کی۔ جگت کے چہرے پر بھڑکتی ہوئی آگ دیکھ کر چنا لرز گیا۔ ''اب کیا کریں؟'' وہ دھڑکتے دل سے پوچھ رہا تھا۔

''جاؤ! پالا سے کہو ہم فرار ہو رہے ہیں۔ جلدی آؤ' پولیس آتی نظر آرہی ہے۔'' جگت نے دانت پیس کر چنا کے کان میں کہا' جگت دیوار پر سے نیچے کود گیا۔

''ہوشیار! ہم بیوقوف بن گئے۔ اب میں جو کچھ کروں تم خاموشی سے دیکھتے رہو۔'' ہوشیار تیز نظروں سے آس پاس دیکھنے لگا۔

''مگر ہوا کیا؟ یہ تو بتاؤ!'' ہوشیار نے پوچھا' مگر جگت کسی اور ہی الجھن میں تھا۔ اس نے نیچے پڑے ہوئے چار پانچ پتھر اٹھائے۔

''ہوشیار! اپنا صافہ کھول کر پتھر باندھ لو' جلدی کرو۔'' جگت کی پھنکار سنائی دی۔ ''وہ پالا جوگندر جیسا ثابت ہوا۔'' چنا پالا کو لے کر آگیا۔ اس لیے جگت چنا کو آنکھ مار کر بولا۔ ''چلو جلدی کرو۔ چاندی کی اینٹیں ہوشیار کے سپرد کردی ہیں۔ کام ختم ہوگیا۔ اب فرار ہوجائیں۔'' چنا سمجھے بغیر ہاں کرکے خاموش ہوگیا۔ اسے سخت بے چینی تھی۔ جگت نے تاکید کی۔ ''خبردار! ہمارے ارادے کا پالا کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔''

''تو کیا جگت پالا کو کوئی سزا دینا چاہتا ہے؟'' چنا نے سوچا' بسنت کور کا گھر اسی نے بتایا تھا۔ پالا سنگھ پر اعتماد کرنے کی بات جگت سے اسی نے کہی تھی۔

چار چھ میل راستہ کٹ گیا تب چنا سنگھ بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ اس کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھا ہوا پالا سنگھ بڑبڑا رہا تھا۔ ''سالے تم نے خوامخواہ جلدی کی۔ پولیس کا نام لے کر مزہ خراب کردیا۔''

ہوشیار' جوگندر والا قصہ تازہ کرنے کے لیے ذہن کو تیار کررہا تھا مگر اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ سب سے آگے گھوڑی دوڑاتا ہوا جگت سوچ رہا تھا کہ پالا کو کیا سبق سکھایا جائے؟ راستے میں ایک کنواں نظر آیا اور جگت نے گھوڑی روک لی۔ اس نے نیچے اتر کر کنویں میں جھانکا' پانی کافی گہرائی میں تھا اور اوپر کی جانب لکڑی کا چکر بنا ہوا تھا تاکہ آنے والے مسافر پانی نکال سکیں۔ چکر کے سرے پر زنجیر بندھی

ہوئی تھی جس میں بالٹی پھنسی ہوئی تھی اور کنارے پر وزنی دار پتھر بندھا ہوا تھا۔ جگت نے بالٹی کنویں میں اتار کر پانی کھینچا اس وقت تک تینوں ساتھی بھی آ گئے۔

"میں سوچ رہا تھا آرام کرنے کے لیے کوئی کیوں نہیں کہتا؟" پالا نے نیچے جست لگا کر بندوق شانے پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "جگت! تم پولیس سے بہت بھڑکتے ہو؟"

جگت نے منہ دھو کر پالا کی جانب کلی کر دی۔ "پالا سنگھ تمہارے جیسا دلیر شخص ہو تو پھر ڈر کس بات کا؟" جگت نے غصہ قابو میں رکھا تھا۔ "میں تو آرام کرنے کے لیے اچھے ٹھکانے کی تلاش میں تھا۔ کنویں کے قریب درخت کے نیچے چاروں ساتھی بیٹھ گئے۔ ہوشیار پوری طرح چوکنا تھا۔ چنا ابھی الجھن میں گرفتار تھا۔ جس طرح شکاری شکار کو کھلاتا ہے اسی طرح جگت پالا کو کھلا رہا تھا۔ "ہم حصے کرنے سے پہلے تھوڑی گپ شپ لگائیں۔ ابھی رات بہت باقی ہے۔"

"پہلے تو مجھے جاننا ہے کہ پولیس کے نام کی غلط آواز کس نے لگائی تھی؟" پالا سنگھ غصے سے بولا۔ "میں بسنت کور کے جسم پر سے زیور اتار رہا تھا کہ مجھے فرار ہونا پڑا۔"

"چنا! مجھے ایک قصہ یاد آ رہا ہے۔" جگت نے پالا کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے شیخوپورہ میں ایک جگا نامی ڈاکو تھا..... اس کا نام تم نے سنا ہوگا۔"

"کیوں نہیں سنا؟ وہ تو بہت مشہور ہے۔" چنا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جگت کیا کھیل کھیل رہا ہے؟

"وہ جگا ڈاکو غلط اطلاع دے کر ڈاکہ ڈالنے کے لیے للچانے والے انفارمر کو بے رحمی سے کاٹ دیتا تھا۔ ایک بار جوگندر نامی مخبر نے جگا کو ایک جگہ ڈاکہ ڈالنے کے لیے تیار کیا۔ جگا ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ مخبر ساتھ تھا۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ گھر میں کافی سونا ہے اس گھر میں ایک خوبصورت عورت رہتی تھی۔" جگت جان بوجھ کر رک گیا۔ پالا سنگھ کو بات میں دلچسپی ہو گئی تھی۔ اب کچھ چنا کی سمجھ میں بھی آنے لگا۔ ہوشیار کے ذہن میں جوگندر والا قصہ تازہ ہو لیا۔

"اچھا..... پھر؟" پالا نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"پھر کیا؟ جگا کو گھر میں سے کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ وہ جوگندر سے پوچھنے جا رہا تھا کہ ایک کمرے میں گھر کی خوبصورت عورت کو جوگندر دبا رہا تھا۔" چنا کی جان آدھی ہو گئی۔ پالا کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا کہ قصے کا کردار اسے بنایا جا رہا ہے۔ ہوس اکثر انسان کی عقل گم کر دیتی ہے۔ اسے اب بھی بسنت کور کی یاد ستا رہی تھی۔

"جوگندر اس عورت سے کیا کہہ رہا تھا؟" پالا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ کمبخت کہہ رہا تھا کہ جگا ڈاکو کو تمہارے گھر ڈاکہ ڈالنے میں اس لیے لایا ہوں کہ تم میرا مطالبہ ٹھکرا رہی تھیں، بولو اب بھی قابو میں آؤ گی؟"

"پھر کیا ہوا؟" پالا کی آواز میں ہلکی کپکپی تھی۔

"جگا نے یہ سن لیا۔ اس کے نام پر کسی عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالا جائے یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ ڈاکہ ڈالنے کا کام ملتوی کر کے اس نے ساتھیوں کو باہر نکالا۔ ایسی ہی گھنگھور اندھیری رات تھی۔ ایسے ہی کنویں کے پاس ڈاکو آرام کرنے ٹھہرے، جوگندر سے جگا نے پانی نکالنے کے لیے کہا، وہ کنویں کے کنارے پر کھڑا تھا اسی لمحے جگا نے اسے پھونک دیا۔" پالا سنگھ کو جھٹکا لگا۔ قصے کے آخری الفاظ کی ادائیگی کے وقت جگا کی آواز بھاری اور چہرہ غضب ناک ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جگت کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ اب تمام معاملہ سمجھ گیا اور اس نے شانے پر سے بندوق اتار لی۔ کنویں کی آڑ لے کر وہ گرجا۔

"میں وہ جوگندر نہیں اور تم وہ جگا نہیں۔ اس لیے زیادہ ہوشیاری نہیں چلے گی۔"

ہوشیار دانت پیس کر شانے سے بندوق اتار رہا تھا مگر جگت نے اسے روکا۔ چنا سکتے کے عالم میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ پالا سنگھ بیہودگی سے ہنسا۔ "بسنت کور سے میں نے کیا برتاؤ کیا یہ جاننے کی تمہیں ضرورت نہیں۔ وہ تم میں

سے کسی کی بہن نہیں تھی۔'' پھر بندوق کے ٹرائیگر پر انگلی رکھ کر نالی جگت کے چہرے کی جانب کرتا ہوا بولا۔ ''ہوشیار! ہتھیار نیچے پھینک دو۔ لوٹ کا سارا مال میں اکیلا لے جاؤں گا۔'' ہوشیار کے لیے یہ برداشت سے باہر تھا مگر جگت کی نظروں نے اسے روک دیا۔ اس نے سوچا کھیل الٹ گیا ہے' پھر بھی جگت ہوشیار کیوں نہیں ہوتا؟

''پالا! تمہاری بندوق میں ایک ہی گولی ہے اور ہم تین ہیں۔ تم کسے مارنا چاہتے ہو؟'' جگت نے اس پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

''تمہیں......!'' پالا نے یہ کہہ کر ہونٹ بھینچے۔ ''اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم جگا ڈاکو ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے بندوق کا ٹرائیگر دبا دیا..... کھٹاک کی آواز آئی مگر دھماکہ نہیں ہوا۔ اس کی بجائے جگت کا بھیانک قہقہہ اندھیرے میں گونج گیا جس سے خاموشی کا سینہ لرز گیا۔

''پالا! اس میں کارتوس ہی نہیں ہیں۔'' جگت نے پشت پر سے گن ہاتھ میں لے لی۔ ''تم مجھے پہچان گئے' مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے جبڑے تنگ ہو گئے اور گن گرج اٹھی۔ پالا کنویں کے کنارے گرا۔ دھماکے کی آواز ختم ہونے سے پہلے سب خاموش رہے۔ پالا کچھ دیر تڑپا' پھر اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں۔

''جگت! اس کی بندوق میں سے تم نے کب کارتوس نکال لیے تھے؟'' ہوشیار نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میری جان آدھی ہو گئی تھی۔''

جگت نے اپنے لباس کی جیب سے کارتوس نکال کر دکھائے۔ ''یہ کام چنا کے سپرد کیا تھا۔'' چنا کھلے منہ سے جگا کو دیکھ رہا تھا۔ ''ارے تم خاموش کیوں ہو گئے؟ پالا کے قتل کا صدمہ تو نہیں ہوا؟''

چنا کو اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے جگا ڈاکو بیٹھا ہوا ہے۔

''پا...... جی......'' وہ بمشکل بول سکا۔ ''کیا آپ خود جگا ڈاکو ہیں؟''

''کیوں......اب بھی نہیں مان رہا؟'' اس نے چنا کی پشت پر ایک ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''پوچھو ہوشیار سے۔''

ہوشیار مسکرا رہا تھا۔ ''نہیں چنا! یہ تمہیں بنا رہے ہیں جگا ڈاکو یہاں کہاں؟ وہ تو ابھی شیخوپورہ میں ڈاکے ڈال رہا ہے۔'' چنا بیچارہ الجھن میں پڑ گیا۔ وہ کبھی جگت کو اور کبھی ہوشیار کو گردن گھما کر دیکھنے لگا۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''چلو ہوشیار! اس کی لاش کنویں میں پھینک کر ہم روانہ ہوں گے۔'' جگت نے کہا۔ چنا سنگھ نے خاموشی سے پالا سنگھ کی لاش اٹھانے میں مدد کی پھر راستے بھر الجھن میں گرفتار رہا۔

تیسرے دن اخبارات میں خبر چھپی...... ''شیخوپورہ کا خطرناک ڈاکو جگا پاکستان کی سرحد پار کر کے امرتسر میں آ گیا۔ یہاں بھی اس نے کام شروع کر دیا ہے۔ اسے ختم کرنے کے لیے پولیس نے احکامات دیئے ہیں کہ جہاں بھی اسے دیکھا جائے گا' گولی مار دی جائے گی۔ اسے قتل کرنے والے کو مجرم نہیں سمجھا جائے گا۔'' یہ پڑھنے کے بعد چنا سنگھ کا رہا سہا شک بھی دور ہو گیا۔ وہ جگا ڈاکو کا ساتھی ہے یہ سوچ کر وہ فخر سے سر اٹھا کے گھومنے لگا۔

47ء کا سال ماضی کے سمندر میں ڈوب گیا اور دیواروں پر 48ء کے کیلنڈر لگ گئے۔ ان چار ماہ میں جگت نے گروہ بنا لیا۔ بارہ تیرہ پرانے ساتھی شامل ہونے کے بعد اس کا زور بڑھ گیا۔

''جگت! پرانے ساتھیوں میں جس کا سب سے زیادہ انتظار تھا وہ یعنی اپنا بچن نظر نہیں آیا۔'' ایک بار کھانا کھاتے ہوئے ہوشیار نے بات چھیڑی۔ رات چندن کور کے ہاتھ کی روٹی کھانے آیا تھا مگر رات رک گیا تھا۔ جگت کے گھر کا پتا اس کے اور چنا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

''ہوشیار بھائی' بچن بھائی کو بار بار یاد کرتے ہیں۔ آپ انہیں سچ بات کیوں نہیں بتاتے؟'' چندن کور نے دونوں کی تھالی میں گرما گرم پراٹھے رکھتے ہوئے کہا۔ جگت نے پہلے چندن کور کو پھر ہوشیار کو دیکھا۔ ہوشیار چونک

اٹھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا بچن کی کوئی بات اس سے چھپائی گئی ہے؟ جگت مسکراتا نہ تو وہ الٹا سمجھ بیٹھتا۔

"ہوشیار! بچن اب کبھی واپس نہیں لوٹے گا۔" جگت نے پراسرار لہجے میں کہا۔ "میں نے جدا ہوتے وقت اچلا کے کان میں سرگوشی کی تھی کہ بچن کو اس راستے سے واپس لے جانا۔"

"بس......؟ اس میں مجھ سے کیا چھپانا تھا؟" ہوشیار کو اطمینان ہوا۔ اس نے کئی اندازے لگائے تھے۔ "تم مجھے پہلے بتا دیتے تو فکر تو کم ہو جاتی۔ مجھے فکر ہو رہی تھی کہ بلوے کے درمیان کہیں پولیس کے پنجے میں پھنس کر......" اس سے آگے منحوس الفاظ وہ نہ بول سکا پھر ہوشیار بہت دیر تک خاموش رہا تو جگت بور ہو گیا۔

"ہوشیار! بچن کو میں نے ساری رقم دے دی تھی۔ اس کی وجہ سے تم ناراض تو نہیں؟"

"یہ کیا کہا جگت؟ بچن میرے لیے پرایا نہیں تھا۔ گھر بنا کر سکون کی زندگی گزار رہا ہوگا اس خیال سے مجھے مسرت ہوئی ہے۔" ہوشیار کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"پھر بھی جگت! میں تم سے ناراض ہوں۔" چندن کور کھانے کے برتن سمیٹنے آئی۔ اس نے یہ الفاظ سنے۔ اس نے چونک کر ہوشیار کو دیکھا۔

"دونوں دوستوں میں کیا تکرار ہو رہی ہے؟ مجھے بتاؤ! میں فیصلہ کر دوں۔" وہ بولی۔

جگت نے فوراً مذاق کیا۔ "اتنی بڑی بی بن کر فیصلہ کرنے آئی ہے ہوشیار' بچپن میں ہم نے دو بلیوں اور ایک بندر کی کہانی سنی تھی' یاد ہے؟ بلیوں کا جھگڑا ہٹانے کے بہانے بندر سب کچھ ہضم کر گیا۔"

"یعنی...... آپ مجھے بندریا گن رہے ہیں؟" چندن ایک انداز سے بولی۔ ہوشیار کو اس نوک جھونک میں لطف آیا۔

"نہیں بھئی...... میں تمہیں بندریا نہیں گن رہا' یہاں کہانی بدل گئی ہے۔ دو بندروں کے جھگڑے میں بلی جج بن کر آئی ہے۔" پھر ہنس کر بولا۔ "مگر بندر اپنے جھگڑے میں بلی کو نہیں لانا چاہتے۔" ہنستی ہوئی چندن کور باورچی خانے میں چلی گئی۔

"نہیں بھابی! آپ کی خاص ضرورت ہے۔" ہوشیار نے اسے روکا۔ "میں مذاق نہیں کر رہا۔" ہوشیار کے چہرے پر اچانک سنجیدگی چھا گئی۔ جگت اور چندن اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"بولو! کیا بات ہے؟" جگت نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ......" ہوشیار جلدی نہیں کہہ سکا۔ "بچن کو گھر بسانے کے لیے رخصت کر دیا مگر تمہیں چندن بھابی کا خیال کیوں نہیں آتا؟" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھر آگئی۔ چندن کو اس کی ہمدردی سے راحت محسوس ہوئی۔ وہ اتنے لمبے عرصے سے خاموش تھی۔ جو بات جگت کو سمجھانے کے لیے ساس اور سسر کو چھوڑ آئی تھی یہ کہنے کا اسے موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ آج ہوشیار یوں اچانک بات چھیڑ بیٹھا' اسے یہ پسند آیا۔ اس کے باوجود ہچکچائی۔ جگت ممکن ہے خفا ہو جائے گا یا ہوشیار سے جھگڑا کر بیٹھے گا۔ اسے ایسا خوف محسوس ہوا۔

"ہوشیار بھائی! بھابی کے ہاتھ کی روٹیاں کھانے کو ملیں اس وجہ سے مسکا تو نہیں لگا رہے؟" چندن نے بات ٹالنے کے ارادے سے کہا۔ "یہ میرا خیال نہیں رکھتے ایسا کہہ کر کہیں ہمیں آپس میں لڑانے کا پروگرام تو نہیں ہے؟" مگر اس کی چال بیکار گئی۔ جگت اور ہوشیار سنجیدہ ہو گئے۔

"بھابی! اب تک تو ہم گھر کی محبت سے دور تھے۔ لہٰذا ایسا خیال کبھی نہیں آیا۔" ہوشیار کی آواز میں محبت جھلک رہی تھی۔ "تمہارے ہاتھ کی روٹی کھانے جب بھی آتا ہوں' اپنے آپ کو مجرم گردانتا ہوں۔ آج تک جگت کے ساتھی ہونے کا دماغ میں غرور بھر کر گھوم رہا تھا......" وہ کچھ دیر کے لیے رک گیا۔ جگت اور چندن کور اس کی گفتگو کے منتظر تھے۔ "مگر اب بھی محسوس کر رہا ہوں کہ ہم نے جگت کا ساتھ دے کر اس سے دوسروں کا ساتھ چھڑایا ہے۔ بھابی! مرد چاہے جتنے کارنامے انجام دے مگر عورت کے

ساتھ کے بغیر اس کی روح کو سکون نہیں ملتا۔ جگت! ہم باہر کے لوگوں کو لوٹ کر دل میں خوش ہوتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہم اپنے گھر کے سکھ برباد کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں۔"

"ہوشیار! تمہیں شاید گھر یاد آ رہا ہے؟" جگت جان بوجھ کر چہرے پر مصنوعی سختی پیدا کرتا ہوا بولا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر ایسے خیالات ذہن میں گھر کر گئے تو اس کی روح کو بے چین بنا دیں گے۔

"تم ایک بات بھول جاتے ہو ہوشیار! کچھ راستے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔"

"پھر بچن بھائی کس طرح لوٹ گئے؟" چندن کور نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اسی وجہ سے تو مجھے خیال آیا ہے جگت!" ہوشیار چندن کا سہارا پا کر جوش میں آ گیا۔ "ابھی دیش میں گڑبڑ ہے، نئی حکومت جمی نہیں، اس وقت ادھر ادھر ہو جانے کا موقع ہے۔"

"مگر ہم کدھر جا سکتے ہیں؟" جگت نے ویسے ہی پوچھا۔ "جہاں جائیں گے سرکار اور پولیس تعاقب میں ہوگی۔"

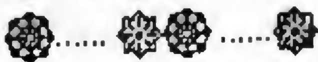
"نہیں جگت...... میں پردیس فرار ہونے کی بات کر رہا ہوں۔" ہوشیار کی آنکھیں پرجوش انداز میں چمکنے لگیں۔ "وہاں کون ہمارا تعاقب کرے گا؟" پردیس جانے کی بات نے چندن کو دہلا دیا۔ جگت کو دیرو یاد آ گئی۔ ملک چھوڑنے کے بعد بھی دیرو سے ملن کی آس نہیں چھوٹی تھی۔ اب اگر وہ پردیس چلا جائے تو ہمیشہ کی جدائی اسے چین نہیں لینے دے گی۔ چندن کو ساس سسر کی جدائی کا دکھ تھا۔

"ہوشیار! غیر ملک جانے کے لیے پیسہ پانی کی طرح خرچ کرنا پڑتا ہے۔ انجانے دیس میں قیام کے لیے لمبی رقم چاہیے۔" جگت نے اعتراض کیا۔ "ابھی ہم یہاں پکا ٹھکانہ بھی نہیں بنا سکے۔"

ہوشیار دو چار منٹ خاموش رہا۔ جگت مخالفت نہیں کر رہا تھا یا اس کے لیے نصف فتح تھی۔ اس نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ "ہم اس طرح چھوٹے چھوٹے ڈاکے ڈال کر بھاگتے رہے ہیں، اس کی بجائے ایک بڑا دھماکہ کر کے ہمیشہ کا سکھ پا سکتے ہیں۔"

"ہمیشہ کا سکھ؟" جگت کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے سوچا ہوشیار کچھ سچ کہتا ہے۔ ایسا ڈاکہ ڈال کر ہمیشہ کا امن مل سکتا ہے مگر پھر اونگھتی ہوئی پولیس بیدار ہو جائے اس کا کیا ہوگا؟ بات یہیں ختم کرنے کے لیے جگت نے کہا۔ "ہوشیار! ابھی ہم وہ بوٹا والے بیوپاری کے متعلق پلان بنائیں۔ مخبر کی اطلاع آتے ہی ہمیں روانہ ہونا ہے۔"

چندن سمجھ گئی کہ جگت نے بات ٹال دی ہے پھر بھی اسے اتنا اطمینان تھا کہ اس نے کچھ بیج بو دیئے ہیں اور تھوڑا تھوڑا پانی دیتی رہے گی تو کبھی تو زمین پھٹے گی اور پودا نمودار ہوگا۔ اس وقت شاید چندن کو بھی یہ پتہ نہیں تھا کہ قدرت دوسرے پودے کے پھوٹنے کی تیاری کر رہی ہے......!



بوٹالہ کا دیسی مخبر اطلاع لایا۔ "ہمارے گاؤں کے ایک بیوپاری کا لمبا کاروبار ہے، دس پندرہ ہزار کی رقم کا روزانہ لین دین ہوتا ہے۔" جگت نے اپنے ایک ساتھی کو اس کے ساتھ بھیج کر مزید معلومات حاصل کیں۔ بیوپاری کی دکان کب بند ہوتی ہے؟ رقم وہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے یا کسی کے سپرد کرتا ہے؟ اس کے ساتھ کتنے آدمی ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

دو دن کے بعد اطلاع ملی۔ "بیوپاری کیش کوٹ کی جیب میں چھپا کر گھر لے جاتا ہے اور دوسرے دن بینک میں جمع کرا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ کبھی اس کا جوان بیٹا اور کبھی منشی ہوتا ہے۔ دس بجے تک بازار بند ہو جاتا ہے۔"

ہوشیار اور دوسرے چار ساتھیوں کو لے کر جگت شام کو بوٹالہ پہنچ گیا۔ کبھی کبھی زیادہ آدمی ساتھ لینے سے خطرہ بڑھ جاتا ہے، بیوپاری کو بیچ بازار میں لوٹنا تھا لہٰذا تیزی سے اور پھرتی سے کام لینا تھا۔ زیادہ ساتھی ہونے میں کوئی

غفلت کر بیٹھے' جھپٹ میں آ جائے یا غلط جگہ فائر کر دے تو کام بگڑ جانے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔

"ہوشیار! رات دس بجے بیوپاری دکان بند کر کے نکلتا ہے۔ لہٰذا چوکنا رہنا پڑے گا۔ بھاگنے کے لیے پورا بازار پار کرنا پڑے گا۔" جگت نے ہوشیار سے کہا۔

دسمبر کی سرد رات تھی۔ ہوا کے زور کی وجہ سے لوگ جلدی جلدی گھر جا رہے تھے۔ نو بجے ہی بازار بند ہونے لگا۔ جگت' ہوشیار اور چنا کانوں تک کمبل اوڑھ کر روپ چند کی دکان کے سامنے والی دکان سے کپڑا خریدنے لگے۔ کپڑے والا تھان دکھانے لگا۔ جگت بار بار سامنے والی دکان کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کپڑا چار گز کاٹ دو...... وہ کپڑا دکھاؤ! اس کا بھاؤ زیادہ ہے۔ وہ اس طرح وقت کاٹ رہے تھے۔ کمبلوں کے نیچے ان کی رائفلیں چھپی ہوئی تھیں۔

"سردار جی' ذرا آرام سے بیٹھیں! آپ کو بہترین کپڑا دکھا رہا ہوں۔" گاہک دوسری دکان کی جانب متوجہ نہ ہو اس خیال کے تحت کپڑے والے نے نرمی سے کہا مگر جگت نے بات سنی ان سنی کر دی۔

"ہوشیار! اسے جلدی سے حساب چکا دو۔" ہوشیار سمجھ گیا کہ سامنے والی دکان بند ہو رہی ہے۔ جگت اور چنا اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ ہوشیار پیسے چکانے کے بہانے رک گیا۔ اسے عقب میں رہنا تھا۔ دوسرے چار ساتھی کچھ دور آگ پر ہاتھ سینک رہے تھے۔ روپ چند نے دکان کے دروازوں کے بعد تالے اچھی طرح چیک کیے اور کوٹ کی جیب پر ایک بار ہاتھ کا دباؤ دیا' پھر آس پاس نظریں گھمائیں۔ جسم پر کمبل اچھی طرح لپیٹ لینے کے بعد وہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہاتھ میں لالٹین لیے بوڑھا منشی چل رہا تھا۔ راستے پر اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ رات کی پولیس ابھی پہرے پر نہیں آئی تھی۔ نصف شب سے پہلے چوکیدار کی ضرورت بھی کیا تھی؟

"چنا! چہرے سے ذرا بھی بے چینی کا اظہار نہ کرنا۔ سمجھے؟" جگت نے اسے خبردار کیا۔ اب بھی چنا کبھی گھبرا جاتا تھا۔ جگت اسے برابر تربیت دینا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ "تم مجھ سے دو قدم دور رہو گے۔ جب میں سیٹھ کو دباؤں تو تمہیں منشی کو سنبھالنا ہو گا۔"

جگت نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ چنا نے کچھ لمحے بعد گھوڑا روکا۔ روپ چند اور منشی سامنے سے آ رہے تھے۔ ہوشیار شکار کے عقب میں تھا تاکہ وہ فرار کی کوشش نہ کر سکیں۔ چاروں ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر تیار ہو گئے۔ چوک پار کر کے روپ چند اور منشی گلی کی جانب بڑھ رہے تھے تو اس وقت انہیں جگت اور چنا کے گھوڑے نظر آئے۔ گھڑ سواروں کو راستہ دینے کے لیے سیٹھ ایک طرف ہٹ گیا مگر یہ کیا؟ ایک گھڑ سوار اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

"ست سری اکال سیٹھ صاحب! سنا ہے کہ تم بڑی رقم کا دھندا کرتے ہو؟"

روپ چند نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ شانے پر لپٹے ہوئے کمبل سے جگت کی رائفل کی نال نظر آ رہی تھی۔ راستے کے درمیان اس غلط وقت پر دھندے کی پوچھ گچھ کرنے والے کے ارادے ٹھیک نہیں سیٹھ یہ سمجھ گیا۔ پھر بھی خاموشی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"آپ کو پہچانا نہیں سردار جی!" یہ کہہ کر اس نے کن انکھیوں سے دوسرے گھڑ سوار کو دیکھا۔

اسی لمحے روپ چند پشت پھیر کر بھاگنے لگا۔ "بھاگو! یہ بدمعاش دکھائی دیتے ہیں۔" وہ خود سے کہہ رہا تھا یا منشی سے' کسی کو بھی کہہ رہا ہو مگر دونوں میں سے ایک بھی فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ عقب میں ہوشیار ہاتھ میں رائفل تھامے راستہ روک کر کھڑا ہوا تھا۔ منشی نے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر چنا نے گھوڑا راہ میں حائل کر دیا۔ منشی کے ہاتھ سے لالٹین گر گئی۔ کمبل گھوڑی کی پیٹھ پر رکھ کر جگت نیچے کود گیا۔ روپ چند کی آنکھیں اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ مدد کے لیے چیخے یا نہیں؟ یہ وہ شاید طے نہیں کر سکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کمبل جسم کے گرد اور زور سے لپیٹ لیا۔

"سیٹھ! کمبل کی کیا ضرورت ہے؟ جسم پر کچھ کی گرمی

بہت ہے۔'' جگت نے جھپٹا مار کر کمبل چھین لیا۔ ''فوراً تم یہاں رکھ دو! ورنہ ایسی سخت سردی میں تمہارے رشتے داروں کو شمشان جانا پڑے گا۔'' جگت کی آواز سخت تھی۔

''سیٹھ جی انہیں جلدی رقم دے دو، میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ میں مفت میں مارا جاؤں گا۔'' منشی لرز رہا تھا۔ سیٹھ کو منشی پر غصہ آ گیا مگر اس نے دیکھا کہ منشی آنکھ مار کر اشارہ کر رہا تھا۔ ''دو میں سے ایک بازو بچالو!''

سامنے موت کا خوف تھا' ایسے وقت لٹنے والا زیادہ سے زیادہ بچانے کی ترکیب کرتا ہے۔ ایک پل میں اسے یاد آ گیا کہ بائیں سے زیادہ دائیں پہلو میں وزن ہے۔ بائیں بازو کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے رقم نکالنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ ''بھائی صاحب! یہ رقم لے کر ہمیں صحیح سلامت جانے دو۔'' رقم پر جھپٹا مار کر جگت نے سیٹھ کے دائیں پہلو میں گھونسہ مارا۔

''اب اس طرف کی گرمی کم کرنی ہے۔'' پھر طنزیہ انداز میں ہنس کر بولا۔ ''جب تم نے بڑی رقم اس پہلو میں دبائی تھی' اس وقت میں دیکھ رہا تھا۔''

سیٹھ سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ اس نے ہوشیار کے گھوڑے کے پیٹ کے نیچے سے نکل جانے کے لیے جست لگائی' ہوشیار بپھر گیا۔ اس نے رائفل کا بٹ روپ چند کی پشت پر مارا۔ جگت بھی شعلہ بن گیا۔ اس نے سیٹھ کی ایک ٹانگ تھام کر زمین پر گھسیٹا۔ ''زندہ فرار نہیں ہوسکے گا۔'' پھر پہلو میں لات ماری۔ ہوشیار گھوڑے پر سے کود گیا۔ اس نے کپکپاتے ہوئے سیٹھ کا کوٹ پھاڑ دیا۔ بائیں ہاتھ سے اس کے جبڑے پر گھونسہ مار کر دائیں ہاتھ سے رقم نکال لی۔

''اے منشی! سیٹھ کے پاس اور کچھ تو نہیں؟'' جگت نے آنکھیں نکال کر کہا مگر منشی جواب دے اس سے پہلے چوک کی عمارت کی دو ایک کھڑکیوں سے لوگ شور مچانے لگے۔

''پکڑو...... ان بدمعاشوں کو......''

جگت اور ہوشیار بجلی کی سی پھرتی سے گھوڑوں پر سوار ہوگئے۔ چنا نے منشی کو گھونسہ مار کر ایک طرف دھکیل دیا۔ باقی چار ساتھی بھی قریب آ گئے۔ ''پندرہ آدمیوں کا گروہ گلی میں سے آ رہا ہے۔ تیزی سے گاؤں سے باہر نکل جاؤ۔'' جگت نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ ''میں اور ہوشیار فائر کر کے انہیں بھگا دیں گے۔''

سردی میں سنسان سڑک پر سات گھوڑوں کی ٹاپیں گونجنے لگیں۔ ان کی پشت پر ''پکڑو...... پکڑو'' کا شور ہونے لگا۔ فرار ہوتے ہوئے ڈاکوؤں کو سامنے والے خطرے سے خبردار رہنا ہوتا ہے۔ اچانک کوئی راستہ روک لے تو مصیبت آ جائے۔ جگت کو عقب کی فکر نہ تھی۔ پھر بھی گروہ کو ڈرانے کے لیے اس نے ہوائی فائر کیے۔ دھماکوں سے گاؤں کی سردی ختم ہوگئی۔ عقب میں آنے والے لوگوں میں دو چار جوشیلے جوان تھے۔ ''اپنی نظر کے سامنے گاؤں کے بیوپاری کو لوٹ کر جانے والے بدمعاشوں کو صحیح سلامت نہیں جانا چاہیے۔ ورنہ گاؤں کی عزت چلی جائے گی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے لوگوں کو جوش دلایا۔ لکڑی ڈنڈے کرپانیں' جو کچھ ہاتھ آیا لے کر شور کرتے ہوئے اور بھی لوگ گروہ میں شامل ہوگئے۔ گاؤں کی حد پار کرنے کے بعد بھی انہوں نے ڈاکوؤں کا تعاقب ختم نہیں کیا۔

''ہوشیار! فائرنگ کرو۔ چاہے دو چار زخمی ہو جائیں۔'' یہ کہہ کر جگت نے دونالی رائفل سے فائرنگ شروع کر دی۔ اندھیرے میں فائرنگ کی لپیٹ میں تین آدمی آ گئے جن میں ایک لیٹ گیا اور دو زخمی ہو گئے۔

''ارے...... ڈاکوؤں کو گاؤں کے باہر نکالنے کے بعد خواہ مخواہ تعاقب کر رہے ہو۔'' کسی نے اختلاف کیا۔ ''گاؤں کا پانی دکھانے کے چکر میں مزید دو چار لاشیں لے کر لوٹو گے؟'' جگت نے دیکھا گروہ رک گیا۔ اب عقب کی فکر نہیں تھی۔ رائفل کو شانے پر لٹکا کر اس نے گھوڑی کو ایڑ لگائی۔

''ہوشیار! اب خطرہ نہیں' دس بارہ میل نکل جانے کے بعد پھر کہیں آرام کریں گے۔''



بٹالہ کا بیوپاری بازار کے بیچ میں لوٹا گیا۔ دس ہزار کا

ڈاکہ اور ایک قتل' ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے والے لوگوں میں سے دو زخمی بھی ہو گئے' پھر بھی پولیس سوتی رہی۔ علاقے میں شور مچ گیا۔ امرتسر کا پولیس چیف خود بوٹالہ دوڑا آیا۔ پہلے یہ تحقیق کرنی تھی کہ کس گروہ نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ گنگا' یا جگا......؟

اس کپڑے والے نے اپنے گاہکوں کے متعلق جو کچھ بتلایا اور روپ چند نے لوٹنے والے آدمیوں کے چہرے کا جو نقشہ بتایا اس سے پورن سنگھ سمجھ گیا کہ یہ جگا کا کارنامہ ہے۔ دیکھتے ہی گولی مارنے کے حکم کے بعد اس کا زور اور بڑھ گیا تھا۔

''مگر اس ڈاکے سے میں اس کی راہ پر لگ جاؤں گا۔'' وہ سوچنے لگا۔ جگا کو اس بیوپاری کی مخبری کس نے کی؟ آخری چار دن کی سرگرمیوں کا حساب لیا جانے لگا۔ بیوپاری کی دکان کے قریب مشکوک حالت میں گھومنے والوں کو یاد کیا جانے لگا۔ پانچ سات آدمیوں کو حوالات میں بند کر کے تھوڑی مار بھی لگائی۔ اس طرح پورن سنگھ کے ہاتھ صحیح شخص آ گیا۔

بیوپاری کے متعلق مخبری کرنے والے نے بتایا کہ جگت نے ہی ڈاکہ ڈالا تھا۔ پولیس پارٹی لے کر پورن سنگھ خود جگا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ پنج گوریا' کادیہ اور دوسری جگہوں پر اس نے جگا کو تلاش کیا۔ موقع ملتے ہی گولی مار دینے کے آرڈر کے بل پر وہ جگا کو آنکھیں بند کر کے شوٹ کر سکتا تھا مگر جگا ایک بار بھی سامنے نہیں آیا تھا۔

پولیس کے تعاقب سے بچنے کے لیے جگا کو بہت زیادہ بھٹکنا پڑا۔ چندن کور کو محفوظ جگہ پر رکھ کر ساتھیوں کے ساتھ وہ پیدل بھاگ رہا تھا۔ وہ کھیت اور جنگل پار کر کے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک سمت سے دوسری سمت جاتا رہا۔ ایک بار تو پولیس سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ایک ہی کھیت کے اس جانب ڈاکو تھے اور دوسری سمت پولیس پارٹی تھی مگر پکی ہوئی فصل نے انہیں ایک دوسرے سے انجان رکھا۔ چندن کور سے ملے ہوئے سات روز گزر چکے تھے۔ جدا ہوتے وقت وہ اتنی بے چین کیوں نظر آ رہی تھی؟ پوچھا تو اس نے صرف اتنا کہا تھا۔

''پورا یقین ہونے کے بعد بتاؤں گی۔ تم خود کو سنبھالنا۔''

جگت کو اس کے الفاظ بار بار یاد آ رہے تھے۔ چندن کور کو کس بات کا وہم تھا؟ کیا ان کا ساتھ چھوٹ جانے والا تھا؟ نہیں...... چندن کور اس کی خطرے سے پر زندگی کی عادی ہو چکی تھی۔ ضرور دوسری کوئی بات ہے۔ کوئی اور نئی بات۔'' جگت سوچ رہا تھا۔

''ہوشیار! اس طرح گاؤں اور کھیتوں میں بھٹکنے کی بجائے ہم الگ الگ ہو جائیں۔ تم' میں اور چندن شہر کے کسی ہوٹل میں چلے جائیں۔ بھٹکنا بھی نہیں پڑے گا' نہ بھوک پیاس کی پریشانی ہو گی۔''

''نہیں جگت! دوسرا راستہ سوچنا پڑے گا۔ ہوٹل پر پولیس کی گہری نظر ہے۔'' ہوشیار نے سوچا وہ بات یاد کرانے کا یہ موقع ہے۔ اس لیے مزید بولا۔ ''میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ کوئی بڑا ہاتھ مار کر سمندر پار چلے جائیں۔''

سورج غروب ہو رہا تھا۔ شام اداس تھی۔ جگت' ہوشیار اور ساتھیوں کے چہرے بھوک اور پیاس سے اتر گئے تھے۔ جھڑیالہ شہر سے تین میل کے فاصلے پر سوکھی ہوئی نہر کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سب کی نظریں بار بار سامنے والی پگڈنڈی پر چکرا رہی تھیں۔ چنا سنگھ کو کھانا لینے کے لیے شہر بھیجا تھا اسے اتنی دیر کیوں ہوئی؟ صبح سے کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بھٹکتے ہوئے اور بڑھتی ہوئی سردی کے مقابلے میں جسم کو گرم رکھنے کے لیے کھانے کی ضرورت تھی۔

''میرا بیٹا چنا سنگھ پیٹ بھر کر پہلے کھائے گا پھر لوٹے گا۔'' کسی نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو یہ سورج تربوز جیسا معلوم ہوتا ہے۔ اسے چیر کر کھا لیں' پھر پیٹ ٹھنڈا ہو گا۔'' وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑا رہا تھا۔

''ارے بھائی! اب سورج کو کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دیکھو چنا سنگھ چلا آ رہا ہے۔'' کسی نے سب کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ سب غور سے چنا کو دیکھنے

لگے۔ چنا پر اس وقت سب کو پیار آ رہا تھا بلکہ وہ جوں جوں قریب آ رہا تھا' پیار بڑھتا جا رہا تھا۔

"ارے اب جلدی سے آ بھی جاؤ یار۔" ایک سے برداشت نہ ہو سکا۔ "ٹوٹے ہوئے پیروں کی طرح چل رہا ہے۔"

چنا سنگھ کھانے کے بنڈلوں کو نیچے رکھ کر بیٹھ گیا اور رونی صورت بنا کر بولا۔ "کچھ اور دیر سے جاتا تو سب کو رات بھوکے سونا پڑتا۔ کیونکہ دکانیں بند ہو رہی تھیں۔" اس کی بات پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ سب کھانے پر جت گئے۔ پانچ دس منٹ تو کسی نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ چنا کھانے میں شامل ہوئے بغیر گم صم بیٹھا ہے' ممکن ہے وہ یہ سمجھ رہے ہوں کہ وہ کھانا کھا کر آیا ہے لہٰذا ہاتھ نہیں بٹا رہا۔ "سالے لوگ پوچھو تو سہی کہ میں نے کھایا بھی ہے یا نہیں؟ بس جھپٹ پڑتے ہو۔" چنا سنگھ غصے میں بولا۔ "میں نے کہا کہ ذرا دیر ہوتی تو ہم بھوکے سوتے۔ اس کی وجہ بھی کسی نے نہیں پوچھی۔"

"بھئی بغیر پوچھے کہہ ڈالو۔" جگت نے مرغی کی ٹانگ چوستے ہوئے کہا۔

"سن کر تمہارا کھانا زہر ہو جائے گا۔ پہلے پیٹ بھر کر کھا لو۔" چنا سنگھ غصے میں بول رہا تھا یا ناراض تھا یہ کسی کو سمجھ میں نہیں آیا مگر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

جگت چونکا۔ اس نے ساتھیوں کو ڈانٹا۔ "ارے بھئی! تم لوگ ٹھہرو' چنا کے پاس کوئی اہم بات ہے۔" پھر اس نے کہا۔ "کہو..... چھوٹے بچوں کی طرح منہ کیوں بنا رہے ہو؟"

"تمہارا باپ مر گیا' چنا غصے میں کہہ رہا تھا۔ "ہمارے سب کے باپو کو قتل کر دیا گیا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "گاندھی جی پرارتھنا کرنے جا رہے تھے تو کسی ظالم دشمن نے انہیں گولی مار دی۔" پھر چنا چھوٹے بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ سب کے دل بیٹھ گئے۔ جگت نے آہ بھری۔

"مگر گولی مارنے والا کوئی مسلمان ہوا تو بلوے شروع ہو جائیں گے۔"

سورج سر جھکا کر مغرب میں ڈوب گیا۔ رات گزارنے کے لیے سب جنگل میں داخل ہو گئے۔ چنا اور ہوشیار کی بیدار رہنے کی باری تھی۔ باقی لوگ سو گئے' جگت کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ چنا جھریالہ کے بازار کی ایک بات کہنا بھول گیا تھا۔ وہ ہوشیار کو سنا رہا تھا۔

"دوست! وہاں کا جوہری بازار بہت بڑا ہے۔ سونا چاندی کے جواہرات شوکیسوں میں سجائے ہوئے تھے۔ وہ دکانیں جلدی جلدی بند ہونے لگیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک ڈاکو بازار میں گھس آئے ہوں اور لوگ خوف کے مارے دکانیں بند کر رہے ہوں۔" چنا یا ہوشیار کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جگت آنکھیں بند کیے بیدار تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پانچ منٹ کے سناٹے کے بعد جگت نے انہیں چونکایا۔

"ہوشیار! اگر جوہری بازار میں ڈاکہ ڈالیں تو کیسی رہے؟" چنا سنگھ اس طرح لرز گیا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ ہوشیار چپ ہو گیا۔ جگت بڑبڑا رہا تھا۔ "لاکھ دو لاکھ کا ہاتھ ماریں تو ہمیشہ کی دردسری ختم ہو جائے۔" چنا سنگھ محسوس کر رہا تھا جگت نیند میں بک رہا ہے۔ مگر ہوشیار اس کی بات سمجھ گیا۔ جگت اپنے ارادے کا اتنی جلدی اظہار کرے گا یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بس اب بڑے اور آخری ڈاکے کی سرگرمی شروع ہونے کی دیر تھی۔

❁ ...... ❁❁ ...... ❁

گاندھی کے قتل کی رات جگت کے دماغ میں آیا ہوا خیال جگت اور ہوشیار کے ذہنوں میں ہلچل مچانے لگا۔ جوہری بازار لوٹنے والا کارنامہ معمولی نہیں تھا۔ اس پار یا اس پار کا جوا کھیلنا تھا۔ اس خیال سے رگوں میں خون کی گردش بڑھ گئی۔ "ہم ہر طرح سوچ بچار کر کے آگے بڑھیں یہ بہتر رہے گا۔" ہوشیار جوں جوں سوچتا گیا اس کا ذہن بیدار ہوتا گیا۔ "لاکھوں کا مال جہاں فروخت ہوتا ہو وہاں دکانیں لاوارث کی ملکیت کی طرح نہیں ہوں گی۔"

"تیاری پوری کریں گے مگر سوچنے کے چکر میں

پلان بگڑ جائے گا۔" جگت ذرا بھی پروا کیے بغیر بول رہا تھا۔

"ہمارے ہاتھ میں صرف دو دن ہیں۔ آج گاندھی جی کے سوگ میں بازار بند ہے۔ کل اتوار تیاری میں جائے گا۔"

"تو کیا تم پیر کو ہی چھاپہ مارنا چاہتے ہو؟" ہوشیار کی آواز جوش میں لرز رہی تھی۔ جگت مسکرایا۔ کچھ دیر خاموشی رہی تو ہوشیار کو اپنے غیر ضروری جوش کا احساس ہوا۔ اتنے سالوں کے ساتھ کے بعد بھی جوش میں وہ جگت کی خاصیت کو بھول چکا تھا۔ جگت اکثر کہا کرتا تھا۔

"پلان بناتے وقت جلدی نہیں کرنی چاہیے ورنہ عمل کے وقت جوش میں اندھے ہو جاؤ گے۔ ایسے کام بڑے اطمینان سے جو کر سکتا ہے وہ کبھی نقصان نہیں اٹھاتا۔"

"ہوشیار! ہم منگل کو ڈاکہ ڈالیں گے۔ میں پیر کو جوہری بازار مال پسند کرنے جاؤں گا۔"

"مال پسند کرنے؟" ہوشیار کو تعجب ہوا۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ "جگت تم اس طرح بات کر رہے ہو جیسے ہم زیورات خریدنے جا رہے ہوں۔ جیسے شادی میں زیور دینے ہوں اس طرح پسند کرنے جا رہے ہو۔"

"شادی کے لیے ہی پسند کرنے جانا ہے۔" جگت سنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "میری شادی ہونے والی ہے۔ میں ملٹری کا بڑا افسر ہوں۔ شادی فوراً ہو رہی ہے لہٰذا تیار زیور لینے ہیں۔ منہ مانگی قیمت دینے کو ہم راضی ہیں۔"

اب ہوشیار کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "سمجھ گیا۔ ہمیں فوجی افسر بن کر جانا ہے۔ قیمتی مال پسند کرنا ہے جس کی پوری قیمت ملے۔ مگر جگت اسی لمحے مال لے کر فرار ہو جائیں پھر تمہیں کیا اعتراض ہے؟ دوسرے دن جانے کی ضرورت کیا ہے؟"

جگت مسکرانے لگا۔ "تم کچھ دیر پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ سوچ بچار کر قدم اٹھانا چاہیے اب کہہ رہے ہو کہ ایک چکر میں نمٹا لیں۔" پھر بولا۔ "ہوشیار! پیر کو ہم فوجی لباس میں جائیں گے اور خود کو کسی فوجی افسر کی طرح ظاہر کرنا ہے۔ مگر منگل کو......"

"ڈاکو بن کر جائیں گے۔ یہی کہنا چاہتے ہو؟" ہوشیار رنگ میں آ گیا۔ یہ مشورہ کرنے کے لیے وہ لوگ دوسرے ساتھیوں سے الگ ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ جگت یہ چال آخر تک پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ ڈاکہ ڈالنے کا ٹھکانہ سوائے ان کے کسی اور کو آخر تک معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ چنا کو بھی نہیں۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ پوری طرح محتاط رہنا تھا۔

"ہوشیار! میں فوج میں ہوتا تو اتنے سالوں میں کس عہدے پر پہنچ جاتا؟" ہوشیار نے سوچا جگت یہ کیا پوچھنے لگا؟

"جگت! تم شاید میجر یا پھر کرنل ہوتے مگر کیوں پوچھ رہے ہو؟"

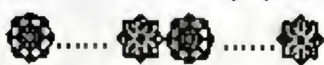
"بس..... تو پھر تمہیں میرے لیے کرنل جیسا لباس لانا پڑے گا۔" پھر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا۔ "بندہ ایک گھنٹے کے لیے کرنل بن جائے گا۔"

"اور میں.....؟"

"تم میرے اردلی۔" جگت ہنسا۔ "تم میری جیپ چلاؤ گے۔ رعب ڈالنے کے لیے دو ایک سلیوٹ بھی کرنا پڑیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے جیپ کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔ یہ کیوں نہیں کہتے؟" ہوشیار نے کھڑے ہو کر فوجی انداز میں سلام کیا۔ "ایک ہی دن باقی ہے کرنل صاحب! مجھے اجازت دیں۔ دشمنوں پر حملہ کرنے کے لیے ابھی کافی تیاری کرنی ہے۔"

جگت قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ ان کی حرکات دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جوہری بازار لوٹنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ پیسے خرچ کر کے زیورات خریدنے والے کے ذہن پر بھی بوجھ رہتا ہے مگر یہاں تو دن کے اجالے میں ڈاکہ ڈالنے کی تیاری ہو رہی تھی.....!



پیر کی دوپہر کے بعد جھڑیالہ کے بازار میں ایک فوجی جیپ آ کر رکی۔ جیپ چلانے والے فوجی نے جلدی سے

اتر کرنل صاحب کو زوردار سلیوٹ دیا۔ بہت سی دکانوں کے بیوپاری ادھر دیکھنے لگے۔ سارے بازار کی سب سے بڑی دکان کے سامنے جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ گاہک جاننے والا معلوم ہوتا تھا۔

"آیئے تشریف لایئے بڑے صاحب۔" بیوپاری نے استقبالیہ انداز میں دروازے کے قریب آ کر کہا۔ کچھ بھی ہو وہ ملٹری کا کوئی افسر تھا۔ چوڑے سینے سے لمبا سانس خارج کرتے ہوئے جگت نے آنکھوں پر چڑھائے ہوئے گاگلس ٹھیک کیے۔ وہ خاصا بارعب لگ رہا تھا۔ کرنل کے لباس کی سجاوٹ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ صاف' استری شدہ ٹائٹ یونیفارم' چمکتے ہوئے جوتے' سر پر سکھ افسر کی سی پگڑی' شانے پر فوجی عہدہ ظاہر کرنے والا پیتل کا نشان۔ پشت پر اسٹین گن بھی لٹک رہی تھی۔ جس سے رعب پڑ رہا تھا۔ یہ دیکھ لینے کے بعد جگت دکان میں داخل ہوا۔ پیچھے چلتے ہوئے ہوشیار نے دکاندار کے کان میں سرگوشی کی۔

"کرنل صاحب کی شادی ہے۔ قیمتی چیزیں دکھانا' سرمایہ دار خاندان کے بیٹے ہیں۔ فوج میں شوقیہ ہیں۔" اس کی بات نے سب کو ہوشیار کر دیا۔ زیورات کے الگ الگ نمونے پیش ہونے لگے۔ ہوشیار نے جگت کو اشارہ کر کے سمجھایا۔ مال دیکھنے کے لیے گوگلس اتار دو! نہیں تو شک ہو جائے گا۔"

ہلکے انداز میں مسکرا کر جگت نے رنگین چشمہ آنکھوں پر سے ہٹا لیا۔ اب سونے کی چمک نظر آنے لگی۔ "آپ معمولی چیز نہ دکھائیں۔ قیمت کی پروا نہ کریں۔ مجھے قیمتی زیورات چاہئیں۔ کوئی طنز کرے کہ ہلکے زیورات لے آئے ہو تو میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔ باپ دادا کی عزت اور گھر میں آنے والی لچھمی کی خوشی کا سوال ہے۔" جگت بولا۔

"حضور! آپ بے فکر رہیں۔ میں ابھی قیمتی چیزیں منگوا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ "سیف میں سے پانچ دس بھاری سیٹ لے آؤ۔"

ہلکے سے انداز میں کہی گئی بات جگت نے سنی۔ اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور داڑھی کھجاتے ہوئے پوچھا۔

"دیر لگے گی ...... مجھے کچھ زیادہ جلدی ہے۔"

"نہیں حضور! نزدیک میں ہے۔ دس منٹ میں آ جائے گا۔" بیوپاری نے لجاجت سے کہا۔ "ارے دیپ چند! صاحب کے لیے ٹھنڈا لاؤ۔"

"نہیں لالہ جی! تکلیف کی ضرورت نہیں۔" جگت نے تکلف کیا۔ "مجھے بہت جلدی ہے۔ تم جانتے ہو باپو جی کے قتل کے بعد حالات بہت زیادہ بگڑے ہوئے ہیں' کچھ ہو جائے اس سے پہلے ہمیں خبردار رہنا چاہیے۔ شادی کے لیے بمشکل فرصت ملے گی۔"

"سچ بات ہے ...... مگر اچھی چیز پسند کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔" بیوپاری کو بڑا گاہک گنوانا نہیں تھا۔ "بات یہ ہے کہ دکان میں بڑا مال رکھنا خطرہ ہے۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ اس لیے سیٹ قریب ہی ایک محفوظ جگہ رکھتے ہیں۔ آپ جیسا کوئی بڑا گاہک آتا ہے تو منگوا لیتے ہیں۔"

"اچھا ......" جگت نے ہمدردی سے کہا۔ "اس طرح تو آپ کو ڈبل محنت کرنی پڑتی ہوگی۔" اسے زیادہ وقت دکان میں رہنا بھی ٹھیک نہیں لگا۔ نقلی کرنل کی پول کھل جانے کا بھی خطرہ تھا۔ "اصل پسند تو عورتوں کو کرنا ہوتی ہے۔ ماتا جی' بھابی کل آنے والی ہیں۔" پھر یکبارگی رسٹ واچ کو دیکھتا ہوا بولا۔ "اچھا! ایسا کرو کل بھاری سیٹ منگوا کر رکھیں' چار بجے ہم آ جائیں گے۔"

"مگر آج دیکھتے جائیں۔ کل پھر سیٹ منگوا لیں گے۔" "اس میں تکلیف کا سوال نہیں ہے۔" لالہ جی نے سوچا ممکن ہے گاہک نکل جائے۔ "آپ کے لیے ٹھنڈا منگوایا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں لالہ جی!" جگت نے اسے اطمینان دلایا۔ "آپ کی دکان سارے بازار کی ناک پر ہے۔ یہ کون نہیں جانتا؟ بیس پچیس ہزار کے زیورات کے لیے دوسری دکان پر جانا ہم اچھا نہیں سمجھتے۔"

اپنی دکان کی تعریف اور سن چھوٹیں ہزاروں کی رقم گن کر جوہری کی باچھیں کھل گئیں۔ کتنا نفع ہوگا اور دام کتنے بڑھا کر بولے جائیں، وہ سوچنے لگا۔ وہ میٹھے لہجے میں بولا۔

"حضور! دکان آپ کی ہے، جیسی چیز مانگیں گے حاضر کریں گے۔" جگت چلنے لگا تو وہ عاجزانہ لہجے میں بولا۔

"چار بجے تیار رکھوں گا آپ ضرور تشریف لائیں۔ کہیں تو مال گھر دکھلاؤں؟"

جگت چونک پڑا۔ "نہیں بھئی، ایسی تکلیف کیوں کریں؟ آپ یہ قیمتی سامان لے کر آئیں یہ ٹھیک نہیں۔ ہمیں آپ لوگوں کا خیال بھی کرنا چاہیے۔" پھر آہستگی سے بولا۔ "ممکن ہے دیر ہو جائے، مگر سیٹ منگوا کر تیار رکھنا۔ شادی کے ہزار چکر کرنے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے چار کی جگہ دوپہر ہی آ جائیں۔"

"بہتر...... جیسی آپ کی مرضی۔ آپ جب بھی آئیں گے نمونے تیار ملیں گے۔ دوسرے گاہکوں کو پھر دیکھیں گے۔" وہ بولتا رہا اور جگت ملٹری افسر کے سے رعب سے باہر نکل گیا۔ ہوشیار نے ایک زوردار سلیوٹ دیا۔ کرنل صاحب جیپ میں سوار ہو گئے تو وہ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا لالہ جی نے چہرے پر خوشامد لا کر کرنل صاحب کو وداع کیا۔

"کل کا انتظار کروں گا۔ دکان آپ کی ہے۔ ضرور تشریف لائیں۔"

ہوشیار نے جیپ اسٹارٹ کی۔ صرافہ بازار میں گرد اڑاتی ہوئی جیپ چلی گئی۔ دو منٹ تک دونوں خاموش رہے پھر دونوں ایک ساتھ قہقہہ لگانے لگے۔ پہلا داؤ صحیح رہا تھا اس کی خوشی دونوں کے چہروں پر جھلک رہی تھی۔

"واہ کرنل صاحب واہ!" برابر بیٹھے ہوئے جگت کی پشت پر ہاتھ جھاڑتے ہوئے ہوشیار نے کہا۔ "کیا اداکاری کی ہے تم نے بھئی... بے چارہ جوہری بچھا جا رہا تھا۔"

"دکان آپ کی ہے۔ ضرور تشریف لائیں! کہتے ہوئے لالہ تھک نہیں رہا تھا۔" جگت نے شرٹ کے بٹن کھولے۔ "میں تو پندرہ منٹ میں بے چین ہو گیا تھا۔"

"پھر بھی تم بالکل کرنل نظر آ رہے تھے۔ بڑا رعب بیٹھ گیا تھا۔" ہوشیار پرمسرت لہجے میں بول رہا تھا۔ "اب مجھے سمجھاؤ! کہ یہ ڈرامہ کیوں کھیلا گیا؟ میں اردگرد کا جائزہ لینے کے لیے وہاں سے کھسک گیا تھا۔ لالہ مال منگوا کر رکھنے کا کہہ رہا تھا، یہ میں نے سنا تھا۔"

"بس! تو اسی لیے ڈرامہ کھیلنا پڑا۔" جگت نے کہا۔

"ہوشیار! جب ہم ڈاکہ ڈالنے آئیں، ہمیں کھرا سونا ملنا چاہیے۔ تم سمجھ رہے تھے کہ جوہری سارا مال دکان میں رکھتے ہیں مگر میرا اندازہ سچ نکلا۔ لالہ جی نے قبول کیا کہ بھاری سیٹ محفوظ جگہ رکھتے ہیں۔ میں آج یہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ کل ہم لوٹ مار کریں تو زیادہ سے زیادہ قیمتی سیٹ ہاتھ لگیں۔" ہوشیار جگت کی معاملہ فہمی پر عش عش کر اٹھا۔ "لالہ بیچارہ سب منگوا کر تیار رکھے گا اور ہم جھپٹ پڑیں گے۔ اگر میری اداکاری میں کسر رہ گئی ہوگی تو اس صورت میں گاہکوں کے پہنچنے کے بعد مال منگوائے گا۔"

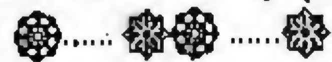
"نہیں یار! تمہاری اداکاری کھرے سونے کی طرح تھی۔" ہوشیار کو یقین تھا۔ "اب ہم کل کے لیے پھر پلان پر نظر ڈالیں۔ بازار کے راستے میں نے دماغ میں بٹھا لیے ہیں، کسے کون سی پوزیشن پر رہنا اور کام نمٹا کر فرار ہونا ہے یہ ہمیں سوچنا ہے۔"

"سب ہو جائے گا۔" جگت صافہ اتارتا ہوا بولا پھر اسے جیپ کی پچھلی نشست پر رکھتے ہوئے بولا۔ "پہلے مجھے کرنل صاحب کا لباس اتارنے دو۔"

"میری ایک بات مان جاؤ جگت! یہ بہتر رہے گا۔" ہوشیار نے جیپ کو بریک لگا کر کہا۔ "فرار ہونے کے لیے یہ جیپ بہتر رہے گی۔ دو گھنٹے میں بیج گوریا پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں ہوشیار! تم مجھ پر اعتماد کرو، میں نے تمہارے مشورے پر کافی سوچا ہے۔ جیپ سے فرار ہونے میں تیزی کے ساتھ نظروں میں آ جانے کا خطرہ زیادہ ہے۔" پھر جیپ سے اترتا ہوا بولا۔ "تم جیپ لوٹا کر آؤ! میں فوجی لباس اتارتا ہوں۔"

''بہتر......'' کہہ کر ہوشیار نے جیپ آگے بڑھادی۔
بوٹالہ کا ڈاکہ اور قتل کے بعد اس کے تعاقب میں لگی ہوئی پولیس گاندھی کے قتل کی وجہ سے دوسرے انتظامات میں پڑی ہوئی تھی۔ جوہری بازار لوٹنے کا تیزی سے پلان مرتب کرنے کی یہی وجہ تھی۔ جگت سوچ رہا تھا پولیس کو ڈاج دینے کا یہ بہتر موقع ہے۔ لالہ جی کو جو لالچ دیا گیا تھا اس سے یہی اندازہ لگایا گیا تھا کہ لاکھ روپے سے کم کا مال ہاتھ نہیں لگے گا۔ بڑا سودا نمٹنے کے خیال سے جتنے سیٹ اس کے پاس ہوں گے اس سے زیادہ سیٹ دوسرے جوہری سے مانگ لائے گا۔''لاکھ روپے!'' ہوشیار کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ ''جگت یہ کام صحیح سلامت ہوجائے تو ہمیشہ کا سکھ ہوجائے۔''
''ہوشیار! اب اندازے کے گھوڑے دوڑانا چھوڑ دو! تم کہتے تھے ایسا ڈاکہ نصف گھنٹے میں نمٹا کر فرار ہوجائیں گے۔'' پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''آج بچن بہت یاد آرہا ہے۔''
''اس ڈاکے کے بعد وہ جہاں ہوگا' وہاں ہمیں یاد کرے گا۔ فخر کرے گا کہ جگا نے نئے ملک میں جا کر لاکھ روپے پر ہاتھ مارا۔'' ہوشیار نے پرجوش لہجے میں کہا۔
وقت گزاری کے لیے یہ باتیں ہورہی تھیں۔ دوسری کوئی تیاری نہیں کرنی تھی۔ روانہ ہوتے وقت دوسرے ساتھیوں کو بتانا تھا کہ صرافہ بازار لوٹنے جارہے ہیں۔ کون کس کے سیکشن کے ساتھ فرار ہوگا؟ یہ بتادیا گیا تھا۔ اس ڈاکے کے بعد ڈھائی مہینے تک کوئی ایک دوسرے سے ملنے والا نہیں تھا یہ بھی طے ہوچکا تھا۔ اس وقت تک پولیس ان کی تلاش میں چاہے زمین آسمان ایک کردے۔



الگ الگ راستوں سے جوہری بازار میں داخل ہو کر ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ لے لی۔ چار بج چکے تھے۔ جوہری بڑی بے چینی سے ملٹری والے گاہک کا انتظار کررہا تھا۔ جگا کے ایک گھڑ سوار ساتھی پر اس کی نظر گئی اور وہ چونکا۔ اسے کچھ شک گزرا مگر اسی لمحے اس کی دکان کے قریب زبردست دھماکہ ہوا۔ بازار لرز اٹھا۔ بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کی آوازیں آنے لگیں۔ گرد اور دھوئیں سے اندھیرا سا ہوگیا۔
لوٹ مار کرنے سے پہلے جگت نے چوک میں گرینیڈ پھینکا تھا تاکہ گھبراہٹ میں لوگ ادھر ادھر بھاگ جائیں۔ جان مال سنبھالنے کے چکر میں پڑ جائیں۔ اس دوران کام ختم کیا جاسکتا تھا۔ ہوشیار اور چنا جگت کے عقب میں جوہری کی دکان میں داخل ہوئے۔ ان کی رائفلیں دیکھ کر جوہری کی آدھی جان نکل گئی۔ دکان کے ملازم جدھر سے موقع ملا فرار ہوگئے۔ لالہ جی اور اس کا لڑکا بری طرح کپکپاتے ہوئے ایک کونے میں کھڑے ہوگئے۔ ہوشیار اور چنا شوکیس توڑ کر اندر کے زیورات کے سیٹ قبضے میں کرنے لگے۔
''چنا! جو کچھ ہاتھ لگے تھیلے میں بھرتے جاؤ' اصلی نقلی پھر دیکھا جائے گا۔'' ہوشیار جلدی جلدی ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا۔ اس نے گزشتہ روز سب نظر میں رکھا تھا اس لیے کام جلدی ہورہا تھا۔ جگت دکان کے دروازے پر شیر کی طرح کھڑا تھا۔ دکانیں تیزی سے بند ہونے لگیں۔ جگت رائفل کے ٹرائیگر پر انگلی رکھ کر تیار کھڑا ہوا تھا۔ کہیں ذرا سے بھی مقابلے کے آثار نظر آئیں تو وہ اپنے ہاتھ کو حرکت دے سکے۔ دکان کے سامنے ہنس راج صراف کی دکان تھی۔ اس کے دروازے بند ہورہے تھے۔ ملازم تو بہت پہلے ہی بھاگ لیے تھے اس لیے دکان ہنس راج کو بند کرنی پڑی۔
''سالے سب بزدل ہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''دروازے کا ایک حصہ کھول کر ایک ایک چٹخنی چڑھا رہا تھا' نہ جانے اسے کیا ہوا کہ شیخی بگھارنے لگا۔ دروازے کو مکمل بند کرتا ہوا چیلنج کرنے والے لہجے میں بولا۔ ''انہیں جانے نہ دینا..... میں آرہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازہ اندر سے بند کرکے دکان میں گھسنا چاہتا تھا' اسی لمحے جگت نے فائر کیا۔ دروازہ بند کرنے والے ہاتھ کا اس نے نشانہ لیا۔ گولی بازو کے پار نکلتی ہوئی دکان کی دیوار میں شیشے کی الماری

سے ٹکرائی۔ زخمی ہنس راج نے دکان میں گھسنے کے لیے زور کیا مگر گولی کے زخم اور جھٹکے سے توازن کھو بیٹھا اور باہر الٹ گیا۔ رائفل کے دھماکے نے سب کے دل دہلا دیے۔ لالہ جی نے سامنے والی دکان کے مالک ہنس راج کو گرتے دیکھا تو اسے اپنا دل بند ہو جانے کا خوف ہوا۔ ڈاکوؤں کے فرار ہونے سے پہلے شور مچانے کی طاقت فنا ہوگئی۔ دھڑکتے دل سے وہ ہاتھ سر پر اٹھا کر دوزانو بیٹھ گیا۔ ہنس راج کی دکان کے کھلے ہوئے ایک دروازے کی جانب اشارہ کر کے جگت بولا۔

"ارے..... اب زیادہ نہیں رہا۔ سامنے والے لالہ جی کو خالی کرو! جگا کو چیلنج کرنے کی سزا اسے ملنی چاہیے۔" جمع کیا ہوا مال جگت کے سپرد کر کے ہوشیار اس طرف دوڑ گیا۔ "بہت دیر نہ لگانا۔" جگت نے تاکید کی۔ "ایسی لوٹ کے وقت آدمی کا لالچ بڑھ جاتا ہے۔ زیادہ لینے کی خواہش زور کرتی ہے اور اس میں پھنس جاتا ہے۔"

جگت چوکنا تھا' بیدار تھا۔ پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ چیخا۔ "بس کرو....."

پہلے سے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق ایک کے بعد ایک ساتھی سرکنے لگا۔ چنا نے لالہ جی کی ساری دکان صاف کر دی تھی۔ ہوشیار نے بھی سامنے والی دکان سے اتنا سامان بھر لیا تھا جتنا وہ اطمینان سے اٹھا سکے۔

"جگت کچھ دیر رک جاتا تو بہتر تھا۔" ہوشیار نے سوچا۔ وہ سامنے والی دکان میں بہت کچھ چھوڑ آیا تھا۔ اس کا اظہار اس نے جگت سے بھی کیا۔

"نہیں..... زیادہ لالچ اچھا نہیں ہوتا ہوشیار۔" جگت نے یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے تھیلا لے لیا۔ "تم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ' اس وقت تک میں دیکھتا ہوں۔" ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے ہاتھ میں لوٹ کا مال تھام کر جگا سینہ پھیلائے کھڑا تھا۔ صرافہ بازار میں سناٹا چھا گیا تھا۔ ہنس راج صراف زخمی حالت میں کراہتا ہوا اپنی دکان کے پاس تڑپ رہا تھا۔ اس کے بازو سے خون بہہ بہہ کر زمین پر دور تک پھیل رہا تھا۔ "بھاگ چلو....." جگا نے یہ کہتے ہوئے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا گرد اڑاتے ہوئے گھوڑے سنسان بازار سے نکل گئے۔

"خبردار.....!" ایک آواز سنائی دی۔ جگت اور [illegible] چونکے۔ ایک گھڑسوار تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا [illegible]

جگت نے رائفل کی نال گھما کر فائر کیا۔ گولی سوار کے شانے کے قریب سے نکل گئی۔ وہ بچ گیا [illegible] قریب سے گزرتی ہوئی گولی نے اس کی ہمت توڑ دی [illegible] ہوشیار فائر کرنا چاہتا تھا مگر جگت نے اسے روکا۔ "نہیں..... اسے نہ مارنا۔ میں نے جان بوجھ کر نشانہ خالی [illegible] ہے۔ صرف اسے خبردار کرنے کے لیے۔"

گھڑسوار کو جان پیاری تھی۔ گھوڑے کی لگام کھینچ کر لوٹ گیا۔ ڈوبتے سورج کے سامنے گرد اڑاتے ہو[illegible] جگت' ہوشیار اور چنا کے گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ دوسرے ساتھی پہلے ہی الگ الگ سمتوں میں روانہ ہو چکے تھے۔

چند ہی لمحوں میں جھڑ یالہ میں کہرام مچ گیا۔ جوہری بازار میں ڈاکہ پڑا۔ ایک صراف زخمی ہوا اور ڈاکو سونے چاندی کے زیور اٹھا کر فرار ہوگئے۔ "کون تھا؟ گنگا سنگھ کے علاوہ کوئی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔" لوگ اندازے لگانے لگے۔

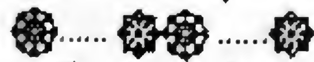
"نہیں..... کہتے ہیں دوسرے ڈاکوؤں کا گروہ تھا۔ جگا ڈاکو کا گروہ....." کسی نے کہا۔

پولیس کے آنے تک سورج غروب ہو چکا تھا۔ ڈاکہ بڑا تھا اس لیے بڑے افسران کے آنے تک پولیس والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تھے۔ جھڑ یالہ کے صوبیدار نے امرتسر کے پولیس چیف پورن سنگھ کو فون پر ڈاکے کی خبر سنائی۔ دوسری سمت سے "اوہ.....اوہ" کی آواز سنائی دی جیسے چیف کی زبان پر فالج گر گیا ہو۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"صرافہ بازار لوٹ لیا گیا۔ دن دہاڑے..... کون تھے؟ جگا کا گروہ؟ کتنا مال گیا ہوگا؟" پورن سنگھ نے پوچھا۔ مگر جواب سننے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ مخالف سمت سے صوبیدار بھی بولتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"صاحب اندازاً ڈیڑھ دولا کھ کا مال گیا ہے۔"

"ڈیڑھ دولا کھ؟" اس کی زبان پر ایک گالی آ گئی' مگر اس نے ضبط کر کے کہا۔ "تم پولیس کو دوڑاؤ' مشکوک آدمی نظر آئیں تو انہیں فوراً حراست میں لے لو...... میں آ رہا ہوں۔" اس نے ریسیور زور سے کریڈل پر پٹخا۔ "چار دن اطمینان کی سانس لی اور بدمعاش جگا زبردست وار کر گیا۔ ڈیڑھ دولا کھ...... اب اگر وہ گرفتار نہیں ہوا تو اپنی چھٹی ہو جائے گی۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔



وہ ایک گھنٹے میں کافی دور نکل گئے' پھر کھیتوں والا راستہ شروع ہو رہا تھا۔ وہاں جگت نے گھوڑے روکے۔ "بس...... اب یہاں سے ہم اپنے گھوڑے الگ کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پشت پر سے لوٹ کا مال اتار لیا۔ "سامنے والے کھیت میں گھس جاؤ۔" ہوشیار کچھ ہچکچایا۔ اس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ گھوڑوں پر ہی تیزی سے پنج گوریا پہنچ جائیں گے اور نصف شب تک کسی محفوظ جگہ چھپ جائیں گے۔ اتنا لمبا فاصلہ کیوں پیدل طے کیا جائے؟ جگت اس کا ارادہ سمجھ گیا مگر اس نے مشورہ رد کر دیا۔

"ہوشیار! تم سب کچھ میرے بھروسے پر چھوڑ دو۔ ہر گھڑ سوار پر پولیس کی نظر رہے گی۔ پیدل جانے میں کھیتوں میں کھڑی فصلوں کی آڑ ملے گی۔"

ٹھنڈی ہوا سے لہراتے ہوئے کھیتوں میں تینوں داخل ہو گئے۔ قد آدم فصل کے درمیان وہ دوڑنے لگے۔ چنا کو تو یہ سب ابھی ایک خواب معلوم ہو رہا تھا۔ کتنے بہت سارے زیورات اس نے جمع کیے تھے' زندگی میں اس نے اتنا سونا نہیں دیکھا تھا۔ سونے کا لمس پا کر اس کے جسم میں گدگدی ہوئی تھی۔

"ارے چنا! تم پیچھے رہ جاتے ہو۔ ابھی تو پانچ میل چلے ہیں اور تم ہانپ گئے ہو۔" جگت نے اسے خیالات سے بیدار کیا۔ "قدم اٹھاؤ! صبح سے پہلے ہمیں ٹھکانے پر پہنچ جانا ہے۔"

"جگت سنگھ! آپ کے ہاتھ میں دو تھیلے ہیں۔ ان میں سے ایک مجھے دے دیجیے! میں وزن اٹھا لوں گا۔" جگت کو تعجب ہوا۔

"ارے ایک تو تم پیچھے رہ جاتے ہو' پھر یہ وزن بھی اٹھاؤ گے؟"

"نہیں' یہ وزن ساتھ ہوگا تو دوڑنے میں جوش آئے گا۔ سالا اتنا بہت سارا سونا یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ یہ اپنا ہو گیا۔" چنا بچوں کی سی باتیں کرنے لگا۔

جگت نے سوچا ہر چند یہ جوان قابل اعتماد ہے پھر بھی پھنسا دے گا۔ سونے کے خیال سے وہ پاگل ہو رہا تھا۔ "یہ مال یقیناً اپنا ہوگا اگر تم صبح سے پہلے پنج گوریا پہنچ گئے۔ ورنہ......" جگت نے اس کی پشت پر دھول رسید کرتے ہوئے کہا۔ "مال اور ہم سب پولیس کے قبضے میں ہوں گے سمجھے؟" آسمان کے ستاروں کے سہارے راستہ دیکھ کر وہ مسلسل دوڑے جا رہے تھے۔ درمیان میں پانچ سات منٹ رکتے' پھر کھیتوں اور جنگلوں میں چھپتے چھپاتے چالیس میل کا فاصلہ طے کر کے وہ پنج گوریا پہنچ گئے۔ چنا سنگھ زندگی میں کبھی اتنا نہیں دوڑا تھا۔ وہ تھک کر چور ہو گیا۔ آخر میں تو اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ آخری دو میل تو اس نے جگت اور ہوشیار کے سہارے کاٹے تھے۔ گھنٹے بھر سانس لینے کے بعد چنا سنگھ نے جگت سے کہا۔

"اب تھیلے کھول کر دیکھیں! سب سونا اصلی تو ہے؟ مجھے ڈر ہے کہ سونا پیتل ہو گیا ہوگا۔ کتنے کا ملا ہوگا؟ اندازہ لگائیں۔"

"چنا! تم پاگل ہو جاؤ گے۔" جگت نے مذاق میں کہا مگر دل میں اسے ڈر تھا۔ "سونا اصلی ہے۔ اصلی سونا ہاتھ آنے کا انتظام ہم نے پہلے ہی کر لیا تھا۔" جگت نے اب بھید کھولا۔ "پیر کو میں اور ہوشیار مال پسند کرنے گئے تھے۔"

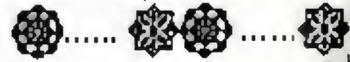
"پھر بھی مجھے تجسس ہو رہا ہے کہ ہم نے کتنے ہزار کی لوٹ کی ہے؟" چنا نے ضد کی۔

جگت کو مذاق سوجھا۔ "چنا! ایسا کر پہلے ہم کچھ پیٹ میں ڈال لیں۔ تم جو ملے وہ کسی دکان سے لے آؤ۔" چنا

جانے کے لیے کھڑا ہوا تو جگت مزید بولا۔ "اور ساتھ صبح کا اخبار بھی لے آنا۔ دیکھنا کسی کو ذرا سا بھی شک نہ ہوجائے۔ راستے میں اخبار پڑھنے کی جلدی نہ کرنا۔"

پندرہ بیس منٹ کے بعد چنا کھانا لے کر آ گیا تو جگت نے اس کی بغل سے اخبار لے لیا۔ اخبار کھول کر اس نے ایک سرخی پڑھی۔ "جگا ڈاکو نے جھڑیالہ کے صرافہ بازار میں ڈاکہ ڈالا۔ ڈیڑھ دو لاکھ کے زیورات لوٹ گیا۔ زخمی ہنس راج کا ایک ہاتھ کاٹنا پڑا۔"

"چنا! لوٹ کی رقم اخبار میں پڑھ لو۔" جگت نے مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "ڈیڑھ دو لاکھ یعنی سوا لکھ سچے......" یہ سن کر چنا کا دماغ گھوم گیا۔



فرید کوٹ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چہل پہل ہونے لگی۔ آنے والی گاڑی اگلے اسٹیشن سے چھوٹ چکی تھی۔ ہوا کے زور دار جھونکوں سے اسٹیشن کے درختوں پر لگے ہوئے پتے زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ چھوٹی لائن والے اسٹیشن کے مٹی کے تیل والے فانوس مدھم مدھم جل رہے تھے۔ سردی دور کرنے کے لیے الاؤ پر اپنے ہاتھ گرم کرنے چار پانچ مزدور بیٹھے تھے۔ ایک پولیس والا بھی ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ "ارے بیڑی دینا۔" اس نے عادت کے مطابق بیڑی مانگی۔ مزدور نے اس کی بجائے ایک سوال کیا۔

"حوالدار صرافہ بازار کے ڈاکے والا کیا ایک بھی شخص گرفتار نہیں ہوا؟"

دس قدم دور کمبل میں لپٹ کر بیٹھے ہوئے جگت کو یہ سوال ضرب لگا گیا۔ گردن گھما کر کن انکھیوں سے اس نے دیکھا' جلتی ہوئی دیا سلائی کی روشنی میں حوالدار کے حرکت کرتے ہوئے لب نظر آئے۔ "ارے اس طرح دو دن میں پکڑے جائیں تو ڈاکو کیسے؟"

مزدور کا مذاق اڑانے کو جی چاہا۔ "اس کی بجائے ایسا کہو! کہ دو دن میں پکڑیں تو ہم پولیس والے کیسے؟" حوالدار نے سر جھکا کر آس پاس کن انکھیوں سے دیکھا' پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔

"گروہ کا ایک آدمی پکڑا جائے تو پھر دیکھ لینا سب پکڑے جاتے ہیں یا نہیں۔"

"اس سے پہلے سرحد پار کر گئے پھر؟" مزدور نے الاؤ میں لکڑی رکھتے ہوئے کہا۔ "دو لاکھ کا سونا ساتھ ہے۔ پانچ ہزار خرچ کریں پھر بھی کام ہوجائے گا۔"

"ہمارا پولیس ڈیپارٹمنٹ اونگھتا نہیں ہے۔" حوالدار نے ہاتھ گرم کرکے جبڑے پر گھمائے۔ "سرحدوں پر پولیس لگا دی گئی ہے۔ سونا کتنا بھی ہو کس کام کا؟ فروخت کرنے گئے اور پکڑے گئے۔ بس اتنی دیر ہے۔" زیر لب مسکراتا اور جسم پر کمبل ٹھیک کرتا جگت دور ہٹ گیا' اپنے متعلق باتیں سننے کا لالچ اس نے روک لیا۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ پولیس نے صرافہ بازار کے ڈاکے کو عزت کا سوال بنا کر زبردست دوڑ دھوپ شروع کردی تھی۔ اس نے صبح کے اخبار میں پڑھا تھا کہ پنجاب کی تمام سرحدوں پر پہرہ قائم کردیا گیا تھا تاکہ ٹرین' کار یا پلین کے راستے ڈاکو فرار نہ ہوں۔ اس کے لیے پولیس نے پورا انتظام کردیا تھا۔ حوالدار نے کہا کہ گروہ کا ایک آدمی ہاتھ آجائے تو پورا گروہ پکڑنے کی پولیس کی خواہش تھی۔ اس نے مال اپنے' ہوشیار اور چنا کے درمیان تقسیم کرلیا تھا۔ تقریباً ساٹھ ہزار کے زیورات جگت نے اپنے پاس رکھے تھے اور تقریباً چالیس ہزار کے ہوشیار کے سپرد کیے اور تیس ہزار کا مال چنا نے رکھ لیا تھا۔ جگت نے اسے خبردار کیا تھا۔

"بچوں جیسی حرکت نہ کرنا۔ میری اجازت کے بغیر اس میں سے ایک چیز بھی فروخت کرنے نہ جانا۔" تینوں ساتھیوں کو پورے دو ماہ الگ رہنا تھا۔ دو دن گزر گئے' اسی طرح دو ماہ گزر جائیں تو پولیس کو ہمیشہ کے لیے ڈاج دینے کا آخری داؤ کھیلنا تھا۔ اس کی تیاری ہوشیار کے سر تھی۔ اس وقت تک ان سے علیحدہ رہنے کے لیے جگت نے ایک مکان تلاش کرلیا تھا۔ فرید کوٹ کی حکومت کا ابھی ہندوستان سے الحاق نہیں ہوا تھا اس لیے وہاں تک دیکھتے ہی گولی مار دینے کے سرکاری حکم پر عمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس

حسب سے جگت نے فرید کوٹ کا اسٹیشن پسند کیا۔ چندن کور کو یہاں لانے کا کام چنا کے سپرد کیا۔ جگت اسے لینے کے لیے اسٹیشن آیا ہوا تھا۔ انجن کی سیٹی سنائی دی اور اندھیرے کو چیرتی ہوئی روشنی کی لکیر نزدیک آنے لگی۔

جگت کھڑا ہو گیا۔ اس کے دل پر ایسا تاثر چھایا ہوا تھا جیسے بیاہ کر میکے گئی ہوئی بیوی پہلی بار آ رہی ہو اور مرد کا دل مسرت سے اچھلنے لگے۔ جگت جوشِ مسرت میں ڈوبا چندن کور کا استقبال کرنے فرید کوٹ اسٹیشن پر آیا تھا پھر بھی اس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ گاڑی آ کر رک گئی پھر بھی وہ سامنے نہیں گیا۔ چنا سے کہا گیا تھا۔ ''گاڑی سے اترنے کے بعد میری تلاش میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ چندن کور کے ساتھ باہر آ جانا۔ میں تم لوگوں کو تلاش کر لوں گا۔''

بوگیوں سے اترتے ہوئے مسافروں کو وہ دور سے دیکھنے لگا۔ کچھ دور حوالدر کام میں لگا ہوا تھا۔ اسے ٹرین سے آنے والے مشکوک لوگوں پر نگاہ رکھنی تھی۔ جگت نے چندن کور کو ڈبے سے باہر آتے دیکھا۔ مگر چنا کیوں ساتھ نہیں؟ جگت نے دیکھا حوالدار آگے چلا گیا ہے تو وہ چندن کور کی جانب بڑھا۔ چندن ایک ہاتھ میں کپڑوں کا بنڈل سنبھالتی ہوئی دوسرے ہاتھ سے ٹین کا صندوق سر پر رکھنے جا رہی تھی۔

''لائیے میں سامان اٹھا لوں۔ چونی دے دینا۔ آپ کو گاؤں پہنچا دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے جگت نے چندن کور کے ہاتھ سے صندوق لے لیا۔

''مجھے مزدور کی ضرورت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر چندن نے صندوق واپس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر کمبل اوڑھ کر کھڑا ہوا شخص مزدور نہیں اس کا شوہر تھا۔ یہ جان کر وہ بری طرح جھینپ گئی۔ مسرت کا جھٹکا سا لگا پھر ارد گرد نظر ڈال کر اس نے سرگوشی کی۔ ''ٹھہرو! میرا بھائی برابر والی بوگی سے آئے گا پھر دیکھیں گے۔''

یہ سن کر جگت بڑبڑایا۔ ''اس بے وقوف کو الگ بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟ عورت کے ساتھ سفر کرتا تو کسی کو شک نہ ہوتا۔''

''لو..... آ گئے۔'' کہتے ہوئے چندن مسکرائی۔ چنا نے دیکھا کہ سر پر صندوق رکھ کر جگت اسے گھور رہا تھا۔

''مزدور مل گیا؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے مسرت کا اظہار کیا۔ ''پھر اب کیا دیر ہے چلو۔''

جگت نے چندن کور کے ہاتھ سے بنڈل لے لیا اور آگے چلنے لگا۔ نصف پلیٹ فارم گزرنے کے بعد وہ چنا کے پہلو میں ہلکا سا گھونسہ مار کر بولا۔ ''گیٹ پر وہ حوالدار ہے اس سے جا کر پوچھو کہ پیر والی اِلی کہاں ہے؟'' ٹکٹیں جیب سے نکال کر چنا نے گیٹ کیپر کو دیں اور جگت کے حکم کے مطابق حوالدار سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

''چلے جاؤ سیدھے لائن پر۔'' پھر سامان اٹھا کر چلتے ہوئے جگت سے کہا۔ ''اے قلی! انہیں پیر والی اِلی لے جانا۔''

''شکریہ۔'' کہہ کر چنا آگے بڑھ گیا۔ چندن کور اس کے پیچھے چلنے لگی۔ مسافروں کی بھیڑ سے تینوں الگ ہو کر ریلوے لائن پر چلنے لگے۔ چنا بمشکل کچھ دیر تک صبر کر سکا۔ جیسے ہی تنہائی نظر آئی اس نے فوراً ہی پوچھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے حوالدار سے پوچھنے کو کیوں کہا تھا؟'' جگت نے اپنے سر سے صندوق اتار کر چنا کے سر پر رکھا۔

''سوال پوچھنے میں جلدی کر رہا ہے اس کی بجائے سامان اٹھانے کی پیش کش کرتا تو کوئی بات بھی تھی۔'' جگت نے اسے ڈانٹا۔ ''حوالدار سے چھپ کر چلتے تو اسے شک ہو جاتا۔ تم نے یہ نہیں دیکھا کہ تم سے بات کرتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں گزرنے والے مسافروں کے چہروں پر جمی ہوئی تھیں۔'' کچھ دور چلنے کے بعد جگت نے چندن کے بازو پر چٹکی لی۔ ''بی بی! سامنے جو کوٹھی نظر آ رہی ہے یہ ہمارا گھر ہے۔''

''وہاں تو فانوس جل رہا ہے۔ دوسرے لوگ بھی رہتے ہوں گے؟'' چندن نے پوچھا۔

''یہ ہمارا کام ہے کرایہ بھی نہیں دینا پڑتا۔''

چنا اور چندن کو حیرت ہوئی' جگت نے تفصیل بتائی۔ "اس طرف مسلمانوں کے مکان ہیں' وہ پاکستان چلے گئے اس لیے وہاں سے آنے والے مہاجروں کو خالی مکان دیے جارہے ہیں۔ ہماری کوٹھی ایک سرپھرے شخص کی تھی اس لیے کوئی ہمت نہیں کرتا تھا' میں نے سوچا ہمارے لیے خالی پڑی ہے' اس لیے میں نے تالا توڑا اور قبضہ کرلیا۔"

"یہاں بھی ڈاکہ ڈالنے سے باز نہ آئے۔" چندن مصنوعی غصے اور لاڈ میں بولی۔ "اس کی بجائے بستی کے درمیان کھولی کرائے پر لے لی ہوتی۔"

جگت کو جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ گھر آ گیا تو اس نے پھاٹک کھول کر کہا۔ "تشریف لایئے بیگم صاحبہ! غلام آپ کا استقبال کرتا ہے۔" اس کے مذاق سے چندن شرما گئی مگر چنا کو لطف آیا۔ اس کے دل میں بھی کوئی آرزو جاگی۔ وہ سوچنے لگا' میں بھی ایسا گھر لوں گا اور اس میں حسین عورت لے آؤں گا۔ بس اب صرف دو مہینے کا انتظار ہے۔ دس پندرہ ہزار تو میرے حصے میں آ ہی جائیں گے۔ ماں سے کہوں گا ایک اچھی لڑکی ڈھونڈ نکالے۔ پھر اس چنا سنگھ کو گھر سے نکالنا پڑے گا' مگر ماں اسے نہیں جانے دے گی پھر؟ تو پھر میں ماں کو چھوڑ دوں گا۔

"ارے..... کس کی راہ دیکھنے دروازے کے قریب کھڑا ہے؟ مجھے تیرا بھی استقبال کرنا پڑے گا کیا؟" جگت نے اسے خیالات سے بیدار کیا تو چنا کو احساس ہوا کہ وہ حسین خوابوں کی وادی میں گم ہو گیا تھا۔

"کوٹھی دیکھ کر مجھے کچھ دن رک جانے کا خیال آ گیا۔"

مگر جگت نے اسے نصف شب کی گاڑی سے لوٹا دیا۔ چندن کور کے ساتھ اسے بہت دن بعد تنہائی ملی تھی اس لیے وہ وہاں چنا کو برداشت نہیں کرسکتا تھا' پھر اس کے دن میں جانے سے کسی کی نظر میں آنے کا اندیشہ تھا۔ "دیکھنا..... حوالدار اسٹیشن پر ہو تو اس کے سامنے جانے کی ہوشیاری نہ کرنا۔ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ جانا اور ہوشیار سے کہنا کام ختم کرکے مجھ سے ملے۔"

چنا چلا گیا تو چندن نے کہا۔ "بے چارہ تھکا ہارا آیا تھا اور اسے فوراً واپس بھیج دیا۔ ایک دن رہنے دیتے تو آپ کا کیا جاتا؟"

"چندن! یہ تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔" جگت نے پیار سے اسے قریب کرلیا۔ "ایسی حسین رات خراب ہو یہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔" چندن شرما کر دور ہٹ گئی۔

"پورے مطلبی ہو۔ ڈاکہ ڈالنے سے فرصت ہوتی ہے تو بیوی یاد آتی ہے۔"

"اس وقت دور نہ رہو چندن!" جگت نے زور کرکے اسے گھسیٹ لیا۔ "اب دو ماہ میں تم سے ایک گھنٹہ الگ نہیں رہوں گا۔" چندن کے رخسار جگت کی گرم سانسوں سے سرخ ہونے لگے۔

"صرف دو مہینے..... پھر لمبی جدائی کا دکھ۔" چندن کور کے رخسار پر آنسو بہنے لگے۔ جگت کے ہونٹوں کو نمکین پانی چھو گیا۔

"تم تو رونے لگی پاگل! دو مہینے کے بعد ہمیشہ کا سکھ ہو جائے گا۔ میں اور ہوشیار اسی کے چکر میں ہیں۔"

"کیا ڈاکہ ڈالنا چھوڑ دو گے؟" چندن کے بہتے ہوئے آنسو رک گئے۔

"ڈاکہ چھوڑنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ ملک ہی چھوڑ دیں گے۔" جگت نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"اسی لیے جوہری بازار لوٹنے کا خطرہ مول لیا تھا؟" چندن بولی۔ ملک چھوڑ جانے کی بات سے چندن کو جھٹکا سا لگا۔ "اس کا مطلب ہے ہمیشہ کے لیے ماں باپ سے الگ ہونا پڑے گا؟" یہ کہہ کر چندن بیٹھ گئی جگت کو تعجب ہوا۔ اس نے سمجھا وہ ناراض ہو گئی ہے۔

"تم پوری بات سنو!"

"میرا دل گھبرا رہا ہے ٹھہرو میں آرہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوئی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ جگت کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اسے غصہ آ گیا۔ دیر یاد آئی۔ "وہ سب

چھوڑ کر میرے ساتھ چل دی تھی اور یہ......" مگر وہ آگے نہ سوچ سکا۔ اسے چندن کی ابکائیاں سنائی دے رہی تھیں۔ جگت فانوس لے کر اندر پہنچ گیا۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" وہ اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

"ابھی کچھ دن سے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔" چندن کور نے کلی کر کے کہا۔ پھر جگت کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ "مگر تم نے میری طبیعت پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔"

"اب دو ماہ میں دیکھنا کیسی ٹھیک کر دیتا ہوں۔" جگت نے اس کے بالوں کی لٹ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "تم کہو گی تو ڈاکٹر کو روز وزٹ پر بلائیں گے۔"

"تمہارا ڈاکٹر کیا کر سکے گا؟" وہ جگت کو تعجب سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "یہ روگ ڈاکٹر سے اچھا نہیں ہوگا۔ دن بدن بڑھتا جائے گا۔"

اب جگت کو فکر ہونے لگی۔ "اس کا مطلب ہے تم بیماری سے واقف ہو۔ کیا بیماری ہے تمہیں چندن؟" جگت نے بھاری آواز میں کہا۔ "تم فکر نہ کرنا...... میں ہزاروں روپے خرچ کر کے تمہیں صحت مند بنا دوں گا۔" اس کی آواز بھیگ گئی۔ بالکل بچوں کی طرح چندن کو اب اس پر رحم آنے لگا۔

"کچھ روگ مٹانے کے لیے نہیں ہوتے۔"

"تم مجھ سے گول باتیں نہ کرو چندن! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ کیا بیماری ہے یہ بتاؤ!" جگت غصے میں بول رہا تھا پھر بھی چندن کو اس کی پروا نہیں تھی۔ باورچی خانے کی چھت پر اس کی نظر گئی۔

"وہاں کیا نظر آرہا ہے؟"

"پالنا...... مگر اس سے تمہاری بیماری کا کیا واسطہ؟" جگت بور ہو کر بولا مگر اچانک اس کا دماغ روشن ہو گیا۔ وہ پالنے سے نظر ہٹا کر چندن کو دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا تھا جیسے اس کے دل کو یقین نہ آرہا ہو۔ وہ فانوس کی لو بڑھا کر غور سے چندن کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کتنی معصومیت آگئی تھی؟ لرزتے ہوئے گلابی ہونٹ سرخ دہکتے ہوئے رخسار، چمکتی خوب صورت آنکھیں جن میں پیار جھلک رہا تھا۔ جگت کو اس کے چہرے میں دوسرا معصوم چہرہ نظر آیا۔

"کیا سچ کہتی ہو چندن......؟" یہ سوال اس کے وجود سے اٹھ رہا تھا اور جواب سننے کے لیے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ چندن نے صرف نظر سے اثبات میں جواب دیا۔ جگت مسرت سے دیوانہ ہو گیا۔ "تم نے اب تک کیوں نہیں بتایا؟" فانوس زمین پر رکھ کر اس نے چندن کور کو دونوں ہاتھوں میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ارے......ارے......" اس نے احتجاج کیا مگر پروا کیے بغیر وہ اسے گود میں لے کر گھومنے لگا جیسے ساری دنیا کو گود میں اٹھا کر گھوم رہا ہو وہ ایسی ہی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

"میں باپ بن جاؤں گا...... باپ بن جاؤں گا۔" جگت مسرت سے چیخ رہا تھا اور چندن اسے روک رہی تھی۔

"اب بس بھی کرو! مجھے چکر آرہے ہیں۔ تمہیں ہوش ہے یا نہیں؟ مجھے کچھ ہو جائے گا۔" چندن کی بات سن کر جگت کا جوش قابو میں آگیا۔ ہانپتے ہوئے اس نے چندن کے رخسار پر بوسہ دیا۔

"میں آج بہت خوش ہوں چندن! کہو...... اس خوشخبری کے بدلے میں تمہیں کیا دوں؟"

"پہلے مجھے نیچے اترنے دو۔"

"نہیں...... پہلے تم مانگو! جو جی چاہے وہ مانگ لو! آج میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہے۔" چندن نے دیکھا اس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے تھے۔

"تم باپ بن جاؤ اس وقت مانگوں گی۔" چندن جگت کی گردن میں لٹکتے ہوئے تعویذ سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "ابھی سے مانگ کر میں سکھ سے الگ نہیں ہونا چاہتی۔"

"نہیں چندن! میں اس لمحے کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں بسا لینا چاہتا ہوں۔ جب تک کچھ نہیں مانگو گی اس وقت تک تمہیں نیچے نہیں اتاروں گا۔"

"اور میں وہ مانگوں گی کہ آپ کا دینے کے لیے دل نہیں کرے گا۔" اب بھی اس کی انگلیاں تعویذ پر گھوم رہی تھیں۔

"تم مجھے پریشان نہ کرو چندن! تمہارا شوہر ڈاکو ہے یہ

تم جانتی ہو۔ سنت اور ڈاکو وچن دے کر انحراف نہیں کرتے۔" وہ چندن کو اوپر اٹھا کر اس کے ہونٹ چومتا ہوا بولا۔ "ہمارے ہونے والے بچے کی قسم جو چاہو مانگ لو۔"

"مجھے دبا کر رکھ دیا ہے۔" یہ کہہ کر چندن نے اپنا چہرہ ہٹالیا پھر ہونٹ اس کے کانوں کے قریب لے جا کر دھیمے لہجے میں بولی۔ "ضد کررہے ہو تو میں مانگ رہی ہوں کہ جس ڈاکے کی زندگی پر تمہیں فخر ہے اسے چھوڑ دو۔" چندن کور کے الفاظ جگت کے کان میں ہو کر ذہن میں چکرانے لگے۔ لمحے کے لیے اسے محسوس ہوا کہ چندن نے یہ کیا مانگ لیا؟

"یہ میں نے تم سے اپنے ہونے والے بچے کے لیے مانگا ہے۔" چندن شوہر کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھتی ہوئی بولی۔ "کسی کی آہ اسے نہ لگے اس لیے......" چندن نے محسوس کیا کہ جن ہاتھوں پر وہ بلند تھی ان ہاتھوں کا زور آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔

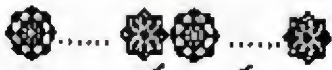
"تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟" چندن گھبرا گئی۔ "اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو میں معافی مانگ کر واپس لیتی ہوں۔" مگر جگت نے اسے زیادہ نہیں بولنے دیا۔ دونوں ہاتھ وزن اٹھا رہے تھے اس لیے اس نے لبوں پر لب رکھ دیئے اور انجانے میں اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ اس کے گرم آنسوؤں سے چندن کے رخسار بھیگنے لگے۔

"مجھے سودا منظور ہے۔ اولاد کے لیے میں یہ زندگی چھوڑ تا ہوں۔ اب مجھے بتاؤ ڈاکو ختم ہو کر باپ کب بنے گا۔"

"ابھی سات ماہ کی دیر ہے۔" چندن نے پیار سے آنکھیں جھپکائیں۔ "اب مجھے نیچے اتارو! اس طرح اٹھا کر تمہارے ہاتھ دکھ جائیں گے۔" جیسے کسی بچے کو اٹھا رہا ہو اس طرح جگت نے اسے اندر لے جا کر بستر پر ڈال دیا۔

"پھول کی طرح معلوم ہوتی ہو۔" یہ کہہ کر جگت اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا جیسے وہ آنے والے بچے پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔

"اے بھگوان اب تک بہت سارے دکھ برداشت کرتی آئی ہوں......" چندن کور دل میں دعا کر رہی تھی۔ "اب جب دینے پر آیا ہے تو دونوں ہاتھوں سے سکھ دینا۔ کہیں ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے چھین لینے کا کھیل نہ کرنا۔"



پہلے صرف دو مہینے گزر جائیں اس کے انتظار میں رہنے والا جگت اب سات مہینے جلدی بیت جانے کا انتظار کرنے لگا۔ جب سے باپ بننے کی اطلاع ملی تھی، دن رات اس کے خواب وخیال میں چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیروں والا توتلی زبان میں بولتا ہوا ہنستا روتا ایک بچہ کھیلنے لگا۔

ڈیڑھ ماہ گزرنے کے بعد ہوشیار ایک بار ملنے آیا...... "جگت! پوری تیاری ہوگئی ہے۔ پہلے میں کلکتہ جا رہا ہوں۔ کرتارا نے سارا انتظام کر دیا ہے۔ مال لے جانے والے ٹرک میں بیٹھ جاؤں گا۔ وہاں جا کر سنگاپور جانے والے بحری جہاز میں ملازمت مل جائے گی۔ اس کے بعد فوراً تمہیں بلالوں گا۔" جگت نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

"ہوشیار! آہستہ بول۔ چندن کور کو اس بات کا پتہ نہیں چلنا چاہیے۔"

"کیوں...... بھابی کو ساتھ نہیں لو گے؟"

"نہیں اب وہ جا نہیں سکے گی۔" جگت نے اس کے کان میں کہا۔ "میں اب چھ ماہ میں باپ بننے والا ہوں۔"

"اچھا......؟" ہوشیار جھوم اٹھا۔ "یہ خوشخبری میرے لیے سوا لاکھ کے ڈاکے سے بڑی ہے یار! ہمیں بھی کوئی چاچا کہہ کر پکارنے والا ہو تو کس قدر لطف آئے۔" جگت کا جی چاہا کہ کہہ دے باپ بننے کی مجھے بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے ہوشیار! اپنے اندر کے ڈاکو کو مارنا پڑے گا۔ مگر ہوشیار سے یہ بات کہنے کے لیے اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ اس نے سب سوچ رکھا تھا۔ بچپن کی طرح ہوشیار کو بھی جدا کرنا تھا۔ اس کے لیے اس نے تھوڑی بناوٹ کی۔

"تم اپنے حصے کا تمام مال لے جانا۔ وہاں فروخت کرنے میں آسانی رہے گی۔" پھر کھنکھار کر بولا۔

"میرے انتظار میں کلکتہ نہیں رکنا۔ سنگاپور میں ہم ملیں گے۔"

ہوشیار کو کچھ شک ہوا "جگت بھابی کی زچگی تک یہیں رکو گے؟"

"ارے یار! تم مجھے دائی سمجھ رہے ہو؟" جگت نے بات مذاق میں اڑا دی۔ "زچگی کا فائدہ ساس کو پہنچے گا۔"

"ارے ہاں...... میں کہنا بھول گیا بھئی!" ہوشیار نے کہا۔ "چنا سے ملا تھا تو اس نے خبر دی تھی کہ تمہارے باپو الور روانہ ہو گئے ہیں۔ سرکار نے مہاجروں کو کرنال میں زمین دی ہے۔ اس لیے نانا وہیں رہیں گے۔"

"ہوشیار! چنا کا اس کی ماں سے کیسا برتاؤ ہے؟"

"وہ انتظار کر رہا ہے جیسے ہاتھ میں آئیں اور وہ چنا سنگھ کو اپنی ماں سے الگ کر دے۔" جدا ہوتے ہوئے اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ جگت اسے چھوڑنے اسٹیشن تک گیا۔

"کسے پتہ پھر کب ملیں گے؟" جگت نے دل ہی دل میں سوچا۔ ہوشیار نظر سے دور ہوا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں......!

❁......❁❁......❁

مارچ گزر کر اپریل آ گیا...... چندن کور سے جگت نے گھر خط لکھوایا۔

"بہو کو اٹھے دن لگ چکے ہیں۔ خط ملتے ہی آ کر لے جانا۔"

بیساکھی کو دس دن کی دیر تھی۔ ایک رات تقریباً نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ جگت چونکا۔

"کون ہوگا؟" اس نے بستر کے نیچے سے گن نکال لی۔ "چندن! تم اندر والے کمرے میں چلی جاؤ۔" یہ اشارہ کر کے اس نے آواز بدل کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں کرتارا سنگھ۔" جواب ملا تو جگت نے اطمینان کی سانس لی۔

پھر بھی وہ گن تھامے ہوئے تھا۔ "کرتارا! تم اس وقت؟ اس طرح اچانک......"

"خاص کام سے آیا ہوں۔ وہ جگت کی گن پر نظر رکھ کر بولا۔ "مگر پہلے بھابی! کچھ کھانے کو دو! جو بھی تیار ہو۔ مجھے واپسی گاڑی سے جانا ہے۔ جگت کو ساتھ لے کر۔"

چندن کور چونکی۔ جگت بھی اسے دیکھنے لگا۔ ضرور کوئی مصیبت آئی ہے۔ نہیں تو کرتارا اس طرح اچانک نہ آتا۔ اس نے سوچا کیا ہوشیار فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا؟ جو کچھ حاضر تھا چندن کور نے کھانے کو دیا۔ کھاتے ہوئے کرتارا کہنے لگا۔

"ہوشیار بحفاظت پہنچ گیا۔ اس کی خبر کلکتہ سے آ گئی ہے۔"

"کرتارا! یہ خبر دینے کے لیے یہاں تک تم نے پریشانی اٹھائی۔" جگت کو اب بھی بے چینی تھی۔ ممکن ہے چنا سنگھ نے کچھ گڑبڑ کر دی ہو۔

"نہیں جگا! میں اپنے کام سے آیا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "ہماری زمین کا ایک شخص سے جھگڑا پڑ گیا ہے۔ میں اسے قتل کرنے کی دھمکی دے کر آیا ہوں۔ اس لیے تمہیں ساتھ لے جانا ہے۔" جگت ہنسا مگر چندن کور کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ "بھا جی ایک دن کے لیے بھائی کو لے جاؤں؟" اس نے ویسے تو پر مذاق لہجے میں کہا مگر چندن کور اداس رہی۔

"نہیں کرتارا بھائی! تمہاری اور ان کی دوستی میں جانتی ہوں۔ پھر بھی منع کر رہی ہوں۔"

"دوستوں کے معاملے میں دخل اندازی نہ کرو چندن!" جگت جذبات میں بول گیا۔ "تمہیں پتہ نہیں کرتارا کے ہم پر کتنے احسان ہیں۔ اس کی خاطر ایک آدھ قتل کرنا پڑے تو......" مگر وہ اچانک رک گیا۔ چندن کور آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس میں سے غصہ کی چنگاریاں بکھر رہی تھیں جیسے جگت کو یاد دلایا ہو کہ ابھی کچھ دن پہلے ہونے والے بیٹے کی قسم کھائی تھی اور اب......

"کرتارا! اگر میرے بغیر کام چل جائے تو میری گن لے جاؤ۔" جگت کے اچانک پلٹنے پر کرتارا چونکا۔ "میں آؤں گا تو ایک دو شوٹ کر دوں گا۔" کرتارا خاموش رہا۔

جگت نے بچاؤ کا دوسرا بہانہ کیا۔ "اوہ ..... کل بیح ایک بیوپاری آنے والا ہے مال کا سودا کرنے۔" وہ اس طرح بولا جیسے کرتارا کو منا رہا ہو۔ "دوست! چار چھ دن رک جاؤ! مال کے پیسے کرلوں، تمہاری بھابھی کو گھر بھیج دوں، پھر ہم ساتھ جائیں گے۔"

"نہیں جگا! مجھے اپنی گن دے دو۔ یہ کافی رہے گا۔" کرتارا مان گیا۔ اس سے جگت کو تعجب ہوا۔ "میں دو دن میں تمہیں لوٹا دوں گا۔"

دونوں نے ہنس کر کرتارا کو الوداع کیا۔ چندن نے سوچا کرتارا کے جانے کے بعد جگت خفا ہوگا مگر اس کی بجائے جگا مذاق میں بولا "دوست کے سامنے میری عزت گھٹا دی تم نے۔" چندن کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس پر جھک گیا۔ "اچھا ہوا تم نے مجھے روک لیا اگر جاتا تو کچھ الٹا سیدھا کر کے واپس آتا۔" خوش ہوتی ہوئی چندن نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔

"میں زیادہ خوش اس لیے ہوئی کہ میری رقیب گن آپ نے اسے دے دی۔ آپ اسے ایک پل پہلو سے الگ نہیں کرتے تھے۔" دونوں بہت خوش تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ صبح کیا ہونے والا ہے.....؟؟

جگت آج جلدی بیدار ہوگیا۔ شاید بیوپاری پیسے لے کر آنے والا تھا، لہٰذا اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا رہا۔ چندن کا بستر خالی تھا۔ اس نے آواز دی۔

"چندے..... میرے لیے چائے بنا لانا۔"

غسل خانے میں نہاتی ہوئی چندن کی آواز آئی۔ "میں نہا لوں..... اتنی دیر رکو۔" جگت نے جماہی لی، دو ماہ سے آرام کی زندگی گزر رہی تھی۔ چائے کا کپ ملنے کے بعد ہی وہ بستر چھوڑتا تھا۔

چندن ٹوکتی۔ "گھر میں بیٹھے بیٹھے سیٹھ بن گئے ہو۔ آرام کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"اتنے سال آرام نہیں ملا اس لیے ایک ساتھ وصول کر رہا ہوں۔" جگت جواب دیتا۔

چائے آنے تک وہ سو جائے یا نہیں، وہ اسی الجھن میں تھا کہ اس نے کمرے کی کھڑکی میں کوئی سایہ سا کھڑا پایا جیسے کوئی ادھ کھلی کھڑکی سے اندر دیکھ رہا ہو.....!

"کون ہے.....؟" جگت نے کہا۔

جواب میں کھلی کھڑکی سے اسٹین گن کی نال اس کی جانب منہ کیے نظر آئی..... وہ گھبرا گیا۔ اس نے چارپائی سے کودنے کے لیے سوچا ہی لمحے آواز آئی۔ "خبردار جگا! ذرا بھی چالاکی کی کوشش نہیں کرو گے۔" جگت کا جسم لرز گیا۔ اسے اب خیال آیا کہ اس نے اپنی گن کرتارا کو دے دی تھی۔ اور وہ بغیر اسلحہ کے ہوگیا تھا۔

"کون..... رام سنگھ؟" وہ ہمت کر کے بولا۔

"نہیں ..... پورن سنگھ۔" خاکی وردی میں ملبوس پولیس چیف نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ "جگا! اب تم گھیر لیے گئے ہو۔" تقدیر کی کرامت پر پھنسا ہوا جگت مسکرایا۔

"پھر صاحب آ کر گرفتار کر لو۔ انتظار کس بات کا ہے؟"

پورن سنگھ کو حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا تھا پھنسا ہوا جگا بپھر جائے گا، فرار کی کوشش کرے گا، اسلحہ استعمال کرے گا۔ اس کی بجائے وہ اسے اس طرح خوش اخلاقی سے اندر بلا رہا تھا جیسے وہ اس کا مہمان ہو۔ "جگا! تم کسی چال بازی کی کوشش نہیں کرو گے۔" اس نے پھر اسے خبردار کیا۔ "ورنہ جان گنواؤ گے۔"

"آپ نے دوسری بار مجھے خبردار کیا ہے چیف صاحب!" جگت کا اطمینان قابل تعجب تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں تو کوئی چالاکی نہیں آزما رہا۔ آپ کامیاب ہوئے ہیں اندر آئیں! چائے پی کر ہم چلتے ہیں۔"

"نہیں جگا! تم اب تک پولیس کو کئی چکر دے کر فرار ہو چکے ہو۔ پورن سنگھ کے چہرے پر فتح کی مسکراہٹ تھی۔

"اب تم کامیاب نہیں ہو گے۔ اپنا اسلحہ پھینک دو۔"

جگت نے چادر کے نیچے سے اپنے دونوں ہاتھ باہر نکالے۔ اسی لمحے پورن سنگھ نے اپنا سر آڑ میں کر لیا۔ اسے ڈر لگا ممکن ہے جگا فائر کر دے۔ جگت پھر ہنس دیا۔

"صاحب! میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں، پھر ڈرتے

کس لیے ہو؟"

"کہہ رہا ہوں کھڑے ہو کر باہر آجاؤ۔" پورن سنگھ کو ڈرنے والی بات ہتک آمیز معلوم ہوئی۔ وہ بگڑ گیا۔ "میرے ساتھ زبان درازی کرو گے تو پھونک دوں گا۔ شوٹ ایٹ سائٹ کے آرڈر کا تمہیں پتہ ہے۔"

"پورن سنگھ! تمہاری جیت ہوئی ہے پھر کیوں بگڑ رہے ہو؟" جگت اب ضد پر آ گیا "میں کھڑا ہو کر تمہارے پاس نہیں آؤں گا، تمہیں مجھے پکڑنا ہے تو اندر آنا پڑے گا۔"

"کمال ہے...... تمہیں موت کا خوف نہیں؟"

"نہیں صاحب! آپ فرید کوٹ میں اس آرڈر پر عمل نہیں کر سکیں گے اس کا مجھے یقین ہے۔"

"تم بہت پکے ہو۔ اس حکومت میں تمہیں شوٹ کرنے کے ہمیں اختیارات نہیں اسی لیے تم یہاں چھپے ہوئے تھے۔" پورن سنگھ یہ کہہ کر مسکرا دیا۔

"جی ہاں صاحب! اب یہ بتائیں کہ آپ نے یہاں کا پتہ کیسے معلوم کر لیا؟"

"یہ سب راستے میں بتاؤں گا۔ پہلے گرفتار ہو جاؤ۔"

یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ چندن کور نے باورچی خانے کا دروازہ کھولا۔ سامنے ہاتھ میں گن لیے پولیس چیف کو دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔

"بہن! آپ گھبرائیں نہیں۔ ہم جگا کو کچھ نہیں کہیں گے، آپ اسے سمجھائیں یہ خود کو قانون کے سپرد کر دے۔" پھر باورچی خانے کی کھڑکی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "آپ خود دیکھ لیں! سارے مکان کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ چھت پر بھی پولیس موجود ہے۔"

پولیس کا گھیرا دیکھ کر چندن کور کو پسینہ آ گیا۔ اسے ڈر لگا کہ جگت گرفتار نہیں ہوا تو گولی چلا کر اسے مار دیا جائے گا۔ "صاحب! یہ سچ کہہ رہے ہیں، ان کے پاس اسلحہ نہیں ہے۔ آپ کمرے میں آ کر بے دھڑک انہیں گرفتار کر لیں۔" چندن نے کہا۔ اس کے باوجود پورن سنگھ ہچکچا رہا تھا۔ اس لیے چندن نے روتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ہونے والے بچے کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ یہ کوئی چالاکی نہیں کریں گے۔"

یہ سننے کے بعد پولیس چیف کو کچھ یقین آیا۔ وہ آہستہ مگر چوکنے انداز میں قدم بڑھاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ جگت اب بھی ہنس رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا لیے تو پورن سنگھ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "صاحب اتنا نہ گھبرائیں۔ میں نے تو ہتھکڑی پہننے کے لیے ہاتھ بڑھائے ہیں۔" جیب سے ہتھکڑی نکال کر پولیس چیف نے اسے پہنا دی۔

"چلو...... اب آگے بڑھو!"

"صاحب! چائے پی کر چلیں گے پھر آپ کہاں میرے مہمان بنیں گے؟" اس نے ہتھکڑی بجاتے ہوئے کہا۔ "چائے پیے بغیر سستی ختم نہیں ہوگی۔"

پورن سنگھ اب بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ خطرناک ڈاکو جگا اس کے ہاتھوں گرفتار ہوا ہے۔ اس نے گھر میں ایک نظر ڈالی۔ دوسرے پولیس والے بھی اندر آ چکے تھے۔ وہ ان سے بولا۔ "تلاشی لو! دیکھو کوئی اسلحہ یا چوری کا مال ہو تو ساتھ لے چلو۔"

چندن کور چائے کے دو کپ لے آئی۔ جگت نے اس کی جانب دیکھا مگر چندن اس سے نظریں نہ ملا سکی۔ پورن سنگھ کی نظر چندن کور کے کان میں لٹکے ہوئے بندوں پر گئی۔ "بہن! آپ کو اپنے کان سے بندے اتارنے پڑیں گے۔ لوٹ کا مال ہے یا نہیں، اس کا یقین کرنے کے لیے ہمیں یہ ساتھ لے جانے پڑیں گے۔"

چندن نے جگت کی جانب دیکھا، اس نے اثبات میں سر ہلایا، اس لیے اس نے فوراً بندے کانوں سے نکال کر چیف کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ جگت کو اتنا اطمینان تھا کہ گھر میں زمین میں دبایا ہوا سونا پولیس کے ہاتھ نہیں لگے گا۔ پھر یاد آیا کہ وہ بیوپاری آنے والا تھا۔ ممکن ہے جلدی آ جائے پھر پول کھل جائے گا اور مال پکڑا جائے گا۔

"چلو صاحب! چائے کے دو تین گھونٹ جلدی سے حلق کے نیچے اتار کر جگت کھڑا ہو گیا۔ "اب تمہارا مہمان بن گیا ہوں۔" جانے سے پہلے جگت نے آخری بار چندن

پر نظر ڈالی۔ "ہمت رکھنا۔" اتنا کہا۔ اس کے الفاظ نے چندن کی آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسو روک لیے۔ اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ شوہر کو الوداع کہا۔ چندن کور نہیں روئی البتہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیٹ میں پلنے والا بچہ چیخ چیخ کر رو رہا ہے......!

❁......❁❁......❁

"بیٹا! ابھی تمہیں ملازمت نہیں ملی؟" چنا کی ماں پوچھ رہی تھی۔ "پہلے ہر پندرہ دن یا ایک ماہ میں بمشکل منہ دکھانے آتا تھا مگر اب دو ماہ سے مسلسل گھر میں پڑا رہتا ہے۔" چھت کو گھورتے' چارپائی پر لیٹے ہوئے چنا نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ خاموش رہا۔ ماں نے بیٹے کی جانب دیکھا وہ کسی سوچ میں ہونٹ چبا رہا تھا۔

"کس الجھن میں ہے چنا؟" ماں کی یہ دخل اندازی اسے پسند نہ آئی۔ وہ کیسے خیالات میں گم ہے' ماں کو تو بڑبڑانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اب تھوڑے دن میں اس کی بڑبڑاہٹ بند ہو جائے گی۔

"بس...... اب تھوڑے دن۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیا بڑبڑا رہا ہے چنا؟" ماں نے سوچا آج کل بیٹا بیکار ہو گیا ہے اس لیے اداس ہے۔ "میں کہتی ہوں چھوٹا بڑا کام کرتے رہو! دو پیسے بنا لے تو گھر میں بہو لے آؤں۔" دو ماہ میں بارہویں بار ماں یہ بات کہہ رہی تھی۔ چنا کو ہر بار کہہ دینے کی خواہش ہوتی۔

"ارے ماں اب زندگی بھر مزدوری نہیں کرنی پڑے گی' اتنا کما لیا ہے تیرے بیٹے نے۔ بہو کو ساری ڈبو دیں اتنا زیورات اور سونا چھپایا ہے۔ بس مال فروخت کر دوں اتنی دیر ہے۔"

مگر ماں سے کچھ کہنے کے لیے زبان نہیں کھل رہی تھی۔ اسے اپنے سامنے دو ڈراؤنی آنکھیں گھورتی دکھائی دیتیں۔ "دیکھنا! بچے کی طرح بک نہ دینا۔ میری اجازت کے بغیر مال کو ہاتھ نہ لگانا۔ تیری وجہ سے کچھ ہوا تو......" جگا کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ چنا دل کی بات ماں سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ مگر آج اس کا دماغ گھوم گیا ضبط ٹوٹ گیا۔

"بہو لانے کی بڑی تمنا ہے ماں؟"

"بہو لانے کے ارمان کس ماں کو نہیں ہوتے چنا؟"

اس نے سوچا بیٹا کچھ پگھلنے لگا ہے۔ لہٰذا اسے اور جوش میں لانا چاہیے۔ "ابھی دو دن پہلے اپنی برادری کی ایک لڑکی دیکھی ہے۔ میرا دل موہ لیا اس نے۔" پھر آہ بھر کر بولی۔ "مگر ہائے رے...... ہمارے نصیب میں ایسی بہو کہاں؟"

"کیوں ماں نصیب میں کیا برائی ہے؟" لڑکی کی تعریف سن کر چنا پگھلنے لگا۔ "جاؤ! جا کر رشتہ کر آؤ۔" تب ماں نے محسوس کیا لڑکا واقعی بک رہا ہے۔

"بیٹا! بہو اس طرح مفت میں نہیں آتی۔ زیورات چڑھانے پڑتے ہیں۔ اور بیٹی کا باپ کام دھندے کے بغیر کسی لڑکے کو اپنی لڑکی کیسے دے سکتا ہے؟"

"کتنے زیورات چاہئیں ماں؟" چنا سنگھ کی آواز میں غرور جھلک رہا تھا۔ "لڑکی کے باپ نے کبھی دیکھے بھی نہیں ہوں گے' ہم اتنے زیورات چڑھائیں گے۔"

"ہائے ہائے......" ماں نے سر پیٹ لیا۔ "ارے تجھے کچھ ہو گیا ہے۔" پھر اٹھ کر فکرمندانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھر چنا نے جیکٹ کی جیب سے ایک چیز نکال کر ماں کی ہتھیلی پر رکھی تو اسے محسوس ہوا کہ خود اس کا جسم گرم ہو گیا ہے۔ پیلی چمکتی ہوئی چیز دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یہ کیا......؟"

"یہ سونا ہے...... بالکل کھرا سونا ماں۔" چنا یہ الفاظ کہنے کے لیے کتنے دنوں سے اندر ہی اندر دہک رہا تھا۔

"کہاں سے چوری کی......؟" وہ زیادہ پوچھ نہ سکی۔ اب بھی نظر ماننے کو انکار کر رہی تھی۔ شاید اسے بنا رہا ہو گا۔

"ہاہاہا......" چنا نے قہقہہ لگایا جیسے وہ اس لمحے لڑکے سے مرد بن چکا تھا۔ "ماں! ابھی تو یہ صرف ابتداء ہے۔" ماں کبھی سونے کو تو کبھی لڑکے کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

"چنا! تم مجھ سے سیدھی بات کرو! میرا دل کانپ رہا ہے۔ میں یہ بھید برداشت نہیں کر سکتی۔ تم پر کوئی آفت آئی تو میں کیا کروں گی؟" ماں کا چہرہ بدلنے لگا۔ وہ کپکپاتی

ہانپتی پسینے سے تر ہوگئی۔ تب چنا گھبرا گیا۔ اس نے نصف بات کہہ کر مصیبت مول لے لی تھی۔

"ماں! کسی سے کہنا نہیں۔ یہ محنت کی کمائی ہے۔ میرا دوست جگت سنگھ جگا ہے۔ اس کے ساتھ مل کر پارٹنر شپ میں دھندا کیا اور پہلے دھاکے میں لمبا نفع ہوا۔ میرے حصے میں دس پندرہ ہزار آئے ہیں۔" ماں کو اب سکون ہوا۔ سونے کا لمس اسے پیارا لگا۔ بیٹے کے نصیب نے زور کیا۔ اس جاہل عورت کو اور کوئی خیال نہ آیا کہ دھندا کرنے والا بیٹا گھر میں کیوں پڑا ہے؟ دس پندرہ ہزار کی بجائے گھر میں دس پندرہ روپے کیوں نہیں ہیں؟ وہ مسرت کے جوش میں جوان بیٹے سے لپٹ گئی۔

"اب میں دھوم دھام سے شادی کروں گی اپنے بیٹے کی۔ سونے کی قدموں والی بہو گھر میں لاؤں گی۔"

"نہیں...... اس گھر میں نہیں۔ ایسی تنگ کھولی میں نہیں ماں......" چنا جس خواب کو اتنے دن سے ذہن میں پال رہا تھا' اسے کہنے لگا۔ "ہمارے اپنے مکان میں بہو کے قدم آئیں گے۔" بیٹے کے الفاظ میں ماں کو جنت نظر آنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ اتنا بڑا سکھ وہ برداشت نہیں کر سکے گی۔

"بیٹا! آج تیرا باپ ہوتا تو......" ماں کی آنکھیں بہنے لگیں۔

"باپو ہوتے تو......" بیٹے نے ماں کی آہ کے مقابلے میں بھی آہ کھینچی۔ "میرے باپو ہوتے تو وہ کمبخت اس گھر میں داخل نہ ہوتا۔" یہ سن کر ماں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بیٹے کی آنکھیں نفرت سے ابل رہی تھیں۔ "ماں! اتنے عرصے میں نے صبر کیا ہے' اب تمہیں دونوں میں سے ایک کے درمیان فیصلہ کرنا پڑے گا۔"

ماں بیٹے کی نظریں ٹکرائیں دونوں اس بات سے لاعلم تھے کہ پنا سنگھ دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہوا تھا۔ چنا نے اسے کمبخت کہا تو اس نے دانت پیس لیے۔ اس کا جبڑا توڑ دینے کے لیے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگی مگر پرم جیت کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے سونے نے اسے خاموش رکھا۔

اس سونے کا راز جاننا ضروری تھا۔ "بیٹا چنا! اس طرح جذباتی نہ بنو۔ تم جس سے نفرت کرتے ہو اس نے ہمیں آسرا دیا۔ عین موقع پر مدد کی۔ اسے گالی دینا انسانیت نہیں۔"

"ماں! اس کی مدد کے پیچھے مطلب تھا۔ وہ تمہارے حسن کا بھوکا تھا۔ تمہاری جوانی کا لالچ تھا اسے۔"

"چنا......!" ماں چیخ اٹھی۔ مگر چنا نے اس کی پروا نہیں کی۔

"آج مجھے بول لینے دے ماں! میں نے کتنی راتیں کروٹیں بدل کر کاٹ دی ہیں۔ پنا سنگھ جس طرح بے ہودگی سے تم کو دیکھ کر ہنستا ہے' دوسرے لوگوں کے سامنے میرے مرحوم باپ کا مذاق اڑاتا ہے' مجھے وہ زخم آج تمہیں دکھانے ہیں۔" ماں سر جھکا کر روتی رہی' کپکپاتی رہی۔ ہاتھ کی مٹھیاں بھینچتی رہی۔ جذبات میں اور پسینے سے تر چنا' ماں کی ممتا اور پنا سنگھ سے نفرت کے درمیان پس رہا تھا۔ کہنے بیٹھا ہوں تو آج سب کچھ کہہ دوں اس جذبے سے وہ بلند آواز میں بولا۔ "اور سن لے ماں؟" وہ کچھ رک گیا۔ ماں نے آہستگی سے گردن اٹھائی۔ وہ آنسو بہاتی نظروں سے بیٹے کا غضب ناک چہرہ دیکھنے لگی۔

"بیساکھی تک تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ دوسرے شوہر کو ساتھ رکھنا ہے یا اپنے اکلوتے بیٹے کو۔"

دل پر جیسے کسی نے آری رکھ دی ہو وہ اکڑوں بیٹھی بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے ہاتھ سے سونا زمین پر گر گیا۔ چنا نے دوڑ کر سونا اٹھالیا' پھر جیکٹ کی جیب میں ڈال کر وہ باہر چلا گیا۔ پنا سنگھ اس وقت دور ہٹ گیا تھا۔ چنا دور چلا گیا تو وہ غضب ناک نظروں سے نتھنے پھلاتا ہوا گھر آیا۔

"میرا بیٹا بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے پر لانا ہوگا۔" وہ بڑبڑایا اور چنا کی ماں کے برابر بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "پرم جیت! کیوں رو رہی ہو؟" اس نے اجنبی ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے پیار سے کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے تمہیں کیا دکھ ہے؟" بیٹے کی موجودگی میں پنا سنگھ اسے پیار کرنے وہ اس کے خلاف

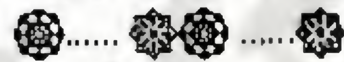
تھی۔ اس لیے اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا' مگر چنا نظر نہیں آیا تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔

"آپ کب آئے؟" پنا سنگھ نے ماں بیٹے کے درمیان ہونے والی باتیں تو نہیں سن لیں؟ یہ جاننے کے لیے اس نے پوچھا۔

"ابھی آرہا ہوں۔" پنا سنگھ نے اداکاری کی۔ "چنا مجھے راستے میں ملا تھا' وہ کچھ غصے میں نظر آرہا تھا۔" پھر پرم جیت کے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے پوچھا۔ "تم سے جھگڑا کرکے گیا ہے شاید؟"

"نہیں تو......" پرم جیت نے جلد ہی آنسو خشک کرلیے۔ "یہ تو میں اسے کچھ کام دھندا کرنے کے لیے سمجھا رہی تھی' میں نے کچھ سختی کی اس لیے غصہ ہو کر چلا گیا۔ پھر میرا بھی دل بھر آیا۔" پرم جیت اس سے حقیقت چھپا رہی تھی۔ پنا سنگھ کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ ماں اکلوتے بیٹے کی ناراضگی مول لے کر بھی اس کا پیار نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ پنا سنگھ نے لاڈ سے کہا۔

"چنا کی فکر نہ کرنا۔ میں اسے ٹھکانے پر لے آؤں گا۔ اس کا دماغ ٹھکانے لگ جائے گا۔" ٹھکانے لگا دینے کا مطلب پرم جیت اس وقت بھی نہیں تھی۔



امرتسر کا پولیس چیف پورن سنگھ اپنے بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد تھکن اتارنے کے لیے شراب کے تین چار پیگ پیٹ میں اتارنے کے بعد بھی اس میں پھرتی نہیں آئی۔ ذہن پر جگا سوار تھا۔ صرافہ بازار کے ڈاکے کو دو ماہ گزرنے والے تھے اس کے باوجود ایک بھی سراغ ہاتھ نہیں لگا تھا' اس سے وہ بے چین تھا۔ اوپر سے بار بار تاکید ہو رہی تھی۔ ڈانٹ پڑتی۔ "پنجاب پولیس کی عزت کا نیلام ہو رہی ہے۔ سارا ڈیپارٹمنٹ ادنگھتا دکھائی دیتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

"اب تو سالی شراب بھی اثر نہیں کرتی۔" اس نے غصے میں شراب کا گلاس پھینک دیا۔

"صاحب! اس وقت نہیں ملیں گے کل پولیس چوکی جا کر ملنا' یہاں گھر کیا دوڑ آتے ہو؟" دروازے پر چوکیدار کسی سے بک جھک رہا تھا۔ پورن سنگھ کی توجہ اس جانب گئی۔

"صاحب سے مجھے پرائیویٹ کام ہے۔ لہٰذا گھر آیا ہوں۔ ایک بار جا کر ان سے کہو۔" آنے والے نے ضد کی' تب پورن سنگھ نے آواز دی۔

"ارے......کون ہے؟"

چوکیدار پنا سنگھ کو برآمدے کے قریب لے گیا۔ "صاحب! یہ شخص......" مگر اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی پنا سنگھ شروع ہو گیا۔

"ایک خاص کام سے آیا ہوں۔"

"بولو! کیا کام ہے؟" پورن سنگھ نے بیزاری سے کہا۔ اس وقت جگا کے علاوہ اسے کسی بات میں دلچسپی نہیں تھی۔

"میں جلدی میں ہوں۔" پنا سنگھ نے چوکیدار کی جانب نظر کی۔ "صاحب! دو منٹ دیں۔ مجھے تنہائی میں بات کرنی ہے۔"

ایک لمحے کے لیے پورن سنگھ نے سوچا کہ ڈانٹ کر باہر نکال دے مگر نصیب نے اسے عقل دے دی۔ "چل! جلدی کہہ دے۔" اور چوکیدار کو وہاں سے ہٹا دیا۔ "تم دروازے پر جا کر کھڑے رہو۔"

"صاحب!" پنا سنگھ کے لب کپکپائے۔ "جوہری بازار کے ڈاکے کی ایک کڑی ہاتھ لگی ہے۔" پورن سنگھ کا ذہن ہل گیا مگر اس نے چہرے کا تاثر نہیں بدلا۔

"ایسی کڑی لے کر تو بہت سے آئے اور وقت ضائع کر گئے۔"

"صاحب! چوری کے مال میں کچا سونا بھی تھا۔" یہ سن کر پولیس چیف کی آنکھوں کی چمک پنا نے اندھیرے میں بھی دیکھ لی۔

"اندر آؤ۔" صاحب کے لہجے میں زبردست تبدیلی آ گئی۔ شراب کی بوتل کے ساتھ وہ پنا کو اندر لے گیا۔ نصف گھنٹے بعد پنا سنگھ نشے میں جھوم رہا تھا۔

"مگر صاحب! اس میں میرا نام کہیں نہیں آنا چاہیے اس کا خیال رکھنا۔"

"تم بے فکر رہنا۔" چیف نے اٹھ کر پیٹھ تھپتھپائی۔ "تمہاری اطلاع سے کام ہو گیا تو تمہیں نہال کر دوں گا۔"

پنا سنگھ دل میں ہنسا تم کیا نہال کرو گے؟ وہ راستہ مجھے مل گیا ہے۔ چیف اس کے خیالات نہ پڑھ لے اس لیے وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ پنا کے جاتے ہی پورن سنگھ نے فوراً پولیس چوکی فون کیا۔

"پنا کے گھر پر پورا جال بچھا دو! اس کا لڑکا فرار نہ ہو جائے۔"

صبح کے وقت ہی پنا سنگھ کی کھولی پر پورن سنگھ نے چھاپہ مارا۔ پولیس چیف کو دیکھ کر چنا کے پاؤں لرز گئے۔ اس کی ماں کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ گر گیا۔ پنا سنگھ انجان ہو کر بولا۔

"پولیس...... ہمارے گھر میں؟"

پورن سنگھ نے اس کی پروا کیے بغیر چنا کو دھمکایا۔ "کیوں لڑکے آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"کچھ نہیں صاحب!" جملہ ختم ہوتے ہی چیف نے اس کے رخسار پر چانٹا مارا۔

"بے وقوف! کس کے ساتھ لگ گیا ہے؟" پھر وہ سپاہیوں سے بولا۔ "چلو تلاشی لو۔"

پولیس والے حکم کے منتظر تھے۔ گھر پر کچھ نہیں تھا۔ کوئی چیز ہاتھ نہیں لگی۔ پورن سنگھ ہاتھ ملتا پنا سنگھ کی جانب دیکھنے لگا' اس نے اشارے سے دیوار کی کھونٹی پر لٹکتی ہوئی جیکٹ کی جانب اس کی توجہ دلائی' پورن سنگھ سمجھ گیا۔

"اس جیکٹ میں کیا ہے؟" یہ سن کر چنا کے پیر کپکپانے لگے۔ پورن سنگھ نے خود جیکٹ کھونٹی سے اتارلی۔ جیب میں ہاتھ ڈالتے ہی سونا مل گیا۔ "یہ جیکٹ کس کی ہے؟" چنا نے سر جھکا لیا۔ "سونا کہاں سے آیا؟" چنا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ "اسے تھانے لے جاؤ۔" ماں پر جیسے بجلی گری۔ وہ ہاتھ جوڑ کر درمیان میں آ گئی۔

"صاحب! یہ بے قصور ہے۔ اس نے کبھی چوری نہیں کی۔ آپ کو کسی نے غلط شک دلایا ہے۔" ماں کے آنسوؤں کی پرواہ نہ کرنے کی اسے عادت پڑ گئی تھی۔

"پھر یہ سونا بھی کوئی اس کی جیب میں رکھ گیا ہے۔"

"صاحب! تم اس کی بجائے مجھے تھانے لے چلو۔" پنا سنگھ نے اداکاری جاری رکھی۔ "اس کا کوئی جرم ہو تو میں اپنے سر لینے کو تیار ہوں۔ میں اس کے باپ کی جگہ ہوں۔"

"نہیں......!" چنا چیخا۔ میرے باپ کی جگہ دوسرے کسی کو نہیں ملے گی۔" اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ "صاحب! میں بے قصور ہوں۔"

"اس کا پولیس تھانے پر پتہ چلے گا۔" پورن سنگھ نے اس کا بازو تھام کر آگے کیا۔ روتی' سر پٹختی ہوئی ماں کو پنا نے تھامے رکھا۔

"پرم جیت! میں تیرے بیٹے کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ اس کے لیے میں اپنی جان بھی دے دوں گا۔"

"ارے میرا نصیب الٹا ہے۔" دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پرم جیت بڑبڑائی۔ "اس کے باپ کا زخم ابھی دل پر تازہ ہے۔ اب اگر لڑکے کو کچھ ہو گیا تو میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔" پنا سنگھ نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ "یہ کہہ کر تم میری ہمت توڑ رہی ہو کہ میں اس کا باپ نہیں ہوں۔ میں اس کے باپ سے زیادہ ہوں۔"

پرم جیت آہ بھر کر دل ہی دل میں بڑبڑائی۔ "اس وقت اسے سگے باپ کی ضرورت ہے۔ تمہاری نہیں۔" پہلی بار اس عورت کے ذہن میں اس شک نے سر ابھارا کہ چنا کی گرفتاری میں اس شخص کا ہاتھ تو نہیں......؟

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

